

جولائی 2018

خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ

خواتین طلوع

BOOKSPK
Books & Magazines



خواتین ڈائجسٹ

خط و کتابت کا پتہ

خواتین ڈائجسٹ

37- اردو بازار کراچی

بانی و مدیر اعلیٰ — محمود ریاض

مدیر — نگارہ خاتون

مدیر — اقرار ریاض

نائب مدیر — رخصیہ جمیل

مدیر خصوصی — اومت الصبور

بلقیس بھٹی

نفسیات — عدنان

اشتہارات — خالہ جیلانی

قانونی مشیر — نور الدین سرکی اینڈ کمپنی

ایڈیٹریس اینڈ ریگل کنٹرولرز

MEMBER
APNS
CPNE
رکن آل پاکستان نیوز پیپر سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپر ڈائریکٹرز



BOOKSPK
Books & Magazines

BAKE
PARLOR

نیا
پیک

BAKE
PARLOR
VERMICELLI

BAKE
PARLOR
VERMICELLI

BAKE
PARLOR
VERMICELLI



وہی روایتی
سویاں

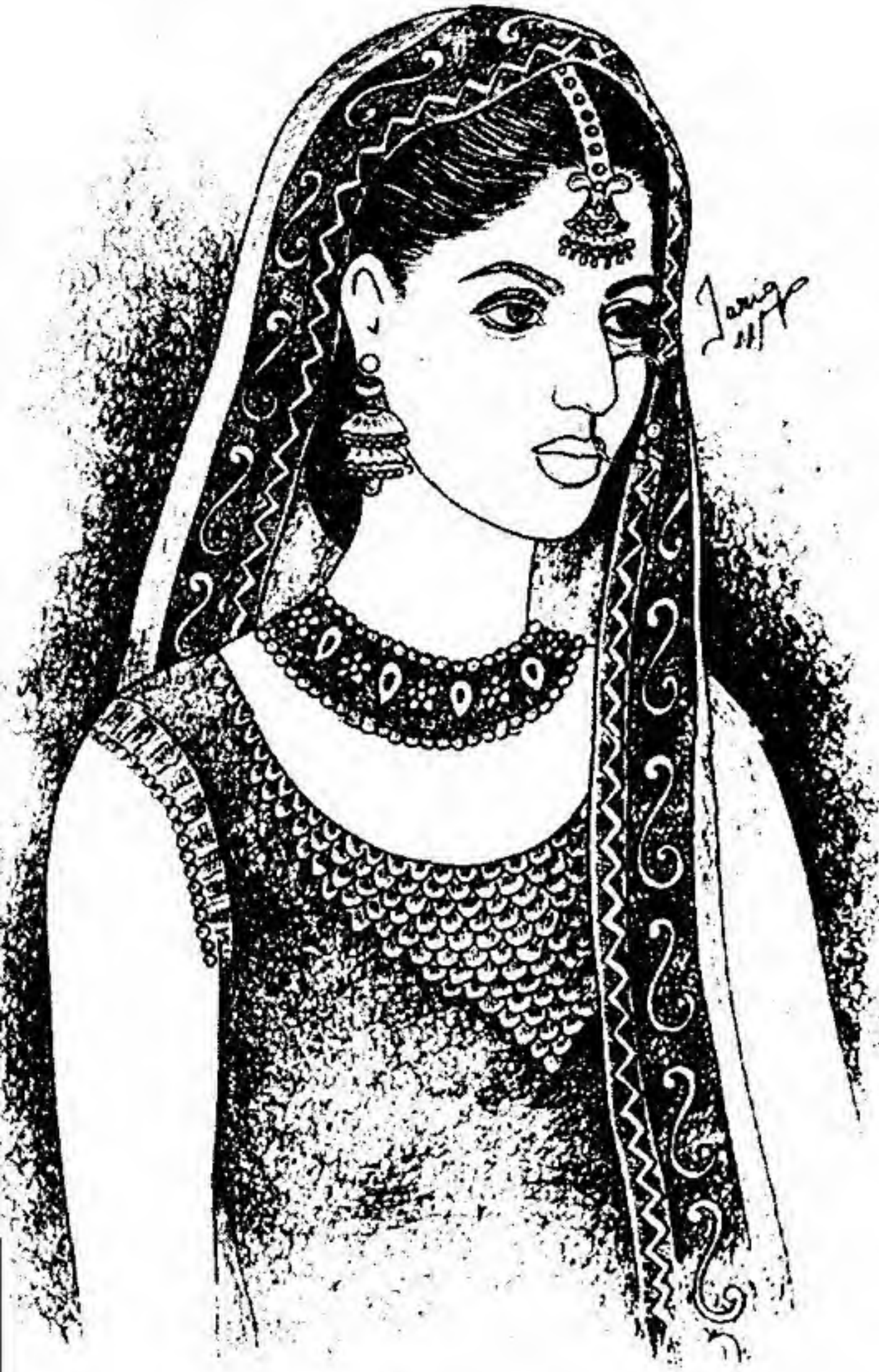
100 فیصد خالص گندم سے بنی چٹھے دار اور کمراری بیک پارلر سویاں

اب نئے سبیل بند پیک میں روایت برسوں کی، بس پیکنگ نئی۔

www.bakeparlor.com | www.bakeparlor.com | www.bakeparlor.com

www.bookspk.site

www.bookspk.site



نظمیں غزلیں

- غزل 263 فیضانِ سروری
غزل 262 ڈاکٹر عزیزہ اہم
تظلم 263 اعتبارِ ساجد
غزل 262 فراقِ گورکھ پوری

رنگارنگ پہول

- رنگارنگ سلسلہ 264 شگفتہ جہا
خبریں و بریں 279 واصفہ سہیل

میری بیاض سے

- آپ کی بیاض سے 267 خالدہ جیلانی

پکوان

- موسم کے پکوان 286 خالدہ جیلانی
آپ کا باورچی خانہ 282 قرآنہ انصاری

بیوٹی بکس

- بیوٹی بکس کے مشورے امت الصبور 290

نفسیات
نفسیاتی ازدواجی الجھنیں عدنان 288

جولائی 2018

جلد 46 نمبر 3

قیمت 70 روپے

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابنِ حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ٹاؤن، آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872

Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com

مکمل ناول

- یہ کوئی اور کہانی 36 فاخرہ حبیب
پیدل پیدل 78 فرزانہ کھرل
نسخہ ہاتھ و پا 120 نعیمہ ناز
میں اور تم 212 صدق کلین گیلانی

ناولٹ

- ریشم کہانی 190 اذلاح سکندر

افسانے

- آئینہ 149 سنیعہ عمیر
ہم کہاں جا رہے ہیں 116 کاشفہ حسین
سبق 70 شازیہ جلال طارق
ہمارے یہ رشتے 205 طاہرہ فردوس بیگم

زیر سالانہ باب کیلئے رجسٹری

پاکستان (سالانہ) --- 700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ --- 6000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا --- 7000 روپے
subscriptions@khawateendigest.com

ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے ہر جلد ماہنامہ شائع اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ٹی وی چینل پر ڈراما، ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ یہ صورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

کہنی سننی 14 سیر
کرن کرن روٹی 15 ادارہ
ہمارے نام 272 نادرہ خاتون

آپ سے گیل پورہ

ڈگریاں 20 انشاجی

خاتون کی ڈائری

میری ڈائری سے 268 امت الصبور

مجھ سے ملنے

باتیں نعمان سمیع سے 22 شاہین رشید

انٹرویو

قصہ حیات ملاقات 27 شاہین رشید
خامشی کو زباں ملے 32 ادارہ

ناول

حالم 158 مسرہ احمد

خواتین ڈائجسٹ کا جولائی کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔
کچھ دن، کچھ تاریخیں قوموں کے لیے بہت اہم ہوتی ہیں۔ ان میں کیے گئے فیصلے قوموں کی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔
ان کی تاریخ کو بدلنے کی طاقت رکھتے ہیں۔

جمہوری نظام میں انتخابات کا دن بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس دن عوام اپنے نمائندے منتخب کر کے پارلیمنٹ میں بھیجتے ہیں اور وہ آئندہ پانچ سال کے لیے ملک کے سربراہ کا انتخاب کرتے ہیں۔
قانون میں جب انتخابات منعقد ہوتے تو ملکی آئین پر درجہ مسائل تھے۔ امن وامان کا مسئلہ اور
توانائی کا بحران، دہشت گردی، بم دھماکے شدت اختیار کر چکے تھے۔ ملکی عدم فراہمی سے صنعتیں بند ہو رہی تھیں۔
سی این جی اسٹیشن پر گاڑیوں کی سڑکیں لمبی قطاریں نظر آتیں۔

اس وقت جو منظر نامہ سامنے آ رہا تھا سب کچھ بہت اچھا نہیں ہے لیکن صورت حال میں بڑی حد تک بہتری نظر آ رہی
ہے۔ گزشتہ پانچ سال کے دوران نفل و حمل اور مواصلات کا انفراسٹرکچر واضح طور پر بہتر ہوا ہے۔ لوڈ شیڈنگ تقریباً
ختم ہو گئی۔ سی این جی کی حصول کے لیے گاڑیوں کی لمبی لمبی قطاریں نظر نہیں آتیں۔ بم دھماکوں اور دہشت گردی میں نمایاں
کمی ہوئی ہے۔ سب سے بڑھ کر عروس البلاد کو لڑائی کا امن لوٹ آیا ہے۔ اگر جمہوری عمل اسی سلسلے سے جاری رہا تو آگے
بھی ملک کے لیے خوش آئند امکانات نظر آ رہے ہیں۔

دنیا میں کسی قوم کو اپنا وجود منوانے اور اسے قائم رکھنے کے لیے اخلاق و کردار بہت معنی رکھتے ہیں۔ عوام کے مزاج
اخلاق اور کردار کی تشکیل میں اس ملک کے سربراہ کا بہت بڑا حصہ ہوتا ہے۔ ملک کا سربراہ اور اس کے مشیر و وزیر
کا کردار بناتے ہیں اور ان کا انتخاب عوام کے فیصلے کا منہ ہوتا ہے۔

ایک بار پھر انتخاب آج کے ہاتھ میں ہے۔ سر قلم کے لسانی، صوبائی، بلدی اور رشتہ داری کے تقصیر سے
بالا تر ہو کر اپنے ملک کے لیے، اپنے اور اپنی آنے والی نسلوں کے بہتر مستقبل کے لیے نیک، باعمل اور باکردار قیادت کا
انتخاب کریں۔ پاکستان میں بڑھے ملے لوگوں کی اکثریت اپنا حق رکھنے دہی استعمال ہی نہیں کرتی۔ وہ الیکشن کے دن
کو عام تغلیل کا دن سمجھتے ہیں۔ یہ انتہائی حیرت کی بات ہے کہ ہم اپنے مکرانوں پر تنقید کو کرتے ہیں لیکن جب ان کے
انتخاب کا موقع آتا ہے تو اعلیٰ کا اظہار کرتے ہیں۔
وہاں ہے کہ انتخابات کا عمل پر امن طور پر انجام پائے اور آنے والی قیادت ملک و قوم کے لیے بہتر ثابت ہو۔

قاریں کے لیے خوش خبری

آپ حیات کے بعد قاریں کی فرمائش حق کر میرہ احمد خاتون ڈائجسٹ کے لیے نیا ناول لکھیں۔ آپ ب کی خواہش کو
مقبول نظر رکھتے ہوئے آئندہ ماہ یعنی اگست کے شمارے میں میرہ احمد کا نیا ناول ”الف“ شائع کیا جا رہا ہے۔
اس ناول کے بارے میں میرہ احمد کہتی ہیں۔

”الف“ آپ حیات کے بعد میرا اگلا ناول ہے جو آپ حیات کی طرح ضخیم اور طویل نہیں ہے لیکن آج کے انسان
کو اس دنیاوی زندگی میں دیرینہ چیلنجز کا سامنا کرنا ہے۔
شہر فساد کے بعد میں نے ایک بار پھر کسی ناول کو اللہ تعالیٰ کے نام کیا ہے اور میں امید کرتی ہوں

میرے دل سے نکلنے والی یہ تحریر آپ کے دل کو جھولے گی۔

اس شمارے میں،

۱۔ فاخرہ جمیل کا مکتب ناول۔ یہ کوئی ادبی کہانی ہے، نغمہ ناز کا مکتب ناول۔ نسخہ ہلے و فاف،
۲۔ فرزانہ گل کا مکتب ناول۔ پھیل کے پھول پر، صدف رحمان کی لالی کا مکتب ناول۔ میں ماورج،
۳۔ ریشم کسان کی افراخ سکندر کا ناول، غمرہ احمد کا ناول۔ عالم،
۴۔ شانزہ جمال طارق، کا شہر میں، سنیہ عمیر، طاہرہ فروغی، عبداللہ کے افسانے،
۵۔ ناول نگار، ڈراما نگار، قیصر حیات سے ملاقات، فی دی فیکار لغمان سمیع سے باتیں،
۶۔ کرکٹ روٹنی۔ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ، نفسانی اندھا دھی الجین اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔
خواتین کا جولائی کا شمارہ آپ کو کیسا لگا، اپنی رائے سے ضرور دوازیے گا۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی
تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت
رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی ناممکن اور ادھوری ہے، اس لیے ان دونوں کو
دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ
کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک
کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔
حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات
بھی شائع کریں گے۔

کن کن روٹی

ادارہ

قاضی کی ذمہ داری

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے،
نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”جسے لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنے والا
(جج) مقرر کیا گیا، اسے (گویا) بغیر چھری کے ذبح
کر دیا گیا۔“ (ابوداؤد)

فوائد و مسائل:

1۔ لوگوں کے جھگڑوں کا فیصلہ کرنا ایک اہم
ذمہ داری ہے لیکن یہ بہت نازک ذمہ داری ہے
کیونکہ صحیح فیصلوں سے معاشرے میں امن و سکون
قائم رہتا ہے اور غلط فیصلوں کا نتیجہ بد امنی اور فساد کی
صورت میں سامنے آتا ہے۔

2۔ غلط فیصلے سے کسی بے گناہ کی جان بھی جا
سکتی ہے اور ایک آدمی کا حق دوسرے کو مل سکتا ہے،
اس لیے جج کو اپنی اس ذمہ داری کا احساس کرتے
ہوئے صحیح فیصلے تک پہنچنے کی زیادہ سے زیادہ کوشش کرنا

ضروری ہے۔

3۔ ”بغیر چھری کے ذبح ہونے“ سے اس
منصب کی نزاکت اور اس فریضے کی انجام دہی کی
مشکل کی طرف اشارہ ہے، اس کے باوجود معاشرے
میں اس منصب کا وجود ضروری ہے، اس لیے جس
فحص میں صلاحیت موجود ہو، اسے یہ ذمہ داری قبول
کرنا اور اسے انصاف کے ساتھ کما حقہ ادا کرنا
ضروری ہے۔

منصب مانگنا

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے
روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
”جس نے قاضی کا منصب طلب کیا، وہ اپنی

جان کے حوالے کر دیا جاتا ہے، اور جسے اس (منصب
کو قبول کرنے) پر مجبور کیا گیا، ایک فرشتہ نازل ہو کر
اس کی رہنمائی کرتا ہے۔“

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے،

انہوں نے فرمایا: ”مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن روانہ فرمایا تو میں نے عرض کیا۔“ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! آپ مجھے روانہ فرما رہے ہیں کہ ان کے فیصلے کروں، حالانکہ میں جوان ہوں (جربہ کار نہیں)، مجھے تو معلوم نہیں فیصلہ کیسے کیا جاتا ہے؟“

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بیان کیا: ”آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے سینے پر ہاتھ مارا اور فرمایا۔“

”اے اللہ! اس کے دل کو ہدایت دے اور اس کی زبان کو (صحیح بات پر) قائم فرما۔“ وہ فرماتے ہیں: اس کے بعد مجھے دو شخصوں کے درمیان فیصلہ کرتے وقت بھی شک پیش نہیں آیا۔“ (ابوداؤد)

فوائد و مسائل:

- 1- کسی منصب کے لیے اس شخص کو مقرر کرنا چاہیے جس میں اس سے متعلقہ فرائض انجام دینے کی اہلیت موجود ہو۔
- 2- اگر ایک شخص محسوس کرے کہ وہ ان فرائض کو ادا کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا جو اس کے ذمے لگائے جا رہے ہیں تو اسے حق حاصل ہے کہ وہ منصب قبول کرنے سے انکار کر دے۔
- 3- اپنے بزرگ یا سربراہ کے سامنے اپنی کمزوری یا مشکلات بیان کرنا حکم عدولی میں شمار نہیں ہوتا۔
- 4- جس شخص کو نئی ذمہ داری سونپی جائے، اس کی مناسب رہنمائی کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے حق میں دعا کرنا بھی اس کے لیے بہت مفید ہے۔

غلط فیصلے کا عذاب

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”جو بھی قاضی لوگوں کے درمیان فیصلے کرتا ہے، قیامت کے دن وہ اس حال میں حاضر ہوگا کہ

ایک فرشتے نے اسے گدے سے پکڑ رکھا ہوگا، پھر آسمان کی طرف سر اٹھائے گا، اگر اللہ نے فرمایا: اسے پھینک دے تو فرشتہ اسے (جہنم کے) گڑھے میں پھینک دے گا (جس میں وہ) چالیس سال تک (گرتا چلا جائے گا)۔“ (مسند احمد)

نا انصافی کرنا

حضرت عبداللہ بن ابی اونی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ قاضی کے ساتھ ہوتا ہے جب تک وہ ظلم (بے انصافی) نہ کرے۔ جب وہ ظلم کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے اس کے نفس کے سپرد کر دیتا ہے۔“ (طبرانی)

فوائد و مسائل:

- 1- جب انسان صحیح کام کی نیت رکھتا ہو تو اسے اللہ کی طرف سے توفیق اور مدد حاصل ہوتی ہے۔ اسی طرح قاضی اگر صحیح فیصلہ کرنا چاہے تو اللہ تعالیٰ اس کی رہنمائی فرماتا ہے اور اس کے لیے حقیقت تک پہنچنا آسان ہو جاتا ہے، اگر نیک نیتی کے باوجود غلطی بھی ہو جائے تو وہ غلطی معاف ہے۔
- 2- جب قاضی کا ارادہ بے انصافی کرنے کا ہو تو اللہ کی تائید و نصرت حاصل نہیں رہتی۔ اس کے نتیجے میں شیطان کو داؤ لگانے کا موقع مل جاتا ہے اور قاضی غلط فیصلہ کر کے ظلم کا مرتکب ہو جاتا ہے۔
- 3- ہر اچھا کام اللہ کی توفیق و عنایت سے ہوتا ہے، اس لیے فرائض کی انجام دہی میں اللہ سے مدد مانگتے رہنا چاہیے۔

رشوت

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”رشوت دینے والے اور رشوت لینے والے پر اللہ کی لعنت ہے۔“ (ابوداؤد)

فوائد و مسائل:

- 1- رشوت دینے کی ضرورت تب ہی پیش آتی

ہے جب کوئی شخص غلط موقف پر ہونے کے باوجود اپنے حق میں فیصلہ کرنا چاہتا ہے۔ اس طرح رشوت دینے والا حق دار کا حق بھی مارتا ہے اور قاضی کو بھی گناہ پر آمادہ کرتا ہے۔ یہ دگنا گناہ اسے اللہ کی رحمت سے محروم کر دیتا ہے۔

2- رشوت لینے والا دنیا کے معمولی سے مفاد کے لیے ایک بے گناہ پر ظلم کرتا ہے اور اس سے اس کا حق چھین لیتا ہے، حالانکہ اسے مقرر ہی اس لیے کیا گیا ہے کہ دوسروں کو ظلم سے روکے۔ اس لحاظ سے اس کا گناہ دوسرے ظالم سے کہیں زیادہ سنگین ہو جاتا ہے، اس لیے وہ بھی اللہ کی رحمت سے محروم ہو جاتا ہے۔

3- لعنت کا مطلب اللہ کی رحمت سے محروم ہونا اللہ کا کسی بندے کو اس کے کسی جرم کی وجہ سے اپنی رحمت سے محروم کرنا ہے۔ لعنت کا مطلب کسی کو یہ بد دعا دینا بھی ہے کہ وہ اللہ کی رحمت سے محروم ہو جائے۔

4- (راشی) رشوت دینے والے کو (مرثی) رشوت لینے والے کو اور (رائش) ان دونوں کے درمیان معاملہ طے کرانے والے کو کہتے ہیں۔ یہ سب بڑے گناہ گار ہیں۔

صحیح فیصلہ کرنے کی کوشش کرے

حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ آپ نے فرمایا:

”جب فیصلہ کرنے والا فیصلہ کرے اور اجتہاد کر کے صحیح بات تک پہنچ جائے تو اس کے لیے دو ثواب ہیں۔ اور جب فیصلہ کرے لیکن اجتہاد کرنے میں اس سے غلطی ہو جائے تو اس کے لیے ایک ثواب ہے۔“ (بخاری)

یہی روایت ایک دوسری سند سے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔

فوائد و مسائل:

1- اجتہاد کے لفظی معنی کوشش کرنا ہیں۔ یہاں یہ مطلب ہے کہ دلائل و شواہد کی روشنی میں اخلاص کے ساتھ پیش آمدہ مسئلے میں صحیح موقف تک پہنچنے کے لیے پوری توجہ اور کوشش سے سوچ بچار کی جائے، اور یہ فیصلہ کرنے والے کا فرض ہے کہ اپنی طرف سے صحیح فیصلہ کرنے کی پوری کوشش کرے۔

2- اس کوشش اور اجتہاد کے نتیجے میں صحیح بات سمجھ میں آ جانا اللہ کا فضل ہے جس کے نتیجے میں حق دار کو اس کا حق مل جاتا ہے، یا مسئلہ پوچھنے والے کو صحیح مسئلہ معلوم ہو جاتا ہے اور مسلمان کو فائدہ پہنچانا ایک نیکی ہے، لہذا اجتہاد کرنے والے کو اس کا بھی ثواب ملتا ہے۔ یہ ثواب اللہ کی خاص رحمت ہے۔

3- جس شخص سے اجتہاد میں غلطی ہو جائے اور اس کے نتیجے میں کسی کو غلط مسئلہ بتایا جائے یا حق دار اپنے حق سے محروم ہو جائے تو اجتہاد کرنے والے قاضی یا عالم کو گناہ نہیں ہوگا کیونکہ اس نے صحیح بات کو سمجھنے کی پوری کوشش کی ہے، لہذا اسے اس کوشش کا ثواب بہر حال ملے گا۔

4- اگر بعد میں آنے والوں کو معلوم ہو جائے کہ عالم سے مسئلہ معلوم کرنے میں غلطی ہوئی ہے تو انہیں اپنی تحقیق کے مطابق عمل کرنا چاہیے اور غلطی کرنے والے عالم کے بارے میں حسن ظن رکھنا چاہیے کہ اس نے جان بوجھ کر غلط مسئلہ نہیں بتایا۔

قاضی تین قسم کے ہیں

حضرت ابو ہاشم رحمۃ اللہ سے روایت ہے کہ اگر حضرت عبداللہ بن بریدہ رحمۃ اللہ کی وہ حدیث نہ ہوتی جو انہوں نے اپنے والد (حضرت بریدہ بن حصیب اسلمی رضی اللہ عنہ) سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”قاضی تین (طرح کے) ہیں۔ دو جہنم میں جائیں گے اور ایک جنت میں۔ (ایک) وہ آدمی (ہے) جس نے حق معلوم کر لیا پھر اس کے مطابق

فیصلہ دیا تو وہ جنت میں جائے گا۔ (دوسرا) وہ آدمی (ہے) جس نے (حق سے) لاعلم ہوتے ہوئے لوگوں میں فیصلہ کیا، وہ جہنم میں جائے گا۔ (تیسرا) وہ آدمی (ہے) جس نے فیصلہ کرتے ہوئے ظلم سے کام لیا، وہ بھی جہنم میں جائے گا۔ (اگر یہ حدیث نہ ہوتی) تو ہم کہتے کہ قاضی جب اجتہاد سے کام لے (اپنی پوری کوشش کرے) تو وہ جنتی ہے۔ (ابوداؤد)

فوائد و مسائل:

1- حج کے لیے ضروری ہے کہ فیصلہ کرتے وقت اسے یقین ہو کہ حج بات یہ ہے، پھر اس کے مطابق فیصلہ کرے۔

2- سرسری سماعت کے بعد فیصلہ دے دینا، جب کہ معاملے کی پوری طرح چھان بین کر کے حق معلوم نہ کیا گیا ہو، جائز نہیں۔

3- جب یقین ہو جائے کہ حق فلاں فریق کا ہے، پھر فیصلہ دوسرے کے حق میں دے دیا جائے، یہ ظلم ہے اور اس کی سزا جہنم ہے۔ اس نا انصافی کی وجہ بعض اوقات کوئی وقتی دنیوی مفاد ہوتا ہے۔ یہ مفاد رشوت میں شامل ہے جس کی وجہ سے لعنت پڑتی ہے۔

4- اجتہادی غلطی معاف ہونے کے باوجود حق تبدیل نہیں ہوتا، اس لیے جب معلوم ہو جائے کہ غلطی ہو گئی ہے تو قاضی یا مجتہد کو اپنے پہلے فیصلے یا فتوے سے رجوع کر لینا چاہیے۔

غصے کی حالت میں فیصلہ کرنا

حضرت ابو بکرہ (رضی اللہ عنہ) (نفع بن حارث بن کلدہ ثقفی) سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”قاضی دو آدمیوں کے درمیان فیصلہ نہ کرے جب کہ وہ غصے میں ہو۔“ (بخاری)

فوائد و مسائل:

غصے کی حالت میں انسان کی ذہنی حالت

درست نہیں رہتی اور جذبات کی وجہ سے معاملات کے تمام پہلوؤں پر غور کرنا ممکن نہیں رہتا، اس لیے خطرہ ہوتا ہے کہ اس حالت میں دیا ہوا فیصلہ درست نہیں ہو گا۔

جھوٹ بول کر مال حاصل کرنا

ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”تم میرے پاس اپنے تنازعات لے کر آتے ہو اور میں ایک انسان ہی ہوں۔ شاید کوئی شخص اپنی دلیل کو دوسرے کی نسبت بہتر طور پر بیان کر سکتا۔۔۔۔۔ اور میں تو جو کچھ تم (فریقین اور گواہوں) سے سنتا ہوں اسی کے مطابق فیصلہ کرتا ہوں، لہذا جس کو میں اس کے بھائی کے حق میں سے کوئی چیز دے دوں تو وہ اسے نہ لے۔ میں تو اسے آگ کا ایک ٹکڑا دے رہا ہوں۔ قیامت کے دن وہ اسے لے کر حاضر ہوگا۔“ (بخاری)

فوائد و مسائل:

1- قاضی کو فریقین کے دلائل، گواہوں کی گواہی اور قرآن کی روشنی میں صحیح فیصلہ کرنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ اس کے باوجود اگر اس سے غلط فیصلہ ہو گیا تو اسے گناہ نہیں ہوگا۔

2- اگر ایک شخص کو معلوم ہے کہ اس معاملے میں میرا موقف درست نہیں لیکن قاضی اس کے حق میں فیصلہ دے دیتا ہے تو اس سے اصل حقیقت میں فرق نہیں پڑتا، لہذا اس کے لیے وہ چیز لینا جائز نہیں جسے قاضی اس کی قرار دے چکا ہے۔

3- اس حدیث کی روشنی میں علمائے کرام نے یہ اصول بیان فرمایا ہے: ”قاضی کا فیصلہ ظاہر انافذ ہوتا ہے، باطناً نہیں۔“ اس کا یہی مطلب ہے کہ قاضی کے فیصلے سے کسی دوسرے کی چیز حلال نہیں ہو جاتی، مثلاً: اگر جھوٹے گواہوں کی مدد سے یہ فیصلہ لے لیا جائے کہ فلاں عورت سے نکاح ہو چکا ہے تو مرد کے لیے اس عورت کے ساتھ ازدواجی تعلقات قائم کرنا

جائز نہیں ہوگا۔ اگر وہ ایسا کرے گا تو زنا کا مرتکب ہو گا، اور قیامت والے دن اسے اس کی سزا ملے گی۔ اسی طرح اگر قاضی یہ فیصلہ کر دے کہ فلاں عورت کو طلاق ہو چکی ہے جبکہ حقیقت میں مرد نے طلاق نہ دی ہو تو مرد اپنی اس بیوی سے ازدواجی تعلقات قائم رکھنے پر اللہ کے ہاں مجرم نہیں ہوگا۔

4- ناجائز طور پر حاصل کیا ہوا مال قیامت کے دن سزا کا باعث بھی ہوگا اور رسوائی کا سبب بھی، جب مجرم سب لوگوں کے سامنے اپنے جرم کے ثبوت سمیت موجود ہوگا اور اسے اس کے مطابق سرعام سزا ملے گی۔

5- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی شریعت کے احکام کے مطابق عمل کرنے اور فیصلہ کرنے کے مکلف تھے۔

6- کسی کے حق سے ٹکڑا کاٹ کر دینے کا مطلب یہ ہے کہ جتنا حق دار کا حق تھا اسے پورا نہیں دیا گیا بلکہ کچھ حصہ غلطی سے دوسرے کو دے دیا گیا۔ واللہ اعلم۔

جھوٹا دعوا کرنا

حضرت ابو ذر (جندب بن جنادہ غفاری رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے، انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے:

”جو شخص اس چیز کا دعویٰ کرے جو اس کی نہیں تو وہ ہم میں سے نہیں، اسے اپنا ٹھکانا جہنم میں بنا لینا چاہیے۔“

فوائد و مسائل:

1- ”ہم میں سے نہیں۔“ کا مطلب یہ ہے کہ اس کا یہ عمل مسلمانوں کا عمل نہیں اور اس کا ایمان کامل نہیں۔

2- ”جہنم میں ٹھکانہ بنا لینا چاہیے۔“ کا مطلب یہ ہے کہ اسے یقین ہونا چاہیے کہ وہ جہنم میں جائے گا، لہذا اس سے بچنے کے لیے اسے اس گناہ سے اجتناب کرنا چاہیے۔ اور اگر یہ گناہ ہو گیا ہے تو حق دار کو اس کا

حق واپس کر کے توبہ کر کے جہنم سے بچ جانا چاہیے۔ 3- ارشاد نبویؐ ہے: ”جس نے گواہی دی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں، اللہ اسے (جہنم کی) آگ پر حرام کر دیتا ہے۔“ (صحیح مسلم، حدیث: ۲۶) اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسے اس کے گناہوں کی سزا نہیں ملے گی بلکہ یہ مطلب ہے اسے جہنم میں ہمیشہ رہنے کا عذاب نہیں ہوگا۔

ظالم کی مدد

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”جس نے کسی مقدمے میں ظلم میں (ظالم کی) مدد کی، وہ ہمیشہ اللہ کی ناراضی کا مستحق رہتا ہے حتیٰ کہ (اس گناہ سے) باز آ جائے۔“ (ابوداؤد)

فوائد و مسائل:

1- لوگوں کے آپس کے اختلافات میں ہر شخص کو چاہیے کہ اس شخص کی حمایت کرے جس کا موقف درست ہو اور جو غلطی پر ہو اسے سمجھائے اور منع کرے۔

2- ظالم کی حمایت اور مدد کرنا بڑا گناہ ہے۔ حق کی حمایت میں دوستی یا رشتے داری کے تعلقات کو رکاوٹ نہیں بنے دینا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (النساء: ۱۳۵)

”اے ایمان والو! تم انصاف کے لیے ڈٹ جانے والے اور اللہ کے لیے سچی گواہی دینے والے بن جاؤ، خواہ وہ تمہارے اپنے خلاف یا تمہارے والدین اور رشتے داروں کے خلاف ہو، معاملے کا فریق امیر ہو یا غریب، دونوں صورتوں میں تمہاری نسبت اللہ زیادہ ان کا خیر خواہ ہے، لہذا تم نفسانی خواہش کے پیچھے پڑ کر انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑو۔“



ڈگریاں بڑی نعمت ہیں

انشائی

لاہور کے ایک اخبار میں ایک وکیل صاحب کے متعلق یہ خبر مشہور ہوئی ہے کہ کوئی عالم دین کا سرمایہ علم و فضل اور دولت صبر و قرار اور آلات کاروبار لوٹ لے گیا ہے۔ تفصیل مال مسروقہ کی یہ ہے۔

ڈگری بی اے کی ایک ایل ایل بی کی، ایک کریکٹر سر ٹیفکیٹ بدیں مضمون کہ حامل سرٹیفکیٹ ہذا بھی جیل نہیں گیا۔ اس پر ہر قسم کے مقدمے چلے لیکن یہ ہمیشہ بری ہوا۔ وکیل صاحب نے اعلان کیا ہے کہ یہ صاحب غلطی سے میری الماری ہ تالا توڑ کر یہ سرٹیفکیٹ لے گئے ہوں یا سہواً خود ان کے پاس چلے گئے ہوں۔ وہ براہ کرم واپس کر دیں۔ ان کو کچھ نہیں کہا جائے گا۔ اگر کوئی اور صاحب اس نابکار چور کو پکڑ کر لائیں تو خرچہ آمدورفت بھی پیش کیا جائے گا۔

حلیہ یہ ہے۔ چور کا نہیں، سرٹیفکیٹوں کا کہ ان پر بندے کا نام لکھا ہے۔ گلشن علی شمر قندی، سابق سوداگر شکر قندی، مقیم گوانڈی، بعض کم فہم ظاہر بین کہیں گے کہ ڈگری سے کیا ہوتا ہے وکیل صاحب! شوق سے کاروبار جاری رکھیں۔ وکالت علم و عقل بلند زبان سے کی جاتی ہے۔ ڈگری کوئی تعویذ تھوڑا ہی ہے کہ جس کے بازو پر باندھا وہ گونگا بھی ہے تو پٹ پٹ بولنے لگا۔ فصاحت کے بتائے کھولنے لگا۔ لیکن ہماری سنیے تو ڈگری اور عہدہ دونوں کام کی چیزیں ہیں۔ بلکہ علم اور لیاقت کا نعم البدل ہیں۔

آناں راکہ ایں وہند، ان نہ وہند تم نے منصب دار لوگوں کو دیکھا ہوگا کہ بظاہر بے علم معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن وقت آنے پر ادب اور آرٹ کے اسرار و غوامض پر ایسی مدبرانہ گفتگو کرتے ہیں کہ واناں اندراں حیراں بماند، جتنا بڑا عہدہ دار ہوگا۔ اتنی ہی وہ اونچی بات کرے گا۔ نیچے والوں کو خاطر میں نہ لائے گا۔ ڈگری کو بھی ہم نے اسی طرح لوگوں کے سر چڑھ کر بولتے دیکھا۔

ایک ہمارے مہربان ہیں اردو زبان و ادب کے پروفیسر۔ ایک روز دست نگر کو دست نگر پڑھ رہے تھے اور

استفادہ حاصل کرنا بول رہے تھے۔ ہم نے بڑے ادب سے ٹوکا۔ لیکن وہ کھڑکے اور پوچھنے لگے۔

”کتنا پڑھے لکھے ہو تم؟“

ہم نے کہا۔ ”کچھ بھی نہیں، بس حرف شناس ہیں۔ الف بے آتی ہے۔ گنتی بھی لکھ لیتے ہیں۔ اس پر وہ اندر سے فریم شدہ جو کھٹے اٹھالائے۔ ان پر ایک ڈگری ایم اے کی تھی۔ دوسری پی ایچ ڈی کی۔ بولے۔ ”اب کہو تمہارا کہاسند ہے یا ہمارا فرمایا ہوا؟“

اس دن پہلی بار ہمیں اپنی غلطی معلوم ہوئی۔ اب ہم بھی ریڈیو اور ٹیلی ویژن والوں کی طرح دست نگر چشم دیدہ، دم زدن اور استفادہ حاصل کرتے ہیں بولتے اور لکھتے ہیں۔

ڈگری اور سرٹیفکیٹ کا چلن پرانے زمانے میں اتنا نہ تھا جیسا آج کل ہے۔ اس زمانے کے لوگ بیمار بھی سر ٹیفکیٹ کے بغیر ہو جایا کرتے تھے اور بعض اوقات تو شدت مرض سے مر بھی جایا کرتے تھے۔ اب کسی آدمی کی علالت کو خواہ سامنے پڑا پڑیاں رٹ رہا ہو۔ بلا سرٹیفکیٹ کے ماننا قانون کے خلاف ہے۔ پرانے زمانے میں لوگوں کے اخلاق بھی بلا سرٹیفکیٹ شائستہ ہوا کرتے تھے۔ اب جس کے پاس کریکٹر سرٹیفکیٹ نہیں، سمجھو کہ اس کا کچھ اخلاق نہیں۔ اس کی نیک چلتی مشتبہ۔ اب تو مرنے جینے کا انحصار بھی سرٹیفکیٹ پر ہے۔ سانس کی آمد و شد پر نہیں۔

آپ نے اس شخص کا قصہ سنا ہوگا۔ جو خزانے سے پنشن لینے گیا تھا۔ جون کی پنشن تو اسے مل گئی۔ کیونکہ اس ماہ کے متعلق اس کے پاس بقدر حیات ہونے کا سرٹیفکیٹ تھا۔ لیکن مئی کی پنشن روک لی گئی کہ جب مئی میں زندہ ہونے کا سرٹیفکیٹ لاؤ گے، تب ادا کی جائے گی۔ اصول، اصول ہے۔ اس منطق سے تھوڑا ہی توڑا جاسکتا ہے کہ جو شخص جون میں زندہ ہے۔ اس کے مئی میں بھی زندہ ہونے کا غالب امکان ہے۔ باقاعدہ سرٹیفکیٹ ہونا

چاہیے۔ عشق کا ریت کہ بے آہ نغاں نیز کنند..... وکیلوں کے لیے بے شک ڈگری کی پابندی ہے۔ اسی لیے وہ ڈگریاں چوری ہو جانے پر پریشان اور بے بس ہو جاتے ہیں۔ لیکن موکلوں اور گواہوں کو ان کے بغیر ہی ایسی لیاقت پیدا کرتے دیکھا ہے کہ ڈگری والا تیری قدرت کا تماشا دیکھے۔ آپ نے ان میر صاحب کا ذکر سنا ہے جو ہاتھ میں چھری، لیے پھندتے دار ٹوپی پہنے۔ بغل میں بستہ مارے پکھری کے احاطے میں گھومتے رہتے تھے کہ اگر لکھوائے کوئی ان کو خط تو ہم سے لکھوائے یعنی..... مناسب معاوضے پر گواہی دے کر حاجت مندوں کے آڑے وقت کام آتے تھے۔

ایک روز کی بات ہے کہ کوئی جائیداد کا مقدمہ عدالت میں تھا۔ مدعی کا وکیل تیار نہ تھا۔ اسے پوری امید تھی کہ آتے ہی تاریخ لے لے گا۔ لیکن مجسٹریٹ نے جانے کیوں اصرار کیا کہ سماعت آج ہی ہوگی۔ گواہ پیش کیے جائیں۔ ورنہ ایک طرفہ ڈگری دیتا ہوں۔ وکیل صاحب بوکھلائے ہوئے باہر نکلے کہ میر صاحب دکھائی دیے۔ ان کی جان میں جان آئی۔ فوراً انہیں بازو سے پکڑ کر اندر لے گئے۔ مقدمہ سمجھنے سمجھانے کا تو وقت ہی نہ تھا۔ بس اتنی بھٹک کان میں پڑی کہ کوئی خان بہادر رضا علی مرگئے ہیں۔ ان کی جائیداد کا قصہ ہے۔

یہ کون تھے..... کیا تھے..... جھگڑا کیا ہے..... کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ بہر حال پیش ہو گئے اور حلف اٹھا کر کٹہرے میں کھڑے ہو گئے۔ وکیل مخالف کو معلوم تھا کہ یہ بھاڑے کے ٹٹو ہیں۔ ابھی ان کے قدم اکھاڑ دوں گا..... جرح..... شروع کر دی۔

”میر صاحب..... آپ خان بہادر رضا علی مرحوم کو جانتے تھے؟“

میر صاحب نے فرمایا۔ ”اجی جانتا کیا معنی..... دانت کاٹی روٹی تھی۔ بڑی خوبیوں کے آدمی تھے۔ خدا مغفرت کرے۔ ان کی صورت ہمہ وقت آنکھوں کے آگے پھرتی ہے۔“

”کیا عمر تھی ان کی؟“

”بس چالیس اور اسی کے درمیان ہوں گے۔ بدن چور تھے اسی لیے بیخ اندازہ آج تک کوئی نہیں لگا سکا۔“

”اچھا یہ بتائیے کہ وہ لائے تھے یا نا لے۔“

میر صاحب نے کہا ”خوب لانا تھا۔ لیکن ازراہ خاکساری جھک کے چلتے تھے۔ اس لیے نا لے معلوم ہوتے تھے۔“

وکیل نے دوسرا سوال داغا..... ”ان کی رنگت تو آپ بتا ہی سکتے ہیں۔ گورے تھے یا کالے؟“

میر صاحب نے کہا۔ ”خوب سرخ و سفید رنگت تھی۔ لیکن بیماری کے باعث جلد سنو لاجانی تھی تو کالے نظر آنے لگتے تھے۔“

وکیل نے ایک اور وار کیا۔ ”یہ بتائیے کہ داڑھی مونچھر رکھتے تھے یا صفا چٹ تھے۔“

میر صاحب نے کہا۔ ”مرحوم کی طبیعت عجب باغ و بہار تھی۔ کبھی جی میں آیا تو مونچھیں رکھ لیں۔ کبھی کبھی نکلی، کبھی کچھ دار، داڑھی بھی چھوڑ دیتے تھے، کبھی یک مشت۔ کبھی یہ لمبی ناف تک اور پھر ترنگ آئی تو سب کچھ منڈا صفا چٹ ہو جاتے تھے۔“

”اچھا آپ نے ان کی داڑھی دیکھی ہوگی۔ سفید ہوتی تھی یا کالی۔“

میر صاحب نے کہا۔ ”ویسے تو سفید ہی ہوتی تھی لیکن جب خضاب لگا لیتے تھے تو بالکل کالی نظر آتی تھی۔ ان کی طبیعت ایک رنگ پر نہیں تھی۔ وکیل صاحب! کہہ دیا نا کہ باغ و بہار آدمی تھے۔“

وکیل صاحب نے کہا۔ ”اچھا یہ فرمائیے کہ ان کا انتقال کس مرض میں ہوا۔“

میر صاحب نے ایک لمبی آہ بھری اور کہا۔ ”رونا تو یہی ہے کہ آخر تک کچھ تحقیق نہ ہوئی۔ ڈاکٹر کچھ کہتے تھے۔ حکیم کچھ..... مرگ چو آید طیب ابلہ شود ہم..... تو یہی کہیں گے کہ ان کو مرض الموت تھا۔ ہائے! کیسی نورانی صورت تھی ہمارے خان بہادر صاحب کی۔ ان کی یاد آتی ہے تو سینے میں تیر سا لگتا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ ڈس ڈس رونے بھی لگے۔

مجسٹریٹ نے کہا۔ ”اچھا“ اب دوسرے مقدمے کی باری ہے۔ اگلی بدھ کو دوسرے گواہان پیش ہوں۔“



باتیں نعلان سمیٹے

شاہین رشید



”میں نے اے سی اے سی اے کیا ہے۔ یو کے سے اکاؤنٹنگ میں ڈگری لی۔ اور پھر ایک آڈٹ فرم میں چھ سال جاب بھی کی یہ حیثیت آڈیٹر کے۔“
7- ”شادی ہوئی؟“
”جی نہیں..... ابھی نہیں ہوئی۔“
8- ”شوہز میں آمد؟“
”ایکٹنگ کورس کیا، پھر آڈیشنز دیے۔ کامیاب ہوا۔ اور سب کام گھر والوں کی اجازت سے کیے۔“
9- ”بہلا ڈرامہ؟“
”دلہل“

10- ”وہ ڈراما جس نے شہرت دی۔“
”ماں صدقے“ ”نومی کے کردار نے۔“
11- ”پہلی کمائی / کہاں خرچ کی؟“
”جب لندن میں تعلیم حاصل کر رہا تھا تو میکڈونلڈ میں جاب کی تھی اور پہلی کمائی میں جو کچھ ملا دوستوں کے ساتھ مل کر کھاپی لیا۔ پہلی کمائی 18 سال کی عمر میں کی۔“

12- ”شوہز کی بڑی برائی؟“
”ہر شعبے میں اچھائیاں، برائیاں ہوتی ہیں۔ اس میں بھی ہیں تو کوئی حیرانی کی بات نہیں۔“
13- ”آپ کی سب کب ہوئی ہے؟“
”جب بھی سوتا ہوں اس کے ساتھ آٹھ گھنٹے کے بعد میری صبح ہوتی ہے۔“
14- ”آنکھ کھلتے ہی کیا دل چاہتا ہے؟“
”کہ پھر سے سو جاؤں۔“

15- ”دنیا میں تبدیلی لانے کو کہا جائے؟“
”مسلمانوں کے بارے میں جو ایک تصور

1- ”اصلی نام؟“
”نعلان سمیٹ“
2- ”پیار کا نام؟“
”کافی سارے ہیں۔ ”نومی“، ”مانی“، اور ”شاہ میر“۔ جس کا جودل چاہتا ہے، پیار سے پکار لیتا ہے۔“
3- ”تاریخ پیدائش / شہر؟“
”3 مئی / کراچی“
4- ”قد / ستارہ؟“
”ستارہ ٹو ٹورس“ ہے جبکہ قد کی لمبائی کبھی چیک نہیں کی لیکن لگتا ہے کہ 5 فٹ 8 انچ ہوگی۔“
5- ”بہن بھائی / آپ کا نمبر؟“
”دو بہنیں اور میں۔ میں گھر میں بڑا ہوں۔“
6- ”تعلیم؟“

بنادیا گیا ہے، اسے بدلنا چاہیے۔“
16- ”اچھی یا بری خبر سب سے پہلے کس کو سناتے ہیں؟“
”اچھی خبر گھر والوں کو اور بری کے لیے کوشش کرتا ہوں کہ کسی کو نہ سناؤں۔“
17- ”خود میں کیا تبدیلی لانا چاہتے ہیں؟“
”بہت ساری تبدیلیاں لانا چاہتا ہوں۔“
18- ”فخر کا کوئی لمحہ؟“
”جب جب زندگی میں کوئی کامیابی حاصل کی، مثلاً جب ڈگری ملی، جب جاب ملی اور جب پروموشن ملی۔“
19- ”بچپن کی کوئی بری عادت جو ابھی بھی ہے؟“
”جب کچھ کرنے کی ضد آجائے اور جب تک وہ کام نہ کر لوں، دھیان ادھر ہی لگا رہتا ہے۔“
20- ”ضد ہی ہیں؟“
”جی ہاں جیسا کہ پہلے بتا چکا ہوں۔“
21- ”کھیلوں سے رغبت؟“
”کوئی خاص لگاؤ نہیں، کرکٹ پسند ہے۔“
22- ”زندگی سے کیا سیکھا؟“
”صبر کرنا اور ہر حال میں خوش رہنا۔“
23- ”اپنے آپ کو کس اٹیج کا تصور کرتے ہیں؟“
”بائیس سال کا۔“
24- ”عشق اور محبت میں کیا فرق ہے؟“
”جی مجھے اس کا کوئی علم نہیں، مجھے محبت ہے گھر والوں سے، اللہ سے اور اللہ کے نبی حضرت محمد ﷺ سے۔“
25- ”پہلی بار کیمرے کے سامنے آئے تو؟“
”خوش بھی بہت تھا اور زور بھی بہت تھا۔“
26- ”بھی بجوم میں تنہائی محسوس کی؟“
”بہت بار بہت دفعہ۔“



27- ”دل کی دھڑکن کب تیز ہوتی ہے؟“
”ایکسر سائز کرتے وقت (مسکراتے ہوئے)“
28- ”مارٹنگ شوکی میزبانی ملے تو؟“
”تو ضرور کروں گا۔“
29- ”گھر میں سب سے زیادہ پیار کس سے ملا؟“
”میں بہت لکٹی ہوں کہ مجھے سب کا پیار ملا۔ ماں باپ اور دونوں بہنوں کا پیار ملا۔“
30- ”بھی پیار ہوئے تو سیریس ہو جاتے ہیں؟“
”نہیں کبھی نہیں۔ بس اللہ بڑی پیاری سے بچائے۔“
31- ”بھوک میں آپ کی کیفیت؟“
”بھوک لگنے سے پہلے ہی بہت کچھ کھا لیتا ہوں۔“
32- ”اگر ہوائی جہاز کا اوپن ٹکٹ ملے تو؟“

”پسندیدہ رسم؟..... سوچنا پڑے گا۔“
 69۔ ”ناشتا اور کھانا کس کے ہاتھ کا پسند ہے؟“
 ”ناشتہ امی کے ہاتھ کا اور کھانا باہر کا۔“
 70۔ ”بدلہ لیتے ہیں؟“
 ”سوچتا ہوں کہ لوں..... مگر پھر لے نہیں سکتا۔“
 71۔ ”کب فریش ہوتے ہیں؟“
 ”جب نیند پوری ہو۔“
 72۔ ”اپنے تجربے سے سیکھتے ہیں یا دوسروں کے؟“
 ”اپنے تجربے سے سیکھتا ہوں۔“
 73۔ ”دنیا میں اللہ کا بہترین گفٹ؟“
 ”ماں باپ اور بہنیں..... میری توکل کائنات ہی یہی ہیں۔“
 74۔ ”لوگ ملتے ہیں تو کیا فرمائش کرتے ہیں؟“

55۔ ”کوئی کھانا جو کئی دن تک کھا سکتے ہیں؟“
 ”گرلڈ چکن، گرلڈ چکن بہت پسند ہے مجھے۔“
 56۔ ”کوئی ایسی ڈیٹ جو بھول نہیں سکتے؟“
 ”والدین کی شادی کی سالگرہ اور بہنوں کی برتھ ڈے۔“
 57۔ ”دوسرے ملک جا کر کیا بات نوٹ کرتے ہیں؟“
 ”یہ محض ہے کہ میں کس ملک میں ہوں۔ کیونکہ ہر ملک میں الگ الگ قوانین ہوتے ہیں۔“
 58۔ ”اپنے لیے سب سے قیمتی چیز کیا خریدی؟“
 59۔ ”گاڑی۔“
 60۔ ”کوکنگ سے آپ کا لگاؤ؟“
 ”کوئی خاص نہیں۔“
 61۔ ”ایک کردار جو آپ کرنا چاہتے ہیں؟“
 ”ایک نہیں بہت سارے وراثت بننا چاہتا ہوں۔“
 62۔ ”ایک کردار جو مقبول ہوا؟“
 ”ماں صدقے میں نومی کا کردار بہت مقبول ہوا۔“
 63۔ ”ایک کردار جو کر کے پچھتائے؟“
 ”ہے ایک کردار جو بتانا نہیں چاہتا۔“
 64۔ ”آپ کی فیوچر پلاننگ؟“
 ”کچھ خاص نہیں۔ ابھی جو چل رہا ہے وقت، وہی اچھا ہے۔“
 65۔ ”عورت حسین ہونی چاہیے یا ذہین؟“
 ”ذہین، ذہانت، حسن سنوار دیتی ہے۔“
 66۔ ”ایک خواب جو بار بار دیکھتے ہیں؟“
 ”میں نے سنا ہے کہ خواب بتانے نہیں چاہئیں، بابا!۔“
 67۔ ”پسندیدہ فوڈ اسٹریٹ؟“
 ”صرف فوڈ اسٹریٹ نہیں، کھانے کی بہت سی جگہیں ہیں جو پسندیدہ ہیں۔“
 68۔ ”شادی میں پسندیدہ رسم؟“

43۔ ”ایک محبت جو بھول نہیں سکتے؟“
 ”اپنے گھر والوں کی محبت کو بھول نہیں سکتا۔“
 44۔ ”کہاں جانے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے ہیں؟“
 ”کھانا کھانے کے لیے اور میٹھا کھانے کے لیے ہمیشہ تیار رہتا ہوں۔“
 45۔ ”کس کو دیکھے بنائیند نہیں آتی؟“
 ”ایسا کچھ نہیں..... نیند آرام سے آجاتی ہے۔“
 46۔ ”گھر کے کس کمرے میں سکون ملتا ہے؟“
 ”اپنے کمرے میں۔“
 47۔ ”کبھی کراسس میں وقت گزارا؟“
 ”بہت بار کراسس میں وقت گزارا ہے۔“
 48۔ ”بی بی ہائی ہو جاتا ہے جب؟“
 ”کبھی چیک نہیں کیا۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ جب میں غصے میں ہوتا ہوں تو بی بی ہائی ہو جاتا ہوگا۔“
 49۔ ”آپ کے والٹ کی تلاشی لیں تو؟“
 ”روے، کارڈز وغیرہ نکلیں گے۔“
 50۔ ”نصیحت جو بری لگتی ہے؟“
 ”شادی کر لو۔“
 51۔ ”کھانے کی ٹیبل پر کیا نہ ہو تو کھانے کا مزہ نہیں آتا؟“
 ”میٹھا نہ ہو تو مزہ نہیں آتا۔“
 52۔ ”کھانے کا مزہ آتا ہے، ڈائننگ ٹیبل پر چٹائی یا اسنے بیڈ پر؟“
 ”جب گھر میں ہوتا ہوں تو کھانے کا مزہ اپنے بیڈ پر ہی آتا ہے۔“
 53۔ ”ایف بی، انشا گرام اور انٹرنیٹ سے دلچسپی؟“
 ”جی کافی ہے۔“
 54۔ ”وقت کی پابندی کرتے ہیں؟“
 ”سائے صبح اٹھنے کے ہر جگہ جانے کے لیے وقت کی پابندی کرتا ہوں۔“

”سعودی عرب جاؤں گا۔ گھر والوں سے بھی ملاقات ہو جائے گی اور مکہ مدینہ بھی چلا جاؤں گا۔“
 33۔ ”اگر کسی ارب پتی کا بلینک چیک ملے تو کتنا اماؤنٹ لکھیں گے؟“
 ”جتنی غربت آس پاس نظر آتی ہے اس لحاظ سے تو جتنا بھی لکھوں گا کم ہی محسوس ہوگا۔“
 34۔ ”سیاست میں آئے تو کس کو فالو کریں گے؟“
 ”جب آؤں گا تب پتا چلے گا کہ کون بہتر ہے پھر ہی بتا سکوں گا۔“
 35۔ ”ایک نصیحت جو لڑکیوں کو کرنا چاہتے ہیں؟“
 ”اپنی تعلیم مکمل کریں۔“
 36۔ ”جھوٹ کب بولتے ہیں؟“
 ”نہیں بولنا آتا جس کی وجہ سے اکثر نقصان اٹھاتا ہوں۔“
 37۔ ”گھر آ کر کیا دل چاہتا ہے؟“
 ”لیٹنے کو، آرام دہ بستر پر۔“
 38۔ ”کسی کی تعریف میں دو جملے بولنے ہوں تو؟“
 ”اللہ کی تعریف میں دو جملے بولوں گا کہ اللہ بڑا رحم کرنے والا ہے۔“
 39۔ ”شوہر میں جگہ بنانے کے لیے ضروری ہے کہ؟“
 ”اچھی قسمت اور بھرپور محنت۔“
 40۔ ”کس فنکارہ کے ساتھ رومینک سین کرنا اچھا لگتا ہے؟“
 ”نی الحال تو صرف کام کرنا ہی اچھا لگتا ہے۔“
 41۔ ”خواہش ہے کہ ایسی فلم میں کام کروں جو؟“
 ”جو ہمارے کلچر کو دنیا کے سامنے پیش کرے۔“
 42۔ ”اپنی کمائی کا کتنے فیصد بچاتے ہیں؟“
 ”بچ جاتا ہے۔ بچاتا نہیں ہوں۔“

بھولتی بکس کا تیار کردہ
Herbal
سوہنی شیمپو
SOHNI SHAMPOO
 اس کے استعمال سے چند دنوں میں خشکی ختم
 گرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے
 بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے
 قیمت -/120 روپے
 رجسٹری سے منگوانے پر اور می آرڈر سے منگوانے والے
 دو بوتلیں -/300 روپے تین بوتلیں -/400 روپے
 اس میں ڈاک خرچ اور پیکنگ چارج شامل ہیں۔
 بذریعہ ڈاک سے منگوانے کا پتہ
 بیوٹی بکس 53، اورنگزب مارکیٹ، ایم اے جناح روڈ، کراچی۔
 دقت خریدنے کے لیے
 مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37، اردو بازار کراچی۔ فون نمبر 32216361

قیصرہ حیات کے ملال

شاہین رشید

کے قلم میں کافی طاقت ہے۔ لوگ آپ کے بارے میں جانتا چاہتے ہیں اس لیے زحمت دی..... اچھا جی..... پہلے تو آپ اپنے نام کی وضاحت کریں۔ ”قیصرہ“ بہت کم بلکہ یہ نام خواتین میں سنا ہی نہیں..... تو کس نے رکھا تھا نام؟

”میرا اصلی نام ”قیصرہ گل ناز“ ہے اور یہ نام میرے تایا ابا (مرحوم ”ابورشید“) نے رکھا۔ میں اکثر ان سے پوچھا کرتی تھی کہ آپ نے میرا یہ نام کیوں رکھا تو وہ صرف مسکرا دیا کرتے تھے..... کہ ابھی نہیں تمہیں بعد میں پتا چلے گا کہ میں نے یہ نام کیوں رکھا..... انہوں نے تو مجھے کبھی نہیں بتایا لیکن میں جتنی ہوں کہ یہ نام میرے لیے بہت لگی ثابت ہوا کہ اسی نام سے مجھے شہرت و عزت ملی.....

تو جب میں چھوٹی تھی اور پھر جب بڑی ہوئی تو میرے علاوہ کسی کا یہ نام نہیں تھا، اسکول، کالج اور پھر یٹیکنگ کے دوران بھی مجھے کوئی ”قیصرہ“ نام کی لڑکی نہیں ملی..... میں خود بھی اس نام کو پسند نہیں کرتی تھی..... پھر جب میں نے لکھنا شروع کیا تو قیصرہ کے نام کے ساتھ ”گل ناز“ کو ہٹا کر اپنے والد صاحب کا نام شامل کر لیا۔ اور یوں مجھے اپنا نام ”قیصرہ حیات“ اچھا لگنے لگا۔

”ہوں..... اچھا..... اپنا فیملی بیک گراؤنڈ بتائیے پھر فیلڈ کی طرف آتے ہیں؟“

”جی..... میرا تعلق سیالکوٹ سے ہے۔ سیالکوٹ میں ہی میں نے تعلیم حاصل کی اور سیالکوٹ میں ہی میری شادی ہوئی۔ ہم لوگ چھ بہنیں اور دو بھائی ہیں۔ والد صاحب ”بینک آفیسر“ تھے، اب

گلے میں سر ہو یا قلم تخلیق کا جو ہر رکھتا ہو، یہ خدا داد صلاحیت ہوتی ہے اور بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو ان صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں۔ کسی عام سی بات کو کہانی بنانا یا کسی کی کہانی کو الفاظ کا پیرا بن دینا بھی ایک رائٹر کا ہی کمال ہوتا ہے۔

ڈراموں کی دنیا ہو یا ناولوں اور افسانوں کی، خوب صورت تحریر دیکھنے اور پڑھنے والوں کو مسحور کر دیتی ہے۔ کل تک خوب صورت تحریریں صرف کتابوں تک محدود تھیں۔ مگر اب اسکرین کے ذریعے ہم ان سے محفوظ ہوتے ہیں۔ پہلے صرف چند ڈراما رائٹرز ہوتے تھے مگر اب ایسا نہیں..... اب بے شمار چینلوں کی بدولت باصلاحیت لکھنے والوں کو سامنے آنے کا موقع مل رہا ہے..... خواتین میں آج کل کے ڈرامے زیادہ مقبول ہیں کیونکہ انہیں خواتین لکھ رہی ہیں، جن کا مشاہدہ گہرا ہوتا ہے۔

ڈراموں کی دنیا کا ایک معتبر نام قیصرہ حیات کا بھی ہے، جنہوں نے جب بھی لکھا، بہترین لکھا۔ ”الف اللہ اور انسان“ اور ”دل دل“ ایسے سیریلز ہیں جنہیں لوگ برسوں فراموش نہیں کر پائیں گے۔ اس کے علاوہ ”سراب، پل صراط، مسیحا، آئیڈیلز، وارڈ، بے عیب، آگینے اور احساس“ ان کی قابل ذکر تحریریں ہیں۔

”کیا حال ہے قیصرہ حیات صاحبہ؟“

”جی..... اللہ کا شکر ہے..... اور میں آپ کی اور آپ کے ادارے کی انتہائی ممنون ہوں کہ آپ نے مجھے اپنے ڈائجسٹ کا مہمان بنایا اور مجھے کچھ کہنے کا موقع دیا۔“

”آپ ماشاء اللہ بہت اچھا لکھتی ہیں۔ آپ

88- ”مارنگ شوز کیسے لگتے ہیں؟“
”مارنگ شوز دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔“
89- ”کن چیزوں کو لیے بغیر گھر سے نہیں نکلتے؟“

”موبائل، والٹ اور دیگر ضروری چیزیں۔“
90- ”پاکستان کے لیے کیا سوچتے ہیں؟“
”کہ اچھے اور ایمان دار لوگ حکومت میں آجائیں تاکہ پاکستان ترقی کرے۔“

91- ”آپ کی اچھی اور بری عادت؟“
”بہت ساری ہیں..... لمبی لسٹ ہے۔“
92- ”شوہر میں نہ ہوتے تو؟“

”امی ابو کے ساتھ سعودی عرب میں ہوتا اور جاب کر رہا ہوتا آڈٹ فرم میں۔“

93- ”ایک وہم جو پریشان کرتا ہے؟“
”نہیں کوئی وہم نہیں ہے..... اللہ کا شکر ہے۔“
94- ”کون سی چیزیں نشے کی حد تک پسند ہیں؟“

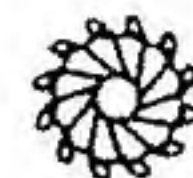
”اچھا کھانا، میٹھا اور چاکلیٹ۔“
95- ”خدا کی حسین تخلیق؟“
”ہر چیز حسین ہے جو اللہ تعالیٰ نے بنائی ہے۔“

96- ”شہرت کب مسئلہ بنتی ہے؟“
”جب پرائیویٹ لائف پرائیویٹ نہ رہے۔“
97- ”بھی آنسوؤں سے روئے؟“

”بہت بار..... کئی مرتبہ۔“
98- ”آنکھ کھلتے ہی بستر چھوڑ دیتے ہیں؟“
”نہیں، اٹھنے میں کافی ٹائم لگ جاتا ہے۔“

99- ”اپنا فون نمبر کتنی بار تبدیل کیا؟“
”پاکستان میں ایک ہی ہے مگر جس ملک میں جاتا ہوں وہاں کی سم لینا پڑتی ہے۔“

100- ”اگر آپ کی شہرت گوز وال آجائے تو؟“
”تو اللہ کی مصلحت سمجھ کر خاموش ہو جاؤں گا۔“



”دعا کیجیے گا۔“
75- ”آپ کی کوئی عجیب و غریب خواہش؟“
”عجیب و غریب خواہش بتاتے تھوڑی ہیں۔“
76- ”قلم، ماڈلنگ کی آپ نے؟“
”ماڈلنگ کی ہے۔ فی الحال قلم تو نہیں کی۔“
77- ”بچپن کا کوئی کھلونا جو آج بھی آپ کے پاس ہے؟“

”تصویریں اور ویڈیوز ہیں کچھ۔“
78- ”شادی میں کپڑے دینا چاہیے یا گفٹ؟“
”جو حسب حیثیت ہو وہ دیں۔“
79- ”کیا محبت اندھی ہوتی ہے؟“
”جی..... بالکل۔“

80- ”اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتے ہیں؟“
”جی بالکل..... اس میں کوئی برائی نہیں ہے۔“
81- ”دل کی سنتے ہیں یا دماغ کی؟“

”دل کی سنتا بھی ہوں اور مانتا بھی ہوں۔“
82- ”غصے میں پہلا لفظ؟“
”منحصر ہے اس بات پہ کہ کس بات پر آیا ہے اور کس پر آیا ہے۔“

83- ”کیا بستر پہ لیٹتے ہی نیند آ جاتی ہے؟“
”یہ بھی منحصر ہے کہ کس ٹائم پہ لیٹ رہا ہوں۔“
تھکاوٹ کے ساتھ لیٹ رہا ہوں یا ریلیکس ہو کے لیٹ رہا ہوں۔“

84- ”سونے سے پہلے ایک کام جو لازمی کرتے ہیں؟“
”منہ، ہاتھ اور پاؤں دھو کر سوتا ہوں۔“

85- ”محنت سے پیسہ ملتا ہے یا قسمت سے؟“
”قسمت سے ملتا ہے..... محنت تو بہت لوگ کرتے ہیں۔“

86- ”تہوار جو آپ کو پسند ہیں؟“
”جس میں سب خوش ہوں اور ساتھ ہوں۔“
87- ”زندگی کب بری لگتی ہے؟“

”جب صبح بہت جلدی اٹھنا پڑے۔“

ریٹائرڈ زندگی گزار رہے ہیں۔ والدہ صاحبہ (مرحومہ) بہت گھریلو اور سادہ مزاج خاتون تھیں اور بہت زیادہ مذہبی بھی تھیں اور انہوں نے ہماری تربیت بھی مذہبی انداز میں کی جو کہ ہم سب بہنوں میں نمایاں ہے۔

گھریلو ماحول مذہبی اور تعلیمی تھا۔ سب کو ہی پڑھنے کا شوق تھا۔ میں بہن بھائیوں میں تیسرے نمبر پر ہوں اور میں نے ایم اے انگریزی اور ایم اے ہسٹری کی ڈگریاں حاصل کی ہیں۔ آرمی پبلک اسکول سیالکوٹ میں بطور انگریزی ٹیچر جاب بھی کی۔ میری شادی مکمل طور پر ارنج میرج ہے اور میں نے تو اپنے ہونے والے میاں کو شادی سے پہلے نہ دیکھا نہ بات کی۔ چٹ مگنی پٹ پیاء ہوا..... چار سال شادی کو ہو گئے ہیں..... اللہ تعالیٰ کی ”نعمت اور رحمت“ کا انتظار ہے۔“

”لکھنے کا عمل کب سے جاری ہے اور کس عمر سے لکھنا شروع کیا اور پہلی بار کیا لکھا؟“

”لکھنے کا عمل اس وقت سے جاری ہے جب میں فرسٹ ایئر کی طالبہ تھی۔ اسکول لائف میں بہت دل چاہتا تھا کہ کچھ لکھوں مگر پتا نہیں کیوں ہمت نہیں ہوتی تھی..... مگر جب فرسٹ ایئر میں آئی تو میں نے ایک کہانی لکھی ”وعدہ“ کے نام سے اور اسے گھر والوں سے چوری چھپے جنگ اخبار کے ”فرائیڈے میگزین“ (ان دنوں فرائیڈے میگزین آیا کرتا تھا) میں بھیج دی اور خوش قسمتی کہ وہ شائع بھی ہو گئی۔ خوشی خوشی گھر والوں کو بتایا تو سب بہت خوش ہوئے۔ ابو نے بہت تعریف کی۔ حوصلہ افزائی کی..... ابو ہمیشہ میرے ہر کام کو پسند کرتے تھے..... اس حوصلہ افزائی کے بعد پھر میں نے جنگ میگزین میں ہی تسلسل کے ساتھ کچھ کہانیاں لکھیں، اور یوں یہ سلسلہ جاری ہو گیا..... یہ بات ہے 87-1986ء کی۔

پڑھائی بھی جاری تھی۔ اس دوران ایک ”روحانی“ بزرگ سے ملاقات ہوئی اور ان سے میں بہت متاثر ہوئی اور میں نے ناول ”ذات کا سفر“

لکھا۔ یہ میرا پہلا ناول تھا..... اس کے بعد میں نے افسانوں کا مجموعہ ”بارش کے بعد“ لکھا۔ ناول شائع ہونے سے پہلے افسانوں کا مجموعہ شائع ہوا۔ پھر ایک ناول ”وقت جو ٹھہر گیا، لکھا، اس کے بعد 2000ء میں، میں ڈائجسٹ رائٹنگ کی طرف آئی..... اور کافی کچھ لکھا۔

2004ء میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے 102 ناموں پہ ریسرچ بک لکھی ”انوار اسماء النبی“ کے نام سے، میرا زیادہ رجحان مذہب اور روحانیت کی طرف رہا..... میں نے ”پہل صراط“ ”سایہ دیوار بھی نہیں“ ناولز لکھے۔ 2010ء میں ”الف اللہ اور انسان“ ناول لکھا اور 2014ء میں ”آخری امید“ لکھی، اور اب جو ڈرامے میں لکھ رہی ہوں انہیں ناول کی شکل میں لانے کا ارادہ ہے میرا۔“

”آپ ڈراما فیلڈ میں کیسے آئیں؟ اس سوال سے پہلے میں آپ سے یہ پوچھنا چاہوں گی کہ ڈرامے کی کامیابی میں کہانی زیادہ اہم ہے یا چینل کی مقبولیت؟“

”میرا نظریہ یہ ہے کہ جب تک ڈرامے کی اسٹوری اسٹرونگ نہیں ہوگی وہ ڈراما بھی مقبولیت حاصل نہیں کرے گا..... آج کل لوگوں کے پاس دیکھنے کے لیے بہت درائی ہے مگر ڈراما صرف اپنی مضبوط کہانی کی وجہ سے شہرت حاصل کرتا ہے جبکہ ہر چینل پر بے شمار ڈرامے نشر ہو رہے ہیں ان کے بارے میں کسی کو پتا بھی نہیں.....

یہ سچ ہے کہ چینل کی مقبولیت کا بھی بڑا ہاتھ ہوتا ہے مگر ضروری نہیں کہ ناظرین جس چینل کو پسند کرتے ہیں اس کے ہر ڈرامے کو بھی پسند کریں..... اب..... ناظرین بہت سمجھ دار ہو گئے ہیں، انہیں آئیڈیا ہو جاتا ہے کہ کون سا اچھا ہے، بہتر ہے یا بہترین ہے۔ میں نہیں سمجھتی کہ چینل کی مقبولیت سے ڈراما بھی مقبول ہوتا ہے۔“

”ہر ڈرامے میں ہیروئن کے لیے ایک ایکسٹرا مرد کیوں ہوتا ہے اور ہیرو سے ہی آخر میں شادی

کیوں ہوتی ہے؟“

”حقیقی زندگی میں اور ڈراموں میں دکھائی جانے والی زندگی میں فرق ہے۔ حقیقی زندگی میں ہم کوشش کرتے ہیں کہ بس کپڑا پہنا کر نہ رہیں..... اگر ڈرامے کو اسی ٹریک پہ لے جائیں گے تو ہمارے دیکھنے والے ہی شور مچانا شروع کر دیں گے کہ یہ کیا ہو رہا ہے..... ناظرین..... ڈرامے میں سنسنی چاہتے ہیں۔ تھوڑی فینٹسی چاہتے ہیں۔ مسالا چاہتے ہیں..... پھر پروڈکشن ہاؤس والے بھی ایک عام سیدھی سادی اسٹوری نہیں لیتے اور بار بار کہتے ہیں کہ کہانی میں جان ڈالیں تاکہ ناظرین متوجہ ہوں۔ جس نے پیسہ لگایا ہوتا ہے وہ صرف سادی اسٹوری نہیں چاہے گا اور ہر ہیروئن کے لیے دو مرد بھی نہیں ہوتے۔ کہانی کی ڈیمانڈ ہوتی ہے تو دو ہیرو لیے جاتے ہیں۔“

”خوبہ سرا کے کردار کے لیے ہمیشہ فنکار کو بک کیا جاتا ہے..... اصل خوبہ سرا کو کیوں نہیں بک کیا جاتا؟“

”میرا خیال ہے کہ اگر اصل خوبہ سرا کو لیں گے تو وہ پروڈیوسر اور ڈائریکٹرز کی ڈیمانڈز کو پورا نہیں کر پائے گا، کیونکہ وہ پروفیشنل اداکار نہیں ہوتے..... ہر انسان کو اللہ تعالیٰ نے جو رول دیا ہے اسے وہ ہی کرنا ہے..... پھر ایک نئے بندے کو اداکاری سکھانا بہت مشکل ہوتا ہے جبکہ پروفیشنل اداکار کو تو صرف اسکرپٹ دینے کی درپڑ ہوتی ہے اور پروڈکشن ہاؤس کی بھی کچھ مجبوریاں ہوتی ہیں کہ وہ ان کو کاسٹ نہیں کر سکتے۔“

”مجھے آپ کی بات سے اختلاف ہے کیونکہ اصل خوبہ سرا بھی بہت اچھے پر فارمر ہوتے ہیں..... خیر..... آپ نے بھی دیگر رائٹرز کی طرح اپنے ناولز لکھ کر آئے یا اور بچل اسٹوریز دیں؟“

”میں نے جو پہلا ڈراما کیا تھا وہ میری اور بچل اسٹوری تھی۔ ڈراما سیریل تھا ”سراب“۔

میں نے لکھنے کا آغاز ادنیٰ کہانیوں سے کیا تھا اور ڈائجسٹ رائٹرنے سے پہلے ہی میرے دو تین ناولز شائع ہو چکے تھے جو کہ روحانی ناولز تھے، اسی طرح

ڈراما سیریل ”پہل صراط“ میں نے پہلے لکھا اور اسے ناول کی شکل بعد میں دی..... میں نے اپنے بہت کم ناولز کو کیش کر لیا ہے۔

”الف اللہ اور انسان“ میرا یہ ناول شائع ہو چکا تھا۔ مومنہ درید نے مجھے کہا کہ اس ناول پہ کام کرتے ہیں۔ یہ کام میرے لیے مشکل تھا کیونکہ اس میں چار ٹریکس تھے اور کہانیاں بھی آپس میں ملتی جلتی نہیں تھیں۔ یہ مومنہ درید کا کمال ہے کہ اس نے بہت خوب صورتی سے کہانیوں کو لنک کیا، اس لیے ڈراما روٹین سے زیادہ لمبا ہو گیا کہ اس کی دو تین کہانیوں کو آپس میں سمونے کی کوشش کر رہے تھے..... اب ان شاء اللہ ایک سیریل کن فیکون آئے گا اسے ناول کی شکل بعد میں دوں گی۔“

”ڈرامے کی کامیابی میں ٹیم ورک تو ہوتا ہی ہے، مگر سب سے زیادہ اہم رول کون ادا کرتا ہے، رائٹر، ڈائریکٹر یا اداکار؟“

”اس میں سب سے اہم رول ”رائٹر“ کا ہے۔ ڈرامے کا ڈھانچہ ”کہانی“ ہے۔ ڈھانچہ مضبوط نہیں ہوگا تو باڈی بھی مضبوط نہیں ہوگی۔ رائٹر کو بہت سوچ سمجھ کر اپنے ٹریک کو چلانا پڑتا ہے۔ لفظوں کو زبان دینا پڑتی ہے۔ کرداروں کو بولنا بھی رائٹر ہی سکھاتا ہے تو جناب سب سے مشکل کام رائٹر کا ہے۔ اس کے بعد ڈائریکٹر کا کام اہم ہے۔ ڈائریکٹر کمزور ہو تو بعض اوقات اچھی کہانیاں بھی فلاپ ہو جاتی ہیں اور تیسرے نمبر پر اداکار آتے ہیں۔“

”ڈراما رائٹنگ کی طرف آپ کو کون لے کر آیا؟“

”ڈراما رائٹنگ کی طرف میری دوست عمیرہ احمد مجھے لے کر آئیں، وہ میرے ساتھ آرمی پبلک اسکول میں پڑھاتی تھیں، وہاں دوستی ہوئی۔ عمیرہ احمد ہی مجھے ڈائجسٹ رائٹنگ کی طرف لے کر آئیں اور کہا کہ اس سے ریڈر شپ بڑھے گی۔ ساتھ ہی ہم کہانیاں بھی ڈسکس کرتے تھے..... انہوں نے مجھے اپنے اسکرپٹ بھی دکھائے..... یوں سمجھیں کہ ڈراما رائٹنگ میں انہوں نے مجھے انگلی پکڑ کر چلانا سکھایا اور

میں ان کی بہت شکر گزار ہوں۔“

”ڈراما لکھنا آسان ہے یا افسانے اور ناولز؟“
”ناولز اور افسانے سے زیادہ مشکل کام ڈراما لکھنا ہے اور مجھے اس کے لیے بہت پاپڑ بننے پڑے۔ شروع شروع میں تو پورا پورا اسکرپٹ تبدیل کرنا پڑتا تھا۔ ٹریک چننا پڑتا تھا۔ تو میں پریشان بھی بہت ہو جایا کرتی تھی۔ لیکن شکر ہے کہ اچھے لوگوں کا تعاون رہا۔ عمیرہ بھی ساتھ ساتھ رہیں، ان سے گائیڈ لائن لیتی رہی۔ انسان جب بھی کسی مقام پر پہنچتا ہے تو اس کے پیچھے جدوجہد کی ایک لمبی کہانی ہوتی ہے۔ ایسا نہیں ہوتا کہ آپ کو راتوں رات ہی کچھ مل جائے، یہ ناممکن سی بات ہے۔“

ڈراما رائٹنگ کی فیلڈ میں اپنے آپ کو اسٹیبلیش کرنا بہت مشکل کام ہے۔ اس میں بہت محدود ہو کر لکھنا پڑتا ہے اور اپنی بات چند کرداروں کے ذریعے آگے پہنچانی ہوتی ہے تو میرے لحاظ سے یہ خاصا مشکل کام ہے۔“

”سنا ہے کہ اسکرپٹ چوری ہو جاتے ہیں پھر کوئی اور اپنے نام سے ڈراما بنا لیتا ہے اور اصلی رائٹر احتجاج ہی کرتا رہ جاتا ہے۔ ایسا ہے؟“

”ہوتا ہے۔ مگر اتنا زیادہ نہیں کہ چوری کر لیا اور پورا ڈراما بنا لیا۔ میرے ساتھ اللہ کا شکر ہے کہ بہت کم ایسا ہوا ہے۔ مجھے ایک دو کہانیوں میں جھلک دکھائی دی کہ یہ میں نے ”ون لائٹر“ بھیجا تھا اور یہ کہانی اس پہ بیس کر رہی ہے۔ تو میں نے کوئی خاص نوٹس نہیں لیا۔ سوچا چلو کر لیا تو کیا کر سکتے ہیں۔“

”کہتے ہیں کہ ڈائریکٹرز پورا پورا اسکرپٹ چینیج کر دیتے ہیں اور رائٹر خاموش رہتا ہے کہ چلو نام اور پیسہ تو کما رہے ہیں؟“

”نہیں۔ ایسا تو بالکل نہیں ہوا، مجھے اچھے ڈائریکٹرز ملے ہیں اور کسی نے کہانی کو اس حد تک چینیج نہیں کیا کہ کہانی اصل ٹریک سے ہٹ گئی ہو۔ ڈائریکٹر نے کہانی کو ہر پوائنٹ آف ویو سے دیکھنا ہوتا ہے۔ کمرشل اینگل سے بھی دیکھنا ہوتا ہے۔ تو

بہت معمولی تبدیلی ہوتی ہے، زیادہ نہیں۔ کیونکہ ڈراما اور عام رائٹنگ میں بہت فرق ہوتا ہے۔ اور ڈائریکٹرز بھی ہماری بہتری کے لیے کام کر رہے ہوتے ہیں اور چینیج بھی تو ہم ہی کر رہے ہوتے ہیں اپنی ہی تحریروں کو۔ سنوار رہے ہوتے ہیں۔ تو میں تو کبھی بھی برا نہیں مانتی اور جتنی بار کہیں، میں ان کے کہنے پہ چینیج کر دیتی ہوں۔ باہم مشورے سے چیز زیادہ نکھر کر سامنے آتی ہے۔“

”ڈراموں میں آپ تمام مسائل کو بلکہ ہر رائٹر تمام مسائل کو بڑی خوش اسگونی سے حل کر لیتا ہے۔ عام زندگی میں بھی ایسا ہوتا ہے کیا؟“

”اصل زندگی میں ہمارے مسائل حل کرنے والی ذات اللہ کی ہے، لیکن ہمارے ڈراموں میں ہمارے کردار کے اچھے ہوئے دھاگے ہمارے ہاتھ میں ہوتے ہیں اور ہم انہیں اپنی مرضی کے مطابق ادھر سے ادھر کرتے ہیں اور مسائل کو سلجھاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ بھی ہمارے ساتھ ایسا ہی کرتا ہے، الجھاتا ہے پھر سلجھاتا ہے۔ تو ہماری کیا اوقات کہ ہم اپنے مسائل کو خود سلجھائیں۔ تو ڈراما اور عام زندگی میں بہت فرق ہوتا ہے۔“

”فلم کے لیے آفرز آئیں اور سیریلز ہی کیوں۔۔۔۔۔ سوپ بھی لکھا آپ نے؟ اور نہ لکھنے کی وجہ؟ اور اپنے پروجیکٹ کو خود کتنا ٹائم دیتی ہیں؟“

”میرا کام اسکرپٹ لکھ کر دینا ہے سو میں وہ دیتی ہوں۔ باقی کام پروڈکشن ہاؤس کا اور ڈائریکٹر کا ہوتا ہے۔ انہیں میری ضرورت ہوتی ہے تو ڈسکس کرنے کے لیے بلا لیتے ہیں۔“

سوپ لکھنے کی طرف میرا بالکل رجحان نہیں ہے۔ سیریل لکھنا مجھے آسان اور اچھا لگتا ہے۔ سیریل کی زیادہ سے زیادہ اقساط میں پیشیں ہوتی ہیں جبکہ سوپ کی سو یا ڈیڑھ سو ہوتی ہیں اور اتنی اقساط کا سوچ کر ہی میرا ذہن تھک جاتا ہے۔ اس کے علاوہ فلم کے لیے بہت آفرز ہیں مگر فلم والا میرا مزاج نہیں ہے اس لیے میں صرف ڈراموں پر ہی فوکس کروں گی۔“

”لکھنے کے لیے آپ کے نزدیک بہترین ٹائم کون سا ہے؟“
”ابتدائی دور میں تو میں رات کو ہی زیادہ لکھتا آتی تھی۔ کالج لائف میں مجھے خاموشی اور تنہائی بہت پسند تھی تو لکھنے کے لیے رات کا وقت ہی بہترین لگتا تھا۔ اب چونکہ گھریلو ذمہ داریاں بڑھ گئی ہیں تو جسے جیسے ٹائم ملتا ہے، لکھ لیتی ہوں۔ ہاں جب اسکرپٹ لکھتی ہوں تو پھر دوسروں کا خیال رکھنا پڑتا ہے، اپنے ٹائم کا نہیں، کیونکہ کام کروانے والا ہمارے ٹائم سے نہیں، اپنے ٹائم سے چلے گا۔“

”چلیں جی کچھ نئی سوال ہو جائیں، اپنے مزاج کے بارے میں بتائیں؟“
”مزاج شروع میں تو بہت گرم تھا۔۔۔۔۔ مگر اب آہستہ آہستہ کافی تبدیلی آگئی ہے، تھوڑی نرمی آگئی ہے مگر غلط بات تو بالکل بھی برداشت نہیں ہوتی۔ بہت یگ اتج میں تو بہت جلدی ہاپر ہو جاتی تھی۔ مگر پھر وہی بات کہ وقت کے ساتھ ساتھ تبدیلی آتی جاتی ہے۔“

”اور کیا مشاغل ہیں آپ کے؟ سیاست سے دلچسپی ہے؟“

”کتابیں پڑھنے کا بہت شوق ہے مگر اب کچھ گھریلو ذمہ داریاں اور کچھ لکھنے کی ذمہ داریوں کی وجہ سے ٹائم بہت کم ملتا ہے کہ مطالعہ کر سکوں۔۔۔۔۔ سیاست سے کچھ خاص دلچسپی نہیں ہے، مگر سیاسی حالات سے باخبر ضرور رہتی ہوں۔۔۔۔۔ کھیلوں سے کچھ خاص لگاؤ نہیں ہے۔ شروع سے ہی کمرے میں بیٹھ کر پڑھنے کی عادی ہوں یا میرا کمرہ ہوتا تھا یا پھر لائبریری۔“

”کوننگ وغیرہ سے شغف ہے؟“
”کوننگ سے بہت لگاؤ ہے۔ کھانا خود ہی بناتی ہوں۔ گھر کے کام میری پہلی ترجیح ہیں۔ صبح اٹھ کر پہلا کام گھر کے کاموں کو دیکھنا، پھر کوننگ کرنا۔۔۔۔۔ اور اس کے بعد لکھنے کا عمل شروع ہوتا ہے۔“

”اچھا۔۔۔۔۔ گڈ۔۔۔۔۔ ورنہ عموماً فلم کی دنیا کے لوگوں کو دیگر کاموں سے بیزار ہی پایا ہے؟“

”نہیں ایسا نہیں ہے۔۔۔۔۔ میں تو دنیا کے سارے ہی کام خود کرتی ہوں۔ بہت ایکٹو رہتی ہوں۔ ملنا جلنا، گھر داری، شاپنگ سب کچھ خود ہی کرتی ہوں اور جو چیز بہت زیادہ رغبت سے بناتی ہوں وہ ہی کم کھاتی ہوں۔“

”رائٹرز میں کس سے متاثر ہیں؟ کل اور آج میں؟“
”اپنے بچپن سے جن لوگوں کو پڑھا، جن لوگوں کے ڈرامے دیکھے اور جن سے متاثر ہوئی، ان میں نورالہدی شاہ، اشفاق احمد، اصغر ندیم سید اور امجد اسلام امجد شامل ہیں، یہ سب بہت کمال کا لکھتے تھے، اور مزاح نگاری میں عطا الحق قاسمی سے بہتر کسی کو نہیں پایا۔۔۔۔۔ اور آج کل سب ٹھیک لکھ رہے ہیں۔۔۔۔۔ کوئی ایسا نہیں لکھ رہا کہ جس کے لیے ہم سب کچھ چھوڑ کر بیٹھ جائیں۔“

مجھے ابھی تک یاد ہے اشفاق احمد کا وہ ڈراما ”فہمدہ کی کہانی استانی راحت کی زبانی“ اس وقت میں اسکول میں پڑھا کرتی تھی۔۔۔۔۔ تو انہوں نے کس خوب صورت انداز میں ایک محروم لڑکی کی نفسیات کو دکھایا تھا اور میں حیران رہ جاتی تھی سب کچھ دیکھ کر اور آج کل کرمانے میں بھی وہی مسائل ہیں، وہی محرومیاں ہیں اور وہ ہی دکھ ہیں۔۔۔۔۔ ان کے پائے کے ڈراما نگار مجھے آج تک نہیں ملے۔ انہوں نے انسانی نفسیات کی جو عکاسی کی ہے وہ آج کل کے ڈراموں میں نظر نہیں آتی۔“

”باتیں بہت تھیں مگر جگہ کی کمی۔۔۔۔۔ ہم نے قیصرہ حیات سے اجازت چاہی۔۔۔۔۔ اس شکرے کے ساتھ کہ انہوں نے ٹائم دیا۔“

”آپ کا بھی شکریہ، آپ کے لیے، آپ کے ادارے کے لیے اور ادارے کے تمام اراکین کے لیے میری نیک خواہشات ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس طرح اس ادارے کو اور اس کے تمام میگزین کو ترقی کی راہ پر گامزن رکھے اور آپ کے ڈائجسٹ کے ذریعے قارئین اچھی اچھی تحریریں پڑھتے رہیں۔۔۔۔۔ شکریہ۔“

☆

حکایتی کویاں

ادارہ

”میں اپنی کسی پوتی یا نواسی کا نام زینب رکھوں گی اللہ تعالیٰ تو اسے شفا دے دے۔“
اس دعا کے بعد پھوپھو ٹھیک ہو گئیں پھر وقت بیٹا۔

بڑی پھوپھو کی کوئی اولاد نہیں ہوئی، دوسری پھوپھو کی بیٹیوں کے نام ان کے ددھیال والوں نے رکھے نہیں دیے اور چھوٹی پھوپھو کے چاروں بیٹے ہوئے۔
پھر میرے تایا کی سب سے بڑی بیٹی ہوئی جو کہ سعودیہ میں ہوئی تھی، اس کے ہونے کے بعد دادی نے تایا سے کہا کہ اس کا نام زینب رکھو تو میرے تایا نے کہا۔ ”یہاں تو پیدا ہونے سے پہلے برتھ ٹیفکیٹ بن جاتا ہے اور ہم اس کا نام رکھ چکے۔“

چنانچہ جب میں اور میری گزن پیدا ہونے والے تھے تو دادی نے میرے بابا اور تایا کو پہلے سے ہی کہہ دیا تھا کہ جس کی بیٹی ہوئی اس کا نام زینب رکھنا۔ ہوئی تو دونوں کی بیٹیاں مگر میں اس سے چند دن پہلے ہوئی تھی لہذا یہ نام میرا نصیب بنا اور الحمد للہ یہ نام مجھے ملا کیونکہ مجھے بہت پسند ہے یہ نام چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے بڑی بیٹی کا نام تھا۔ اوہو! آپ لوگ بور تو نہیں ہو گئے میری کتھا سے، چلیں آگے چلتے ہیں۔

روشنیوں کے شہر کراچی کی باسی ہوں۔ تعلیم بھی جاری ہے، انٹر کے بعد جامعۃ الرشید سے درس نظامی (عالمہ) میں طفل مکتب ہوں۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ مجھے باعمل عالمہ بنائے، آمین۔

(2) اچھی ہوں یا بری ہوں، خود اپنے لیے ہوں میں خود کو نہیں دیکھتی اوروں کی نظر سے خوبیاں..... آہاں پتا نہیں ہیں بھی یا نہیں، ہاں خامیاں بہت زیادہ ہیں۔ بہت شدت پسند ہوں، مستقل

زینب علی خان..... کراچی
(1) نہ قابل تعریف ہوں، نہ قابل تحسین میں سلجھے مزاج کی، ابھی سی لڑکی آہم! نام تو آپ جانتے ہی ہوں گے، زینب علی خان۔ میرے نام کی کہانی بڑی دلچسپ ہے۔ چلیں تو سنتے چلیں کہ آخر زینب، نام میری وراثت میں کیسے آیا۔ یہ آج سے لگ بھگ پچاس سال قبل پہلے کی بات ہے۔ ارے نہیں، نہیں میں ابھی اتنی بوڑھی نہیں ہوئی بلکہ مابعد دولت تو ابھی صرف 19 سال کے ہیں۔ ہاں تو ہم سنا رہے تھے اپنی داستان حیات۔ پچاس سال قبل میری سب سے چھوٹی پھوپھو کی پیدائش سے ایک سال پہلے میرے پردادا اپنے گاؤں سے کراچی واپس آ رہے تھے۔ اسٹیشن پر اتر کر۔ بس یار کشا لینے کے بجائے پیدل ہی گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہ علاقہ کافی سناں تھا۔ وہاں انہیں اچانک ایک باریش بزرگ نظر آئے۔

ان بزرگ نے میرے پردادا سے کہا کہ ”تمہارے گھر خوشی آنے والی ہے، اس کا نام زینب رکھنا۔“ اور کہہ کر چلے گئے۔

جب میری پھوپھو پیدا ہوئیں تو پردادا نے میری دادی کو یہ واقعہ سنایا اور زینب نام رکھنے کو کہا۔ تو میرے دادا، دادی نے کہا یہ سب بے کار باتیں ہوتی ہیں ہم اس کا نام گل ناز رکھیں گے کیونکہ بڑی کا شہناز پھر دوسری کا مہناز ہے اور زینب نام رکھنے سے ربط بھی ٹوٹ جائے گا (ہمارے ہاں Rhyming names رکھے جاتے ہیں) لہذا پھوپھو کا نام گل ناز رکھ دیا گیا جس کے بعد وہ اس حد تک بیمار ہو گئیں کہ ان کے بچنے کے امکانات ناممکن ہو گئے۔ اس کے بعد تو میری دادی کی جان پر بن آئی، تب میری دادی نے دعا کی۔

آتی بہر حال بہت سے پسندیدہ اشعار میں سے ایک کو قلم بند کرتی ہوں۔

تیرے عشق کی انتہا چاہتا ہوں

میری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں

ستم ہو کہ وعدہ بے حجابی

کوئی بات صبر آزما چاہتا ہوں

(۷) آخر میں تمام امت سے میری درخواست ہے کہ دین کو صحیح طریقے سے سمجھیں اور اس پر عمل کریں۔ علماء کو برا بھلا کہنے کے بجائے اہل حق علماء کی صحبت اختیار کریں اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا درس دیں۔

اگرچہ بت ہے جماعت کی آستینوں میں مجھے ہے حکم ازاں لا الہ الا اللہ

تمن شفیق..... راولپنڈی

(1) جہاں تک بات ہے رسالوں سے وابستگی کی تو وہ تو میں اس وقت سے پڑھتی ہوں جب چار سے پانچ حروف کو ملا کر پڑھنے میں دقت ہوتی تھی۔ اندازہ کر لیں..... جب میں اپنی فرینڈز کے ساتھ ٹیچر ٹیچر کھیلتی تھی تو اسٹوڈنٹس کے نام، ناول کے ہیرو، ہیروئن کے ناموں پر رکھتی تھی اور میرا بڑا بھائی جو کہ مجھ سے صرف 360 دن بڑا ہے، اتنا ہنستا تھا، اتنا مذاق اڑاتا تھا میرا کہ حد نہیں.....

واقعہ تو کوئی خاص پیش نہیں آیا کیونکہ ہمارے درمیان کوئی ظالم سماج نہیں تھا (بھئی میرے اور خواتین و شعاع کے) شعاع پاپا لا کر دیتے ہیں جبکہ خواتین پھوپھو سے لے کر پڑھتی ہوں۔

(2) صبح اٹھ کر نماز پڑھتی ہوں اس کے بعد گھر آتی ہوں (دادو کے گھر سوئی ہوں نا) سب بھائیوں کے اسکول اور پاپا کے کام پر جانے کے بعد میں اور ماما ناشتا کرتی ہیں۔ اس کے بعد ماما برتن دھوتی ہیں اور میں سارے گھر میں جھاڑو، پونچھا، ڈسٹنگ وغیرہ کر کے ٹی وی لگا دیتی ہوں۔ ساتھ ساتھ ڈائجسٹ بھی

مزاجی نہیں، بھولتی بہت ہوں۔ بہت سست، کاہل ہوں، غلطیاں بہت کرتی ہوں پھر پچھتاتی ہوں۔ بہت حساس ہوں، خاص کر دوستوں کے معاملے میں۔ میرے دوست میری سانسوں میں بٹے ہیں۔

(3) ویسے تو خواتین، شعاع سے بچپن کی علیک سلیک ہے مگر پڑھنا پچھلے چار سال سے شروع کیا جب میٹرک میں تھی اور اب بھی چھپ کر پڑھتی ہوں کیونکہ بابا، دادی وغیرہ کو بالکل پسند نہیں۔ کتابوں اور رسائل کی دیوانی، شاعری کی جنونی..... راز میرے کھولتی ہے، شاعری سچ بولتی ہے۔ سب سے زیادہ دینی کتب کا مطالعہ کرتی ہوں۔

ادبی کتابوں میں سیم جازی اور اشتیاق احمد لا جواب ہیں۔ ابن انشاء کا۔ مزاج بے مثال ہے۔ عمیرہ احمد فرحت اشتیاق نبیلہ عزیز، نبیلہ ابر راجہ مریم عزیز، ام مریم، عفت سحر طاہر، نایاب جیلانی، سمیرا شریف اور بھی لاتعداد لکھاری بہنیں ہیں جن کا لکھا بہت نایاب ہے۔ جن سے میں نے زندگی کے مد و جزر سے نبرد آزما ہونا سیکھا اور ان سب کی بے حد شکر گزار ہوں۔

(4) سالگرہ، صرف ایک بار دوستوں نے بڑی دھوم دھام سے منائی تھی باقی اس کے علاوہ نہ پہلے بھی منائی، نہ بعد میں۔ مجھے تو اکثر یاد بھی نہیں رہتا کہ میری سالگرہ ہے۔ مجھے نہیں پسند کہ میں عیسائیوں اور یہودیوں کی رسومات اپناؤں۔ جو چیز ہمارے مذہب کا حصہ نہیں، ہمیں کوشش کرنا چاہیے ہم اس سے دور ہیں۔

(5) ہاہ! کتابیں تو اتنی بڑھی ہیں کہ تعداد یاد بھی نہیں اور اس سال تو اگلے پچھلے تمام ریکارڈ توڑ ڈالے۔ کیا دینی، کیا ادبی سب ہی چاٹ ڈالیں مگر جب سے درس نظامی میں داخلہ لیا ہے پڑھنے کا اتنا وقت نہیں ملتا بلکہ آج کل تو صرف اور نحو کی کردانوں اور صیغوں میں ایسی مدغم ہوئی ہوں کہ خواب میں ضرب، ضرب با اور ضرب با ہی نظر آتے ہیں۔

(6) اف..... پسندیدہ اشعار..... بڑا مشکل سوال ہے، مجھے فیصلہ کرنا نہیں آتا۔ چوائس کرنا نہیں

English

English

Prickly Heat
Soap Bar

THANDAAA

English

THANDAAA

Prickly Heat

Non Greasy Cream

Instant and complete relief from prickly heat

20% EXTRA

English

Prickly Heat

THANDAAA
Powder

GARMi ko
THAND KARAO

20% EXTRA

English

Prickly Heat
Powder

ActivNeem

English

Neem
Soap Bar

Natural

English

Prickly Heat

ActivNeem

ہے، باقی سب چھوٹے ہیں، خیر..... بھائی کہتا ہے کہ ہر بات مانتی ہو۔ ماما کی غیر موجودگی میں چپس بنادیتی ہوں، ناراض نہیں ہوتی۔

پھوپھو سے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ ”پیاری سی۔ جب کوئی اچھا لگتا ہے تو اس میں کوئی خامی نظر نہیں آتی، خوبیاں ہی خوبیاں دکھائی دیتی ہیں (تھینک یو پھوپھو جی)۔ میرے خیال میں، میں ڈرپوک ہوں بہت زیادہ شاید۔ آپ یقین نہ کریں لیکن میں بلی اور مرغی سے بھی ڈرتی ہوں، اجبھی لوگوں سے زیادہ جلدی فریک نہیں ہوتی جس کی بنا پر اکثر ”مغرور“ کا لقب دیا جاتا ہے لیکن کیا کریں بس..... اکثر کسی کی کوئی بات بری لگے تو جتنی نہیں ہوں لیکن دل خراب سا ہو جاتا ہے لیکن دو، تین دن میں ٹھیک ہو جاتی ہوں۔ اگر کسی پر غصہ آئے تو بالکل چپ کر جاتی ہوں اور چاہتی ہوں کہ اگلا بندہ دو، تین گھنٹے میرے سامنے نہ آئے اور نہ ہی منائے۔ میں خود ہی مان جاتی ہوں کچھ دیر میں..... کزن سائرہ کہتی ہے کہ تم بہت وعدہ خلاف ہو اور خوبی یہ ہے کہ مخلص ہو۔ بقول ثار ان (چھوٹے بھائی) کے کہ تم مجھے پاپا کی مار سے بچاتی ہو لیکن مار پڑوانی بھی تم ہی ہو۔

(۵) پسندیدہ شعر یہ ہے.....
غضب تھا آج گلشن میں یہ حسرت خیز نظارہ
ادھر بلبل کا دم نکلا، ادھر فصل بہار آئی.....!!
(۶) جی ساون..... اف..... بالکل نہیں پسند۔
ہر وقت بارش اور جو ہمارے یہاں بارش میں
لوڈ شیڈنگ ہوتی ہے کچھ نہ پوچھیں۔

پڑھتی ہوں پھر بارہ، ایک بجے آٹا گوندھ کے نماز کی تیاری اور ماما دوپہر کا کھانا تیار کرتی ہیں جب تک چھوٹے بہن، بھائی بھی آ جاتے ہیں اسکول سے تو کھانا وغیرہ کھا کے اور برتن سمیٹ کر سو جاتی ہوں۔ شام میں اٹھ کر دوپہر کے برتن اور آٹا گوندھنا میری ذمہ داری ہے اس کے بعد مغرب کی نماز پڑھتی ہوں۔ پھر رات کے کھانے تک فارغ ہوتی ہوں، اس دوران بھی خواتین و شعاع زیر مطالعہ آتے ہیں۔ پاپا جب کام سے واپس آتے ہیں تو پاپا کو پانی، جوتے اور تکیہ وغیرہ دینا میرا کام ہے۔ پاپا کے بیٹھ جرائیں بھی میں خود اتارنی ہوں اور پھر پاپا کے پاس بیٹھ کر پورے دن کی روداد بیان کرنا میرا پسندیدہ ترین کام ہے۔ پھر میں کھانا کھا کر دادو کے گھر چلی جاتی ہوں، ڈائجسٹ بغل میں دا بے..... سونے سے پہلے کسی بھی اچھی سی کتاب کا مطالعہ کرنا بچپن کی عادت ہے۔

(۳) ”جنت کے پتے“ بہت پسند ہے، اف بتا نہیں سکتی کہ مجھے ”جہان“ کتنا پسند ہے۔ ان فیکٹ نمبرہ احمد کے تمام ناؤز کے ہیروز..... اور جی نہیں کسی بھی کردار میں اپنی جھلک نظر نہیں آئی۔
(۴) خوبیاں، خامیاں.....

(آہم آہم) سب سے پہلے ماما سے پوچھا بقول ماما کے ”جب گھر میں ہوتی ہوں تو کام کرنے میں بے پروائی دکھاتی ہوں (یہ خامی ہے) اور جب میں کہیں جاتی ہوں تو اچھے طریقے سے ہر کام کرتی ہوں، بہن بھائیوں کو سنبھالتی ہوں (یہ خوبی ہے) ہم ماشاء اللہ سے سات بہن بھائی ہیں اور میرا نمبر دوسرا

خوبصورت سردی
خوبصورت چھائی
مضبوط جلد
آفت بیج

قیمت: 300/- روپے
قیمت: 1000/- روپے
قیمت: 400/- روپے

رضیہ جمیل
راحت جبین
نبیلہ عزیز

☆ فصل غم کا گوشوارہ
☆ زرد موسم
☆ حساب دل رہنے دو

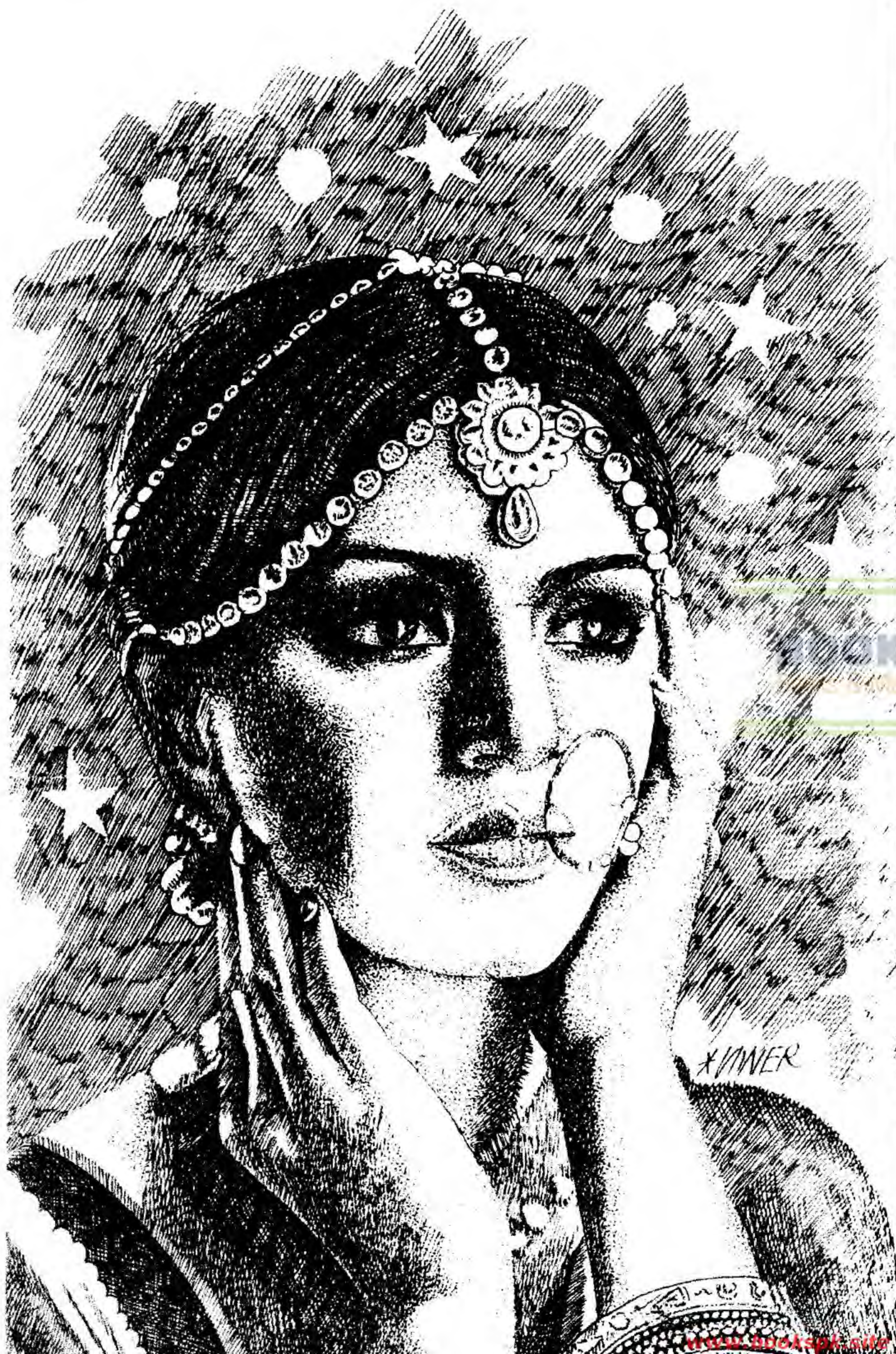
منگوانے کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

خواتین ڈائجسٹ 34 جولائی 2018

فاجہ جبین سکھتی اور ہی سکتی ہے

وجاہت حسین نے اپنی نصف بہتر ثریا خاتون عرف روما کے ساتھ ایک عمر وطن سے باہر گزاری تھی۔ انگریزوں کے رہن بہن سے اس قدر متاثر تھے کہ جو گھر وطن کے پہاڑی علاقے میں تعمیر کرایا۔ اس کی بیرونی عمارت نکون چھت والی تھی اور کسی حد تک گرجا گھر سے مشابہ تھی۔ کمرے بے حد وسیع اور غیر ملکی سامان سے بھرے ہوئے۔ گھر کے چار اطراف میں سرسبز لان اور لان میں کھلتی وسیع وعریض کھڑکیاں جن پر موسم کے مطابق کبھی بھاری دپڑے پردے گرے رہتے اور کبھی جالی دار پردے لہراتے۔ گھر کے ہر کمرے میں آتش دان موجود۔ دیواروں پر سچے نوادرات اور گھر کی طویل راہداریوں میں گھومتے درجن بھر ملازم۔ جن کا کام صرف اور صرف گھر کی اور اہل خانہ کی دیکھ بھال کرنا تھا۔ لیکن یہ گزرے وقتوں کی باتیں تھیں، وجاہت

مکمل ٹاؤل



XIVVER

”کون ہو سکتا ہے؟“ ماورا سے پہچان نہیں پائی۔ مارے تحیر کے وہ کھڑکی کے قریب ہوئی تھی، عین اسی لمحے دریشہ پلٹی تھی، جانے کیسے اس کا پاؤں پھسلا تھا۔ وہ لہرا کر گرنے کو بھی کہہ اجنبی نے اسے یوں تھاما جیسے پھولوں کی ڈال اس کے مضبوط بازوؤں میں آگری ہو۔

”اللہ!“ ماورا کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ ایسا سین تو صرف ڈراموں، فلموں میں دیکھا تھا۔ آج حقیقت میں دیکھا تو دل بڑے زور سے دھڑک اٹھا تھا۔ وہ ساری سردی بھول کر کھڑکی سے چپک گئی۔ دریشہ چند ثانیے بعد سنبھلی تھی اور اب بڑی طرح اس اجنبی پر برس رہی تھی، جو اسے صرف سہارا دینے کا گناہ گار تھا اور اب اس خوب صورت لڑکی کی ڈانٹ پھٹکار سن کر حیران اور ناراض ہو رہا تھا۔ ماورا، دریشہ کو اچھی طرح جانتی تھی۔ وہ ہمیشہ ہر ناگوار بات، معاملات اور حادثات کا ذمے دار دوسروں کو ہی قرار دیتی تھی، خود تو وہ دودھ کی دھلی تھی۔ صد شکر کہ بواجی نے مداخلت کی۔ کچھ کلمات کے تبادلے کے بعد بواجی اس اجنبی کو لے کر گھر کے اندرونی حصے کی طرف بڑھ گئیں۔ دریشہ پہلے ہی وہاں سے جا چکی تھی۔

☆☆☆



دست مسیحا
مکتبہ عمران ڈائجسٹ

قیمت - 400 روپے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

مکتبہ عمران ڈائجسٹ: 37 - اردو بازار کراچی۔ فون نمبر: 32735021

لڑکی کی۔“ بواجی بڑبڑاتے ہوئے ڈرینک نیبل پر پڑا سامان ٹھیک کر رہی تھیں۔ ”سردی کی وجہ سے چھٹی نہیں کی تھی اس نے، رات بھر فلمیں دیکھتی رہی ہے۔ مجھے بھی ڈھنگ سے سونے نہیں دیا۔“ ماورا نے بھی لگے ہاتھوں شکایت جڑدی۔

”بس یہ ہی کچھ تو آتا ہے اسے، ابھی دیکھو۔ بن ٹھن کے گھوم رہی ہے لان میں، مجال ہے جو اپنے کمرے کو ہی دیکھ لے۔ میری بوڑھی ہڈیوں میں اتنی جان کہاں کہ سارا پھیلا واسمیٹ سکوں۔ تم اٹھو تو کچھ نہ کچھ دیکھ لینا، الماریوں کو بھی کھول کر دیکھ لینا۔ جانے کپڑوں کی کیا حالت ہوگی، میں ذرا باورچی خانے تک جا رہی ہوں۔“

”جا ہی رہی ہیں تو گرم گرم کافی ہی پلا دیں بواجی! خوب گرمی اور میٹھی سی۔“

”اچھا، بھجواتی ہوں۔“ بواجی اس کا ہر کام شوق سے کرتی تھیں۔

وہ باہر نکل گئیں تو اونی ٹوٹی کو مزید کانوں تک کھینچتے ہوئے اس نے گردن لمبی کرتے ہوئے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ دریشہ لان کے بیچوں بیچ بنی پختہ روش پر ٹہل رہی تھی۔ اور موبائل پر اپنی کسی دوست کے ساتھ باتوں میں خوب مچھلی۔

”پتا نہیں، اس لڑکی کو ٹھنڈ کیوں نہیں لگتی؟“ ماورا کو ہمیشہ کی طرح حیرت ہوئی۔ دریشہ تک سک سے درست، سرخ کوٹ اور سرخ مفکر میں سیاہ بال لندھوں تک بکھرائے بہت مزے میں لگ رہی تھی۔

”سرخ رنگ کتنا چمکا ہے دریشہ پر۔“ اس نے مسکراتے ہوئے سوچا۔ تب ہی گیٹ کھلا۔ ماورا بے ساختہ ہی ادھر توجہ ہوئی۔ آنے والا کوئی اجنبی تھا۔ بھاری جیکٹ میں لمبا پوڑا وجود۔

فارقلیط بھی شاید اسی انتظار میں تھا، ڈیڑھ سال بعد روڈ ایکسیڈنٹ میں وہ بھی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ اور اب اس بات کو بھی کئی برس بیت گئے تھے۔ یہ اس خاندان کا تعارف تھا جس کے تین افراد آج بھی اس گرجا گھر جیسی تنگونی عمارت والے گھر میں اپنی زندگی کے شب و روز گزار رہے ہیں۔

روما عرف دادی جان.....
دریشہ سطوت حسین.....
ماورا، صبا.....

ان تینوں افراد کی زندگی میں ایک چوتھے فرد کی آمد سے زندگی کے معاملات اور واقعات اس انداز سے وقوع پذیر ہوتے ہیں کہ ان کی زندگی خود بخود ایک کہانی کا روپ دھارتی چلی جاتی ہے۔ کہانی کیا ہے؟ آئیے..... دیکھتے ہیں۔

☆☆☆

موسم اپنی پوری شدت سے حملہ آور ہوا تھا۔ کھر آلود صبحوں میں سورج کی کرنیں جیسے زمین کا راستہ ہی بھول گئی تھیں۔ سردی، جاڑا، پالا..... ہر لفظ کا مفہوم اچھی طرح سمجھ میں آ رہا تھا۔ ایسے ہی موسم میں ماورا دانست کٹکٹاتی، ٹھٹھرتی، کپکپاتی کالج سے واپس آئی تو بواجی کو اس پر بے طرح ترس آیا۔

”کہو تو بیٹر چلا دوں؟“

”چلا تو دیں گی، لیکن پھر دریشہ کو کون بھگتے گا؟ آپ کو پتا ہے اسے ہیٹر پسند نہیں۔ وہ سردی کو بھرپور طریقے سے انجوائے کرنا چاہتی ہے۔“

”ارے انجوائے کرنا چاہتی ہے تو پھر کالج سے چھٹی کیوں کی؟ پورے گیارہ بجے بستر سے لگی ہے شہزادی اور ناشتا پونے بارہ پر آنکھ کھلنے کے بعد بس یہ ہی ایک کام کر رہی ہے اور تب سے اب تک لگی ہیں ٹیلی فونوں پر۔“ بواجی کو دریشہ کی عادات ایک آنکھ نہیں بھاتی تھیں۔ خوب چڑتیں اور پھر ماورا کے سامنے دل ہلکا کرتیں۔

”سارا قصور تمہاری دادی کا ہے، عادتیں خراب

حسین پردیس میں ہی جہاں فانی سے کوچ کر گئے۔ بڑے بیٹے سطوت حسین ہو، ہو باپ پر تھے۔ عقل، شکل، مزاج میں اور اسی لیے بڑی آسانی سے باپ کی جگہ سنبھال لی۔ اعلا خاندان میں بیا ہے گئے تھے۔ بیوی مہرین ساتھ دینے والی نکلی، دوہی بچے پیدا کیے، بڑا بیٹا شان اور بیٹی دریشہ۔ دونوں ہی بچے لاڈلے، سرچڑھے۔

ثریا خاتون عرف روما شوہر کی وفات کے بعد دیس میں اپنے گھر آ بسیں۔ یہ گھر ان کے شوہر کو بہت عزیز تھا، سوانہیں بھی پیارا تھا۔ مگر اب پہلے جیسی بات نہ تھی، ملازموں کی بھیڑ سے انہیں کوفت ہونے لگی تھی، سوا کاڈ کا کے سوا باقی سب کو فارغ کر دیا گیا۔

وجاہت حسین کا دوسرا بیٹا فارقلیط شاید غلطی سے اس خاندان میں آ گیا تھا۔ مزاج اور عادت میں یکسر مختلف ثابت ہوا تھا، وہ اس شاہانہ زندگی سے متنفر تھا، آئے روز کی تقریبات، لوگوں سے گھلنا ملنا، دولت کا بے دریغ استعمال اسے ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ خود وہ ایک ہی جوڑے میں کئی کئی دن گزار دیتا، روما اور وجاہت اپنے حلقہ احباب میں متعارف کراتے ہوئے اکثر ہی شرمندگی محسوس کرتے تھے۔ فارقلیط نے ماں باپ کی مرضی کے خلاف

شادی اپنی پسند سے کی، کسی غریب گھرانے کی لڑکی کو بیاہ کر لایا، جو پہلے سے کسی موذی مرض میں مبتلا تھی۔ ڈاکٹر اس کی زندگی سے مایوس ہو چکے تھے اور فارقلیط اس کی باقی ماندہ زندگی میں خوشیاں اور رنگ بھر دینا چاہتا تھا۔

یہ ایسی خواہش تھی کہ جس پر ماں اور باپ دونوں اپنے بیٹے کی ذہنی حالت پر شبہ ہی کر سکتے تھے پھر وہ لڑکی صبا اس قدر ڈری سہمی اور خوب صورت تھی کہ روما اور وجاہت نے فارقلیط کے فیصلے پر چپ سادھ لی۔

اور پھر وہی ہوا.....

بہترین علاج اور زندگی میں خوشیوں بھرے رنگوں کے باوجود صبا کی زندگی نے وفانہ کی اور وہ ایک بچی کو جنم دے کر رخصت ہو گئی۔

آتش دان میں لکڑیاں ایک تواتر سے جل رہی تھیں۔ وسیع و عریض، بھاری ساز و سامان سے آراستہ ڈانگ روم خاصا گرم تھا۔

دادی اور فارس ایک صوفے پر بیٹھے تھے۔ برابر کے صوفے پر وریشہ، روما سے بڑی مسلسل کاجو کھارہی تھی یا پھر بول رہی تھی۔

”ہاں بھی فارس! کھانے میں کیا.....“ دادی کچھ پوچھ رہی تھیں، وریشہ نے سننے نہیں دیا۔

”فارس..... دی ٹائٹ، فاسٹ سپیریٹر، عوام کے ہیرو.....“ اس سے قبل کہ فارس نام کو مزید کھنگالا جاتا، دادی نے ہولے سے کھنکھار کر اس کی سرگوشی پر تنبیہی انداز میں اسے دیکھا اور پھر دوبارہ سے مہمان کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

فارس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ کو پھیلنے اور پھر غائب ہوتے دیکھ کر جہاں یاورا کو ہلکی سی خفت نے گھیرا، وہیں وریشہ تپ کر رہ گئی تھی۔ کسی اور پہ بس نہ چلا تو کافی کاگ بھی بچ دیا۔

”کسی کام کی کافی نہیں بنائی بوانے، انتہائی بکواس۔“ آپ دونوں جاسیں کچن میں، بواجی کی مدد کروائیں۔ فارس کھانا کھا کر جائے گا۔“ دادی نے دونوں سے مخاطب ہو کر کہا تھا۔

”فارس کھانا کھا کر جائے گا، ہونہہ.....!“ وریشہ باورچی خانے میں آتے ہی شروع ہو گئی تھی۔

”کیا ضرورت ہے بھلا اس قدر سرچڑھانے کی، اول تو اس گھر میں کوئی آتا نہیں اور اگر کوئی آجائے تو وبال جان ہی بن جاتا ہے۔ کافی پلا دی، تو واضح ہوگئی۔ اب اسے باہر کا راستہ دکھانے کے بجائے کھانا کھلانے بٹھالیں گی دادی اور وہ بھی مزے سے بیٹھ گیا ہے خاطر کردانے۔“ وریشہ سب اٹھا کر دانتوں سے کتر رہی تھی۔

”بتایا تو ہے دادی نے، کئی برس بعد وطن واپس آیا ہے۔ پتا نہیں یہاں کوئی دوست، رشتے دار ہے بھی یا نہیں۔“ ماورا کہا بوں کا پیکٹ نکالتے ہوئے بولی۔

”ایسے لوگوں کے لیے بڑے عالی شان ہوٹلز

بنے ہوئے ہیں، اس لیے دوسروں کے لیے پرابلم بننے کے بجائے انہیں سیدھا وہاں جانا چاہیے۔“ وہ بڑی ڈھٹائی سے مشورہ دے رہی تھی۔

”اور یہ تم کہاں جا رہی ہو؟ دادی نے ہمیں بواجی کی ہیلپ کے لیے بھیجا ہے۔“ اسے باہر جاتے دیکھ کر ماورا نے یاد دہانی کرائی۔

”سوری..... میں نے یہ ساری تیاری چولے میں جھونکنے کے لیے نہیں کی اور نہ ہی مجھے کڑی نبھانے کا کوئی شوق ہے۔ تم جانو اور تمہاری یہ بوا۔“ وہ ہاتھ ہلا کر کہتے ہوئے کچن سے باہر نکل گئی تھی اور پیچھے ماورا رہ گئی تھی۔ جسے مروت دکھانے کا شوق خدا جانے تھا یا نہیں لیکن وہ وریشہ کی طرح بہادر اور بے دھڑک بھی نہیں تھی، اسی لیے کھانا بنانے سے لے کر کھانا لگانے تک وہ بواجی کے ساتھ لگی ہی رہی۔

☆☆☆

فارس چلا گیا تھا، تایا ابو کے پارٹر کا بیٹا تھا۔ وہ تایا ابو نے بہت سا سامان بھیجا تھا اس کے ہاتھ، وریشہ نے فرمائش کر کے منگوایا تھا سب کچھ..... ایک کے بعد ایک چیز کھولتی اور دیکھتی، شور مچاتی۔ کچھ پسند آیا اور کچھ ناپسند۔

ایسے میں خاموش بیٹھی ماورا پہ بے طرح لاڈ آیا تھا دادی کو اور شاید ترس بھی۔

”ماورا! تم بھی اپنے لیے کچھ دیکھ لو۔“ انہوں نے کھوئی ہوئی سی لڑکی کو پکارا جو بھی بھی اپنے جذبات کا اظہار کھل کر نہیں کرتی تھی۔

”یہ کیا دیکھے گی، الماری بھری ہوئی ہے اس کی پیکڈ آئٹمز سے۔ دو چار جوڑے آٹھ دس موزے، ایک پرفیوم اور ایک گھٹیا کوالٹی کا لوشن۔ نہ وہ ختم ہونے سے جان چھوٹے اور چند ایک باوا آدم کے زمانے کے مفکر۔ اس کے سوا ان محترمہ نے استعمال ہی کیا کرنا ہے۔ حد ہوئی تو کسی فرینڈ کی برتھ ڈے پر اٹھا کر گفٹ کر دے گی کچھ نہ کچھ.....“

”آں..... آں..... کیا فضول بولے جا رہی ہو۔“ دادی نے گھبرا کر اسے ٹوکا پھر ماورا کو دیکھا،

نہیں دل پر ہی نہ لے لے۔

”کیا فضول کہا میں نے، پوچھ لیں اس سے جو ایک لفظ بھی جھوٹ بولا ہو، کیوں پتاؤناں، بولو..... بولو.....“ وہ ہنستی ہوئی اسے اکسارہی تھی۔

”کچھ بھی جھوٹ نہیں، سو فیصد سچ کہا تم نے۔“ وہ سدا کی ڈرپوک، ناراض ہو کر وریشہ کی ناراضی سے سکتی تھی بھلا۔ سو کھلے دل سے کہہ کر مسکراتی ہوئی اٹھ گئی، لیکن اندر جانے کیوں خاموشی بڑھ ہی گئی تھی۔

اتنی خاموشی کہ رات گئے تک آنے والی ہر آواز اس کے اعصاب کو جھنجھوڑتی رہی۔

گھر سے اٹھتی برتنوں کی ہلکی سی کھنک..... دروازوں کے کھلنے اور بند ہونے کی دھمک۔ اور وریشہ کے پل پل بدلنے والے چینلز کی موہوم سی آوازیں.....

نہ اعصاب پر سکون ہوئے، نہ نیند آئی۔ یہاں تک کہ بے خوابی سے آنکھیں کڑوی اور پوٹے بھاری ہو گئے تھے۔

نیم تاریک کمرے میں روشنی کے ہولے ہولے سے جھماکے رنگ بدلتے تھے۔ بھی سرخ، بھی نارنجی، بھی نیلا رنگ.....

وریشہ کی انگلی تلے دبا بٹن ہر چینل بدل دیتا تھا اور رنگ بھی۔

”وریشہ کو آج کچھ بھی پسند نہیں آ رہا دیکھنے کے لیے۔“ اس نے بے زاری سے کروٹ بدلی۔

”تمہیں نیند نہیں آ رہی، تو ایکٹنگ کیوں کر رہی ہو سونے کی۔“ اسے بار بار کروٹ بدلتے دیکھ کر وریشہ نے ٹوکا۔

”تمہیں کچھ پسند نہیں آ رہا تو اسے بند کیوں نہیں کر دیتیں۔“

”لو..... کر دیتی ہوں۔“

”ہائیں۔“ ماورا نے بمشکل آنکھیں کھول کر دیکھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وریشہ نے اس کے کہنے پر

ایل ای ڈی آف کر دی تھی۔

”بڑی بات ہے، آج ہماری بھی سنی گئی۔“ دل ہی دل میں ایک گونہ خوشی محسوس کرتے ہوئے اس نے کروٹ بدلی۔

کھڑکی اس کی نظروں کے سامنے تھی جس پر اس وقت بھاری پردہ گرا ہوا تھا۔ ماورا کو اچانک ہی آج صبح ہونے والا واقعہ یاد آیا تھا تو وہ بے اختیار ہی مسکرا دی۔

گردن موڑ کر وریشہ کو دیکھنے کی کوشش کی، پھر پکارا تھی۔

”وریشہ.....!“

”ہوں۔“

”آج جب فارس آیا تھا۔“ اس نے جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑا۔

”ہوں.....“

”تم گرنے والی تھیں، پھر ایک دم سے اس نے تمہیں تھام لیا۔ کتنی رومانٹک سچویشن لگ رہی تھی، تمہیں کیسا میل ہوا؟“ اپنی بات کے جواب میں اس نے چند لمحے انتظار کیا۔ دوسری طرف سے گہری سانسوں کی آواز آرہی تھی۔

وریشہ اتنی جلدی بھی نہیں سوتی تھی، ماورا کو اچنبا ہوا تو دوبارہ پکار پڑی تھی۔

”وریشہ!“

”وائس رائنگ وہ یو؟ سونے کیوں نہیں دے رہیں؟“ وریشہ نے بری طرح جھڑکا تھا اسے۔

ماورا کو بے حد برا لگا تھا اس کا انداز، اندھیرے کمرے میں کچھ پل خود پر ضبط کرنے میں بیت گیا تھا۔

”یہ لڑکی ہے ہی بدتمیز! میں آئندہ اس سے بھی بات نہیں کروں گی۔“ اس نے دل ہی دل میں پکا فیصلہ کرتے ہوئے رخ موڑ لیا تھا۔

☆☆☆

اونچی چھت والے ڈانگ ہال میں موسمی شمعیں جلا کر رات کا کھانا تب ہی کھایا جاتا تھا جب رومادادی اپنے کمرے میں پڑے پڑے گھبرا جاتیں یا پھر گئے وقتوں کی یاد انہیں جی بھر کے ستانی۔ تب وہ بواجی سے کہہ کر اپنی پسند کی کئی ڈشز بنواتیں اور جب اوپچی سی

مور پنکھ والی کرسی پر بیٹھ کر وہ ہر ڈش کو ذرا ذرا سا چکھتے تو ماورا کو ان میں ملکہ و کٹوریہ کی سی جھلک دکھائی دیتی۔

آج بھی مومی شمعیں روشن تھیں۔ میز پر ایک سے زیادہ سالن، چاولوں کی ڈش اور دو تین طرح کے سلاد دیکھ کر وریشہ نے آنکھیں منکائیں۔

”اوہو..... روما دادی کا موڈ آج پھر سے رومانٹک ہو گیا، یعنی وجہ نامہ شروع۔ دو گھنٹے تو کہیں نہیں گئے مارو! ڈوم تھنگ یار! میں اتنا پور نہیں ہو سکتی۔“

ماورا کے کچھ کہنے یا کہنے سے قبل ہی دادی کی انٹری ہو چکی تھی۔

”گارڈ کو کھانا بھجوا دیا؟“ انہوں نے آتے ہی حسب عادت پوچھا۔

”بھجوا دیا ہے۔“ بواجی نے پلیٹ ان کے سامنے رکھتے ہوئے باؤں بلند کہا۔ پھر سرگوشی۔

(”وہ کہاں کا مانی باپ ہے، جو سب سے پہلے اسے بھجواتی.....“)

”اس کی الیکٹرک کیبل خراب ہو گئی ہے، آج پیغام بھجوایا ہے اس نے۔ گرم پانی کا فلاسک بھر کر دے آنا، سردی بہت ہے۔ رات میں کئی بار چائے پیتا ہے۔“

”مفت کی چائے ہے، کیوں نہیں پیے گا۔ گھر کے پچھواڑے پورا خاندان آباد ہے اس کا، مجال ہے کبھی وہاں سے کچھ منگوالے اپنے لیے۔“ بواجی کی نیچی آواز..... وریشہ بھی کھی کھی کر کے ہنس دی، ماورا نے مسکراہٹ لبوں میں دبالی۔

دادی کے تاثرات میں البتہ کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی تھی۔

”خاصا ایکٹور ہوتا ہے، میں نے رات میں کئی بار اٹھ کر دیکھا ہے۔“

”دادی! اس بار ڈیڈ آئیں۔ تو ان سے کہیں مجھے گاڑی لے کر دیں۔“ وریشہ نے موضوع تبدیل کرنے کے لیے فوراً کیا۔

”سطوت حسین کا فون سن کر آرہی ہوں، سخت خفا ہو رہے تھے کہ فارس واپس کیوں چلا گیا؟ بتا رہے

تھے کہ یہاں اس کا کوئی دوست، رشتے دار نہیں ہے اور اسے یہیں ہمارے ہاں قیام کرنا تھا۔ یہ اور بات کہ سطوت حسین مجھے فون کر کے بتانا بھول گئے، اب بتاؤ بھلا۔ مجھے کیا خبر تھی؟ نہ اس لڑکے نے تذکرہ کیا نہ میں نے اصرار کیا، سرسری طور پر کہا بھی لیکن.....“

دادی کی بات طوالت اختیار کر گئی تھی۔

ماورا نے وریشہ کو دیکھا، وہ کھانے میں مگن نظر آرہی تھی۔ ”گویا نور سپاس“ ماورا کو پتا تھا، کھانا ختم ہوتے ہی اسے کوئی بہت ہی ضروری کام یاد آ جائے گا یا پھر پیٹ درد کی شکایت اور کچھ نہیں تو ماورا کے موبائل سے وریشہ کا نمبر ڈائل ہوگا اور وہ ایکسکیوز می کہتی یہ جاوہ جا۔ لیکن حیرت انگیز طور پر وریشہ بیٹھی ہوئی تھی، کھانا ختم ہونے کے باوجود.....

”تو اس میں اتنی پریشانی کی کیا بات ہے؟ آپ فون کر کے بلا لیں اسے۔ فون نمبر تو ہوگا نا آپ کے پاس؟“ وریشہ سرسری سے انداز میں کہہ رہی تھی۔

بڑی بات تھی، آج وہ رومادادی کی باتیں سن رہی تھی۔

”نہیں، نمبر نہیں ہے میرے پاس۔ سطوت حسین سے کہتی ہوں، اسے فون کر کے دوبارہ آنے کا کہیں.....“

”ہوں، ٹھیک ہے۔ بوا! چاول ذرا کچے رہ گئے شاید کھاتے ہی پیٹ میں درد ہونے لگا۔“ وریشہ نے کرسی کھینچی تو بواجی جل کر بولیں۔

”تو پھر جا کہاں رہی ہو بیٹیا! بیٹھو ذرا، اجوائن کا قہوہ بنا کر لاتی ہوں۔“

”کمرے میں جا رہی ہوں، وہیں لے آئیے گا۔ اب تو بیٹھا بھی نہیں جا رہا۔“

وہ دائیں آنکھ دبا کر کہتی ہوئی وہاں سے اٹھی، بوالبتہ اپنی جگہ سے نہ ملیں۔ انہیں معلوم تھا قہوہ لے بھی گئیں تو صبح کو جوں کا توں وہیں بڑا ملے گا جہاں رات کو وہ رہیں گی۔ سو آرام سے بیٹھی اپنا ہی پکایا مزا لے لے کر کھاتی رہیں۔

”اس لڑکی پر میں نے بہت محنت کی لیکن پھر بھی اسے میسر نہ کرنا تو کرنا نہیں آیا۔ اس معاملے میں انگریز قوم کا کوئی ثانی نہیں..... ایٹی کیٹس میں۔“ ماورا اپنی

پلیٹ میں موجود چاول گننے لگی تھی۔

”پتا نہیں..... بواجی کے پکائے چاول کھا کر میرے پیٹ میں درد کیوں نہیں ہوتا۔“ وہ بے چارگی سے سوچ رہی تھی۔

☆☆☆

تب ہی فارس چلا آیا تھا، ویسا ہی سنجیدہ و مدبر، جیسا وہ تھا۔

ماورا نے مسکرا کر اس کے سلام کا جواب دیا اور میز پر پڑی کتابیں، اٹھا کر الماری میں رکھنے لگی۔ وہ دادی کے برابر بیٹھا ان کا احوال دریافت کر رہا تھا، بہت ٹھہرے ٹھہرے انداز میں، مدہم لہجے میں بولتا تھا وہ۔

”کہاں رہے اتنے دن؟ سطوت حسین مجھ پر خفا ہو رہے تھے کہ تمہیں جانے کیوں دیا؟ اس شہر میں تو غالباً تمہارا کوئی دوست، رشتے دار بھی نہیں ہے۔“ دادی پوچھ رہی تھیں۔

”آف..... وہی ہزار بار کا تذکرہ، کاش اس کا کوئی دوست، رشتے دار ہوتا یہاں۔“ ماورا نے الماری بند کر کے دو کتابیں دادی کے بیڈ کی سائڈ ٹیبل پر رکھیں۔

”یہ دونوں کتابیں آج کل ان کے زیر مطالعہ تھیں۔“

”ایسے لوگوں کے لیے بڑے عالی شان ہوٹلز بنے ہوئے ہیں، اس لیے میں نے سوچا دوسروں کے لیے پراہلم بننے کے بجائے سیدھا وہیں چلا جاؤں۔“

وہ باہر نکلنے کے لیے دروازے کا ہینڈل گھما رہی تھی جب اس کے کانوں نے سنا..... ایک بل کے لیے تو بات سمجھ میں نہ آئی اور جب آئی تو وہ جھٹکے سے اس کی طرف پلٹی۔

وہ نہایت اطمینان سے دادی کی طرف رخ موڑے بات کر رہا تھا۔ ماورا کو پلٹتے دیکھا تو بے ساختہ ہی اس کی طرف متوجہ ہوا۔

ماورا نے بغور دیکھا، اس کے چہرے پر کسی طنز، کسی شکایت کا کوئی تاثر نہ تھا۔ وہ چند لمحوں کے لیے الجھی اور پھر فوراً ہر نکل آئی۔

”تو کیا اس نے وہ ساری باتیں سن لی تھیں؟“ وہ کمرے سے باہر آ کر رکی نہیں، سیدھی چلتے ہوئے

کچن تک آئی۔ بوا کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اور مہمان کو تواضع کے بغیر جانے دینا اس گھر کی ریت نہ تھی سو وہ خود سے الجھتی، کشمکش میں ڈوبی چائے کی ٹرالی تیار کرنے لگی۔

”شک کی گنجائش تو نہیں، من و عن وہی الفاظ تھے جو اس دن وریشہ نے کہے تھے۔“ وہ عجیب سی پشیمانی میں گھری تھی (حساس لوگوں کا المیہ..... کچھ نہ کر کے بھی خود کو قصور وار سمجھنا، ایویں..... بس)

ملازم کو چائے سرد کرنے کا کہہ کر وہ لان میں اترتی سیڑھیوں پر جا بیٹھی۔

وریشہ آج گھر پر نہیں تھی، اپنی دوستوں کے ساتھ پکنک پر گئی ہوئی تھی۔ شام کو واپسی کا وعدہ تھا اور اب..... اس نے سیر اٹھا کر دیکھا۔ شام اپنے آخری کنارے پر پہنچ چکی تھی، تیز ہوا کا جھونکا سا آیا تھا۔

نم آلود اور سرد ہوا، موسم کے تیور ٹھیک نہیں تھے۔

”وریشہ کو اب آ جانا چاہیے، موسم خطرناک ہے۔“ اس نے فکر مندی سے سوچا اور سر پر بھی ٹوپی کو کانوں تک مزید کھینچ لیا۔

تب ہی وہ تیز تیز قدم اٹھاتا اس کے قریب سے گزرا تھا۔ ماورا نے دانستہ نگاہ نہ اٹھائی، کچھ دیر قبل فراموش ہو چکی پشیمانی ایک بار پھر عود کر آئی تھی۔

وہ سیڑھیاں پھلانگ کر لان کی پتھریلی روش پر پاؤں رکھ چکا تھا۔ پھر ایک دم سے ٹھٹک گیا، یوں جیسے اس کی موجودگی کا احساس چند لمحوں بعد ہوا ہو لیکن نہیں، وہ اپنی جیبیں ٹول رہا تھا، پھر ایک دم سے پلٹا۔

اب چھپا نہیں جاسکتا تھا، سورسی سی مسکراہٹ چہرے پر سجائے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میں چابیاں وہیں کمرے میں بھول آیا ہوں۔“ اس نے اپنے رکنے کی وجہ بتائی تھی۔

”موسم ٹھیک نہیں، آپ کچھ دیر رک جاتے۔“ اگلے چند لمحوں میں چابیاں اس کی طرف بڑھاتے ہوئے اس نے بڑے خلوص سے کہا تھا۔

وہ جو سر اٹھائے آسمان کے بدلتے رنگوں کو دیکھ رہا تھا، اس کی بات پر نظروں کا زاویہ بدل کر چند

ٹاپے بڑی خاموشی سے اسے دیکھتا رہا لیکن صرف لب خاموش تھے، آنکھیں تو بہت کچھ کہہ رہی تھیں۔ اس نے شرمندگی میں گھر کر نظریں جھکا لیں۔

”آپ نے اس دن ہماری باتیں سن لی تھیں؟“

فارس نے ذرا سا مسکرا کر سر جھٹکا۔

”دانتہ نہیں، میں صرف فون کال سننے کے لیے باہر آیا تھا۔“

”اسی لیے آپ اتنے دنوں سے نہیں آئے؟ اور سطوت انکل نے کئی بار آپ کے آنے کا پوچھا تھا۔“

”نہیں، صرف یہ ہی وجہ نہیں تھی۔ میں کچھ مصروف بھی رہا۔“

”آئی ایم سوری فارس صاحب! لیکن وریشہ نے یہ سب مذاق میں کہا تھا۔“ اس کی بات پر فارس نے تعجب سے اسے دیکھا۔

”یہ سب وریشہ نے کہا تھا؟“

”جی..... میں نے تو نہیں کہا تھا۔“

”تو پھر ایکسکوز آپ کی طرف سے کیوں؟“ اس کے قدرے حسابی کتابی انداز نے ماورا کو پریشان کر دیا تھا۔

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟“ اس نے حیرت سے کندھے اچکائے۔

”دوسروں کی غلطیاں اپنے کھاتے میں ڈالنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ وہ اس سے بڑھ کر حیران تھا۔

”پتا نہیں، میں کبھی ایسے حسابوں کتابوں میں نہیں پڑی، اتنی جمع تفریق مجھ سے نہیں ہوتی۔“ وہ قدرے کنفیوز نظر آئی۔

وہ لب بھیجے اسے دیکھتا رہا۔

ماورا نے بھی اسے دیکھا تھا اور پھر اس کے عقب میں کھڑے درختوں کو، جو تیز ہوا میں مست تھے اور اپنی شاخیں آسمان کی وسعتوں میں پھیلاؤ جھوم رہے تھے پھر وہ مسکرایا تھا۔ بڑی اداس لیکن پُر خلوص مسکراہٹ۔

”بے غرض ہو اور سادہ دل بھی۔“ وہ ہولے سے بڑبڑایا۔ پھر پلٹا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس سے دور ہوتا چلا گیا۔ سیاہ گھور بادل آسمان پر چھاتے چلے

گئے اور تاریکی لمحہ بہ لمحہ گہری ہوتی چلی گئی۔

ماورا اسی زاویے میں وہاں کھڑی رہی تھی۔ سرد، تیز اور نم آلود ہوا میں بہت دیر تک..... یہاں تک کہ بارش کا پہلا قطرہ اس کی ناک پر گرا۔ تب اسے احساس ہوا۔ سردی بہت زیادہ تھی اور وہ بری طرح کپکپا رہی تھی۔

اسے لگا وہ کسی خواب سے جاگی ہے.....

بارش کے قطرے ٹپاٹپ برسنے لگے تھے۔ وہ بھاگ کر اندر چلی آئی۔

☆☆☆

وریشہ آئی تو اس کے ساتھ اس کی دو۔ سہیلیاں بھی تھیں۔ ان تینوں کے آتے ہی گھر میں ہنگامہ مچ گیا تھا۔ ادھ سوئے ملازم دوبارہ جاگ گئے، کچن آباد ہو گیا۔

شاور، کپڑے، چائے، کھانا، کافی..... خاطر داری کا لمبا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ وہ دونوں لڑکیاں بہت باتوئی تھیں (ظاہر ہے وریشہ کی فرینڈز تھیں تو.....) ہنستیں تو ہنسنے چلی جاتیں۔ بات بے بات ہاتھ مارتیں، ذرا ذرا سی دیر میں انہیں بھوک لگنے لگتی۔

ماورا نے کچھ دیر بادل نحو استہ ان کا ساتھ دیا پھر وہ گھر دیکھنے کے ارادے سے اسیں تو ماورا چپکے سے اپنے کمرے میں چلی آئی۔ وریشہ نے اس کے جانے کا خاص نوٹس نہ لیا اور نہ ہی ماورا کو تو قہر بھی سو آرام سے اپنی اسچ بک نکال کر کمبل میں آچھپی۔

اسے ایک ادھورا اسچ مکمل کرنا تھا لیکن جب ہاتھ روال ہوا تو وہ مزید اسیکچز بناتی چلی گئی۔ بغیر ٹھکے، بنا سر اٹھائے، وہ ایک ہی چہرہ تھا۔ انداز مختلف تھے۔ ایک خوب صورت مردانہ چہرہ جس کے اسیکچز وہ ہر ہر انداز سے بناتی تھی۔ بھی ترچھا، بھی سیدھا، بھی مسکراتا، بھی اداس، بھی سوچ میں ڈوبا، بھی سر اوپر اٹھائے، بھی ٹھوڑی سینے سے لگائے، بھی عمر کے دو سال آگے، بھی عمر کے دو سال پیچھے..... وہ نم آنکھوں سے یہ اسیکچز بناتی تھی، یہاں تک کہ آنکھیں جھلک جاتیں اور وہ اسچ ادھورے چھوڑ کر

اسچ بک بند کر دیا کرتی۔

یہ ہی وجہ تھی کہ ان اسیکچز پر کہیں کہیں اس کے آنسوؤں کے دھبے صاف دکھائی دیتے تھے۔ آج کا اسچ بہت متاثر کن تھا، جیکٹ کے کارلز بناتے ہوئے وہ ذرا سا چونکی۔

”یہ جیکٹ؟ میں نے آج دیکھی ہے.....“

کہاں..... کس کی؟“ اور اگلے ہی پل ایک جھپاکے سے سب یاد آ گیا۔

دل نے ایک بیٹ مس کی تھی۔

”ایسا کیا یاد آ گیا؟“ اس نے پنسل اسچ بک پر گرا کے ایک دم ہی سینے پر ہاتھ رکھا۔ آنکھیں زور سے میچیں، کھولیں لیکن وہ منظر تھا کہ آنکھوں سے ہٹتا ہی نہ تھا۔ کچھ ہوا تھا۔ ایسا عجیب اور انوکھا، جو ماورا کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ اس نے اسچ بک بند کر کے الماری میں چھپائی اور کھڑکی سے آگئی۔

رات بہت تاریک تھی، بارش بند ہو گئی تھی لیکن آسمان پر چاند، تاروں کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ اس نے فرصت سے اس منظر کو سوچا۔

وہ اس کے سامنے کھڑا تھا اور ماوراجیسے ابھی بھی اسے وہاں کھڑے دیکھ رہی تھی۔ اس کی سیاہ جیکٹ، گردن کے گرد لیٹا سرمئی مفلر، دراز قد، اس کی آنکھیں، اس کی مسکراہٹ اور اس کے عقب میں جھومتے، شور مچاتے درخت، دم بدم بڑھتی تاریکی، اٹک کر آتے سیاہ بادلوں کے دل کے دل..... اور اس کے ملبوس سے اٹھتی کلون کی ہلکی سی مہک جو ہوا کے ہر جھونکے کے ساتھ اس تک برابر پہنچ رہی تھی۔

کیا تھا اس شام کے آخری لمحات میں؟

ماورا کو لگا، اس کا وجود ریت بن کر ہولے ہولے بہہ رہا ہے۔ وہ کم صم بھی اور شاید اس بھی۔ یہ جاتے موسم کی آخری بارش تھی اور آتے موسم کی پہلی انگڑائی۔

بارش کے ساتھ ساتھ ساری دھند بھی چھٹ گئی تھی۔ سورج بادشاہ چمکا تو اس کی کرنوں سے وادی کا کوٹا کوٹا چمک اٹھا تھا۔ سردی سے مردہ ہوتے سبزے

نے ایک بار پھر سر اٹھانا شروع کر دیا۔ خود رو پودے پتھروں کے پتوں بیچ نمونہ پانے لگے تھے۔ اس روز درختوں پر پرندوں کا شور ہر روز سے زیادہ تھا۔ وہ ہلکے پھلکے لباس میں اونچے نیچے راستوں پر قدم رکتی الیاس کی طرف جارہی تھی۔

الیاس ایک آرٹسٹ تھا۔ شہر کے مشہور بازار میں فٹ پاتھ پر اپنی دکان سجاتا تھا۔ دواسٹول اور ایک میز، ہاتھ میں پنسل اور ارد گرد اسیکچز ہی اسیکچز..... دور دراز سے آنے والے سیاح، مقامی لوگ، طلبہ و طالبات، محبت اور محبوب، ہر کوئی اس سے اسچ بنواتا تھا۔ اس کا پنسل ورک کمال کا تھا، تصویر کو دیکھ کر لگتا تھا، ابھی بول دے گی۔

ماورا اس کے کام کی دیوانی تھی۔ اکثر ہی فٹ پاتھ کے کنارے رک کر اس کے چلتے ہاتھوں کو دیکھتی۔ رفتہ رفتہ شناسائی بڑھی تو الیاس کے گھر کا راستہ بھی دیکھ لیا تھا۔ وہ اس سے وقتاً فوقتاً کچھ نہ کچھ پوچھتی، سیکھتی رہتی تھی۔ آج کے دن وہ کام سے چھٹی گرتا تھا۔ اسے گھر میں بیمار ماں کے بہت سے کام نمٹانا ہوتے تھے۔

”یہ سب کیوں لائی ہیں آپ؟“ اسے لدے پھندے دیکھ کر الیاس نے عادتاً برا مانا۔ ”یہاں کون ہے یہ سب کھانے والا؟“

”میں ہوں، تم ہو اور امی بھی تو ہیں۔“ وہ شارپز کھول کھول کر چیزیں ٹھکانے پر رکھنے لگی۔

پھل، جیم، ڈبل روٹی، انڈے اور ایسی دوسری

کئی چیزیں۔

”یہ دیکھو، یہ تمہارے لیے۔“ اس نے چاکلیٹس اور کافی کا بند ڈبہ اس کے سامنے رکھا۔

”مجھے یہ سب اچھا نہیں لگتا۔“ وہ سیلف میڈ لڑکا ماتھے پر ہل ڈالے بیٹھا تھا۔

”مجھے اچھا لگتا ہے، دکھاؤ..... آج کل نیا کیا بنا رہے ہو؟“ وہ اس کے کمرے میں چلی آئی۔

الیاس اسے اپنی نئی تھری ڈی کلیکشن دکھانے لگا تھا۔ دو تین گھنٹوں کے گزرنے کا پتا بھی نہیں چلا تھا۔

یہ اور بات کہ جب وہ شاداں و فرحاں سی واپس لوٹی تو گھر کے باہر کھڑی گاڑی کو دیکھ کر قدم خود بخود دست پڑ گئے۔

”یہ گاڑی؟“
”فارس صاحب کی ہے؟“ اس کے سوال پر گاڑی نے بتایا تھا۔

”کتنی دیر ہوگئی آئے ہوئے؟“
”یہ ہی کوئی آدھا، پونا گھنٹہ.....“

”آدھا، پونا گھنٹہ.....“ ماورا نے کندھے جھٹکے اور طویل سانس لے کر گھر میں داخل ہوئی۔ وہی وقت تھا۔ جب وہ گھر واپسی کے ارادے سے اٹھی تھی اور الیاس گرما گرم چائے لے کر آ گیا۔

”اس سے بُری چائے تو شاید ہی کبھی مجھے پلاسکو الیاس؟“ چائے کی مٹھاس کڑواہٹ بن گئی تھی۔

لان خوب آباد تھا، دادی، وریشہ اور وہ..... فارس بھی۔

”ارے کہاں گم تھیں، بڑی دیر لگادی تم نے۔“
وریشہ نے اسے دیکھتے ہی ہاتھ ہلایا۔

”ہاں واقعی دیر تو ہوگئی۔ (کاش کچھ دیر پہلے آگئی ہوتی)۔“ ماورا نے سبھاؤ سے کہتے ہوئے کن اکھیوں سے فارس کو دیکھا۔

وہ گردن ترچھی کیے لان میں اتر آنے والی بلبلوں کو دیکھ رہا تھا۔

مختصر لیکن بھرپور سی نگاہ میں ماورا نے اس کے نقوش از بر کیے اور پھر دادو کے برابر بیٹھ گئی۔

”ارے، تم سی آدم بے زار کو کون سی دوست بھاگئی جس کے ساتھ اتنا ناٹم اسپنڈ کر کے آرہی ہو۔“

وریشہ نے حسب عادت اسے چھیڑا۔

”آپ کب آئے؟“ فارس سے نگاہ ملی تو ماورا نے سوال کیا۔ فارس سے قبل وریشہ بول اٹھی۔

”گھنٹہ بھر ہو گیا، ہر دو منٹ بعد“ میں جا رہا ہوں“ کی تھریت دے کر اتنا وقت گزار لیا۔

”اوہوں.....“ دادی نے گھورا۔ ماورا نے بھی

وہ وریشہ کی بات سن کر ہنستے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔
میز سے گاڑی کی چابی اٹھاتے ہوئے سن گلاسز لگائے۔
”لو بھئی، اب تو میں واقعی گیا۔“

”آئیے آئیے، آپ کو باہر کا راستہ دکھا دوں۔“
وریشہ بھی ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اومائے گاڈ، وریشہ..... وریشہ.....! یہ تم اتنی ال میئر ڈکب سے ہو گئیں۔“ دادی نے گھر کا مگر وریشہ نے کہاں سنا۔

قلقل کرتے پہاڑی جھرنے کی طرح ہنستی، قہقہے لگاتی وہ فارس کو گیٹ تک چھوڑنے جا رہی تھی۔
ماورا نے ان دونوں کو جاتے دیکھا اور پھر نوکری میں سے سرخ سرخ اسٹابری اٹھا کر کھانے لگی۔

☆☆☆

اور پھر بہت سے دیگر رونما ہونے والے واقعات میں سے ایک واقعہ یہ بھی رونما ہوا کہ بہت عجلت میں سڑک پار کرتے ہوئے وریشہ گاڑی کے نیچے آتے آتے پٹی تھی۔ وہ بھی یوں کہ اگر گاڑی کا ڈرائیور بریک لگانے میں ایک سیکنڈ کی بھی دیر کر دیتا تو وریشہ کا پتلا کٹ چکا ہوتا۔

بریک کی زور دار چرچر اہٹ، پر لوگ چاروں اطراف سے بھاگے آئے اور پھر مایوس ہو کر لوٹ گئے کہ جس تماشے کی توقع انہیں تھی، وہ وقوع پذیر نہ ہوا تھا۔
الٹا وہ ساحر گاڑی سے اتر اور گاڑی کے نیچے آنے سے بچ جانے والی میں زندگی کی نئی روح پھونک کر، سڑک کنارے کھڑی زرد ہوئی، لرزتی، کانپتی لڑکی کو کاندھوں سے تھام کر گاڑی میں بٹھا، یہ جا، وہ جا۔

اور اب وہ تینوں ایک ریستوران کے پرسکون ماحول میں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔

”آف..... آج تو مرتے مرتے پکی۔“ بڑے سے بڑے واقعے کو چٹکیوں میں اڑانے والی وریشہ ہی ہو سکتی تھی۔ ماورا ابھی تک فتنہ چہرہ لیے گم صم سی بیٹھی تھی۔

”بھی گرتے گرتے اور بھی مرتے مرتے.....“
میں ہر دفعہ بچانے نہیں آؤں گا۔“ فارس نے انگلی اٹھا کر تنبیہ کیا۔

”دیکھیں گے۔“ وریشہ نے کندھے اچکائے اور آکس کریم کھانے لگی۔
ماورایوں ہی پیالے میں چچ چلا رہی تھی۔

وہ بیت جانے والے واقعے سے بہت دیر تک متاثر رہتی۔ ہمیشہ سے ہی، صرف آج کی بات نہ تھی۔

”اگر کچھ ہو جاتا؟“ کچھ ہو جانے کا انجانا سا خوف اس کے ساتھ بل کر جوان ہوا تھا۔

”آپ کیا کرتی ہیں ماورا؟“ پچھلی کئی ملاقاتوں کے بعد آج وہ پہلی بار اس سے براہ راست مخاطب ہوا تھا۔

اپنے ہی خیالوں، خدشوں میں گھری ماورا نے سر اٹھا کر فارس کو دیکھا۔

”اس نے کیا کرنا ہے؟ کالج جاتی ہے، صرف اور صرف بواجی پر رعب جمانے کے لیے۔ وہ خاصی متاثر ہیں اس کی پڑھائی سے، حالانکہ یہ پڑھتی دڑھتی خاک نہیں۔“ وریشہ بیٹھی تھی اسے متعارف کرانے کے لیے۔

ماورا نے لب بھیج لیے.....

”ایسے کیا دیکھ رہے ہیں؟ سچ کہہ رہی ہوں۔“
کلاس میں بھی بیٹھی تصویریں بناتی رہتی ہے۔ یقین نہ آئے تو اس کی فائل اٹھا کر دیکھ لیں۔ سارے

اسائنمنٹ پیپرز اسکیچز سے بھرے ہوئے ہیں، کتابوں کے ہر صفحے پر کوئی نہ کوئی تصویر۔ دن میں ہی نہیں، راتوں میں بھی اٹھ اٹھ کر بناتی ہے۔“

ماورا کو دھندلا سا دکھائی دینے لگا تھا۔

”اس نے مجھے دکھائے نہیں اسکیچز، لیکن میں نے خود ہی دیکھ لیے۔ پتا نہیں کون ہے، لیکن ہے بہت پیارا۔“

مزید بیٹھے رہنا محال تھا، آنسو چھلک جاتے تو پھر سنبھالے نہ جاتے۔

”میں گھر جا رہی ہوں۔“ وہ بمشکل کہہ سکی۔

”بڑی بات ہے وریشہ! تم نے.....“ فارس کچھ کہہ رہا تھا، بھاری دروازے کو دھکیل کر باہر نکلتے ہوئے اس نے سنا مگر کی نہیں۔ حلق میں پھندا سا پڑنے لگا تھا۔

وہ تیز تیز قدموں سے چلتی رہی، عقب میں گاڑی کا ہارن بجتا رہا۔ اس کا دل نہ چاہا گاڑی میں بیٹھنے کو۔

یہاں تک کہ گاڑی اس کے سامنے آ کر اس انداز سے رکی کہ اسے ٹھہر جانا پڑا مجبوراً۔

”ماورا! گاڑی میں بیٹھیں، پلیز۔“ وہ سامنے کھڑا تھا، لہجے میں اس قدر اصرار تھا کہ وہ بیٹھ گئی۔

وریشہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھی تھی۔

ماورا نے دیکھا نہیں لیکن وہ اندازہ کر سکتی تھی، وریشہ کا موڈ کیسا ہوگا۔

راستے بھر گاڑی میں خاموشی طاری رہی، فارس نے ایک آدھ بار ماحول تبدیل کرنے کی کوشش کی پھر وہ بھی چپ ہو رہا۔

☆☆☆

”اس قدر موڈ کیوں بنالیا تھا تم نے؟ ایسی کون سی بات کہہ دی تھی میں نے؟“

ساری دوپہر ساٹ چہرہ، سرد لہجہ رکھنے والی وریشہ اب تند لہجے میں اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔ وہ اپنا دھیان بٹانے کے لیے کالج کے انتہائی نازک اور نفیس ڈیکوریشن پیسز سامنے رکھے ان کی صفائی کر رہی تھی۔ یہ اس کا اپنا شوق تھا، وہ انہیں خود ہی سجاتی، خود ہی سنوارتی تھی۔

”موڈ نہیں بنایا تھا، پریشان تھی میں۔“ جذبات میں ٹھہراؤ آچکا تھا سو اس نے بڑی متانت سے جواب دیا۔

”جھوٹ مت بولو، پریشان ہوتیں تو یوں وہاں سے اٹھ کر نہ چلی جاتیں۔ اسی پریشانی کو ریلیز کرنے کے لیے فارس ہمیں آکس کریم کھلانے لے گیا تھا، لیکن تم ہم دونوں کی پروا کیے بغیر اٹھ کر چلتی بنیں۔“

وریشہ سخت غصے میں بول رہی تھی۔ ماورا نے چپ رہنا ہی مناسب سمجھا۔

”اور..... میں نے ایسی کون سی غلط بات کہہ دی تھی، نہیں بناتیں تم اسکیچز کسی لڑکے کے۔ الماری بھری ہوئی ہے تمہاری اور میں نے چوری چوری نہیں دیکھنے تھے، تم خود الماری کھلی چھوڑ گئی تھیں اور فارس کے سامنے

تم نے یوں ری ایکٹ کیا کہ..... کیا سوچتا ہوگا وہ میرے بارے میں۔“ وہ انگلیاں چٹخا رہی تھی۔

ماورا نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ ”اور..... میرے بارے میں کیا سوچا ہوگا اس نے؟ کیسی لڑکی ہوں میں؟“

”تو تمہیں اس کی پروا کیوں ہونے لگی کہ تمہارے بارے میں کیا سوچا ہوگا اس نے؟“ وریشہ کے رخ لیجے نے جیسے ٹھنڈا ٹھار پانی انڈیل دیا تھا اس پر۔

وہ کھلی آنکھوں سے بہت دیر تک وریشہ کو دیکھ گئی، یہاں تک کہ وہ خود ہی بک جھک کر اس کے سامنے سے ہٹ گئی۔ لیکن اس کا سوال جوں کا توں کھڑا تھا۔

”تمہیں کیوں پروا ہونے لگی کہ.....“

”ہاں، مجھے کیوں پروا ہونے لگی؟“ وہ الجھن میں تھی۔ ابھی خود سے بھی ناواقف، بہت مدہم سی لو تھی، جو دل میں جلی تھی۔

ہلکی سی، بیٹھی سی کک تھی.....

دل اسے دیکھنے کو مچلتا نہیں تھا، ہاں اسے دیکھنے کی چاہ نہ تھی مگر خود پھولوں کی طرح دل میں سر اٹھاتی تھی۔

اس کی آواز کا زیر و بم، اس کا لہجہ، اس کا مسکراتا، اس کا چلنا، ٹھہرنا، بولنا سب کچھ تازہ رہتا تھا۔ اس کے جانے کے بعد بھی، اسے سوچنا اچھا لگتا تھا، کئی دن کی آس، امید، انتظار کے بعد اس کے قدموں کی آہٹ سننا، اسے اپنے سامنے کھڑا دیکھنا اسے نہال کرتا تھا۔

خود سے الجھتے رہنے کے بعد یہ سارے جواب اسے مل گئے تھے۔

”پروا تو ہے مجھے اس کی، محبت جو کرنے لگی ہوں۔“

رات گئے نم آنکھوں سے بے بسی کی انتہا کو چھوٹے ہوئے اس نے اقرار کر بھی لیا مگر تب، جب وریشہ کو سوائے ہوئے کئی گھنٹے بیت گئے تھے۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یہ بات کہتی، اتنی

جرات، اتنا حوصلہ کہاں تھا اس میں۔ بہت کم ہمت لڑکی تھی تھی، خود سے اقرار کے بعد رات بھر سو نہ پائی تھی۔

☆☆☆

ملگجاسا اجالا تھا اور چڑیوں کا بہت سا شور..... وہ دونوں پاؤں اوپر کیے جھولے پر بیٹھی تھی، آنکھیں بند کیے فطرت کے حسن کا ہر پہلو محسوس کر رہی تھی۔ صبح کی ہوا ٹھنڈی، خالص، پاکیزہ چڑیوں کا چہکنہ، دور کسی پہاڑی پر کوئل کو کوکنا، سبز گھاس کی مہک اور ہلکی سی سرسراہٹ..... جیسے کوئی پاؤں دھرتا اور سبزے کو مسل کر پیچھے چھوڑ دیتا ہو۔

”ہیلو.....!“ بھاری، مردانہ آواز۔

وہ بری طرح سٹیٹائی، آنکھیں کھولیں اور پھر گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ننگے پاؤں شبینہ آلود گھاس پر رکھے تو ٹھنڈک سے پورے بدن کو جھرجھری سی آگئی، فارس مسکرا دیا۔

”ڈر گئیں؟“

”ہاں..... نہیں.....“ دل بڑی زور سے دھڑک رہا تھا، خود کو سنبھالنے میں چند لمحے لگے تھے۔

”ہاں..... یا..... نہیں.....“ وہ جاگنگ سوٹ میں تھا۔

ایک طویل سانس لے کر خود کو پرسکون کرتے ہوئے اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”آپ اتنا اچانک بولے تو.....“

”میں تو جاگنگ کے لیے نکلا تھا، گیٹ کھلا دیکھا تو اندر چلا آیا۔“ ماورا نے گردن گھما کر دیکھا، گیٹ واقعی کھلا تھا۔

”آپ جاگنگ کے لیے اتنی دور آتے ہیں؟ اور یہاں تو کوئی جاگنگ ٹریک بھی نہیں۔“ اسے خاصی حیرانی ہوئی۔

”زمین جدھر کو بلاتی ہے، میں ادھر ہی بھاگا چلا جاتا ہوں۔ ویسے بھی میں صرف جاگنگ کے لیے اتنی دور نہیں آتا۔“

”تو پھر؟“

اس کے سوال پر وہ جواب دیے بغیر سر جھٹک کر مسکرا دیا تھا۔

”وریشہ تو سو رہی ہوگی ابھی؟“

”جی۔“

”اور دادو بھی۔“

”جی۔“

دل بجھ سا گیا تھا، بے دلی سے اس کے دونوں سوالوں کے جواب دیے تھے۔

”چلتا ہوں پھر؟“ وہ چند ٹائیپ کے لیے رکا، ماورا گھر کی تکنیکی چھت پر شور مچاتی ابا بیلوں کو سنتی رہی یا گھاس پر گرے بے رنگ موتیوں کو اپنے پیروں سے تسلی رہی۔

”وریشہ سو رہی ہے تو پھر کیا جواز رکھنے کا؟“

اس نے منہ بسورتے ہوئے تب ہی سر اٹھایا جب وہ گیٹ پار کر چکا تھا۔

☆☆☆

بہت اداس سی شام تھی، وہ لان میں جھولے پہ آنکھیں بند کیے بیٹھی گویا پھر سے کسی کی آمد کی آس لگائے بیٹھی تھی لیکن ایسے خوش گوار واقعات ہر گھڑی رونما ہونے کے لیے نہیں ہوتے۔ وہ پل پل آنکھیں بند کرتی اور کھولتی رہی مگر جو نہ ہونا تھا، وہ نہ ہوا۔ یہاں تک کہ گلابی شام پہ سرمئی اندھیرا اتر آیا اور سیاہی پوری وادی پر رات بن کر اتر آئی۔

وریشہ کسی سے فون پر بات کر رہی تھی، پہلے کھڑکی میں دکھائی دے رہی تھی پھر کوریڈور میں چکرانے لگی۔

”یہ لڑکی بہت خوش قسمت ہے۔“ اس نے بہت کوشش کی، آنکھوں میں آنی نمی کو روکنے کی، پر کہاں..... ان آنسوؤں پر بھی زور نہ چلا تھا اس کا بے توجہ پھر بہتے چلے گئے۔

”وہ وریشہ کو دیکھنے آتا ہے، اس سے ملنے۔“

ہاں وہ ایسی ہی ہے کہ اسے چاہا جائے۔

میں کون ہوتی ہوں، ایسی خواہش رکھنے والی۔ عام سی انتہائی عام سی لڑکی۔“

وہ وریشہ کو دیکھ رہی تھی اور جان بوجھ کر خود کو اذیت دے رہی تھی۔ جو نوکروں کی گود میں پل کر جوان ہو گئی۔ جسے ماں کی گود میسر آئی نہ باپ کی شفقت۔ جسے دکھنے کا سلیقہ آتا ہے نہ خوشی کے اظہار کا۔ جس کی اپنی کوئی رائے، کوئی مرضی بھی تھی ہی نہیں۔ وریشہ جیسی ریفا سنڈ پرست کی کے سامنے، مجھ جیسی لڑکی کے دکھائی دے سکتی ہے۔“ وہ بہت تیزی سے جھولا جھول رہی تھی۔

”کاش میں بھی کسی انتہا کو چھونے والی لڑکی ہوتی، خوب صورتی کی انتہا کو چھوتی کوئی پری۔ ماورائی حسن کی مالک، جسے دیکھتے تو لوگ مبہوت ہو جاتے۔ چلو خوب صورتی نہیں تو بد صورت ہی سہی، میں چڑیل ہوتی یا ڈائن، جس سے لوگ امپریس ہوتے نہ ہوتے، خوف ضرور کھاتے۔“

وہ روتے روتے ہنس دی۔ عین اسی وقت اس نے وریشہ کو گاڑی میں بیٹھتے دیکھا۔ وہ کہیں جا رہی تھی۔

”پتا نہیں کہاں مصروف رہتی ہے، سارے دن میں کم ہی ملاقات ہوتی ہے، بات چیت بھی پہلے جیسی نہیں رہی۔“ وہ اٹھ کر اندر آ گئی۔

دل و دماغ پر عجب سی بے زاری سوار تھی، کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ نہ کھانا پینا، نہ کسی سے بات کرنا۔

”بوا کوئی تیسری بار اس سے کھانے کا پوچھنے آئی تھیں۔“

”مجھے ابھی بھوک نہیں ہے، دل چاہا تو خود ہی لے لوں گی، آپ ریٹ کریں۔“ اس نے پھر ٹال دیا۔

”ارے تم تو لے لو گی، اس مہارانی کا کیا کروں، وہ تو رات بارہ بجے بھی لوٹی تو پیٹ بھرنے کو میرا دروازہ ہی ٹھونکنے لگی۔ خدا جانے کہاں نکل گئی سر شام، ابھی تک نہیں لوٹی۔ اوپر سے ضد کر رہی ہے کہ گاڑی لے کر دیں۔ لو بھئی، گاڑی آگئی تو سارے شہر میں اڑتی پھرے گی۔ نہ کوئی روکنے والا، نہ کوئی

ٹوکنے والا۔ کوئی میرے جیسا دو بول کہہ دے تو زمانے بھر کا برا..... ہاں بھی.....“

بوا بہت کچھ کہہ رہی تھیں۔ وہ اپنی ہی دھن میں اٹھی اور چلتے چلتے رومادادی کے پاس چلی آئی۔ وہ اپنی فز یو تھراپسٹ کو بھیج کر بڑے سکون سے اپنے بیڈ پر دراز تھیں۔ اس نے بھاری کشن گھسیٹا اور نیچے کارپٹ پر ہی بیٹھ گئی۔

”اونہوں.....“ دادی نے روکنے کی کوشش کی، انہیں ماورا کی یہ غریبانہ حرکتیں سخت ناپسند تھیں، جو بس کبھی کبھار ہی ظہور پذیر ہوتی تھیں۔ لیکن آج وہ بھی کچھ ڈھٹائی اختیار کیے ہوئے تھی۔

دادی نے چند باتیں کیں اور پھر ہوں، ہاں میں اس کا جواب سن کر حیب ہو گئیں۔

وہ بہت کم بولتی تھی، دل نہ ہوتا تو چند لفظ بھی منہ سے نکالنے بھاری لگتے۔ دادی مزاج آشنا تھیں، سو جلدی ہار مان گئیں۔

”وریشہ کہاں ہے؟“
”فارس کی طرف گئی ہے، ڈنر کے انویٹیشنز تھے۔ کہہ رہی تھی، فارس کے ساتھ ہی سب کو دے آئے گی۔“

ماورا نے بوجھل سی سانس لی اور گھٹنوں پر سر ٹکا دیا۔ بند آنکھوں سے سوچنے لگی۔

وریشہ اور فارس..... دونوں ساتھ ساتھ.....
”کیسا لگتا ہوگا رات کے اولین پہر میں ان آنکھوں کو دیکھنا، جب نیند کا خمار پلکوں کو بوجھل کر دیتا تھا۔ کیسا تاثر دیتی ہوں گی وہ آنکھیں۔“ اس نے حسرت سے سوچا اور شاید بول بھی دیا۔

”کیا ہوتا؟ اگر وہ مجھے بھی ساتھ لے جاتی، بس ایک نظر ہی دل کے خالی کشول کو بھرنے کے لیے کافی ہوتی۔“

”کیا کہہ رہی ہو؟“ دادی کی آواز نے چونکایا۔

”نہیں..... وہ..... میں.....“
”نیند میں بول رہی ہو؟ جاؤ سو جاؤ۔“ دادی

نے سرسری نگاہ اس پر ڈالی۔ عینک ناک پر رکھی اور ضخیم کتاب کھول کر اس میں سر دے لیا۔

”نیند..... ہاں..... شاید آرہی ہے۔ چلتی ہوں، شب بخیر۔“ دادی کا منہ چوم کر دعائیہ کلمات کہتی کمرے سے باہر نکل آئی۔

لیکن یہ اس کا وہم تھا، نیند نہیں آرہی تھی۔ بڑی کوشش کے باوجود، وہ کروٹیں بدل بدل کر تھک گئی، پھر کھڑکی میں آ بیٹھی۔

چاند اپنے جو بن پر تھا اور بہت قریب، دل چاہتا تھا ہاتھ بڑھا کر چھو لے، ہو اید ہم بھی مگر خوشبو دار۔ وہ چپ چاپ دم سادھے بیٹھی تھی، گھر سے باہر بل کھانی دور تک جاتی سڑک بالکل خالی تھی پھر بہت دیر بعد اس پر گاڑی کی ہیڈ لائٹس چمکیں اور رفتہ رفتہ قریب ہوتی گئیں یہاں تک کہ گیٹ کے باہر آرکیں۔

وریشہ گاڑی سے باہر آئی پھر وہ.....
دونوں کے درمیان مختصر سی گفتگو کا تبادلہ ہوا۔

وریشہ گیٹ سے اندر آئی اور فارس گاڑی کی طرف مڑ گیا۔ گاڑی کا دروازہ کھول کر بیٹھنے سے ایک لمحہ قبل وہ رکا تھا۔

پھر پلٹا تھا.....
گیٹ پر لگی لیمپ پوسٹس کی روشنی میں وہ بآسانی دیکھ سکتی تھی۔

اس نے سر اٹھایا اور وہاں دیکھا تھا، جہاں وہ بیٹھی تھی..... کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ وہ ساکت و صامت تھی، بس ایک پل دیکھنے کے بعد اس نے نظریں ہٹائیں اور گاڑی کو آگے بڑھا لے گیا۔

”کیا اس نے مجھے دیکھا ہوگا؟ کیا اس اندھیرے میں، میں دکھائی دے رہی تھی؟“ اس نے رکی ہوئی سانس خارج کی۔

تب ہی موبائل پر میسج ٹون آئی تھی، اس نے سائیڈ ٹیبل سے موبائل اٹھایا۔

کسی اجنبی نمبر سے میسج تھا، کمرے سے باہر

وریشہ کے قدموں کی چاپ ابھر رہی تھی۔ اس نے میسج ڈیلیٹ کر کے موبائل بند کیا اور تکیے پر سر رکھ کر سوئی بن گئی۔ اسے وریشہ سے اس وقت کوئی بات نہیں کرنا تھی۔

☆☆☆
اور بہت حیران کن بات یہ ہوئی تھی کہ ماورا نے اپنا کمرہ الگ کر لیا تھا۔

”کوئی بات ہوئی ہے کیا؟“ کھانے کی میز پر دادی نے حیرت سے استفسار کیا تھا۔

”خیر یوں تو بہت اچھا ہوا، بڑا ہونے پر بچپنے کی عادات ویسے بھی چھوڑ دینا چاہئیں، میں تو بڑے عرصے سے تم لوگوں سے کہہ رہی تھی۔“

”ہماری عادات تو شروع سے ہی میسج نہیں کرتیں، پھر بھی میں اس کے ساتھ گزارہ کر رہی لیتی تھی۔ خیر، اب بھی اس کا اپنا فیصلہ ہے۔ میں نے کچھ نہیں کہا۔“ وریشہ نے ہاتھ جھاڑے۔

ماورا نے سر اٹھا کر اس کے تنے ہوئے نقوش دیکھے، جن میں اجنبیت روز بروز بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ بے معنی سا گریز تھا اس کے انداز میں۔ سمجھ میں نہ آنے والی سرد مہری، ایک ان دیکھی دیوار تھی جو دونوں کے بیچ حائل ہو رہی تھی۔

”وریشہ پہلے والی وریشہ نہیں رہی یا شاید اس کے لیے میری نگاہوں کا زاویہ بدل گیا ہے۔“
وہ عجیب سی پشیمانی میں گھری ہوئی تھی۔

”کیا کہتی ہو ماورا! کوئی پر اہلم تو نہیں ہے ناں؟“ وریشہ کے جانے کے بعد دادی نے دوبارہ پوچھا تو وہ چونکی۔

”نہیں..... کوئی مسئلہ نہیں..... بس یوں ہی۔“
اس نے سرسری سا کہہ کر انہیں ٹالا۔

”سچ تو یہ ہے خود سے ڈرنے لگی ہوں، نیند میں ہی کچھ نہ کچھ بول دیتی ہوں۔ کبھی اس کا نام لے دیا تو؟ ابھی تو محبت کا بیج ہی بویا ہے۔ اسے سینچنے کا ہنر جانے آتا ہے یا نہیں، محبت کو نبھانا، برتنا، پرکھنا، کچھ بھی تو نہیں سیکھا۔ انجانے میں خود کو بے مول نہ

کردوں، سیپ میں بند موتی کی طرح ہے میری محبت۔ سچے، خالص، کھرے جذبوں میں لپٹی، انتظار کروں گی، امتحان لوں گی۔ کسی اور کا نہیں اپنی محبت کا امتحان، کھری ہوگی تو وہ خود آئے گا مجھ تک۔

میں جانتی ہوں خاموش محبتیں کبھی بھی اثر پذیر نہیں ہوتیں، ان کے مقدر میں خورد و پودوں کی طرح سر اٹھانا اور پھر سے مٹی کا رزق بن جانا ہوتا ہے۔ ہاں کچھ محبتیں ہوتی ہیں جو دل کے صحیفے پر کسی معجزے کی طرح اترتی ہیں اور قبولیت کا شرف پا جاتی ہیں۔ میں بھی جانتا چاہتی ہوں، میری محبت کس قدر اثر انگیز ثابت ہوتی ہے۔“

دادی کھانا کھا کر جا چکی تھیں اور وہ تنہا بیٹھی دیر تلک مومی شمعوں کے ساتھ ساتھ خود بھی پکھلتی رہی۔

☆☆☆
خدا جانے دونوں لڑکیوں کی طبیعتوں میں اتنا تضاد کیوں ہے؟“

روما خاتون کی رائے پر بواجی نے سب کام چھوڑ کر دیکھا، وریشہ سارے لان میں چمکتی بھر رہی تھی۔ بہت سے مہمانوں سے ملتی ملائی، مصنوعی مسکراہٹ نہ تھی چہرے پر۔ سچ میں خوش تھی، ایسی محفلیں اسے شروع دن سے نہال رکھتی تھیں، ان میں جان بھی اس کی، اسی لیے حلقہ احباب بھی وسیع تھا۔

”وہ دنیا بے چاری جانے کس کو نے کھدے میں چھپی ہوگی۔“ بواجی نے تاسف سے ماورا کو سوچا، وہ بھاگتی تھی، رش سے، ہجوم سے۔ خار کھاتی تھی لوگوں کی بناوٹ بھری باتوں سے۔

ابھی بھی ماورا وہیں اسی لان کے ایک کونے میں کھڑی ان جگنوؤں کو کھوج رہی تھی جن سے وہ گوشہ ہر روز بچتا تھا۔ آج وہ کہیں نہ تھے اور اگر تھے بھی تو اتنی بہت سی روشنیوں میں ان کا ٹھٹھانا کیا معنی رکھتا تھا۔ وہ تھک کر بیٹھ گئی اور بڑی فرصت سے اس سارے ماحول کے ایک ایک منظر کو ترتیب سے دیکھتی چلی گئی۔

آج سالانہ ڈنر تھا۔

ہر سال موسم بہار کی آمد پر ایک بہت ہی زبردست قسم کے ڈنر کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ رومادادی کی فرینڈز، وریشہ کے دوست احباب، کاروباری شراکت دار، ان کے نت نئے فیشن، قیمتی سگار و پرفیومز کی مہک، نوجوان لڑکے، لڑکیوں کی انھیلیاں اور باربی کیو کی خوشبو، جواشتہا کو مزید بڑھاتی تھی کہ کھانے لگنے میں ابھی کچھ وقت تھا۔

”کتنا کہا تھا الیاس سے..... تھوڑی دیر کے لیے آجائے مگر یہ لڑکا بھی.....“ اس نے سر جھٹکا اور بوریت کی انتہا کو چھوتے ہوئے بمشکل خود کو جمائی لینے سے روکا اور پھر رسمی سی مسکراہٹ چہرے پر سجائے، اکا دکا لوگوں سے ہیلو، ہائے کرنی گھر کے اندرونی حصے میں چلی آئی۔

وریشہ فون کانوں سے لگائے اکیلی کھڑی تھی۔ ”فارس کو انوائٹ نہیں کیا تھا؟“ تقریب کے رنگ اتنے مدہم تھے کہ ماورا کو پوچھنا پڑا۔ وریشہ فون بند کر چکی تھی۔

”اسے انوائٹ کرنے کی کیا ضرورت تھی، وہ تو گھر کا بندہ ہے۔“ وریشہ بھرپور طریقے سے آنکھ مارتے ہوئے مسکرائی تھی۔

”مام ڈیڈ کو لینے گیا ہے ایر پورٹ، نکل آئے ہیں وہاں سے۔ بس کچھ ہی دیر میں پہنچ جائیں گے۔ یہ سارا انتظام اسی نے تو کروایا ہے، ورنہ مام، ڈیڈ کے آنے کے بعد ہوتا یہ ڈنر اور یہ تم کہاں جا رہی ہو؟“ اسے سیڑھیاں چڑھتے دیکھ کر وریشہ نے پکارا۔ ”بس ابھی آرہی ہوں۔“ وہ اپنے کمرے میں آگئی۔

کمرے میں اندھیرا تھا، لیکن اچھا لگ رہا تھا۔ ہائی ہیل سینڈلز سے پاؤں نکال کر اس نے کھڑکی کا پردہ ہٹا کر جگمگ کرتے لان اور خوش باش چہروں کو دیکھا۔

”وہ بھی یہاں ہوتا، ان ہی چہروں کے درمیان تو اسے یوں دیکھنا اور دیکھتے رہنا کتنا اچھا لگتا۔“ لیکن اس کے آنے میں ابھی وقت تھا۔

وہ بستر پر دراز ہو گئی۔ باہر کے شور اور ہنگامے سے کہیں زیادہ پرسکون اور آرام دہ ماحول تھا۔ اس کی آنکھیں نیند کے خمار سے بوجھل سی ہونے لگی تھیں۔

”رومادادی کو شاید برا لگے میرا یوں چلے آنا، سطوت انکل اور آنٹی مہرین بھی برا مانیں گی، مجھے وہاں نہ پا کر، خیر کوئی بات نہیں، ابھی وقت ہے۔ ان کے آنے سے پہلے میں دوبارہ وہاں چلی جاؤں گی۔ آف آج کتنی محنت سے نازیہ نے میرے بال کرل کیے تھے، لینے سے خراب ہی نہ ہو جائیں۔ وریشہ زرد لباس میں بہت پیاری لگ رہی ہے آج، فارس..... پتا نہیں کس رنگ کا ڈریس پہنا ہوگا اس نے آج؟ کون سا رنگ پسند ہوگا اسے؟ کبھی مل بیٹھے تو پوچھوں گی۔ پتا نہیں آج اتنی نیند کیوں آرہی ہے؟ کھانا لگنے میں تو ابھی دیر.....“

اسے نہیں پتا چلا، وہ کیا کیا سوچتے ہوئے اور کب سو گئی تھی۔

☆☆☆ نیم تاریک راہداری تھی۔ دونوں اطراف کے طاقچوں میں مومی شمعیں روشن تھیں۔ ماورا بچی، سنوری، زرق برق لباس میں اپنے کمرے سے نکلی تو کسی سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔ ”کہاں گم رہتی ہو؟ نظر کیوں نہیں آتیں؟“ وہ اس کے عین سامنے کھڑا پوچھ رہا تھا۔ اس قدر بے چینی اور بے تابی سے..... ماورا نے از حد حیرت سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں اداسی تھی اور شکوہ بھی۔

”جانتی ہو؟ میں صرف تمہیں دیکھنے آتا ہوں یہاں، تمہاری ایک جھلک دیکھنے کی آس، امید میں گھنٹوں بیٹھا رہتا ہوں میں اور تم مجھے دیکھتے ہی کھو جاتی ہو کہیں۔“ ایسا بے تاب لہجہ، درد بھرا..... ماورا تڑپ سی گئی تھی۔ ”تمہیں دیکھنا میری زندگی، میری چاہت ہے

ماورا..... مجھ سے یوں دور مت بھاگو۔“ وہ اس کے قریب آ گیا تھا۔

مومی شمعیں ہولے سے لرزی تھیں، بالکل ماورا کے نازک وجود کی طرح..... اس کا سایہ ماورا کے سائے پر حاوی ہو رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ فاصلہ تمام ہوتا، کوئی تیسرا سایہ ان کے بیچ میں آن کھڑا ہوا تھا۔ اتنا وحشت ناک کہ ماورا بری طرح خوف زدہ ہو کر ان دونوں سے دور ہٹ گئی اور عین اسی لمحے ماورا کی آنکھ کھل گئی تھی۔

کمر اتار یک تھا، ویسا ہی جیسے سونے سے قبل تھا لیکن اب کیفیت وہ نہ تھی۔ دھڑ دھڑاتے دل اور سرد ہوتے ہاتھ پاؤں کے ساتھ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ ”وریشہ.....“ اس نے حسب عادت پکار کر تسلی کرنا چاہی لیکن کمرے میں خاموشی تھی۔ بہت زیادہ خاموشی اتنی کہ وہ اپنی سانسوں کی آواز بھی با سانی سن سکتی تھی۔

گویا کمرے میں اس کے سوا کوئی نہ تھا۔ زبان خشک ہو کر تالو سے جا لگی تھی۔ وہ ہاتھوں سے دیواروں کو ٹٹولتی ہوئی کھڑکی تک آئی، پردہ ہٹا کر اس نے کھڑکی کے دونوں پٹ کھول دیے۔ سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی، ایسے میں سب سے زیادہ ضرورت تازہ ہوا اور آکسیجن کی تھی۔

وہ کھڑکی کی چوکھٹ پر ہاتھ رکھے باہر کو جھک گئی۔ ہوا میں ٹھنڈک تھی۔ وہ لمبے لمبے سانس کھینچ کر خود کو پرسکون کرنے لگی۔

لان ویران ہو چکا تھا، محفل سمٹ چکی تھی۔ سارا منظر تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔

”خاصی دیر سوئی رہی میں۔“ دل کی دھڑکن معمول کی رفتار پر آنے لگی تھی۔ وہ کھڑکی بند کر کے کمرے سے باہر آ گئی۔ وہ اس خواب کے اثر سے نکلتا چاہ رہی تھی جو کچھ لمحے قبل اس نے دیکھا تھا۔

لاؤنج کی طرف سے آوازیں آرہی تھیں۔ گویا ابھی سب لوگ نہیں سوئے تھے، وہ بہت عجلت میں چلتی ہوئی لاؤنج میں داخل ہوئی۔ انکل اور

آنٹی بالکل سامنے کے صوفے پر بیٹھے تھے۔ سطوت انکل نے اسے دیکھتے ہی ہانپیں پھیلا دی تھیں۔

وریشہ، مہرین کے پہلو سے لگی بیٹھی تھی، ماورا بھی سطوت انکل کے بازوؤں میں جاسائی۔

”اتنی نیند آرہی تھی، ہمارا انتظار بھی نہیں کیا؟“ بڑا پیار بھرا شکوہ کر رہے تھے وہ۔

”میں خواب میں ڈر گئی تھی تایا ابو!“ پتا نہیں کیسے وہ بول گئی۔ بہت سہا ہوا انداز تھا۔

سطوت حسین چونکے، وہ عام طور پر انہیں تایا ابو نہیں کہتی تھی۔

”کیا دیکھا خواب میں ہمارے بیٹے نے؟“ انہوں نے نرمی سے اس کی پلکوں پر ٹھہرے پانی کے بے رنگ قطرے صاف کیے۔

”میں نے دیکھا کہ.....“ اس نے پلکیں اٹھائیں اور پھر ساکت و صامت رہ گئی، جسے خواب میں دیکھا تھا وہ سامنے بیٹھا تھا۔ ٹانگ پر ٹانگ رکھے، دونوں بازو سینے پر باندھے، وہ یک ٹک اسے دیکھے جا رہا تھا، بڑی گہری نگاہوں سے۔

☆☆☆ سب لوگ اپنے اپنے کمروں میں جا چکے تھے، وہ بھی اپنی بھوک مٹا کر چائے کا بڑا سا گلاسے لے کر نکلی تو ٹھٹھک سی گئی۔

کوریدور کے دوسرے سرے پر وہ کھڑا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ آگے بڑھ آیا، طاق میں جلتی مومی شمعیں ہولے سے لرزیں اور ماورا کا دل غیر معمولی رفتار سے دھڑکنے لگا۔

جو خواب دیکھا، وہ سچ ہونے والا ہے کیا؟ وہ کیا کہے گا؟ اور پھر..... کیا ہوگا؟

”ایلیکسیوزی.....“ اس نے پکارا۔ ”نہیں، مجھے کچھ نہیں سننا۔“ وہ فوراً پلٹی۔ چائے چھلکی، ہاتھ پر گری لیکن اسے احساس تک نہ ہوا۔ بہت تیزی سے سیڑھیاں چڑھی لیکن ایک دم رک جانا پڑا۔ وریشہ عین سامنے کھڑی تھی، انتہائی

عجیب نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے۔

”کیا ہوا؟“

”کچھ نہیں..... وہ.....“ ماورا نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ بجلی سیڑھی کے قریب کھڑا کمرہ رہا تھا۔ ”ایکسیکوزی! مجھے کس کمرے میں جانا ہے؟ کوئی مجھے گائیڈ کرے گا؟“ لہجے میں ہلکی سی ناراضی تھی۔

”اوہ یس، وائے ناٹ۔“ دریشہ عجلت میں کہتی ہوئی سیڑھیاں اتری۔ ماورا کچھ کہے بغیر ست روی سے چلتی ہوئی اپنے کمرے میں آ گئی۔

مگ سائنڈ ٹیبل پر رکھ کر وہ ایزی چیئر پر گر سی گئی تھی۔ آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ دائیں ہاتھ کی انگلیاں سرخ ہو گئی تھیں، درد تھا کہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

☆☆☆

ہم ان کے لیے اہم
واہ دل تیرے وہم
یہ گھر کے پیچھے کا راستہ تھا۔ سرسبز قدرتی گھاس سے اٹا، وہ ایک بڑے پتھر پر بیٹھی تھی اور لمبی ڈنڈیوں والے مہین کا سنی رنگ پھولوں کو ہوا سے ادھر ادھر ڈولتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ جب کوئی مدھم لہجے میں بولا تھا۔

ایسا لہجہ جو سماعتوں میں دیر تک گونجتا اور سننے والوں کو اگلے کئی لمحوں تک مسحور رکھتا تھا۔

ماورا نے جیسے شکرانے کے طور پر ایک طویل سانس لیتے ہوئے صبح کے اولین لمحات کی اس فسوں خیزی کو اپنے اندر جذب کیا تھا۔

صبح اس راستے پر قدم دھرتے ایک خیال گزرا تھا کہ رات دیر سے سونے کے باعث وہ صبح سیر کے لیے نہیں نکلے گا پر ایک آس تھی کہ شاید نکل آئے اور اب..... ماورا نے گردن موڑ کر دیکھا۔

وہ اس سے کچھ فاصلے پر اس کے برابر بیٹھا تھا۔ ”رات ڈر گئی تھیں مجھ سے؟“ اس نے جیسے پوچھا نہیں، بتایا ہو۔ نظر دور کہیں بھٹک رہی تھی۔

”اللہ..... اتنی خوب صورت آنکھیں.....“

ماورا پلکیں جھپک نہ سکی۔

”ہاتھ بھی جلا لیا، کیسا انسان سمجھتی ہو مجھے؟“ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ فوری طور پر نظر نہ ہٹا سکی، پھر شرمندگی سے سر جھکا لیا۔

”نہیں۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ ”کبھی کبھی مجھے لگتا ہے، میں تمہیں اندر تک پڑھ سکتا ہوں بلکہ کبھی کبھی تو مجھے یہ بھی لگتا ہے کہ تم میرے اندر رہتی ہو۔“

ماورا نے از حد تحیر سے اسے دیکھا۔ ”میں تم میں اپنے آپ کو دیکھتا ہوں، بہت مماثلت ہے ہم میں۔ جانتی ہو؟“ اس نے ایک ہلکا سا پتھر اٹھا کر نشیب میں لڑھکایا اور دیر تک اسے دیکھتا رہا۔

”میں نے اپنی زندگی کے بیس سال اپنے ماں باپ کے بغیر گزارے۔ ان کے ساتھ جو گزرا، جو بچپن تھا۔ لڑکپن، جوانی..... پتھر کی طرح لڑھکتے اور اس معاشرے میں اپنی جگہ بناتے گزری۔ کئی سال میری نیندوں پر خوف کا پہرہ رہا، مسکراہٹ کے معنی کھو گئے، لاڈ، پیار، چونچلے، ضد..... یہ لفظ میری ڈکشنری سے جیسے حذف ہو گئے تھے۔ کون تھا میرا؟ جس سے یہ سب کہتا، کرتا..... جو تھے ان سے تعلق دنیا داری کا تھا، دل کا نہیں اور جن سے دل کا تعلق نہ ہو، میں ان پر اپنا آپ عیاں نہیں کرتا۔ بالکل تمہاری طرح۔“

بات کے اختتام پر وہ ہولے سے مسکرایا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہہ پانی..... فارس کا موبائل بجنے لگا تھا۔

لیکن نیل ایک تواتر سے بجتی رہی، دوبارہ..... سہ بارہ..... فارس نے جیسے بادل ناخواستہ فون اٹینڈ کیا..... دوسری طرف کی بات سن کر وہ ہنسا۔

”مارنگ واک ضروری ہے..... میم..... اوکے آئم کمنگ۔“ ”چلیے جناب..... دریشہ ناشتے پر ویٹ کر رہی

ہے۔“

ماورا کے لیے خاصی حیران کن خبر تھی علی الصباح دریشہ کا جاگنا..... اور پھر ناشتہ..... خیر..... ناقابل یقین واقعات..... بھی اسی دنیا میں ظہور پذیر ہوتے ہیں۔

وہ بغیر کچھ کہے اٹھ گئی تھی۔

☆☆☆

ناشتے کی میز بھر پور طریقے سے سجی ہوئی تھی۔ جس وقت وہ دونوں ہم قدم ڈائننگ ہال میں داخل ہوئے..... دریشہ چائے کے ساتھ لوازمات سیٹ کر رہی تھی۔

”آج اتنی جلدی اٹھ گئیں تم.....“ ماورا نے خوشگوار حیرت سے کہا تو دریشہ بری طرح چونکی..... پھر پلٹی.....

اس کے شاید گمان میں نہ تھا کہ ماورا بھی فارس کے ساتھ ہو سکتی ہے۔

”اور تم..... اتنی جلدی اٹھ گئیں کہ واک بھی کر آئیں“ جوابی حیرت کا اظہار.....

”ہوں..... باقی سب لوگ؟“

”ابھی کچھ دیر میں کریں گے ناشتہ“

ماورا نے ڈائننگ چیئر کھینچی..... فارس ہاتھ دھونے جا چکا تھا۔

ناشتے کی میز کا جائزہ لیتے ہوئے ماورا ذرا سا چونکی پھر دریشہ کو دیکھا.....

وہ اس کے مقابل بیٹھی اپنا موبائل چیک کر رہی تھی..... اس کے چہرے کے تاثرات..... سرد اور ناگواری کے ساتھ ساتھ ناراضی سے بھی بھرپور تھے..... ماورا نے خاموش نگاہوں سے دوبارہ جائزہ لیا.....

میز پر صرف دو افراد کے ناشتے کا اہتمام تھا۔ فارس کی واپسی ہوئی تو ماورا چپکے سے اٹھ کھڑی ہوئی.....

”میں فریش ہو کر آتی ہوں“

☆☆☆

انکل، آئی، رومادادی کے کمرے میں تھے۔ وہ الیاس کی طرف سے واپس آئی تو بوا کے بتانے پر سیدھی ادھر چلی آئی۔

دروازہ بند تھا..... اس کا دل بری طرح دھڑکا۔

”دروازہ بند کیوں ہے..... بوا؟“

”اللہ جانے کیا معاملہ ہے؟“ بوا نے کندھے اچکائے۔ وہ پریشان سی ہو کر کمرے میں آ بیٹھی۔

شام تک گھر کے ماحول میں تناؤ کی واضح کیفیت نظر آرہی تھی۔ دریشہ اپنے کمرے میں بند تھی۔ اس نے مہرین آئی کو اس کے کمرے کے اطراف میں چکراتے دیکھا مگر پوچھنے کی ہمت نہ کر سکی۔

اگلی صبح دادو نے اسے بلا بھیجا۔

”تمہاری خالہ کا فون آچکا ہے کئی بار..... تمہیں دیکھنے کو ترس رہی ہے۔ کالج سے چھٹیاں ہیں..... میں تو کہتی ہوں..... چند روز کے لیے ہواؤ.....“

لیکن دادو! میرا بالکل بھی دل نہیں چاہ رہا.....؟

”خون ہو تم اس کا..... پھر کہے گی ددھیال والے قبضہ جمائے بیٹھے ہیں۔ میں ڈرائیور سے کہتی ہوں..... کل صبح تمہیں لے کر نکل جائے گا..... تم اپنی پیکنگ کر لو، ہفتہ دس دن کے لیے۔“

دادو کا قطعی انداز..... ماورا ہکا بکا رہ گئی تھی۔

”دادو کو ایسی باتوں کی پروا کب سے ہونے لگی..... اور ہفتہ دس دن..... کیوں؟ اور خالہ کو میری یاد کیوں کر آنے لگی..... سال میں ایک آدھ بار ہی خون جوش مارتا ہے ان کا..... اور کل صبح..... اتنی جلدی..... پیکنگ اور وہاں..... وہ جواد..... اوہ نو..... آئی ہیٹ ہم.....“ وہ روہانسی ہو کر تکیے میں منہ دے کر لیٹ گئی تھی۔

اگلی صبح سب کچھ بھول بھال دل میں ڈھیروں ناراضی اور افسردگی لیے وہ خالہ کے پاس دوسرے شہر جانے کے لیے روانہ ہو گئی تھی۔

☆☆☆

خالہ کے گھر میں جیسے چاند اتر آیا تھا، وہ بھی عید کا.....

ان کا متوسط طبقے کا گھر تھا۔ افراد زیادہ..... آمدن کم، اخراجات بے بہا، ایسی مخلوق جس کی چادر بھی سر کو ڈھانپتی تھی تو کبھی پاؤں کو..... پوری نہ پڑتی تھی..... مہمان کے لیے کھانا بنتا..... تو گھر والے منتظر رہتے، بچ کر کیا آتا ہے؟ اس کے نو عمر خالہ زاد بہن بھائی اس سے شرماتے اور کبھی جیکے سے اسے دیکھنے آتے تھے..... اس کے لیے گھر کا نسبتاً صاف ستھرا اور کم سامان والا کمر منتخب کیا گیا تھا۔ جواد خالہ کا سب سے بڑا بیٹا تھا..... کم تعلیم یافتہ، جواد کی پوری کوشش ہوتی تھی کہ وہ اپنے اچھے ذیل ڈول، اور خوبصورتی سے ماورا کو پوری طرح متاثر کر لے۔ پہلے دو وقت کے پر تکلف کھانے کے بعد خالہ کی مہمان نوازی دم توڑ گئی تھی..... اور اس کے بعد تین وقت کے کھانے میں جو پکتا تھا، ماورا اسے کھانے کی عادی نہ تھی۔

سو تین چار دنوں میں ہی اسے اپنا آپ لاغراور کمزور محسوس ہونے لگا تھا۔ اتنے شور، اور کمپرسی میں رہنے کی عادت اس کی ماں کو تھی، اسے نہیں۔ جانے رومادادی نے اسے بھیجنے سے پہلے یہ بات کیوں نہ سوچی تھی۔ اور ابھی اسے یہاں رہنا تھا..... مزید..... کیونکہ ہفتہ، دس دن ہونے میں ابھی کافی دن باقی تھے۔

☆☆☆

رات بے حد گہری تھی..... پچھلی کئی راتوں کی طرح گرم، جھلستی ہوئی، جب چاند، سورج کی طرح تمازت بھری چاندنی، اس چوکور، ماچس کی ڈبی جتنے صحن میں پھینکتا تھا۔ اور ماورا گود میں ہاتھ دھرے اپنی چارپائی پہ بیٹھی، اپنے ارد گرد سوئی ہوئی مخلوق کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتی تھی۔ لمبے لمبے سانس، کھینچتے، خراٹے لیتے وجود، جن پر اسے بیک وقت رحم بھی آتا تھا اور غصہ بھی۔

”کس طرح سولیتے ہیں یہ اتنے گرم، جس زدہ ماحول میں..... ایک ایک چارپائی پہ دو، دو بچے..... پسینے سے شرابور وجود..... اور اگر میں بھی کسی ایسے ہی گھرانے میں رہتی..... ان ہی کی طرح تو.....؟“

”شاید میں عادی ہو چکی ہوتی..... ان ہی کی طرح.....“ وہ پہلے سوال تراشتی اور پھر ان کے جواب گھڑ لیتی.....

”اور اگر ایسے ہی کیسی گھر میں رہنا پڑ گیا..... ہمیشہ کے لیے..... تو.....؟“ یہ وہ سوال تھا، جو کسی ڈنک کی طرح لگتا تھا اسے.....

اسے خوف آتا تھا اپنی خالہ سے، جواد سے، ان کے محبت جتاتے رویوں..... اور کچھ کہتے سنتے ارادوں سے.....

”نہیں..... یہ نہیں ہوگا مجھ سے..... ایسے کیسے؟“

بجلی آجاتی..... پنکھا اپنی گھر گھر کے ساتھ چلنا شروع کرتا..... تو اسے یہ گرم ہوا بھی غنیمت لگتی اور بالآخر وہ سونے میں کامیاب ہو ہی جاتی.....

☆☆☆

رات کا نجانے کون سا پہر تھا۔ جس وقت اس کی آنکھ کھلی، پنکھے کی گھر گھر خاموش ہو چکی تھی۔ پنکھا خاموش نہیں تھا..... یہ پوری کائنات کا سکوت تھا۔ اس کی ٹیص پسینے سے بھیگ کر بدن کے ساتھ چپکی ہوئی تھی۔

زبان خشک، ترختی ہوئی..... اور سانسیں جیسے حلق کے آر پار ہورہی تھیں..... اسے ہوا چاہیے تھی۔ ٹھنڈی..... تازہ ہوا.....

وہ گھبرا کر چارپائی سے اتری تو..... کسی دوسرے کی چارپائی سے ٹکرائی.....

”آئے ہائے کیا ہو گیا.....؟ کون ہے.....؟“

ہائیں..... ماورا، یہ تم ہو.....؟“ خالہ پکاریں.....

”خالہ مجھے سانس نہیں آرہا“ وہ ترپتی.....

”جواد اٹھ..... دروازہ کھول دے..... ذرا باہر

کی تازہ ہوا لے لے..... ان کے ہاں تو جو بیس گھنٹے چلتے ہیں اسے سی..... کہاں برداشت ہوگی یہ گرمی..... ہمارا ہی حوصلہ ہے بھائی..... برسہا برس سے یوں ہی جیے جاتے ہیں.....“ خالہ نے کروٹ بدلی۔“

جواد اسے سہارا دے کر ڈیوڑھی سے باہر نکل آیا تھا۔

باہر گلی سنان اور تاریک تھی..... وہ سیمنٹ کے بنے ٹھڑے پر گر سی گئی۔ جواد اس کے برابر آ بیٹھا۔

”ٹھیک ہونا ادھر..... موسم قدرے بہتر ہے..... ہوا چل رہی ہے۔“ وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے پوچھ رہا تھا۔ بہت ہمدردی سے، میٹھا سا لہجہ۔

ماورا لمبے لمبے سانس کھینچتی بمشکل ہاں میں سر ہلا سکی تھی۔ نارمل ہونے کے لیے کچھ وقت درکار تھا۔

اور اسی وقت کی چند منخوس گھڑیوں میں اسے کچھ عجیب سا محسوس ہوا تھا۔ اس کے معطل ہوتے حواس یک لخت ہی چوکنے ہوئے تھے۔ اس نے گردن موڑ کر جواد کو دیکھنے کی کوشش کی جو اس قدر قریب بیٹھا تھا کہ وہ با آسانی اس کے سانس کی آواز سن سکتی تھی..... اور اس کا ہاتھ..... ماورا کے شانے سے ہوتا ہوا اس کی پشت کو سہلارہا تھا۔

وہ کپکپا کر چیخے ہٹی..... لیکن جواد نے اسے اپنے بازو کے حصار میں لے لیا تھا۔

”انہوں..... ادھر پاس بیٹھو ناں.....“

”چھوڑو مجھے.....“

”پاگل نہ بنو..... کوئی اٹھ جائے گا.....“

اور وہ پاگل بن گئی تھی..... پھر کوئی نہیں..... ایک ساتھ کئی اٹھ کر بھاگے چلے آئے تھے..... جب اس نے اپنے ناخنوں سے جواد کے غلیظ بدن کو ادھیڑ کر رکھ دیا تھا۔

وہ ہوش میں نہیں تھی، وہ جنونی تھی..... آپے سے باہر..... سنبھالے نہ سنبھلتی تھی۔ نجانے کس طرح

ہاتھ پاؤں جوڑ کر خالہ اسے سمجھا بجا کر گھر کے اندر لے کر گئی تھیں..... جواد بقیہ رات گھر میں نظر نہیں آیا تھا اسے.....

”آدھی رات کو ہول تو تمہیں اٹھ رہے تھے..... اسے لے کر گھر سے باہر ہی نکل گئیں..... پھر اتنا شور اور دواویلا کس لیے؟“ خالہ پھری ہوئی تھیں۔

”میں اپنی گھٹن دور کرنے کے لیے باہر گئی تھی..... آپ کے بیٹے کے لطف کا سامان بننے نہیں گئی تھی..... اور اپنے بیٹے کی غلاطت میرے سر تھوپنے کی کوشش مت کریں آپ..... ورنہ میں کسی کا لحاظ نہیں کروں گی.....“

وہ شروع دن سے کوا بیکیشن میں پڑھی تھی..... اسے خوب آتا تھا، کہاں، کس جگہ کس کا منہ توڑنا ہے۔ خالہ نے اسے دھاڑتے سنا تو منظر سے ہٹ گئیں۔ بقیہ رات آنکھوں میں کٹ گئی تھی۔

صبح کا اجالا پھیلا..... تو وہ اپنا بیک پیک کر چکی تھی۔

کمر اچھوڑنے سے قبل اس نے آخری بار دیوار پر لٹکی اس تصویر کو دیکھا جو برس برس سے وہیں لٹکی تھی۔ اور اب اس قدر دھندلا گئی تھی کہ تصویر کے نقش ماند پڑنے لگے تھے۔

”مجھے آج کے بعد دوبارہ اس گھر میں کبھی نہیں آنا..... زندگی بھر نہیں.....“ اس نے مصمم ارادے کے ساتھ وہ تصویر اتار کر اپنے بیک میں ڈال لی تھی۔

☆☆☆

جس وقت وہ گھر میں داخل ہوئی..... بوا کے سوا کوئی بھی اس کے استقبال کے لیے موجود نہ تھا۔ اور نہ ہی اسے کوئی ایسی خواہش یا امید تھی۔

”آئے ہائے..... کیا حال ہو گیا میری بچی کا؟“ چند دنوں میں ہی مر جھا کر رہ گئی..... خالہ کھانے کو کچھ نہیں دیتی تھی کیا؟“

”میں نے آپ کو بہت مرس کیا بوا.....؟ اور آپ کے ہاتھ کے پکے ہوئے کھانوں کو اس سے بھی زیادہ..... اس وقت میں سخت بھوکی ہوں..... جلدی

سے کھانا میرے کمرے میں آئیں.....“ اسے آج سے پہلے بوا پر اتنا پیار بھی نہیں آیا تھا۔ نہادھوکر، کھاپی گروہ سکون کی نیند سوئی تو پھر سرشام ہی جاگی تھی۔

☆☆☆

”دریشہ.....! یہ تم ہو.....؟“ کوئی حیرانی سی حیرانی تھی۔

اس کی بے یقینی کے جواب میں دریشہ ہنس دی تھی۔

لیکن وہ واقعی دریشہ نہیں تھی، آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے..... سفید رنگت، اجڑا بکھرا حلیہ..... وہ دریشہ ہو ہی نہیں سکتی تھی.....

ماورا اس کے کمرے میں تھی..... اس کا ہاتھ تھامے بیٹھی تھی..... اس کی بے دم ہوتی آنکھوں میں وہ چمک کھوج رہی تھی جو دریشہ کے ہونے کا پتا دیتی تھی۔

”تم کیوں نہیں بتا رہیں..... کیا ہو گیا تمہیں؟ میں اتنے دن گھر سے دور تو نہیں رہی.....“

”بیمار ہو گئی تھی یہ..... بی پی بے حد لو ہو گیا تھا..... ہمیں تو اس کی جان کے لالے پڑ گئے تھے۔ چار دن مسلسل ہاسپٹل میں رہی..... اب کہیں جا کر طبیعت سنبھلی ہے اس کی.....“ یہ تائی امی تھیں جو اسے وضاحت دے رہی تھیں.....

”یہ اتنی بیمار رہی اور آپ نے مجھے بتایا تک نہیں.....؟“ وہ جانے کیوں بے یقینی سی تھی۔

”تمہیں کیا پریشان کرتے..... اور ہم لوگ خود اتنے پریشان تھے کہ یہ خیال ہی نہیں آیا..... میرا خیال ہے، اب دریشہ کوریسٹ کرنا چاہیے۔“

ماورا نے دریشہ کو دیکھا..... وہ گھونٹ گھونٹ جوس پیتی کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی..... گویا ماورا کے ٹھہرنے یا جانے کی اسے کوئی پروا نہیں تھی..... وہ بے دلی سے اٹھ کر باہر آ گئی تھی۔

☆☆☆

کچھ ہوا تھا..... کچھ بہت ہی انہونا.....

انجانا..... اچھوتا..... کچھ ایسا جو سب کے چہروں پر لکھا تھا۔ مگر وہ پڑھ نہیں سکتی تھی۔ گھر کے ماحول میں پھیلا سنا بہت سی ان کہی سنارہا تھا..... مگر کیا؟ کیا.....! ٹکڑا ٹکڑا ایک ایک کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

رومادادی، سطوت انکل، تائی امی دریشہ، کوئی بھی اس سے آنکھیں نہیں ملا پارہا تھا۔

بوا سے کچھ پوچھو..... تو ان کے لبوں پر مہر لگ جاتی تھی..... ایسی مہر جو کسی بھی گھیرانے کے وفادار ملازم کے لبوں پر آپوں آپ لگ جاتی ہے جسے کسی راز کو چھپانا مقصود ہو۔

تھک ہار کر وہ بھی سمجھوتا کر بیٹھی..... یہ پہلی کھلی تھی..... لیکن کئی روز بعد بالکل مختلف انداز سے.....

☆☆☆

”تمہیں پتا ہے..... میری شادی ہو رہی ہے.....“

بہت عرصے بعد دریشہ اپنے پہلے سے رنگوں میں نظر آئی تھی..... اور اس پر یہ اطلاع..... وہ سب بھول بھال کر چلا آئی.....

”کیا؟ رینلی.....؟“

”اوہ لیس“

”کب.....؟“ ماورا اس کے قریب آ بیٹھی تھی۔

”کب نہیں، پوچھو، کس سے.....؟“

دریشہ کے انداز میں کچھ ایسا تھا جو اسے چوٹا کیا..... مگر وہ روانی میں پوچھ بیٹھی تھی۔

”کس سے.....؟“

”فارس ابن مراد سے.....“ دریشہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بتا رہی تھی..... بتا رہی تھی یا کچھ کھوج رہی تھی، اس کے چہرے پر، ماورا اپنے آپ میں ہوتی تو شاید جان لیتی۔

”خوشی.....؟“

”خوشی.....“ ماورا نے پر خیال نظروں سے اسے دیکھا۔ اسے یاد نہیں آ رہا تھا۔ خوشی کیا ہوتی ہے.....؟

”بہر حال..... تم تیاری کرلو، زیادہ دن نہیں ہیں تمہارے پاس.....“ دریشہ کہہ کر اٹھ گئی تھی۔ وہ کائنات جو کچھ لمحہ قبل تھم گئی تھی پھر سے متحرک ہوئی۔ لیکن وہ دل اس بل جہاں ٹھہرا تھا، وہیں ٹھہرا رہا..... دیر تک.....

☆☆☆

حساب عمر کا اتنا سا گوشوارہ ہے تمہیں نکال کے دیکھا تو سب خیارہ ہے رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ دونوں ہنٹوں کے گرد بازو لپیٹے وہ کھڑکی میں بیٹھی تھی، اس، گم صم، آنکھیں خالی..... جیسے سارے پیارے بچے کوئی نوج کر لے گیا ہو.....

”اور میں بھی کتنی نادان تھی..... سب کچھ صاف دکھائی دے رہا تھا، بالکل واضح، فارس اور دریشہ، دریشہ اور فارس..... اس کے باوجود جانے کیوں دل میں ایک گمان سا تھا جیسے فارس کی آنکھیں کچھ کہتی ہیں..... جیسے کوئی تڑپ، کوئی لپک جو دل کو پیچھے ہٹاتی ہو اپنی طرف..... لیکن اتنی مبہم کہ گمان بس گمان ہی رہا۔

تو دریشہ سطوت حسین.....! تم سا خوش قسمت کوئی شاید ہی زمانے میں ہوگا..... تم نے ہمیشہ جو چاہا، پالیا..... اور ماورا صبا! تمہیں بھی ہمیشہ کی طرح یہ ہاری ہوئی بازی چپ چاپ گلے سے لگانی ہوگی۔ جو انسان اپنے حق کے لیے آواز اٹھانے کا عادی نہ ہو اسے ”خسارہ“ برداشت کرنے کی عادت ہونی چاہیے..... اور یہ آخری خسارہ شاید میری ساری زندگی لے لے گا.....“

وہ مرے مرے قدم اٹھاتی بیڈ تک آئی.....

”تم ایک بار اظہار تو کرتیں شاید من کی مراد..... برآئی“ سینے کے ایک کونے میں پڑا بے چارہ دل آخری بار تڑپا تھا..... لیکن ماورا نے کان نہیں دیا۔

”تم تو اب ساری عمر تڑپو گے تمہاری کون.....“ وہ تکیے میں منہ دیے سونے کی کوشش کرنے لگی تھی۔

☆☆☆

تیاری کے لیے دن واقعی کم تھے۔ اتنے کم کہ خود کو جوڑتے، بناتے، تعمیر کرتے کرتے ہی وہ دن آپہنچا.....

دریشہ اور فارس ابن مراد کی شادی کا دن..... ہاں تو کیا ہوا؟ جوڑے تو آسمانوں پر بننے ہیں..... اس میں کسی کا کیا دوش..... وہ دونوں خوش نصیب ہیں..... اللہ انہیں ہمیشہ سکھی، سلامت رکھے۔

وہ خود سے ڈرتی تھی، اپنی آہوں سے بھی ڈرتی تھی۔ جو رات گئے تک اس کے تکیے پر کانٹوں کی صورت اگ آتی تھیں۔

”کبھی کبھی مجھے لگتا ہے۔ میں تمہیں اندر تک پڑھ سکتا ہوں..... بلکہ کبھی کبھی تو مجھے یہ بھی لگتا ہے کہ تم میرے اندر بستی ہو.....“

یہ لفظ رات رات بھر اس کے کمرے میں ہیولوں کی صورت چکراتے پھرتے تھے۔ اس کی گردن کا پھندا بن جاتے تھے کبھی پاؤں کی بیڑیاں بن کر اسے زخمیاتے تھے..... وہ ہر صبح اٹھ کر اپنے تکیے پر سجے کانٹوں کو جھاڑتی، گردن کا پھندا اتارتی اور پیروں کے زخموں کو سہلاتی، ہنستی مسکراتی ہر کام میں شرکت کرتی یہاں تک کہ شادی کا دن آیا اور پھر گزر گیا۔

وہ اس تقریب میں بھی اتنا ہی شریک ہوئی تھی، جتنا ہر تقریب میں۔ یہ ہی وجہ تھی کہ کسی مودی، کسی تصویر میں وہ کہیں دکھائی ہی نہ دی تھی۔ دریشہ البتہ بہت پیاری لگ رہی تھی اور بہت خوش بھی.....

”اور فارس.....؟“ اس نے سوچنے کی کوشش کی لیکن ذہن کے پردے پر کوئی شبیہ ابھری ہی نہ تھی.....

کیونکہ اس سارے عرصے میں ماورا صبا نے فارس ابن مراد کو دیکھا ہی کب تھا۔

☆☆☆

اور اس کا خیال تھا، آزمائش بس وہی تھی جو آئی اور گزر گئی لیکن وہ نہیں جانتی تھی..... کہ یہ فقط آغاز تھا..... آزمائش ختم نہیں ہوئی تھی، آزمائش شروع ہوئی تھی۔

”اور کون تھا، جو اسے آزمایا تھا؟“

دریشہ سطوت حسین..... وہ کس مان، گمان میں تھی..... کیا پتا سمجھانا، جتنا چاہتی تھی..... ماورا سمجھنے سے قاصر تھی.....

کسی دعوت پر جانے سے پہلے بے انتہا کی تیاری کے بعد وہ ماورا کو کیا دکھانے آئی تھی.....؟ کسی بھی شاپنگ کے بعد وہ دن رات کی پروا کیے بغیر ماورا کو فارس کے دیے گئے گفٹس دکھانے کیوں بھاگی آتی تھی..... بوا کو کہنے والے سب کاموں کا ذریعہ اور وسیلہ ماورا ہی کیوں بنتی ہے؟

”فارس کو فلاں فلاں ڈش پسند ہے، بوا سے کہہ کر بنوالینا.....“

”آج رات ہم ادھر ہی Stay (قیام) کریں گے، ماورا پلیز ذرا بیڈ روم سیٹ کروالینا بوا سے کہہ کر.....“

اور ان سب معاملات میں فارس کا چہرہ جذبات سے عاری کیوں ہوتا ہے؟ وہ دریشہ کی طرح بہت زیادہ خوش دکھائی کیوں نہیں دیتا..... اور دریشہ کے اس رویے پر گھر کے بقیہ افراد نظریں چرانے لگتے ہیں۔

ماورا کی سمجھ سے بالاتر باتیں وقوع پذیر ہونے لگیں تو وہ اپنے کمرے میں پناہ لینے لگی، وہاں سے نکلتی تو الیاس کی طرف جانتی..... یا پھر رات گئے تک لان کے کسی کونے میں دبی، جگنوؤں سے اپنے دل کی ساری باتیں کہتی..... جو جانے سنتے تھے یا نہیں۔ بس یہاں وہاں جلتے، بجھتے اڑے جاتے تھے.....

وہ بھی ایک بجھتی ہوئی شام تھی جب وہ باہر لان میں آگئی، بوا سارے گھر میں چکراتی ضروری باتیاں جلا رہی تھیں..... تب ہی کوئی مانوس سی مہک ہولے

سے اسے اپنے حصار میں لینے لگی۔ اس نے پلٹ کر قدر آور ہوئے کو دیکھا۔

”واک کریں.....؟“ اس نے پوچھا تھا۔

”ہوں..... ماورا انکار نہ کر سکی۔

بہت گہری خاموشی تھی اور دونوں کے درمیان..... ماورا کو لگتا تھا، ساری باتیں کھو چکی ہیں۔

کوئی سراپا تھ لگتا تو وہ کچھ کہتی.....

”ابھی بھی اسیکچر بنانی ہو.....؟“

بہت غیر متوقع سوال تھا۔

ماورا نے حیرت سے سراٹھا کر اسے دیکھا۔

”کیا مطلب.....؟“

کچھ ایسی مشکل بات تو نہیں کی میں نے ملو آؤ گی نہیں اس سے بھی.....؟

”آپ کیوں ملنا چاہتے ہیں اس سے.....؟“

”فارس..... فارس.....“ بیڈ روم کی کھلی کھڑکی سے دریشہ چلائی تھی۔

ماورا نے سراٹھا کر دیکھا۔ دریشہ کا چہرہ..... اسے ایک بل میں کوئی بھولا بھٹکا خواب یاد آیا..... ایسا وحشت زدہ چہرہ صرف خواب میں دیکھا تھا اس نے.....

”دریشہ بلا رہی ہے آپ کو.....“ فارس دو قدم آگے چلا تھا اس سے۔

برآمدے کی سیڑھیوں تک آتے آتے گھر میں ایک ہنگامہ سا جاگ اٹھا تھا۔

”آپ لوگ سمجھا نہیں سکتے اسے۔ فارس کو اس وقت میرے ساتھ بیڈ روم میں ہونا چاہیے تاکہ اس کے ساتھ لان میں..... کون سا رومالس جھاڑ رہی ہے وہ میرے شوہر کے ساتھ رات گئے.....“

فارس کے صرف قدم سست پڑے تھے۔

اور وہ خود..... دل ایک دم سکڑ کر پھیلا..... تو بس سیاہ گھور رات آنکھوں میں اتری جس نے کچھ دیکھنے ہی نہ دیا..... پاؤں جہاں رکھا، وہاں شاید زمین نہیں تھی۔ گرتی تو پھر گرتی ہی چلی گئی۔ سہارا دینے والا وہاں کوئی نہ تھا۔

☆☆☆

”یہ جان بوجھ کر ایسا کرتی ہے، فارس کی توجہ حاصل کرنے کی کوشش ہے ساری..... آپ نے دیکھا نہیں، اسے بے ہوش ہوتا دیکھ کر اس کی جان نکلتی جا رہی تھی.....“ بہت دور سے آواز آرہی تھی.....

”شش.....“ اسے کراہتے دیکھ کر کسی نے دریشہ کو خاموش رہنے کا اشارہ دیا تھا..... آنکھوں پر بوجھ تھا۔ سر میں درد کی میسٹس اٹھ رہی تھیں..... بہت کوشش کے باوجود وہ آنکھیں نہ کھول سکی..... بہت گہری نیند تھی..... جو سننے سمجھنے کا موقع دیے بغیر اس کے حواسوں پر چھانی چلی گئی تھی۔

”ماورا! ام شادی کیوں نہیں کر لیتیں.....“

سب لوگ اس کے کمرے میں جمع تھے۔ ماورا کے ہاتھ سے چائے پھلکتے پھلکتے پکی۔

”یہ تمہیں اتنی اچانک ماورا کی شادی کا خیال کیسے آگیا؟“ آنٹی نے حیرت سے پوچھا تھا۔

ماورا نے ہولے سے ماتھے کے زخم کو چھوا جو مندل ہونے کے قریب تھا۔

”تو اب کوئی نیاز خیم..... لیکن کیوں.....؟“ وہ منتظر نظروں سے دریشہ کو دیکھ گئی۔

”بھئی“ اتنے خواہش مند ہیں اس کے..... کسی ایک کے پیچھے باقیوں کو انتظار کی سولی پر کیوں لٹکا رکھا ہے؟“

”کیوں بھئی، کوئی آپشن ہے تو بتاؤ ماورا.....“

تایا ابو بڑی محبت سے پوچھ رہے تھے۔

”ہم جاتے جاتے اس کے فرض سے بھی سبک دوش ہو جاتے ہیں..... کیوں اماں؟“

”ارے اس سے کیا پوچھتے ہیں ڈیڈ..... مجھ سے پوچھیں..... ایک تو وہ..... جو اس کی خالہ کا بیٹا..... جان دیتا ہے اس پر..... پھر وہ الیاس..... سردی ہو یا گرمی، ماورا سر کے بل جانا پسند کرتی ہے اس کے پاس..... اور ہاں..... وہ بھی تو ہے.....

ماورا بتاؤ ناں.....“ دریشہ چپک رہی تھی۔

سب کی نظریں ماورا پر تھیں..... اور ماورا چاہتے

ہوئے بھی نگاہ نہ اٹھا پارہی تھی۔

”ایک کے تو ڈھیروں اسیکچر بنا رکھے ہیں اس نے..... بھئی، اسے بلو آؤ ناں کسی دن چائے پر..... ہم بھی مل لیتے ہیں..... ڈیڈ آپ دیکھیں گے تو حیران رہ جائیں گے..... اس قدر ڈشنگ پر سنبلیٹی ہے اس کی..... ماورا دکھاؤ ناں..... کہاں ہیں وہ اسیکچر..... ایک منٹ..... میں دکھاتی ہوں.....“ دریشہ اٹھ گئی تھی۔

ماورا نے ایک بھی گھونٹ پیے بغیر چائے کا کپ سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔ ہر چیز دھندلی دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے زور سے آنکھوں کو رگڑا..... دریشہ فائل ڈھونڈ چکی تھی، اسیکچر بہت سے تھے۔

دادو..... سطوت انکل، آنٹی..... اسیکچر ہاتھوں میں لیے دم بخود بیٹھے تھے.....

”فارقلیط.....!“ دادو نے جیسے بجلی بھری تھی۔

ماورا کی ٹھوڑی اس کے سینے سے جا لگی تھی.....

رومادادی ہولے ہولے لرز رہی تھیں۔ اس گھر میں، گھر کی دیواروں پر..... المناریوں کے نہاں خانوں میں کہیں بھی فارقلیط کی کوئی تصویر نہ تھی، وہ تصویر بنواتا ہی نہ تھا۔ اور اگر کبھی بنوائی، تو اسے سنبھال کر رکھنے والا کوئی نہ تھا۔ پھر..... ماورا نے کہاں دیکھا۔ اپنے باپ کو..... کیسے اس کے نقوش حفظ کئے..... اس کی انگلیوں نے یہ ہنر کہاں سے سیکھا کہ خیل کو مجسم بنا ڈالا..... کمر بے حد گہری خاموشی کی زد میں تھا.....

ماورا دونوں ہاتھوں میں منہ چھپائے ہچکیوں سے رو رہی تھی۔

رومادادی نے آنسوؤں سے لبریز آنکھیں بند کیں تو پھر بہت سا پانی بہہ نکلا تھا۔

”میرا بچہ..... میرا فارقلیط.....“ وہ اسیکچر دیکھ رہی تھیں، چوم رہی تھیں۔ دریشہ دم بخود کھڑی تھی۔

کمر اچھوڑ کر جانے والوں میں سب سے پہلا فرد فارس ابن مراد تھا۔

☆☆☆

”بواپتا نہیں کہاں چلی گئیں۔۔۔۔۔“ اس نے بے دلی سے اٹھتے ہوئے سوچا۔ دادو کے کمرے سے باہر آئی تو بوائون اٹھا چکی تھیں۔

دوسری جانب پتا نہیں کون تھا۔۔۔۔۔؟ اور کیا کہہ رہا تھا۔۔۔۔۔؟ ماورا نے بوا کے فق ہوتے چہرے کو دیکھا تو لپک کر ان کی طرف آئی۔۔۔۔۔

”ارے نہیں۔۔۔۔۔ ہائے۔۔۔۔۔ میں مر گئی۔۔۔۔۔“ حواس باختہ بوا جیسے گر جانے کو تھیں ”بوا۔۔۔۔۔ بوا کیا ہوا؟“

”ہم لٹ گئے۔۔۔۔۔ برباد ہو گئے۔۔۔۔۔ وریشہ ہمیں چھوڑ کر چلی گئی۔۔۔۔۔ بیگم صاحبہ! رومائیگم، دہائی ہے دہائی۔ ہماری دنیا چل بسی۔۔۔۔۔ ارے سنا کسی نے قیامت کی گھڑی آگئی۔۔۔۔۔ ہائے میری بچی۔۔۔۔۔“ بوا تورا کر گر گئیں۔ اور وہ اس قابل بھی نہیں تھی کہ چند بوندیں پانی کی ان کے حلق میں ٹپکا دیتی۔

☆☆☆

وہ انہونی ہوئی تھی کہ جس کے ہونے کا یقین دل کو کسی طور چین نہ لینے دیتا تھا۔ بوا بڑی فرصت میں بیٹھ کر آنے جانے والوں کے سامنے روتیں۔ وہ ضبط کرتے کرتے تھک جاتی تو پھر سے رونے بیٹھ جاتی۔۔۔۔۔ اگر مرنے والا ان آنسوؤں کے بدلے واپس آ سکتا تھا تو پیچھے رہ جانے والے اپنی آنکھوں سے قلمز بہا دیتے۔

روما دادی دوسرے دن ہی ایمر جنسی میں نکل کٹا کر فلائی کر گئی تھیں۔ وہ وریشہ کو دیکھے بغیر بھی رخصت نہ ہونے دیتیں۔۔۔۔۔ سطوت انکل نے بہت منع کیا۔ ان کی طبیعت خراب تھی۔

”یہاں رہی تو مرجاؤں گی سطوت! مجھے آنے دو۔۔۔۔۔ میں اپنی بیٹی کو آخری بار جی بھر کے دیکھ تو لوں گی۔۔۔۔۔“ وہ لاڈلی سی دادو کی۔۔۔۔۔ ان کا بس چلتا تو اپنی باقی کی سانسیں وریشہ کے نام لکھ دیتیں۔

خالہ کو پتا چلا تو دوڑی آئیں۔۔۔۔۔ جواد بھی ان کے ساتھ تھا۔۔۔۔۔

دو دن رہیں۔۔۔۔۔ پچھلی ہر بات کو بھلائے اس

تم میری جان ہو وریشہ! تم نے میرے ساتھ ہی برا نہیں کیا۔“ اس کی اپنی آنکھوں سے آنسو بہہ پڑے تھے۔

”میں پچھلے کئی دنوں سے تمہیں یاد کر رہی تھی، تمہاری باتوں، تمہاری عادتوں کو۔۔۔۔۔ بچپن سے لے کر سال بھر پہلے تک۔۔۔۔۔ ہم اکٹھے رہے۔ ہم نے موسم کو۔۔۔۔۔ ہر اچھی، بری گھڑی کو مل کر، بانٹ کر گزارا۔۔۔۔۔ مجھے پتا تھا، تم میری بعض عادات کو سخت پسند کرتی تھیں، لیکن مجھے کچھ نہیں کہتی تھیں۔ اور میں یاد ہے، ایک بار۔“

وہ بہت پرانی باتیں دہرا رہی تھی۔۔۔۔۔ جسے بڑی خوشی سے سننے کے باوجود ماورا کو کسی غیر معمولی پن کا احساس ہوتا رہا۔۔۔۔۔

وریشہ بولتی رہی تھی۔۔۔۔۔ بے تکان۔۔۔۔۔ لیکن وہ نانا بولنے کے بعد خوش تھی، مطمئن اور پرسکون۔۔۔۔۔ حال کے خاتمے تک وہ بالکل نارمل انداز میں باتیں کرنے لگی تھی۔ شاید کسی اداسی کا اثر تھا۔

”اسے یہاں سے گئے ہوئے بہت دن ہو گئے ہیں، دادو سے کہوں گی اسے کچھ دن کے لیے اپنے ساتھ بلا لیں۔ اسے عادت نہیں ہے ہمارے بغیر رہنے کی۔۔۔۔۔“

فون بند کرنے کے بعد اس نے بڑی وضاحت سے سوچا تھا۔

☆☆☆

صبح اس کی آنکھ خاصی دیر سے کھلی تھی۔۔۔۔۔ اچھو کر چائے ہسٹ کا پلاک سا ناشتہ کرنے کے بعد وہ کمرے میں آگئی تھی۔

”دادو۔۔۔۔۔! وریشہ سے بات ہوئی آپ کی؟“ وہ کا احوال پوچھنے کے بعد اس نے سرسری سا پوچھا۔

”نہیں۔۔۔۔۔ آج کل میں تو کوئی بات نہیں کی۔ اس کی ڈیوری ڈیٹ قریب ہے۔ میرا خیال یہ۔ سطوت کی طرف آجائے گی وہ۔۔۔۔۔“ لاؤنج میں فون مسلسل بج رہا تھا۔

دوسری طرف گہرا سکوت تھا، اتنا گہرا کہ وہ پریشان ہو گئی۔

کئی بار پکارنے کے بعد دوسری طرف سے جو آواز سنائی دی، اس کی نیند اڑا دینے کے لیے کافی تھی۔

”وریشہ۔۔۔۔۔ یہ تم ہو؟“ اس نے تصدیق کرنا چاہی۔

جواب وریشہ ہنسی تھی۔۔۔۔۔ ہنسی جس میں آنسوؤں کی آمیزش تھی۔

”کیا ہوا وریشہ۔۔۔۔۔! تم رورہی ہو۔۔۔۔۔؟“ ”نہیں۔۔۔۔۔ بس مجھے گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ میرا دل چاہا کہ۔۔۔۔۔ میں تم سے بات کروں۔۔۔۔۔“

”ہاں ہاں، کیوں نہیں۔۔۔۔۔ ہم بات کر لیتے ہیں۔۔۔۔۔“ ماورا نے نیم تاریکی میں وقت کا اندازہ لگایا۔ وہاں غالباً رات کا آغاز تھا۔

”گھبراہٹ کیوں ہو رہی ہے؟ طبیعت ٹھیک ہے ناں۔۔۔۔۔؟“

”ہوں۔۔۔۔۔“ مختصر جواب۔

”فارس کہاں ہے۔۔۔۔۔؟ تم اکیلی ہو اس وقت؟“ ماورا کو بے چینی سی ہونے لگی تھی۔

”فارس سو رہے ہیں۔۔۔۔۔ میں ٹیرس پر آئی تھی تم سے بات کرنے۔۔۔۔۔ سارا شہر میرے سامنے ہے اس وقت۔۔۔۔۔ بہت روشنیاں ہیں میرے ارد گرد۔۔۔۔۔ لیکن میرے دل میں بہت اندھیرا ہے ماورا۔۔۔۔۔“

ماورا نے پہلو بدلا۔۔۔۔۔ لیکن خاموش رہی۔۔۔۔۔ وہ اسے بات کرنے کا موقع دے رہی تھی۔

”ماورا۔۔۔۔۔! تم۔۔۔۔۔ تم مجھے معاف کر دینا پلیز۔۔۔۔۔“ وہ پھر سے رورہی تھی۔

”ایسا کیوں کہہ رہی ہو وریشہ۔۔۔۔۔ تم نے کیا کیا ہے؟“

”میں نے تمہارے ساتھ اچھا نہیں کیا۔۔۔۔۔ پلیز! مجھے دل سے معاف کر دینا۔“ وہ اب بلند آواز میں کھل کے رورہی تھی۔

”مت کہو ایسے وریشہ! تم مجھے پریشان کر رہی

”بس وہ آخری رات تھی، جب سب لوگ مل کر بیٹھے۔۔۔۔۔ پھر بکھرے تو بکھرتے ہی چلے گئے۔ انکل، انٹی کے جانے کے چند روز بعد ہی سنا کہ وریشہ اور فارس بھی پر واز کر گئے۔۔۔۔۔“

روما دادی اداس ہو کر اپنے کمرے کی ہو کر رہ گئیں۔۔۔۔۔ بوا کو فراغت نے ست کر ڈالا۔۔۔۔۔

اور خود وہ سارا سارا دن گھر کی لمبی لمبی راہداریوں میں بے مقصد گھومتی، رات گئے تک نی وی میں پناہ لیتی۔۔۔۔۔ اور کچھ نہ ملتا تو الماریاں کھول کر پرانی چیزیں، پرانی تصویریں یا پرانی یادیں کھوجنے لگتی۔۔۔۔۔ الماری کھول کر اس دن کو یاد کرتی جب پہلی بار اس نے فارس کو دیکھا۔۔۔۔۔ یا پھر کاسنی پھولوں والے اس قطعے پر جا بیٹھتی اور سوچوں کے بے نام راستوں پر جا بیٹھتی۔۔۔۔۔ اور بھی آئینہ دیکھتی تو ماتھے پر لگے اس داغ کو اپنی انگلیوں سے بار بار چھوئی جواب بھی کبھی کبھی دیکھنے لگتا تھا۔

”پتا نہیں کون سے واسے، کون سے خدشے تھے جو وریشہ کو مجھ سے بد دل کر گئے۔

جانے کتنے دن اور مہینے گزر گئے، ایک روز کتابوں کی الماری سیٹ کرتے ہوئے دادو نے بتایا۔

”پتا ہے۔ وریشہ ماں بننے والی ہے۔۔۔۔۔“

”ریکی دادو۔۔۔۔۔! یہ تو بہت خوشی کی بات ہے۔ میں آج ہی بات کرتی ہوں اس سے مبارک باد بھی دوں گی۔۔۔۔۔“ اسے حقیقتاً خوشی ہوئی تھی۔

پھر اس رات نہیں، اس کے بعد آنے والے کئی شب دروز میں اس نے وریشہ سے بات کرنا چاہی مگر وریشہ نے کال اینڈ نہیں کی۔ کبھی مسیج ملا کہ مصروف ہے، بات نہیں کر سکتی۔۔۔۔۔ تھک، ہار کر اس نے رابطے کی کوشش ترک کر دی۔

رات کی کوئی گھڑی تھی۔۔۔۔۔ جب اس کی آنکھ کھلی۔

موبائل دھیمے سروں میں بج رہا تھا۔ اور شاید بہت دیر سے بج رہا تھا۔۔۔۔۔ اس نے ممبر پڑھے بغیر غلت میں کال ریسیو کی۔۔۔۔۔

کے ساتھ لگی تسلی۔ دلا سادتی رہیں۔ جاتے جاتے بوا کے کانوں میں پھونک گئیں۔

”روما خالہ سے کہنا۔۔۔۔۔ ماورا کے لیے ادھر ادھر رشتے نہ ڈھونڈتی پھریں۔ میرے جواد سے جوڑ بنتا ہے اس کا۔۔۔۔۔ ہمارا خون ہے تو سب سے پہلا حق بھی اس پر ہمارا ہی ہے۔“

بوا ضبط کر کے سنتی رہیں، ان کے جانے کے بعد انہوں نے اپنا سر پیٹ لیا۔

”ارے ہماری بیٹا کے پڑ سے پہ آئیں اور رشتہ ڈال کر چلتی بنیں۔۔۔۔۔ کہاں گئے احساس، لحاظ، مروت۔۔۔۔۔ ذرا شرم نہ آئی۔۔۔۔۔ ارے ہم تو غم کے مارے اپنے دکھوں کو دروے ہیں اور انہیں جوڑ جوگ یاد آ رہے ہیں۔ یا الہی ایسا پتھر دل بھی نہ ہو کسی کا۔“

ماورا نے گھٹنوں میں سر دیا اور چپ چاپ ان کی سب باتیں سنتی رہی۔

☆☆☆

برسات کا موسم شروع ہو گیا تھا۔ پہاڑی علاقوں کی بارش تھی۔ آنا فانا سیاہ گھور بادل پہاڑوں کی چوٹیوں پر اترتے اور لمحوں میں ہر طرف جل جھل ہو جاتی۔ کبھی رات گئے اچانک زور کا شور ابھرتا، وہ کھڑکی۔ کھولتی اور تا دیر برستی بارش کو آسمان سے زمین پر اترتا دیکھتی۔

”کبھی یہ نظارہ ہم دونوں دیکھا کرتے تھے۔۔۔۔۔ میں اور وریشہ۔۔۔۔۔“

وریشہ کی یاد آتی اور دل جیسے ہر چیز سے اچاٹ ہو جاتا۔۔۔۔۔

روم دادی واپس آرہی تھیں۔

”موسم ٹھیک نہیں ہے۔۔۔۔۔ تم نہیں آؤ گی۔ صرف ڈرائیو کو بھیج دو۔۔۔۔۔“ دادو کی سخت ہدایات کے سامنے اس کی کہاں چل سکتی تھی۔

جس وقت دادو نے قدم رکھا۔۔۔۔۔ سیاہ گھور بادلوں نے دن میں رات کا سماں کر رکھا تھا۔ دادو کو آرام سے بٹھا کر وہ سیدھی ہوئی تو ہٹھک گئی۔

دروازے کے پتوں بچ ایستادہ اس سائے کو

دیکھ کر دل بے اختیار ڈوب کر ابھرا تھا۔ دادو کے ساتھ کوئی اور بھی تھا۔

”دادو نے بتایا۔ کیوں نہیں۔۔۔۔۔؟“ اس۔ مضطرب ہو کر دادو کو دیکھا۔

”آ جاؤ فارس۔۔۔۔۔ لاؤ اسے مجھے دے دو۔۔۔۔۔“

دادو نے دونوں ہاتھ آگے بڑھائے۔ فارس داخل ہوا تو دونوں بازوؤں میں ایک ننھی جان کو بہت احتیاط سے سمیٹ رکھا تھا۔

”آؤ دیکھو۔۔۔۔۔ وریشہ کا بیٹا۔۔۔۔۔“ دادو۔ اسے پکارا تو وہ لڑکھڑاسی گئی۔ ننھا فرشتہ آنکھیں موندے بے سندھ سو رہا تھا۔

وہ دونوں مٹھیاں بچھنے۔۔۔۔۔ ہونٹ کاٹتی اسے دیکھتی رہی۔۔۔۔۔ آنکھوں سے بے آواز آنسو ایک لکیر صورت بہتے رہے۔

”یہ اچھا نہیں ہوا دادو۔۔۔۔۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔۔۔۔۔ یہ کیسے جیے گا۔۔۔۔۔ بہت چھوٹا ہے یہ۔۔۔۔۔“

”اللہ کوئی نہ کوئی سبب بنا دے گا۔ تم جاؤ فارس کے لیے روم سیٹ کرواؤ۔ بہت اپ سیٹ رہا۔ یہ۔۔۔۔۔ چھوٹی آزمائش نہیں ہے اس کے لیے۔۔۔۔۔“

چاند کو آج رات میں اپنے پاس سلاؤں کی۔ ایک بھر پور نیند فارس کے لیے بے حد ضروری ہے۔

حالات کسی حد تک معمول پر آتے جا رہے تھے۔ چاند کے لیے کل وقتی آیا کا بندوبست کر لیا تھا۔ دادی اسے اپنے کمرے میں رکھتی تھیں۔

فارس آتا تو اپنے بیڈ روم میں لے جاتا۔۔۔۔۔ ماورا جب دل چاہتا اس سے کھلنے لگتی۔۔۔۔۔ اس دورا سطوت انکل اور مہرین آنٹی کی آمد نے جیسے ٹھہر پانی میں پلچل سی مجادی تھی۔

ماورا چاند کو گود میں لیے بیٹھی تھی۔ مہرین آنٹی وریشہ کی باتیں کر رہی تھیں۔

”چاند کے لیے اس نے کوئی خاص شاپنگ نہیں کی تھی اماں۔۔۔۔۔ اس کا بی بیویر بہت عجیب تھا۔۔۔۔۔ پہلے بچے کی بارماں بہت کانٹس ہوتی ہے۔ نئے بچے کے لیے شاپنگ کرنی ہے۔ روم سیٹ کر

لیکن اسے تو آخری پل تک فارس کے سوا کچھ لکھائی ہی نہ دیتا تھا۔۔۔۔۔“

ماورا نے کن آنکھوں سے فارس کو دیکھا۔۔۔۔۔ شیو بڑھی ہوئی تھی۔۔۔۔۔ بال بے ترتیب۔۔۔۔۔ وہ خود پر توجہ نہیں دے رہا تھا، ماورا کو معلوم تھا۔

”فارس کے کپڑے، فارس کا کھانا، فارس کے لیے چائے، کافی۔۔۔۔۔ آفس میں ہوتا تو دس بار فون لرتی تھی اس کو۔۔۔۔۔“

”چاند کو دیکھا تھا وریشہ نے۔۔۔۔۔؟“ بس یونہی اردو کو خیال آیا تو پوچھ بیٹھی۔

”ہاں۔ دیکھا تھا، اسے پیار بھی کیا تھا۔۔۔۔۔ پھر اتنی اچانک طبیعت بگڑی کہ۔۔۔۔۔ مجھے بلایا تھا ڈاکٹرز نے۔۔۔۔۔ مجھ سے بات کرنا چاہتی تھی وہ۔۔۔۔۔ بس اپنی وصیت بتائی اور پھر میرے ہاتھوں سے اس کا ہاتھ پھوٹ گیا۔۔۔۔۔ جانتی ہو۔۔۔۔۔ اپنی آخری سانسوں میں کیا کہا اس نے۔۔۔۔۔؟“

ماورا نے سر اٹھا کر دیکھا۔۔۔۔۔

مہرین آنٹی بڑی گہری نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔۔۔۔۔

”اس نے کہا تھا۔۔۔۔۔ میرا بیٹا ماورا کو دے دیں۔۔۔۔۔ فارس اور ماورا اسے مل کر پالیں گے۔۔۔۔۔“

ماورا سن سی رہ گئی تھی۔۔۔۔۔ فارس ایک دم اٹھا اور کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔۔۔۔۔

☆☆☆

”میں وریشہ کی جگہ نہیں لے سکتی۔۔۔۔۔ آتم سواری آنٹی۔۔۔۔۔“ اس قطعی انداز میں کہا گیا تھا کہ مہرین آنٹی چپ کی چپ بیٹھی رہ گئی تھیں۔

دادو نے اسے اٹھ کر جاتے دیکھا۔۔۔۔۔

”مجھے لگتا ہے، وہ ساری رات نہیں سوئی۔۔۔۔۔“

اسٹریپ ہے۔۔۔۔۔ میں بات کر لوں گی اس سے۔۔۔۔۔“

دادو نے تسلی کرائی۔۔۔۔۔

سطوت انکل اور مہرین آنٹی چند روز کے لیے لوہاٹ گئے تو بوا اس کے سر ہو گئیں۔

”کون دے گا اس بچے کو پیار۔۔۔۔۔ کچھ اس کا

بھی خیال کرو۔۔۔۔۔ مان جاؤ۔۔۔۔۔ برائی کیا ہے اس میں؟“

”میں خیال کروں۔۔۔۔۔ اب بھی میں ہی خیال کروں بوا۔۔۔۔۔؟ اور میرا خیال کون کرے گا۔۔۔۔۔؟ میں جیتی جاگتی انسان نہیں ہوں کیا۔۔۔۔۔ میری اپنی کوئی مرضی، کوئی خواہش نہیں ہے کیا۔۔۔۔۔ ساری عمر، ساری زندگی وریشہ مجھ پر حاوی رہی۔۔۔۔۔ مجھے کیا پسند ہے؟ مجھے کیا چاہیے۔۔۔۔۔؟ مجھے کس وقت پڑھنا ہے؟ کس وقت شاپنگ کرنی ہے۔۔۔۔۔ یہ سب میں نہیں وریشہ طے کرتی تھی بوا۔۔۔۔۔ میں کٹھ پتلی تھی وریشہ کے ہاتھ میں۔۔۔۔۔ ایک کھلونا تھی۔۔۔۔۔ بڑی تھی وہ مجھ سے۔۔۔۔۔ اتنا حق جتنا تھی کہ میں اس کی فرماں بردار غلام ہو کر رہ گئی تھی۔۔۔۔۔ اس نے ہر ایرے غیرے کا نام میرے نام کے ساتھ جوڑنے کی کوشش کی۔۔۔۔۔ فارس کے ساتھ گزرے ہوئے چند لمحوں کو کچھڑ بنا کر اس نے میرے کردار پر تھوپ دیا اور اب جاتے جاتے بھی وہ ہی فیصلہ سنا گئی کہ مجھے کس سے شادی کرنی ہے اور کس کا بچہ پالنا ہے۔“

پتا نہیں اور کتنا زہرا کلتی وہ کہ فارس ایک دم سے اس کے سامنے آ گیا۔۔۔۔۔

”کچھ مت کہو۔۔۔۔۔ ماورا۔۔۔۔۔ پلیز چپ رہو۔۔۔۔۔ اگر ساری عمر نہیں بولیں تو اب بھی مت کہو۔۔۔۔۔ اب تو وہ چاچکی ہے۔۔۔۔۔ تکلیف ہوگی اسے۔“

ماورا نے لب بچھنے لیے۔۔۔۔۔ اس کی آواز اس قدر بلند ہو گئی تھی۔۔۔۔۔ اسے اندازہ نہیں تھا۔

”تمہاری مرضی کے بغیر کچھ نہیں ہوگا۔ وہی ہوگا۔ جو تم چاہو گی۔ پریشان مت ہو۔۔۔۔۔ لیکن تمہیں ایک بار، صرف ایک بار میری بات سننا ہوگی۔“

☆☆☆

لیکن اس سے پہلے کہ فارس کوئی بات کرتا، سطوت انکل نے کوہاٹ سے واپس آتے ہی ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا تھا۔ چاند کی آیا ان کے سامنے کھڑی تھیں۔

”یہ نیند کا سیرپ اس کے فیڈر میں ڈال کر اسے

دے رہی تھی..... نجانے کب سے یہ سلسلہ جاری ہے اور کب تک جاری رہنا تھا..... اگر آج میں نہ دیکھ لیتا تو..... آپ سب لوگوں کی ناک کے نیچے یہ عورت اتنا گھناؤنا کام کر رہی تھی..... جب میں یا آپ نہیں ہوں گے تب یہ کیا کرے گی ہمارے بچے کے ساتھ؟

آیا کا حساب کتاب بے باق کر کے سطوت انکل اسے بازو سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے دادو کے کمرے میں لے گئے تھے۔

”ادھر بیٹھو مادرا..... دو ٹوک بات کروں گا تم سے..... ہاں یا ناں میں جواب دو، ابھی اور اسی وقت.....“

مادرا تھر تھر کانپتی ان کے سرخ ہوتے چہرے کو دیکھتی لرزتی رہی.....

”میں آج شام تمہارا نکاح فارس سے کر رہا ہوں..... تمہیں منظور ہے یا نہیں؟“

رائے پوچھنے کا یہ کون سا طریقہ تھا.....؟ وہ ششدر سی بیٹھی تھی۔

”دریشہ کہتی تھی تم الیاس کو پسند کرتی ہو، وہ تھرڈ کلاس فیملی کا لڑکا..... دیہاڑی دار مزدور..... تمہیں پسند ہو بھی تو بھی میں تمہاری شادی اس سے ہرگز، ہرگز نہ کرتا..... فارس کو اور اس کے بچے کو اس وقت ضرورت ہے تمہاری..... میں دریشہ کے بچے کے لیے کسی اور پرٹرسٹ کر ہی نہیں کر سکتا..... یہ دیکھو۔ یہ میرے جڑے ہوئے ہاتھ..... مجھے سکون بخش دو..... تم چاند کو گود میں لوگی تو میں سمجھوں گا۔ چاند دریشہ کی گود میں ہے۔“

اور بس پھر باقی کیا رہ گیا تھا۔
مادرا صبا..... انکار کرتی تو کیسے..... اقرار کرتی تو کس طرح.....

”جیسا آپ کو منظور.....“
وہ اپنے قدموں پر چل کر نہیں، گھسٹ گھسٹ کر اپنے کمرے تک آئی تھی.....

کمرے کا دروازہ بند ہوتے ہی سارا ضبط، حوصلہ ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا..... وہ پھوٹ پھوٹ کر یوں روئی

جیسے سارے رشتوں نے آج ہی دم توڑا ہو۔

”کسی اور کا نہیں، سارا قصور آپ کا ہے..... اس نے سارے اسکیچز پھاڑ کر الماری کے ایک کونے میں ڈال دیے تھے۔“

”کس نے کہا تھا ایسی عورت سے شادی کرنے جس کی زندگی سے ڈاکٹر زبھی مایوس ہو چکے تھے۔ شادی کر لی تھی تو مجھے کیوں پیدا کیا.....؟ اپنے فیصلے کا بھگتا بھگتنے کے لیے خود کیوں نہیں زندہ رہے..... آپ کے حصے کی ساری سزائیں میرے کھاتے میں کیوں ڈال گئیں..... آپ کے ایک غلط فیصلے نے میری ساری زندگی کو امتحان بنا ڈالا..... اس گھر میں مجھے بھی دریشہ برابری نصیب نہیں ہوئی..... ہمیشہ کی بچی بچی چیزوں طرح آج بچا کھچا رشتہ بھی میری جھولی میں ڈال دیا ہے..... کیا آپ ہوتے تو یونہی ہوتا۔“

وہ روئی کر لاتی رہی.....
اور سب کچھ ویسے ہی ہوا جیسے ہونا قرار پایا تھا۔

☆☆☆
چار، چھ لوگوں کی موجودگی میں نکاح ہوا۔

اور وہ فارس کی گاڑی میں بیٹھ کر اس کے گھر تک آ گئی..... بوا چاند کو لیے گاڑی سے اتریں تو اس نے چاند کو ان کی گود سے لے لیا تھا.....

”آپ ڈرائیور کے ساتھ واپس چلی جائیں بوا..... چاند کے لیے ایک ہی آیا کافی ہے۔“

بوا ہکا بکا کھڑی اسے اندر جاتا دیکھتی رہیں چپ چاپ واپس ہو لیں..... اس نے اپنا اور چاند سامان الگ کمرے میں رکھوایا تھا۔

”تم ریسٹ کر لو..... میں چاند کو اپنے روم میں لے جاتا ہوں.....“ فارس نے چاند کو لینا چاہا لیکن اس نے منع کر دیا۔

”جس کام کے لیے مجھے اس گھر میں بھیجا ہے، وہ کرنے دیں،..... چاند میری ذمہ داری ہے..... مجھے بنا بنے دیں.....“

”ایسے مت کہو..... مادرا..... تم غلط اندازے سوچ رہی ہو.....“ فارس تڑپ کر رہ گیا تھا۔ وہ ج

پڑھ نہیں بولی تھی۔

☆☆☆

آج تیسری رات تھی کہ اس نے پلک جھپک کر نہ دیکھی تھی..... نیند نہ آنے پر رات کئی اذیت ناک ہوتی ہے اسے آج سے پہلے بھی اندازہ نہ ہوا تھا.....

آنکھوں میں چھن بھی یوں جیسے کسی نے مٹھیاں بھر بھر کر ریت آنکھوں میں انڈیل دی ہو..... سر درد سے پھٹا جا رہا تھا..... چاند کو کاٹ میں سکون سے سویتا دیکھ کر وہ تھک ہار کر فارس کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔

وہ لاؤنج میں تھا..... صوفے پر نیم دراز..... آنکھیں بند کیے جانے کن سوچوں میں گم..... لی وی بند آواز سے چل رہا تھا.....

”فارس.....! اس کے پکارنے پر وہ چونکا، پھر فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا.....

”خیریت؟ کیا ہوا.....؟“

”میں دور اتوں سے نہیں سوئی..... مجھے لگ رہا ہے میرا دماغ پھٹ جائے گا.....“ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھیں مسل رہی تھی۔

”اونہوں..... یوں مت کرو..... آنکھیں خراب ہو جائیں گی..... یہاں بیٹھو.....“ اسے صوفے پر بٹھا کر وہ پانچ منٹ میں واپس آ گیا تھا.....

چائے بسکٹ اور ایک بھی سی ٹیلیٹ.....
ڑے اس کے سامنے رکھی تھی.....

”یہ سکون آور گولی ہے..... تم اچھا محسوس کرو گی.....“ چپ چاپ اس کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے اس نے ایک آدھ بسکٹ کے ساتھ چائے پی اور گولی بھی نگل لی.....

”چاند ڈسٹرب کرے گا رات میں..... تم اس روم میں آ جاؤ.....“

”لیکن.....“ وہ مترد تھی۔

”حلیمہ دیکھ لے گی اسے..... میں بتا دیتا ہوں، وہ چاند کے پاس آ جائے گی.....“

سوئے سوئے حواس کے ساتھ وہ کمرے میں

داخل ہوئی..... یہ بیڈ روم فارس کا تھا اس کا اندازہ اسے چند لمحوں بعد ہوا تھا۔

وہ جانے کے ارادے سے پٹی تھی..... کہ فارس راہ میں حائل ہو گیا..... اپنے عقب میں دروازہ بند کرتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ چکا تھا۔

”ادھر آ کر لیٹ جاؤ، مادرا..... تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں..... تمہیں اس وقت سکون اور نیند چاہیے۔“

”میں..... دریشہ کی جگہ نہیں لے سکتی.....“ اس نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی..... لیکن گرفت مضبوط تھی۔

”تم دریشہ کی جگہ نہیں لے رہیں؟ دریشہ نے تمہاری جگہ لی تھی.....“

وہ لڑکھڑاسی گئی..... بہت زور کا چکر آیا تھا۔

”کیا مطلب ہوا اس بات کا..... کیا کہا ہے اس نے.....؟“ تیکے پر سر گراتے ہوئے اس نے اپنے دماغ کو اس خمار سے آزاد کرانا چاہا جو لمحہ بہ لمحہ پھیلتا جا رہا تھا۔

”دریشہ نے میری جگہ کیسے لی تھی.....؟ میں سمجھ نہیں پا رہی..... کس طرح.....؟“ وہ پوچھ رہی تھی۔ فارس کا بھاری ہاتھ اس کی پیشانی پر تھا۔

وہ منتظر رہی..... ابھی بولے گا۔ ابھی جواب دے گا۔ بند ہوتی پلکوں کے ساتھ اس نے دیکھا۔ وہ بیڈ کے قریب کرسی پر بیٹھا تھا۔

ابھی کچھ کہے گا..... کیسی گرہ ہے جو کھل نہیں رہی نجانے کس وقت اس کا ذہن مکمل تاریکی میں ڈوب گیا تھا۔ نیند میں بہت سے چہرے اپنے آس پاس دکھائی دیتے رہے۔ خوابوں کا عجیب بے ترتیب سلسلہ تھا جو دیر تک جاری رہا۔

ٹوٹے پھوٹے، ادھورے خواب..... اور ان سب کے باوجود ایک مانوس سی خوشبو تھی جو سارا وقت اس کے آس پاس مہکتی رہی۔ اسے پکھلتی رہی..... یہاں تک کہ وہ گہری نیند سو گئی.....

ایک ایسی پرسکون اور گہری نیند، جس کی وہ خواہش مند تھی۔

☆☆☆

صبح اس کی آنکھ بہت دیر سے کھلی تھی۔

حلیمہ کھڑکیوں کے پردے ہٹائے، جس لیے

اس کے سر ہانے کھڑی تھی..... گویا ابھی بھی وہ نہ اٹھاتی تو نجانے کب تک سوئی رہتی.....

”فارس صاحب کا فون آیا تھا۔ انہوں نے کہا، آپ کو جگانے کے لیے۔ کسی اور چیز کی ضرورت ہے تو بتادیں۔“

”نہیں تم جاؤ۔“ حلیمہ باہر نکل گئی تھی.....

وہ بہ نظر غائر بیدار موم کو دیکھنے لگی۔ کشادہ اور نفیس..... سائینڈ ٹیبل پر فارس کی تصویر تھی۔

”کتنے دن ہو گئے..... میں نے اسے دھیان سے دیکھا تک نہیں، حالانکہ اب وہ اتنے قریب ہے۔“ تصویر کو بغور دیکھتے ہوئے اس نے پاس رکھی ڈائری اٹھالی..... خاصی صغینم ڈائری تھی۔

اس نے سرسری سے انداز میں ڈائری کھول کر نظر دوڑائی..... اور پھر چونک سی گئی..... تحریر یقیناً فارس کی تھی۔

”اور اس خوبصورت موسم میں وہ لڑکی میرے دل کو چھو گئی.....“

اس کے چہرے پر اداس سی مسکراہٹ پھیل گئی..... اسے یاد تھا جب پہلی بار وہ وریشہ سے ٹکرایا تھا..... اس نے چند صفحات مزید پلٹے۔

”اسے دیکھنے، اسے سننے کے لیے وجاہت ہاؤس جانا میرے لیے ایک انوکھا لیکن دل پسند تجربہ ہے۔“

اس نے بے دلی سے صفحات پلٹ دیے۔

”وہ صبح کے اجالے میں سورج کی اولین کرنوں کی طرح تروتازہ اور شبنم کے قطروں کی طرح پاکیزہ لگ رہی تھی۔ اس سے حسین چہرہ میں نے اپنی زندگی میں شاید ہی کبھی۔“

”ہاں! یقیناً وریشہ کی خوبصورتی بے مثال تھی۔“

اس نے گہری سانس لیتے ہوئے ایک ساتھ کئی صفحات پلٹے.....

”محفل کتنی بے رنگ اور رات کس قدر اداس تھی..... میں اس کی ایک جھلک بھی نہ دیکھ پایا..... اور جب آخری پہر میں دیکھا تو دل پر قابو رکھنا مشکل ہو گیا۔ کاش میں اس کے سارے ڈر، خوف، واہے سمیٹ سکتا۔“

خدا جانے کس محفل کا ذکر تھا..... وریشہ تو ہر محفل میں موجود ہوتی تھی۔

اس نے اگلا صفحہ دیکھا اور چونک گئی۔

”میں تم میں اپنے آپ کو دیکھتا ہوں..... بہت مماثلت ہے ہم میں۔“

”میں اس سے کہہ رہا تھا۔ اور وہ بہت پرسکون نظروں سے واوی میں کھلے پھولوں کو دیکھ رہی تھی۔“

مادرا الجھ سی گئی..... یہ باتیں..... بھولنے والی نہیں تھیں.....

”یہ تو مجھ سے کہا تھا فارس نے..... لیکن میرا یہاں کیا تذکرہ.....؟“

اس نے پلکیں جھپک جھپک کر اگلی تحریر پڑھی۔

”میری سمجھ میں نہیں آتا۔ وریشہ کا مسئلہ کیا ہے؟“

اگلے کئی صفحات خالی تھے..... لیکن یوں جیسے ان پر بڑی بے دردی سے قلم گھسیٹا گیا ہو۔ صفحات پھٹنے کے قریب تھے۔

”وریشہ ہتی ہے، اس کی محبت کا محور کوئی اور ہے۔“

”میں نے اس سے براہ راست بات کرنے کا ارادہ کیا مگر وہ جا چکی تھی.....“

اور پھر صفحے کے پتھوں بیچ.....

”مادرا صبا! جسے میں نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کھو دیا۔ I Have lost my love“

مادرا دم بخود بیٹھی تھی..... یہ کیسی کہانی تھی.....

اس کے آغاز اور انجام میں اتنا تضاد کیوں.....؟ وہ پاگل ہونے کے قریب تھی.....

”تو کیا میں غلط تھی..... شروع سے لے کر آج تک..... وہ میری طرف آتا تھا اور میں نے اسے وریشہ کی طرف..... اوہ میرے خدا.....“

اس نے اپنی دونوں ہتھیلیوں سے اپنی آنکھیں رگڑیں..... اتنا پانی کہاں سے بہتا چلا آ رہا تھا۔

”میں مادرا کے لیے جان دیتا..... لیکن اس سے قبل وریشہ میرے لیے زندگی داؤ پر لگا چکی تھی..... وہ لمحہ بہت عجیب تھا جب میں اس کے دم توڑتے وجود کو اپنے بازوؤں میں لے کر ڈاکٹر کی طرف بھاگا..... وہ سیلنگ پلزم لے

ہٹی تھی..... ڈاکٹر آس وراس میں تھے..... شاید زندہ رہے یا شاید مر جائے..... زندگی جیسی قیمتی چیز سے یوں کھیلا جاسکتا ہے صرف اپنی محبت کو پانے کے لیے..... میں مجرم بنا کھڑا تھا، وریشہ سے جڑے رشتوں کو روتے کر لاتے دیکھ رہا تھا..... اور میری گردن کے گرد پھندا سخت ہوتا جا رہا تھا۔

الروہ نہ رہی تو میں خود کو معاف کر پاؤں گا.....؟

لیکن وہ زندہ رہی..... بہت جرأت مند تھی وہ۔

اپنی جان پر کھیل کر اس نے مجھے پالیا..... محبت کو معتبر کر دیا..... اور میں جو اظہار کی تمنا دل میں لیے پھرتا تھا..... اسے دل میں ہی دفن کر دیا.....

”تم مجھے ملویا نہ ملو فارس ابن مراد..... مادرا تمہاری نہیں ہو سکتی..... اس کی محبت کے اور بڑے دعوے دار ہیں..... تم اس فہرست میں کہیں بھی نہیں آتے۔“

اس رات اسپتال کے ٹھنڈے بخ کمرے میں دو لوگ زندگی ہار رہے تھے جن میں سے ایک کو زندگی بخش دی گئی تھی اور وہ وریشہ سطوت حسین تھی۔

اور اس سے آگے کے سب صفحات خالی تھے۔

خالی نہ ہوتے تب بھی شاید وہ پڑھ نہ پائی۔ وہ رو رہی تھی..... پھوٹ پھوٹ کر..... تو یہ وہ پہیلی..... جسے وہ بوجھ نہ سکی..... اس کی سوچ کا ہر زاویہ، ہر انداز غلط تھا۔

کون سا احساس محرومی تھا، کم مائیگی کا کون سا جذبہ تھا کہ اس نے اپنے آپ کو بھی اس قابل سمجھا ہی نہ تھا۔ بھی فارس کی آنکھوں میں دیکھا ہی نہیں..... اس کی باتوں کو، اس کے جذبے کو سمجھنے کی کوشش ہی نہ کی..... ہائے زندگی..... یہ تو نے کیا کیا میرے ساتھ.....

وہ روتے روتے تھک گئی..... یہاں تک کہ فارس نے آکر ڈائری اس کے ہاتھ سے لی۔ اور اس کو اپنے شانے سے لگا لیا۔

”میں بہت مخلص رہا وریشہ کے ساتھ..... اس سے جڑے تعلق کو میں نے پوری ایمان داری سے نبھایا..... یہ جانے بغیر کہ اس رشتے کی عمر کتنی ہوگی..... میں جانتا ہوں..... تم مجبوراً اس گھر میں آئی ہو..... کسی بھی خواہش اور چاہ کے بغیر..... لیکن شاید خود غرض ہو گیا تھا۔ ایک بار پھر سے زندگی کی نوید ملی تو میں انکار نہیں کر سکا، لیکن فیصلہ

آج بھی تمہارے ہاتھ میں ہے مادرا..... چاہو تو زندہ رکھو..... چاہے تو مار دو.....“

اور مادرا کو کہاں آتے تھے فیصلے کرنے..... ایسے لوگوں کے لیے فیصلے خود تقدیر کیا کرتی ہے۔ جو جلد یا بدیر درست ہی ثابت ہوتے ہیں۔

سو چپ چاپ اس کے کاندھے سے سر نکائے آنسو بہا رہی تھی کہ زندگی تو اسی شخص سے عبارت تھی۔ جو اس کی قسمت میں لکھا جا چکا تھا۔

☆☆☆

”تو وریشہ سطوت حسین..... اس رات فون پر مجھ سے معافی طلب کرنے کی وجوہات کچھ اور تھیں..... جنہیں میں آج سمجھ پائی ہوں..... تم نے جو چاہا، جیسے چاہا پالیا اور مجھے بھی مل گیا جو میری تقدیر میں تھا..... بس اتنا شکر کرنی ہوں کہ میرا دل صاف، شفاف ہے اور اس میں پشیمانی یا پچھتاوے کا ایسا کوئی احساس نہیں جو میری آئندہ آنے والی زندگی پر اثر انداز ہو۔ ہاں ایک گناہ میں اپنے کھاتے میں ہمیشہ کے لیے لکھ رہی ہوں..... صرف اور صرف تمہاری خاطر وریشہ فارس ابن مراد، کبھی یہ جان نہیں پائے گا کہ میری محبت کوئی اور نہیں وہ خود ہے۔ کیونکہ تم جانتی تھیں۔ میرے بنائے گئے اسیکچرز میں سے کئی اسیکچرز فارس ابن مراد کے تھے۔ جنہیں پھاڑ کر میری ڈائری میں دوبارہ کون سجادیتا تھا۔ یہ میں جانتی تھی..... لیکن میں نے تمہیں معاف کیا..... ہر زیادتی سے آزاد کیا..... اللہ کرے آئندہ کا ہر مرحلہ تمہارے لیے آسانیاں ہی آسانیاں لائے۔ تم باغ جنت کی بہاریں دیکھو..... اور خدا مجھے بھی توفیق دے کہ میں اس اعتبار اور بھروسے پر پورا اتر سکوں جو تم نے مرتے دم تک مجھ پر کیا.....“

”چلیں.....“ فارس کی آواز پر وہ چونکی۔

پھر مسکرا کر اس کے ساتھ ہوئی۔ ان کے ویسے کی سادہ مگر پُر وقار تقریب میں چاندان کے ساتھ ہر تصویر میں موجود تھا۔





شوخی و چنچل رشنا کے لیے جب مہناز پھو نے رشتہ مانگا تو نفیسہ بیگم لمحہ بھر کے لیے شش و پنج میں مبتلا ہو گئیں۔ خوب رو شخصیت کا مالک اظہار محمود برسر روزگار اور سب سے بڑھ کر حد درجہ فرماں بردار تھا۔ بظاہر رشتے میں کوئی قباحت نہیں تھی لیکن.....

”کیا ہوا بھابھی! کس سوچ میں پڑ گئیں؟ میں نے کوئی ایسی انہونی بات تو نہیں کر دی، میرا اظہار ماشاء اللہ لاکھوں میں ایک ہے۔ اور اپنی رشنا کے لیے تو میں نے شروع سے ہی سوچ رکھا تھا۔ ویسے بھی سیانے سچ کہہ گئے ہیں پھپھی بیٹی ایک ہی ذات، بھیجیوں یہ پہلا حق پھپھوں کا ہی ہوا کرتا ہے۔“

مہناز پھپھو دلائل دینے پر آئیں تو اچھے اچھوں کو قائل کر کے دم لیتیں۔ لیکن نفیسہ بیگم نے فی الفور کچھ بھی کہنے سے گریز کیا کیونکہ یہاں معاملہ ان کی عزیز از جان بیٹی کا تھا۔

”آپ درست کہہ رہی ہیں آپا! میں آپ کے بھائی سے بات کروں گی۔ پھر جو اللہ کو منظور۔“

انہوں نے نرمی سے بات سمیٹ دی۔ دوسرے لفظوں میں سوچنے کے لیے وقت مانگا۔ مہناز پھپھو کی پیشانی پر ناگواری سے بل پڑ گئے۔ پرسوج ہنکارا بھرتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا اور جاتے جاتے کہہ گئیں۔

”دودن بعد جواب لینے آؤں گی۔“

پھپھو کی آمد اور آمد کا مقصد جان کر رشنا مضطرب سی ہو گئی۔ میرب سب کو شام کی چائے سرو کر رہی تھی۔ وہ خاموشی سے اپنا کپ اٹھائی، پچھلے

کہوں ان سے؟“ خاموشی سے گفتگو سنتے شوہر کو انہوں نے سچ میں گھسیٹا تو وہ گہری سانس کھینچتے گویا ہوئے۔

”رشنا سے بات کریں اگر وہ اس رشتے پر دل سے راضی ہے تو ٹھیک ہے ورنہ اگر اسے ذرا سا بھی کوئی اعتراض ہے تو زور زبردستی ہرگز نہیں۔ نہ ہی آپس کی رشتہ داری کے دباؤ میں آنے کی ضرورت ہے۔ ہماری بیٹی باشعور ہے۔ اپنے لیے جو بھی فیصلہ کرے گی بہتر ہوگا۔“ وہ بات مکمل کر کے وہاں سے اٹھ گئے تھے۔ اور بچن کی جانب بڑھتے رشنا کے قدم تھمتھے تھے۔ آنکھوں میں بے ساختہ نمی پھیلی۔

”مجھے آپ کے مان پر بہت فخر ہے ابا!“ اگلے روز پھپھو کو ہاں کر دی گئی۔

☆☆☆

فائقہ کا اندازہ سو فیصد درست تھا۔ پھپھو اظہار کے کہنے بلکہ مجبور کرنے پر رشتہ مانگنے آئی تھیں۔ اونچے گھرانے کی بہو لانا ان کا خواب تھا۔ جس کی تعبیر وہ یہاں وہاں ڈھونڈتی پھر رہی تھیں لیکن انہیں اپنے اس خواب سے دستبردار ہونا پڑا۔ بیٹے کی فرماں برداری آڑے آگئی تھی۔

اظہار جتنا اچھا بیٹا تھا۔ اتنا ہی اچھا شوہر ثابت ہوا۔ مغرور نمین نقوش کی حامل رشنا میں اس کی جان تھی۔ پھپھو کو اپنے بیٹے کا بیوی کی طرف یوں ماتفت ہونا ایک آنکھ نہ بھایا۔ ایک ان کی نازوں پٹی بیٹی تھی جس کا تک چڑھا میاں اسے جوتے کی نوک پر رکھتا۔ ٹرک بھر کر جہیز دیا تھا۔ سمدھیوں کی خاطر مدارت میں کوئی کمی نہ چھوڑیں۔ داماد آتا تو منہ میں نوالے دینے کی بس کسر رہ جاتی۔ لیکن بیٹی تھی کہ اس کے چہرے پر کسی خوشی کی رشتی تک نہ جھلکتی۔

اور ایک یہاں ان کی بیٹی بلکہ بیٹی کی کم بہو زیادہ جو برائے نام جہیز لا کر ڈھیر ساری بے نیازی اور خود اعتمادی لیے ٹھاٹھ سے رہ رہی تھی۔ بے جواز مقابلہ بازی اکثر رشتوں کا حسن گہنا دیتی ہے۔

ان کے چہرے کے اتارو چڑھاؤ سے بے خبر



رشنا وہیں لاؤنج میں ان کے قریب صوفے پر بیٹھی چینل سرچنگ میں مصروف تھی۔

”السلام وعلیکم اماں!“ اظہار نے حسب معمول آتے ہی ماں کے سامنے قدرے جھکتے ہوئے ان کے ہاتھوں کا بوسہ لیا تھا۔

”علیکم السلام بیٹا! جیتے رہو سامان نہیں لائے؟“ وہ عموماً گھر آتے ہوئے شام کو پکانے کے لیے کھانے وغیرہ کا سامان لے آتا تھا۔ آج اسے خالی ہاتھ دیکھ کر انہوں نے استفسار کیا۔

”اماں شام کو کھانا باہر سے منگالیں گے۔ آج گرمی بہت ہے نا، کہاں آپ لوگوں سے چولہے کے سامنے کھڑا ہوا جائے گا۔“ رشنا کی طرف دیکھتے

ہوئے وہ مسکرایا۔

جواباً لب دباتی رشنا بھی مسکرا دی۔ پھپھو کے تاثرات بگڑ گئے۔ بیٹے کی فرماں برداری میں فرق نہیں آیا تھا۔ اس فرماں برداری کے دائرے میں اب کسی اور کے فرمان بھی جگہ بنانے لگے تھے۔

☆☆☆

آج فہمینہ آ رہی تھی۔ پھپھو نے اسے خوب دل لگا کر بریانی پکانے کا آرڈر دیا، یقیناً بریانی کی فرمائش اس نے اپنی آمد کی اطلاع کے ساتھ ہی کر دی تھی۔ ”چلو اچھا ہے فہمی آپا کی وجہ سے ہم بھی ہفتے میں ایک آدھ بار دعوت — اڑا لیتے ہیں۔“ اظہار سے چھوٹے اسرار کو کھانوں کی اشتہا انگیز مہک نے کچن میں جھانکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ پھپھو نے گھور کر اسے دیکھا۔

”ایسے گھوڑیں تو مت، کون سا غلط کہہ رہا ہوں۔ ویسے ہم فہمی آپا کو بلا کر تھک جاتے ہیں وہ مختلف کاموں کا بہانہ بنا کر ٹال جاتی ہیں اور جب ان کے میاں کا کچھ اچھا کھانے کا دل چاہتا ہے تب بمع فرمائشی پروگرام آپا کو یہاں چلتا کر دیتے ہیں۔“ بات سچ تھی مگر کڑوی بھی تھی۔ رشنا کی موجودگی میں پھپھو کو کچھ زیادہ ہی کڑوی لگی۔

”افو ابھی تک چاول بھی نہیں بھگوئے تم نے۔ بہت ہی سست اور کاہل لڑکی ہو۔ خدا جانے تمہاری ماں نے کچھ سکھا کر بھیجا بھی ہے یا ہر چیز کے لیے مجھے ہی اپنا سر کھپانا پڑے گا۔ ایک میری فہمینہ ہے ہر کام میں ماہر، ہنر میں یکتا۔ لیکن ہک ہاہ..... چلو اب جلدی جلدی ہاتھ چلاؤ۔“ اسے خوب لتاڑنے اور ڈھیر ساری ہدایات دینے کے بعد پھپھو کچن سے نکلیں تو اس نے سکھ کا سانس لیا۔ اسے فہمینہ اور اس کے شوہر کے شایان شان بہت کچھ بنانا تھا۔

فہمینہ نے جدید تراش خراش کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ کلائیوں میں چوڑیاں، کمر پر جھولتا پراندہ اور تیز رنگ کی لب اسٹک، لیکن اس کے چہرے پر چھائی

مردنی اس کی ساری تیاری پر پانی پھیر رہی تھی۔ حد درجہ بے زاری اس کے ایک ایک انداز سے جھلکتی کوفت کا یہ عالم تھا کہ آتے کے ساتھ ہی دونوں بچیوں کو یہاں وہاں پٹخا اور خود منہ پر دوپٹہ ڈال کر چارپائی پر لیٹ گئی۔

”ارے فہمینہ! سب ٹھیک تو ہے نا بیٹا!“

”خاک ٹھیک ہے اماں!“ دوپٹہ جھلکتی وہ اٹھ بیٹھی اور یوں زار زار روئی کہ پھپھو کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

”آئے ہائے کچھ بتاؤ تو سہی آخر ہوا کیا ہے؟ کیوں میری جان نکالنے پر تلی ہو۔“ دونوں بچیاں بے چاری سہم کر کبھی ماں تو کبھی نانی کا چہرہ تنکے لگتیں۔ وقت کم تھا اور ہفتہ بھر میں ہونے والے سسرالی مظالم کی داستان طویل تر۔

اسے عماد کے آنے سے پہلے سب کچھ ماں کو گوش گزار کرنا تھا۔ اس کی ایک ایک دہائی پر پھپھو کا ہاتھ کیچے پر جا پڑتا۔ عماد کے آنے کا وقت ہو چلا تھا۔ فہمینہ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر کے ماں کے دل پر بوجھ لادتی منہ پر پانی کے چھپا کے مارنے واش بیسن کے آگے جا کھڑی ہوئی۔ چہرہ عجیب ہیئت کا ہو رہا تھا۔ جھر جھری لے کر اس نے چلو میں بھرا پانی شیشے پر پھینک کر اپنی شبیہ دھندلی کی اور جلدی جلدی چہرے پر چھپا کے مارنے لگی۔

عماد آ گیا تھا۔ رشنا ٹیبل پر کھانا لگانے لگی۔ گلابی کھلتا ہوا لان کا سوٹ پہنے وہ بہت تروتازہ لگ رہی تھی۔ اظہار کام کے سلسلے میں شہر سے باہر گیا ہوا تھا۔ اس کی غیر موجودگی میں رشنا کا لب اسٹک لگانے کو بھی دل نہیں چاہا۔ لیکن سادگی میں بھی وہ بہت منفرد دھستی۔ عماد کی آنکھوں میں ابھرتی ستائش پھپھو اور فہمینہ کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں رہی تھی۔ فہمینہ نے ابرو چڑھائے جبکہ پھپھو نے مصلحتاً مسکراتے ہوئے داماد کا خیر مقدم کیا۔

”جی السلام علیکم خالہ!“ اس نے بد مزہ سا ہو کر

نگاہوں کا زلو یہ بدلا۔ رشنا ٹیبل پر سب کچھ لگا کر وہاں سے ہٹ گئی اور کچن میں آکر چھوٹے موٹے کام پٹانے لگی۔

عماد نے جھنجھلا کر چچہ پلیٹ میں پٹخا، اس کی پلیٹ میں بوٹیوں کے پہاڑی کھڑی کرنی پھپھو چونک گئیں۔

”کیا ہوا عماد؟“ فہمینہ نے گھبرا کر پوچھا۔ عماد نے تیور پان چڑھائیں۔ ”ابھی بھی پوچھ رہی ہو کیا ہو۔ بریانی میں مرچیں چھٹی نہیں؟ جیسے بھی بھر زہر جھونک دیا ہو۔ پتا بھی ہے مجھے تیزابیت کا مسئلہ ہے۔ پر نہ جی یہاں پر احساس کس کو ہے میں بھی اول درجے کا الو کا پٹھا ہوں جو ہر دفعہ کچھلی عزت افزائی بھلا کر پھر سے منہ اٹھائے چلا آتا ہوں۔“ داماد جی کا موڈ بگڑ چکا تھا۔ پھپھو کے دل کو بچنے سے لگ گئے۔ دل ہی دل میں رشنا کو خوب کوسا۔

”یہ رشنا بھی نا کوئی کام ڈھنگ سے نہیں کرتی۔ آپ بریانی چھوڑیں یہ کباب ہیں نا۔“ فہمینہ نے کبابوں کی پلیٹ آگے کی۔ ”رہنے دو بس یہی بریانی ہی زہر مار کر لیتا ہوں۔“

دونوں آستینیں اوپر چڑھائے بڑبڑاتے ہوئے بگڑے تیوروں کے ساتھ دیکھتے ہی دیکھتے بوٹیوں کا پہاڑ ہڑپ کر لیا۔ نخوت سے بریانی کی بچی چھٹی پلیٹ پر بے گھسکانی اور احسان کرنے والے انداز میں کبابوں پر بھی ہاتھ صاف کر لیا۔ تب ہی رشنا چائے کی ٹرے تھامے چلی آئی۔ پھپھو اور فہمینہ دونوں نے بیک وقت اسے کھا جانے والی نگاہوں سے دیکھا تھا وہ خاموشی سے برتن سمیٹنے لگی۔

”کیا سارا کام رشنا بھائی اکیلے ہی کریں گی؟ تم کیوں مہمانوں کی طرح اینٹھ کر بیٹھ جاتی ہو۔ اگر تھوڑا بہت ان کا ہاتھ بٹالو گی تو چربی نہیں پکھل جائے گی تمہاری۔“

عماد جانے سے پہلے آخری کیل بھی ٹھونک گیا

تھا۔ فہمینہ نے روہانسا ہو کر سخت شکایتی نگاہوں سے ماں کو دیکھا۔ اور ماں نے ان کے جانے کے بعد بیٹی کے بہائے ایک ایک آنسو کا حساب آٹھ آٹھ کر کے لیا تھا۔ بریانی میں مرچیں بہت مناسب مقدار میں تھیں۔ اور یہ بات پھپھو خود بھی جانتی تھیں لیکن..... رشنا لب کچلتی خاموشی سے ان کی ڈانٹ سنتی رہی۔ غلطی اس کی نہیں تھی لیکن وہ جانتی تھی اندھے کے آگے لائین لہرانے کا کوئی فائدہ نہیں۔

☆☆☆

چاند نے ابھی اپنا نصف سفر ہی طے کیا تھا جب تھکے مارے اظہار نے گھر میں قدم رکھا۔ رخ ماں کے کمرے کی طرف تھا۔ اسے سامنے پا کر وہ ہچک ہچک کر رو دیں اور دن بھر کی روداد سنانے لگیں۔ روداد کا مظلوم ترین کردار وہ اور فہمینہ تھیں اور رشنا کی دن بدن بڑھتی من مانیوں، جان بوجھ کر برتی جانے والے لاپرواہیاں ناقابل جرم۔

اظہار کے جڑے بھینچ گئے۔ ماں کو ڈھیروں تسلیاں دینے کے بعد وہ اٹھا۔ اس کے قدموں کی چاپ کروٹیں بدلتی رشنا نے اپنے دل پر پڑتی محسوس کرتی تھی۔ کمرے پر بے ہشائی وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ دن بھر کا انتظار..... کچن میں سر کھپائی..... عماد کا رویہ پھپھو کی ڈانٹ پھنکار، ایک کے بعد ایک رنگ اس کے چہرے پر آ کے گزر رہا تھا اور آخر میں ڈھیر سارا سکون، اس کا سائبان گھر آ گیا تھا۔ وہ اس کے سینے میں منہ چھپا کر دن بھر کی مشقت بھول جانا چاہتی تھی۔

”اول روز سے تم جانتی ہو عماد بھائی مرچیں کم کھاتے ہیں پھر بھی کھانا پکانے میں تمہاری اس درجہ غفلت کو میں کیا سمجھو رشنا؟“

رشنا کے قدم تھم گئے۔ ”نجانے کب عقل آگئے گی تمہیں۔ تمہاری وجہ سے عماد بھائی نے بھی آپا کو کیا کچھ نہیں سنایا ہوگا اور یہاں اسی ٹینشن میں اماں کورات بھریند نہیں آئے گی۔ حد درجہ لاپرواہ ہو تم۔“ اور بت بنی کھڑی رشنا کی آنکھوں سے وہ آنسو

بہہ نکلے جنہیں دن بھر اس نے پلوں کی باڑ پھلانگتے نہیں دی تھی۔
”اور پلیز لائٹ آف کرو مجھے نیند آرہی ہے۔“

☆☆☆

صبح معمول کی طرح روشن اور چمکیلی تھی۔ رات تمام تر داغوں کے ساتھ اپنا دامن سمیٹتی گم ہو چکی تھی۔ پھوپھو کا موڈ بحال ہو چکا تھا۔ اور یہ پہلی دفعہ نہیں تھا۔ ہر بار گرجے برسنے کے بعد ان کا موڈ بحال ہی ہوتا۔ شاید وہ اپنے کیے پر اطمینان پا چکی ہوتی۔ جیسے کوئی اچیو مینٹس۔

ماں کو خوشگوار موڈ میں ناشتے سے لطف اندوز ہوتا دیکھ کر اظہار کے چہرے پر مسرت سے تاثرات سچ گئے۔

”یار رشنا! گرما گرم مزے دار چائے تو بلا دو۔“
رشنا نے خاموشی سے بھاپ اڑاتا مک اس کے سامنے لا کر رکھ دیا۔

”تم ناشتہ نہیں کرو گی؟“ اسے پلٹتے دیکھ کر اس نے پوچھا۔

”کر چکی ہوں“ اظہار اس کی ناراضی بھانپ چکا تھا۔ شاید نوے فی صد مردوں کی طرح وہ بھی یہی سوچتا تھا کہ روٹی بیوی کو منانے کا صحیح وقت رات کا ہی ہوتا ہے۔

وہ دانستہ چپ رہا۔ اور رشنا منتظر ہی رہی شاید وہ پھوپھو کے سامنے گزشتہ رات کے اپنے رویے کی معذرت کرے۔

”اگر مرد بھی اتنے اعلا ظرف ہونے لگیں تو.....“

تلخی سے سر جھٹکتے وہ سنک میں پڑے برتن دھونے لگی۔

شام کو گھر آتے ہوئے اظہار اس کے پسندیدہ چاکلیٹ فلیور کی آئس کریم پیک کروا کے لے آیا تھا۔ رشنا کا اتر چہرہ اسے دن بھر ڈسٹرب کرتا رہا تھا۔ اس کی شروع سے عادت تھی شادی سے پہلے اکثر ماں کے

لیے بھی یوں ہی آئس کریم پیک کروا کے لے آتا تھا۔ رشنا صاف ستھری سوچ کی حامل ہا شعور لڑکی تھی۔ کپ پکڑتے ہوئے وہ مسکرا دی وہ یہ نہیں سوچتی تھی جو چیز میرے لیے ہے وہ ساس کے لیے

کیوں جبکہ پھوپھو یہی سوچتی تھیں جو چیز صرف میرے لیے ہوا کرتی تھی وہ اب اس کے لیے بھی کیوں؟

ان کے کپ میں آئس کریم پھلتی جا رہی تھی۔ ان کی سوچوں کی طرح رشنا سوچ بھی نہیں سکتی تھی زندگی میں وہ بھی اپنی پھوپھو کے ہاتھوں یوں سازشوں کا شکار ہو جائے گی۔ پھوپھو کو نہ جانے اپنی حیثیت

کے کمزور پڑ جانے کا خدشہ تھا یا اکلوتی بیٹی کی نا آسودہ زندگی کا دکھ، کہ وہ اس سب کا بدلہ رشنا سے یوں لینے لگیں۔ آگے پیچھے وہ ایسے حالات پیدا کر دیتی کہ قصور دار نہ ہوتے ہوئے بھی رشنا قصور وار گردانی جاتی۔

بھی یوں ہوتا کہ ادھر اظہار گھر میں قدم رکھتا ادھر پھوپھو کپڑے جھٹک جھٹک کرتا رہ پھیلا رہی ہوتی۔ جبکہ رشنا اس وقت اپنے کمرے میں بیڈ پر

نیم دراز میگزین کی ورق گردانی کرتی پانی پانی جاتی۔ اس صورت حال پر اظہار کا تیخ پا ہونا لازمی تھا۔ وہ رشنا سے سخت کبیدہ خاطر ہوتا اور وہ چاہ کر بھی ٹھیک طرح سے وضاحت نہ کر پاتی کہ ابھی ابھی ہی تو پھوپھو نے

زبردستی کمرے میں تھوڑی دیر آرام کرنے کے لیے بھیجا ہے کہ صبح سے کاموں میں لگی ہوئی ہو تھوڑی دیر جا کر کمر سیدھی کر لو، باقی کپڑے بعد میں دھوئے

جاسکتے ہیں۔ اظہار سخت شاکی نگاہ اس پر ڈالتا باہر نکل جاتا اور وہ سر ہاتھوں میں تھام کر رہ جاتی۔

اگلے روز پھوپھو نا سازی طبیعت کے باوجود خود چل کر اپنے لیے کچن میں کھانا گرم کر رہی تھیں۔ لاؤنج میں صوفے پر نیم دراز چینل سرچنگ کرتی رشنا

پر اظہار بری طرح خفا ہوا۔ اس کی من چاہی بیوی اس کے دل سے اترنے لگی تھی۔ جو اس کی بیمار ماں کو کھانا تک گرم کر کے نہ دے سکے۔ رشنا بوکھلا کر

ریوٹ برے چینیٹی فوراً اٹھی تھی۔

”لیکن اظہار میں پانچ منٹ پہلے ہی تو پھوپھو سے پوچھ کر آئی ہوں کہ ان کا کچھ کھانے کو دل چاہ رہا ہے تو میں بنا کر کمرے میں لے آؤں لیکن انہوں نے.....“

”بس کرو۔“ اظہار درشتی سے اس کی بات کاٹتا باہر نکل گیا۔ پھوپھو اور اسرار کو سامنے کھڑا دیکھ کر وہ لب کاٹ کر رہ گئی۔ ان کی نظروں میں واضح

نا پسندیدگی تھی۔ حقیقت چاہے جو بھی ہو مجرم بالآخر وہ ہی ٹھہرتی۔

☆☆☆

”اماں آپ اندازہ نہیں کر سکتیں وہ کن کن طریقوں سے مجھے زچ کرتی ہیں۔ جیسے کوئی شریںد

راکھ میں دبی چنگاری کو چھیڑ کر بھڑکتا شعلہ دیکھ کر لطف اندوز ہوتا ہے بالکل ویسی ہی فطرت کی مالک ہیں وہ۔“ رشنا ہر بار میکے والوں کو ”سب اچھا ہے“

کی رپورٹ دے دے کر تھک چکی تھی۔ اس بار میکے آئی تو جیسے ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے۔ ایک ایک کر کے وہ سب کچھ بتاتی چلی گئی۔

”اسی لیے میں اس رشتے کے حق میں نہیں تھی۔ مجھے پتا تھا آپا بھی اپنی فطرت سے باز نہیں آئیں گی۔ ارے میں نے اپنی پھول سے بچی اس لیے تو ان کے

حوالے نہیں کی کہ وہ یہ سلوک کرتی رہیں۔ اماں کا تو بلڈ پریشر ایک دم شوٹ کر گیا تھا۔ ان کی بیٹی کیا کچھ نہیں سمجھ رہی تھی۔ شک تو انہیں پہلے سے

تھا۔ ان کی شوخ و چلی سی رشنا ایک دم بہت چپ چپ اور اداس رہنے لگی تھی۔ اس کی ساری شوخیاں سارے رنگ جیسے پھیکے پڑتے جا رہے تھے۔

”بس کرو رشنا پلیز، اب رونا نہیں۔ چلو چل کر چائے کے ساتھ پکوڑے بناتے ہیں۔“ میرب نے سامنے پھیلی کتابیں سمیٹ کر بددلی سے ایک طرف

رکھ دیں۔

”چائے کو چھوڑو میں رشنا باجی کے لیے ان کا پسندیدہ قلفہ لے کر آتا ہوں۔“ موبائل پر گیم کھیلتا گڈو موبائل جیب میں رکھتا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ سب اس کی دل جوئی کر رہے تھے۔

رشنا کی آنکھیں پھر سے بھرنے لگیں۔ ابابھی وہیں موجود تھے۔ ان سے تھوڑے فاصلے پر کرسی پر بیٹھے اخبار کی شہ سر یوں پر نظریں دوڑا رہے تھے۔ وہ ہمیشہ سے بہت کم کسی معاملے میں بولتے اب بھی اخبار پر سے نظریں ہٹا کر بیٹی کا سرخ پڑتا چہرہ دیکھا اور گہری سوچ میں گم ہو گئے۔

☆☆☆

دکھ بانٹنے سے دکھ ختم نہیں ہو جاتا کم ضرور ہو جاتا ہے، ماں کی محبت، بھائی کی دلجوئی، بہن کا احساس..... وہ بہت ہلکی پھلکی ہو کر گھر لوٹی تھی۔ لیکن

زندگی ہمارے کسی احساس پر منجمد ہو کر رک نہیں جاتی۔ اسے بہر حال آگے بڑھنا ہوتا ہے۔ ہم خوش ہوں تب بھی ناخوش ہوں تب بھی۔

اگلے بہت سارے دن اس کے لیے آزمائش بن کر آئے تھے۔ فہمی آپا کی آمد ہر بار اس کے لیے کسی امتحان سے کم نہ ہوتی۔ پھوپھو حد سے بڑھیں تو اس نے بھی ضبط کا دامن چھوڑ دیا۔

وہ اب چپ نہیں رہتی تھی۔ اظہار سے اس کی تلخ کلامیاں بڑھنے لگی تھیں۔ ان دنوں اسے اپنے

ماں بننے کی نوید ملی۔ لیکن وہ ڈھنگ سے اس خوشی کو محسوس بھی نہیں کر پارہی تھی۔ اظہار اس کا خیال

رکھنے لگا تھا۔ لیکن ہر بار کچھ نہ کچھ ایسا ہو جاتا کہ ان کے درمیان پھر سے فاصلے بڑھ جاتے۔ میکے آتی تو

پھر سے وہی زونا دھونا، سب کی دل جوئی گڈو اور میرب کے چہرے اتر جاتے۔ اماں پھوپھو کو برا بھلا کہتے نہ سکتیں۔ نہ چاہتے ہوئے بھی ہر بار اس کے

آنے پر گھر کا ماحول مگر ہو جاتا۔ کبھی کبھی اسے خود میں اور فہمی آپا میں کوئی فرق نظر نہ آتا۔

☆☆☆

اور آج تو حد ہی ہو گئی۔ اظہار نے اس پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ وہ ماں کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ اس کے دائیں رخسار پر خبت انگلیوں کے واضح نشان ساری کہانی سنارہے تھے۔ اسرار کی نوکری لگ جانے کی خوشی

Medora
Perfumed Talc

خوشبو جو دل کو پہنائے
تاریکی جو ہر کوئی چارے



خوشبو کی دنیا کے 8 شگفتہ احساس

MEDORA OF LONDON

”جانتی ہو بیٹا! جس طرح ہم چیزوں کو مختلف کیلنگریز میں رکھتے ہیں۔ اعلیٰ بیش قیمت، کم قیمت، معمولی، غیر معمولی..... بالکل اسی طرح انسانوں کی بھی کیلنگریز ہوتی ہیں۔ بدتر سے کم تر، کم ترین سے بدترین تک ہر قسم کے لوگوں سے ہمارا واسطہ پڑتا ہے۔ کچھ لوگ ہوتے ہیں تھرڈ کلاس چاہے یہ غیر ہوں ہمارے اپنے ہوں بہت امیر، بہت پڑھے لکھے ہونے کے باوجود یہ رہتے تھرڈ کلاس ہی ہیں۔ اپنی عامیانا سوچ، طرز عمل اور باتوں سے دوسروں کو دکھ دینے والے، تمہارا واسطہ ان ہی تھرڈ کلاس لوگوں سے پڑا ہے۔“

ابا بہت نرم آواز میں بول رہے تھے ان کے سینے سے سر ٹکائے وہ سنتی رہی۔

”قصور ان کا نہیں ہے، وہ اپنی فطرت کے ہاتھوں مجبور ہیں۔ جیسے دریا پار کرواتے کچھوے کی پیٹھ پر سوار کچھو اپنی فطرت سے مجبور ڈنک مارنے سے باز نہیں آتا۔ سر جاتا ہے تو ہی عادتیں جاتی ہیں۔ ہماری زندگی کو مشکل وہ نہیں درحقیقت ہم خود مشکل بنا رہے ہوتے ہیں۔ تو بیٹا تم اگر ان کی باتیں اپنے دماغ میں فیڈ کرو گی، انہیں دہراؤ گی تو وہی کچھ ہوگا جو تمہارے ساتھ ہو رہا ہے۔ اگر وہ ہمیں گالیاں دیتے ہیں برا بھلا کہتے ہیں تو کہتے رہیں۔ کسی کے برا کہنے سے ہم برے بن نہیں جاتے۔ ہم وہی ہیں جو درحقیقت ہم ہیں۔“

ان کے ساتھ دبدو مقابلہ کرنے کے لیے تمہیں اپنا مقام چھوڑ کر ان کے مقام تک آنا پڑے گا۔ تو سوچو کیا تمہیں یہ زیب دیتا ہے؟ تمہاری تربیت، تمہاری تعلیم، تمہارا شعور تمہیں اس بات کی اجازت دیتا ہے؟ نہیں نا تو بیٹا درگزر کرو۔ درگزر کرتی رہا کرو، اس سے زندگی سہل ہو جائے گی۔ تم سمجھ رہی ہونا میری بات.....“

انہوں نے نرمی سے اپنی ٹھوڑی اس کے سر سے ٹکرائی تو وہ سراو پر اٹھا کر ان کا چہرہ دیکھنے لگی۔ ”جی ابا! سمجھ گئی۔“ بہت روشن، بہت پر امید مسکراہٹ نے اس کے چہرے کا احاطہ کر لیا تھا۔ ☆

میں فہمی آپا کے سرال والوں کو کھانے پر مدعو کیا گیا۔ رشنا کو گری گری طبیعت کے باوجود سب کام اچھے سے سنبھالتے دیکھ کر فہمی آپا کی ساس اور نندیں تعریف کیے بنارہ سکیں۔

”ارے مہناز بہن! بہو تم نے لاکھوں میں ایک پائی ہے کیسی ہیرا صفت بچی ہے۔“

مجال ہے جو اس کے چہرے پر بھی بے زاری دیکھی ہو۔ ہر دم مسکراتی، ایسی عزت کرنے والی بہو ویں کسی کسی کو نصیب ہوتی ہیں۔“

رشنا سادگی سے مسکرا دی۔ فہمی آپا کا چہرہ سرخ پڑنے لگا تھا۔ انہیں یہ سراسر اپنی توہین لگی۔ پچھو کو بھی بیٹی کے سرال والوں کا یوں رشنا کی تعریفوں میں رطب السان ہونا ایک آنکھ نہ بھایا۔

مہمانوں کے رخصت ہونے کے بعد انہوں نے ہمیشہ کی طرح معمولی باتوں کو وجہ تازعہ بناتے ہوئے مسکراتی ہوئی رشنا سے اپنی بیٹی کے اترے چہرے کا خوب حساب لیا۔ آج تو وہ اس کے ماں باپ کو بھی بخشنے کے موڈ میں نہیں تھیں اور یہیں رشنا کا صبر جواب دے گیا۔ اظہار کھانے میں شریک نہ ہو سکا تھا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی رشنا کو ماں کے ساتھ تلخ کلامی کرتا دیکھ کر اس کا فشار خون ایک دم بلند ہوا بغیر جھگڑے کا پس منظر جانے اس کا رشنا پر ہاتھ اٹھ گیا۔

”میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی اظہار کبھی مجھ پر ہاتھ اٹھائیں گے۔ اگر فہمی آپا اپنے گھر میں خوش نہیں ہیں تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ پچھو ان کی محرمیوں کا بدلہ مجھ سے لیتی ہیں۔ آج تو وہ آپ کو اور ابا کو بہت برا بھلا کہہ رہی تھیں۔ مجھ سے برداشت نہیں ہوا لیکن اظہار..... وہ ایسے نہیں تھے۔“

وہ ایک بار پھر سسک اٹھی۔ اماں کا بس نہیں چل رہا تھا۔ دونوں ہاتھوں سے تیند کا گلا دبا آئیں۔ میرب افسردگی سے لب کاٹنے لگی تھی۔ گڈو خاموش اور ابا اٹھ کر اس کے قریب بیٹھ گئے تھے۔ بازو لمبا کر کے اسے اپنے گھرے میں لیے۔ اس کا سراپنے سینے سے لگاتے وہ بہت مدہم آواز میں گویا ہوئے۔



مکمل ناول

”تمہارے شوہر صاحب کس قدر ڈھیٹ انسان ہیں۔ بھلے کہہ دو۔ آپ کا مطلوبہ بندہ کشمیر آزاد کروانے گیا ہوا ہے مگر یہ صاحب ان کی واپسی تک کال یہ کال کرتے رہیں گے۔“

ردا کی آواز سے کہیں زیادہ احسان جتنا تو اس کے پاؤں کی دھب دھب تھی پانی کے پائپ سے پودے دھوتی نمٹل نے اپنے عقب میں متفکر سا ہو کے جھانکا۔

”خدا خیر، ایسی کیا غلطی سرزد ہوگئی کہ چار دن میس میں آئی ہوئی بیٹی کو شوہر کے مزاج جتائے جا رہے ہیں۔“ پھر ردا کے ہاتھ میں اپنا سیل فون دیکھ کے اس کی روح فنا ہوئی۔ نمٹل نے فیس کو چار جنگ پہ لگانے کا کہا تھا اور انہوں نے اپنے بیڈروم میں لگا دیا ہوگا۔

”سوری ردا!“ وہ لب پھیلا کے جبراً مسکرائی اور فون اس کے ہاتھ سے لیا۔

یوں تو ردا کا تمام دن آرام کرتے ہی گزرتا تھا

قزاقانہ کھل

سید کے سوتیلے بچے کی کہانی



لاڈلا ہی مجھے بتانے کی زحمت نہیں کرتا، جب اس نے یہ مسئلہ حل ہی نہیں کرنا تو آپ سب نے اسے ملکی حالات میں کیوں بدل رکھا ہے۔“

سب کی الگ بولیاں الگ مشورے، رد اکالاب ولبہ ہر طرح کے لحاظ سے عاری تھا۔

اس کی تیز آواز پہ عیرش کی اونگھ پل میں ٹوٹی تھی۔

”ارے میں کون سیاتہمارے کمرے میں جا کے دھرتا مار کے بیٹھنے والی تھی کہ بی بی اپنی ضد پہ مٹی ڈالو..... اتنا ہی کہا ہے نا کہ عورت کی بے جاضد گھر توڑ دیتی ہے۔ آگے تم جانو یا تمہارا قیس۔“ دودیا کی آواز رداسے ذرا اونچی ہی تھی۔

”مجھے بھی تو وہ گھر دکھائیے آپ جس کے ٹوٹنے کا وہم پال کے بیٹھی ہیں۔“

”اف۔“ عیرش نے دانتوں تلے زبان دبائی۔

”گھر ٹوٹنے سے مراد ساتھ کا چھوٹ جانا ہوتا ہے۔ رد اکو اتنا پتا ہونا چاہیے۔“

عیرش بیلوں سے ڈھکی کھڑکی کی جانب آئی اور پیشانی جالی سے ٹکا کے اندر جھانکا۔ رد اکو اس بات پہ

ماحول اور وقت بھی اثر انداز نہیں ہو سکا تھا۔ رضا کے اندر اسے پلٹ کے دیکھنے کی خواہش شدید ہوئی اور وہ ہر بار کی طرح اس خواہش سے دست بردار ہوتا باہر چلا گیا..... کیا وہ اس کی خبر لینا چاہتی تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا اور اب وہ جاننے کا خواہاں بھی نہیں تھا۔

اس شخص کا پل بھر کو ٹھٹھک کے رکنا۔ عیرش نے اسے دم سادھ کے دیکھا تھا۔ کھولتے پانی سے پتی مہکی کہ میری بھی خبر لو..... تو وہ گہرا سانس بھر کے دودھ کے برتن کی طرف متوجہ ہوئی، پتا نہیں یہ گھر کس کس کی کمائیوں پہ چل رہا ہے۔ اس نے ہمیشہ کی طرح سوچا تھا۔

☆☆☆

قیام پاکستان سے قبل کی تعمیر شدہ یہ کوٹھی اگرچہ قدیم تھی مگر خستہ حال کسی دور میں بھی نہیں رہی تھی، اس کے رہائشی حصے کو پھل دار درختوں نے چہار اطراف سے گھیر رکھا تھا۔ نسل در نسل اس کوٹھی کے تعلیم یافتہ مالکوں کا ذریعہ معاش بھی ہمیشہ زراعت رہا۔ پھر نئے دور کے تقاضوں کے پیش نظر زمینیں بکتے بکتے اب بشکل گزارے لائق ہی رہ گئی تھیں۔

آج بھی کوٹھی پر مہیب ولا لکھا تھا۔ جب کہ مہیب کو اس دنیا سے رخصت ہوئے بھی پندرہ برس بیت چکے تھے اس سے بڑا مہیب اپنے آبائی گاؤں میں کچھ نیکی کچی زمینیں سنبھالتا تھا۔ اس گھر میں ہمیشہ رشتوں کی کچھڑی سے مروت کی ہی خوشبو پھوٹی تھی سو گز اراہل انداز سے ہو رہا تھا۔

عیرش کا ذہن اس بات میں الجھا ہوا تھا کہ آج کل گھر میں جو ہو رہا ہے اس کا انجام کیا ہوگا۔ وہ کافی دیر سے پچھلے لان کی کپڑیاں سیٹ کر رہی تھی، دو کھڑی ستانے کے لیے۔ وہ ہال کمرے کی دیوار کے قریب آئی۔ مارچ کی ہوا بھی کیا جادو اثر تھی کہ ہولے سے کمر نکاتے ہی وہ اونگھنے لگی۔

”ہمارے شوہر صاحب کو تو چھوڑا اور جسے دیکھو اس معاملے میں سر پیر گھسائے پھرتا ہے ایک آپ کا

”تمہاری انڈے دیتی مرغی تو نہیں مر گئی۔“ اس کی دردناک ہائے کو عیرش اور کیا کہتی۔ بخت ایک دم سیدھی ہوئی۔

”قسم سے باجی، صبح سے جوڑ جوڑ دکھ رہا ہے۔“ اس نے اپنے دانت منہ کے اندر رکھنے کی کافی کوشش کی تھی۔ باجی نے وجہ سمجھتے ہوئے اسے خونخواری سے گھورا۔

”دودیا کے کمرے سے ماشی تیل اٹھاؤ اور اسٹور کا رخ کرو۔“ اس نے چائے کا پانی چولہے پہ رکھتے ہوئے ملازمہ کو مفت مشورہ دیا۔

”باجی یہ امیروں کا درد نہیں ہے ہم غریب تو چائے کے ایک کپ سے ہی۔“

باجی کے تیور بھانپ کے وہ ہکلا کے خاموش ہوئی۔

”ہاں ہاں کیوں نہیں، جاؤ آس پڑوس سے بھی پوچھ آؤ، کسی کو چائے کی طلب تو نہیں ہو رہی۔“ اس نے کینٹ سے پتی نکال کے اسے کھٹاک سے بند کیا۔

”آس پڑوس کا تو پتا نہیں لیکن مجھے ایک کپ چاہیے۔“ اس کے تایا ز اور رضا نے فریج سے پانی کی بوتل نکالتے ہوئے عیرش کے متماتے چہرے پہ ایک سنجیدہ نگاہ ڈالی، پچھلے کئی سالوں سے یہ لڑکی اسے عجب صورت حال سے دوچار کر رہی تھی۔

”دودھ ذرا کم ہے پھر نہ کہنا شیرہ بنا دیا ہے۔“ وہ پتی پتی سی نگاہ اس سے چرائی مخاطب ہوئی۔

”تو ایک کپ الگ سے بنا دو۔“ رضا سے چھوٹا رامس ہوتا تو جھٹ سے کہہ دیتا لیکن وہ جواب دیے بنا ہی جانے لگا تھا۔

”بخت! تم ذرا قیس بھیا اور رامس کی خبر لے کر آؤ۔“ وہ جاتے جاتے ٹھٹھکا۔ عیرش کے لبوں کو چھوٹا یہ جملہ رضا کو ہمیشہ سے بھاتا تھا۔

ان دونوں بہنوں کو اس گھر میں آئے پندرہ برس ہو چکے تھے لیکن چند جملے ایسے تھے جن پہ یہاں کا

لیکن شام سے قبل وہ پوری ہوئی نیند..... مزید پوری کرنی تھی۔ ایک تو نیند ٹوٹی دوسرا اس آثار قدیمہ کی سیڑھیاں اترنا کوئی آسان کام نہیں۔ وہ ناک بھوں چڑھائی اب واپس جا رہی تھی۔ ادھر نمل کال ریسیو کرتے ہی شوہر پہ چڑھائی کر چکی تھی۔ ذرا فاصلے پہ دو زنانوں بیٹھی عیرش نے خاصا بھاری گملا سرکاتے ہوئے اپنی بہن کو گھورا..... کہ ”تمیز سے بات کرو۔“

نمل شوہر سے بات کرتے ہوئے اسی کی جانب آ رہی تھی۔ عیرش کی چھٹی حس چوکنا ہوئی۔ وہ ہاتھ جھاڑتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میں ذرا چائے بنا لوں۔“ اتنا کہنے کے ساتھ وہ وہاں سے بھاگ لی۔

”موی تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔“ یہ بات نمل کے منہ میں ہی رہ گئی۔ اس نے دور جانی بہن کو بے چارگی سے تکا پھر پیچھے سے زوردار آواز لگائی۔

”ایک کپ میرے لیے بھی بنانا۔“ عیرش سیڑھیوں پہ دوپل گور کی اور ہال کمرے کی چوکھٹ پہ ہاتھ رکھ کے دہل سی گئی۔

”ہائے! اللہ نمل کی آواز کہاں سے کہاں تک گئی ہوگی۔“ اس کا منہ سادل کا نپا۔ وہ بنا ادھر ادھر دیکھے ناک کی سیدھ میں چلی۔

”چائے بنا رہی ہو تو ایک کپ مجھے بھی دینا۔“ رد اہال کمرے کے دروازے پہ ہی مل گئی۔

”جی!“ عیرش نے مصنوعی مسکراہٹ کا سہارا لیا اور وہ منہ بناتی آگے بڑھی۔

”عیرش! بچے بھی آتے ہوں گے۔ چائے ذرا زیادہ چڑھا دینا۔“

اف!“ اس نے سر پہ ہاتھ رکھے۔ ”مجال ہے جو اس گھر میں بندہ ایک کپ چائے بنا سکتا ہو۔“

جو صورت نمل کی آواز نے پھونکا تھا یہ تمام نتیجہ اسی کا تھا لیکن چھوٹی دودیا کو محبت سے اچھا کہہ کر وہ کچن میں آئی تو ان کی کل وقتی ملازمہ بخت نے اس کا استقبال اک کڑک دار ہائے کے ساتھ کیا۔

سوچ نگر کی دانی

سوچ نگر کی دانی

وحشیہ جمیل

قیمت - 350 روپے



ساس کے ضبط ٹوٹنے کا خدشہ تھا یا اس نے قیس کو اندر آتے دیکھ لیا تھا کہ اب وہ سیڑھیاں پھلانگ رہی تھی۔ قیس کے ساتھ ریضا بھی تھا جس کے چہرے پہ ناگواری دیکھی جاسکتی تھی کہ اب روزانہ گھر آنے پہ ایسے ہی تماشوں کا سامنا ہوتا تھا۔ دو دن پہلے ہی عیرش نے رضا کو تائی سے کہتے سنا تھا۔

”کہ پرانے گھر کا لحاظ کرتے ہوئے ردا کو اپنے معاملات بیدروم کی حدود تک رکھنے چاہئیں۔“

”آج عیرش کہیں گئی ہوئی ہے۔“ ددیا نے موضوع بدلا اور رضا کو دیکھ کے مسکرائیں۔

”میں نہیں جانتا۔“ وہ اپنے مخصوص انداز کے ساتھ گویا ہوا۔

”تو تم سے پوچھا کس نے ہے۔ میں تو تمہارے ساتھ کھڑی بخت سے پوچھ رہی ہوں۔“

رضا جھل ہوا۔ باہر کھڑی عیرش خوش ہوئی۔

”باجی تو آج صبح سے پیڑ پودوں کو ٹیکے لگا رہی ہیں۔“ بخت نے جواب دانتوں کی نمائش کے ساتھ دیا۔

”اس نمائش کو بھی ٹیکوں کی ضرورت ہے۔“ وہ مسکراہٹ دباتے ہوئے بولا۔

”ایسے ہی اچھے لگتے ہو۔“ عیرش کو ماننا پڑا۔

”اس گھر کے سارے باسی ہی نرالے ہیں بھئی۔“ ددیا نے ایک ادھی سی آہ بھرنے کے ساتھ نگاہیں موند لی تھیں۔ عیرش کا دل قہقہہ لگانے کو چاہا۔

”اس گھر کے اصل مکین تائی، رضا اور راس۔“

..... ماشاء اللہ تینوں پر فیکٹ باقی سب کو تو یہاں قسمت — ہانک کے لائی تھی۔ عیرش کی سوچ حقیقت سے دوچار ہوئی کہ محبت اپنی جگہ مگر سچ بھی کوئی حیثیت رکھتا ہے۔

☆☆☆

”موسیٰ! مجھ پہ بگڑ رہا تھا کہ عیرش کو مجھ سے بات کرنا چاہیے تھی۔“

بہن کے ڈھیلے لہجے کے شکوے نے اسے تھوڑا سا شرمندہ کیا وہ دونوں اپنے کمرے میں تھیں ”تمہیں

یاد ہو گا یا! ماما، پاپا کی ڈیجھ کے بعد جب ہم دونوں کو خالہ یہاں چھوڑنے آئی تھیں تو انہوں نے چندرسی باتوں کے بعد تائی اور ددیا کو جتا دیا تھا کہ اب یہ دونوں بھلے دودھیال میں رہیں گی مگر ان کی زندگی سے متعلق ہر فیصلہ خالہ کے اختیار میں ہو گا۔ تب انہوں نے یہ بھی بتایا تھا کہ نمل اور موسیٰ کا رشتہ وہ طے کر چکی ہیں تو اس وقت انہوں نے یہ کیوں نہیں کہا تھا کہ عیرش بھی اپنے ماموں زاد سے منسوب ہے۔“ وہ نمل کی آنکھوں میں دیکھ کے بولی۔ اس کے لہجے کی کاٹ نمل کی سمجھ سے باہر تھی۔

”تو اس میں برا کیا ہے عیری۔ ہم دونوں دینی میں ایک ساتھ رہیں گے۔“ نمل نے اس کا ہاتھ تھاما۔

”جب ہماری منزل وہی تھی تو سالوں پہلے ہمیں یہاں کیوں چھوڑا گیا۔ ماموں اور خالہ کو اس وقت ہمیں بوجھ کی طرح بھینکنے کے بجائے — پناہ میں لینا چاہیے تھا۔ جب خالہ ہمارا سامان باندھ رہی تھیں تو موسیٰ نے ہماری اسکو لنگ کا جواز دے کر ہمیں روکنے کی بھرپور کوشش کی تھی تو خالہ نے موسیٰ کو جھڑک دیا تھا کہ بڑوں کی بات میں دخل مت دو۔۔۔۔۔ ان کا مقصد ہمیں وہاں سے بھگانا تھا۔

انہوں نے نانا کے بنگلے سے ماما کے حصے کی رقم ہمارے اکاؤنٹ میں ڈال کے لوگوں کی واہ واہ سمیٹ لی تھی لیکن سوچو نمل! نانا کے کاروبار کا ماہانہ منافع لاکھوں میں ہو گا اور جس میں سے ہر ماہ ہمیں پچاس ہزار کی زکوٰۃ دی جاتی ہے۔“ اس نے ساکت کھڑی نمل پہ تیز نظر ڈالی جس نے وہ سب بندکانوں سے سنا تھا۔

”اب تم کیا چاہتی ہو عیرش؟“ نمل نے پوچھا تو لہجے میں ہلکی سی لرزش تھی کہ عیرش کا انکار نمل کی زندگی کو مشکل میں ڈال سکتا تھا۔ ”میں ان سے اپنا حق وصول کرنا چاہتی ہوں۔“ وہ بہن کا ہاتھ جھٹک کے بستر کی طرف چلی آئی۔

”ماں باپ کو تو خدا نے لے لیا تھا لیکن ان کی

زندگیوں میں باقی کی مشکلات کا سبب ان کی خالہ اور ماموں ہی تھے ”دوسری صورت میں بھی تو وہ سب کچھ ہمارا ہی ہے جیسے میں خالہ کی بہو بن کر عیش کر رہی ہوں تم بھی ماموں کی بہو۔“

”بس کرو نمل!“ عیرش نے اس کو درشتی سے ٹوکا۔ ”مجھے یہ عیش بہو کی صورت نہیں چاہیے۔ میں بچ کے پندرہ سالوں کا حساب کتاب بھی چاہتی ہوں۔“ وہ چبا کے بولی تھی۔

اسے وہ دن یاد آ رہا تھا جب چودہ سالہ نمل اور بارہ سالہ عیرش بنا والدین کے اس گھر میں آئی تھیں تو کس قدر محتاط اور سہمی ہوئی تھیں گو یہاں اجنبی کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ یہاں عید کے عید تو آئی تھیں تب ماں باپ کے رشتے کا تقارن ان کے ساتھ ہوتا تھا۔ ان چند روزہ مہمانوں کے ناز و نخرے سو طرح سے اٹھائے جاتے تھے لیکن اب وہ یتیم ہو کر آ رہی تھیں اور نہیں جانتی تھیں کہ اس گھر میں ان کے لیے کتنی گنجائش ہوگی اور اس نئی صورت حال کے ساتھ ان کا استقبال کس طرح ہو گا۔

☆☆☆

”تمہارا باپ ایک کنگلا انسان جو جاب کے سلسلے میں چند دن باپ کے دوست کے گھر کیا ٹکا، اس کی نازوں پٹی بیٹی ہی پٹالی، دوسری طرف پاپا بھی صہیب کی باتوں کے جال میں آ گئے تھے ورنہ کہاں ہم۔ حیدر آباد کے نواب۔۔۔۔۔ اور کہاں صہیب کا خاندان۔“ خالہ ساڑھی کا پلو کندھے پہ ٹکا کے نخوت سے بولیں تو عیرش نے انہیں تحیر سے دیکھا۔

”ہمارے لاکھ منع کرنے کے باوجود ابا مرحوم نے اپنا دینی کا بزنس صہیب کے سپرد کر دیا تھا۔ اس نے خود بھی خوب کھایا اور اپنے کنگلے خاندان کی بھی قسمت بدل دی۔“

”ہمارے پاپا اور ان کا خاندان ہر گز بھی کنگلا نہیں تھا دادا کی شان دار کوٹھی میں دنیا کی ہر نعمت تھی۔“ عیرش خالہ کو جواب دینا چاہتی تھی مگر جملے حلق میں پھنس گئے اور وہ اپنے آنسو پٹی رہ گئی۔

”صہیب نے کون سا آبائی گھر سے حصہ وصول کر لیا تھا۔ تم دونوں اب بھی حصے دار ہو۔ جبکہ اک زمانے سے وہاں مفت خورے بھی عیش کر رہے ہیں۔“ خالہ کا اشارہ چھوٹی ددیا کی طرف تھا۔ ”جنہیں تمہاری دادی میکے سے جہیز میں لائی تھیں جو شادی کے بعد بمعہ شوہر کے وہیں آ بیس کہ دل کہیں اور لگ کے نہ دیا۔۔۔۔۔ خالہ کا خالص حیدر آبادی لب و لہجہ عیرش کو ناگوار گزر رہا تھا۔

”دیکھو تو ذرا تم لوگوں کی چھوٹی ددیا آج بھی بہن کے گھر پہ قبضہ جما کے بیٹھی ہے۔“ خالہ کا غصہ سمجھ سے باہر تھا۔

”اور خبردار جو اپنی ددیا کے اس آوارہ بیٹے قیس سے کوئی ماموں، چاچو جیسا کوئی رشتہ گانٹھا تو۔۔۔۔۔ خواہ خواہ وارث بن بیٹھے گا۔“

عیرش نے آنسو پونچھتے ہوئے دل ہی دل میں خالہ کی باتوں کی ٹٹی کی تھی کہ میں تو ایسا ہی کروں گی۔ خالہ کی بھیجیت دادا کے گھر کے سامنے ہی ختم ہوئی تھیں۔ اندر گھر مہمانوں سے بھرا پڑا تھا۔ چھوٹی ددیا یتیمی کا دور بھگت چکی تھیں۔ سوان دونوں کو ساتھ لپٹائے تادیر سکتی رہیں۔ تائی کا حال بھی بہت برا تھا۔

”ارے دیکھو تو، خون سفید ہو گیا۔ غزالہ بھرے پرے گھر سے بچیوں کو اٹھا کے یہاں پھینک گئی۔ ان لونڈوں میں بچیاں کیا خاک سہولت سے رہیں گی۔“ ان بزرگ خاتون نے کسی حد تک سچ کہا تھا کیونکہ خالہ کی تینوں بیٹیوں کے ساتھ ان کی خوب بنتی تھی۔

نمل اور عیرش نے ان تینوں لونڈوں کو سہم کے دیکھا تھا پھر وقتاً فوقتاً اس طرح کے تبصروں پہ لڑکوں نے جیسے خود کو کوئی ہوا سمجھ لیا تھا کہ ان دونوں سے سامنا ہوتے ہی وہ راستہ بدل لیتے۔۔۔۔۔ تو وہ اپنی جگہ چوری ہو جاتیں۔

رضا اور راس تو ان کے تایا زاد تھے۔ خاندان والوں کا اصل ٹارگٹ تو قیس اسلام تھا جو نہایت نرم خور اور سبھی ہوئی شخصیت کا حامل تھا۔

ان کی وہ عمر حق جتانے والی ہوتی تو وہ کیا گھر چھوڑ کے آتیں؟ ان کے ہاتھوں میں خالہ اور ماموں کا گریبان ہوتا اور نہ ہی ان کی تربیت ایسی ہوئی تھی کہ یہاں وہ سب کو آنکھیں دکھا کے شیر کی خالہ اور پھوپھی بن جاتیں۔ وہ خالہ کی تمام نصیحتیں گاڑی میں چھوڑ — آئی تھیں۔ فی الحال انہیں رہنمائی درکار تھی۔ ددیا اور تائی نے ان پر بے حساب محبت نچھاور کی۔ ان کی تعلیم و تربیت کا آغاز نازخروں کے ساتھ کیا کہ ان کے سر پہ تایا کا سایہ موجود تھا۔ ددیا اور تائی اپنی اولادوں سے بھی احتیاط کریں۔

رضاء ذرا نخریلا تھا۔

”نمل وغیرہ کے سامنے مجھ سے لپٹ کے بات منوانے کی عادت اب چھوڑ دو۔ وہ دونوں احساس محرومی کا شکار ہوتی ہوں گی۔“ ماں کی اس بات پر رضا طیش کھا کر رہ جاتا۔ گھر کا کھلا ڈلا مردانہ ماحول لڑکیوں کی آمد کے ساتھ اب زنان خانے میں بدل چکا تھا۔

”خیر دار جو آئندہ یوں بنیان میں باہر آئے تو۔“ ماں دھمکی تو ہوتی کمرے میں لے آتیں۔

”میں تو موٹر پمپ چلانے نکلا تھا۔“ رضا آنکھیں دکھاتی ماں سے الجھتا تو ہال میں بیٹھی لڑکیاں سہم جاتیں۔

”بھئی کالج سے آنے کے بعد وہ اپنی پرانی روٹین میں صوفے پر لڑھک جاتا۔“

”اب یوں پرانی روٹین میں بے تکی پن سے مت لیٹا کرو۔ شرٹ دیکھو پیٹ نظر آ رہا ہے۔“

اماں فدا نازل ہوتیں وہ جھنجھلا جاتا۔

”کیا مصیبت ہے یار! زندگی اجیرن ہو گئی۔ بھئی انہیں مشین میں ڈال کے لڑکے بنا ڈالو یا پھر ہمیں لڑکیاں۔“ رضا کی تجویز پر باقی دونوں لڑکے ہنس ہنس کے دہرے ہوتے۔ ددیا کانوں کو ہاتھ لگا کے استغفار پڑھتیں۔ ماحول کی تبدیلی کا زیادہ اثر رضا نے لیا تھا۔

”ایسا کریں مجھے ہاسٹل بھیج دیں،“ اس دن

اسے گنگناتے ہوئے دیکھ کر ماں نے ڈانٹا تو اس کا ضبط تڑخ گیا۔ اس کی آواز اتنی اونچی تھی کہ سب نے سنی۔ وہ پیر پختا ہوا گھر سے ہی نکل گیا تھا۔

اس صورت حال پر ددیا اور تائی سر جوڑ کے بیٹھیں پھر مسئلے کا حل یوں نکالا کہ لڑکیوں سے بیزار رضا کا بیڈروم اوپر کی منزل پر سیٹ کر دیا گیا بھلے اب وہ اوپر نیکر بنیان میں پھرتا۔ گو کچھ عرصے بعد گھر کے ماحول میں پہلے سی بے تکلفی اور چہل پہل در آئی تھی مگر رضا باقیوں کی طرح ان سے کبھی کھل مل نہ سکا۔ اس نے ہمیشہ خود کو ان سے ایک مناسب فاصلے پر رکھا اور پھر عیرش کے ماہ سال رضا حبیب سے سامنا کرنے سے کتراتے ہوئے ہی گزرے۔

نمل کی تعلیم مکمل ہونے کے بعد خالہ اسے رخصت کروالے گئی تھیں۔ عیرش کا ہوئی کلچر میں ایم فل بھی اب مکمل ہو چکا تھا۔ ایک سال قبل قیس میاں بھی شادی شدہ افراد کی لسٹ میں آ چکے تھے۔

رضا جاب کے لحاظ سے نہایت سیٹ تھا مگر وہ اپنے حال میں اب تک اب سیٹ تھا۔ سردیوں کی بھلی شاموں اور گرمیوں کے چھلساتے دنوں میں کسی کی آہیں اپنے دل میں محسوس کرتا۔ جانے وہ کیا چاہتا تھا۔ وہ اپنی خبر جان بوجھ کے نہیں لے پار ہاتھ وہ یہ جملہ اس چڑچڑی لڑکی کے لبوں سے کیوں سننا چاہتا تھا کہ۔

”کوئی رضا کی خبر لے کر آؤ۔“

وہ ایک بار کہتی تو اور کیا ایسا ممکن تھا کہ جواب پیغام بر کے ہاتھ آتا۔ پھر وہ اپنی خبر مقابل آ کے دیتا۔

وہ دونوں اپنے بیچ کے روشن محسوسات کا سوچ اکثر بند ہی رکھتے تھے جو کبھی کھل جاتا تو رضا کی جگمگانی نگاہیں عیرش کے ہر انداز میں آشنائی کی شمعیں روشن کر دیتی تھیں۔

اس نے چکور کا پنجرہ برآمدے میں رکھا اور بیوی سے راہ فرار اختیار کیے قیس کو ڈھونڈنے نکلے۔

”لگے ہاتھوں شربت بھی بناتی لے جاؤں۔“

جانے وہ کس قدر سگریٹیں پھونک چکے ہوں گے۔

وہ اسی غرض سے کچن میں آئی۔ بخت کی ماں بھنڈیاں کاٹ رہی تھی۔

”ساری عمر عفت بیگم (چھوٹی ددیا) نے آس پڑوس کے طعنوں پر دھیان دیا نہ کبھی برادری کی باتوں پر کان دھرے بلکہ اچھے نصیبوں سے مفت کی روٹیاں کھائیں۔“

عیرش نے بخت کی ماں کو ناپسندیدگی سے دیکھا اور جگ میں چینی گھولنے لگی۔

”بھئی پرانے گھر میں رہنا بڑا دل گردے کا کام ہوتا ہے۔“ بخت کی ماں نے کیسی دل جلانے والی بات کی تھی۔ عیرش نے گوشت بھونتی تائی کو چور نظروں سے دیکھا کہ بخت کی ماں چھوٹی ددیا کے خلاف بول رہی تھی۔

”اب بہونے ناک میں دم کر رکھا ہے تو ممکن ہے۔“ کسی صندوق سے عفت بیگم اپنے گھر کی چابیاں ڈھونڈ نکالیں۔ ”عیرش کا ہاتھ کانٹا۔“

بھلے ددیا کی عمر بہن کے گھر گزری لیکن وہ ان پر بوجھ تو نہیں تھیں۔ ان دونوں بہنوں سمیت گھر کی کتنی ذمہ داریاں انہوں نے اس پڑھاپے میں بھی اٹھا رکھی تھیں۔ بخت کی ماں جانتی تھی کہ دونوں بہنوں میں لگائی بجھائی اور چغلی جیسی عادت نہیں سوانہیں دیکھ کے موضوع بدلنے کی زحمت اس سمیت کوئی بھی نہیں کرتا تھا۔ کاش وہ چغل خور ہوتی اور اسے دیکھ کے موضوع بدل لیا جاتا۔ کسی پیارے کے خلاف غلط سلط سننا بھی تو تکلیف دہ کام تھا۔

”ارے نہیں آپا! اماں نے کئی بار جانے کی کوشش کی تو ہر بار حبیب آڑے آ جاتا تھا۔ ایک ہی آنگن میں پل بڑھ کے جوان ہوئے خالہ بھانجوں میں محبت بھی تو بہت تھی۔“

تائی کی حمایتی آواز نے عیرش کے دل کو ہاتھ میں پکڑی برف سے بڑھ کے ٹھنڈا ٹھار کیا کہ تائی، ”یا سمیت کسی سے پر خاش نہیں رکھتی تھیں۔“

”یہ تو آپ کا بڑا پس ہے واصفہ! کہ پرانی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھاتے زندگی گزار دی ورنہ خالہ کو اس گھر میں زبردستی بسانے والے بھانجے کی بھی اب چوٹی برسی آنے والی ہے۔“

یہ بخت کی ماں جیسی عورتیں ہی لوگوں کے صبر و تحمل میں دراڑیں ڈالنے کی ہر ممکن کوشش کرتی ہیں نہ کچھ لینا نہ دینا۔ کڑوی باتیں، میٹھی زبان، ان کی زبانوں پر شیطان شہد نکالتا ہے۔ وہ جگ اٹھا کے جلتی کڑھتی باہر آئی۔ اب اس کا رخ قیس کے ٹھکانے کی طرف تھا۔ اگرچہ آج قیس بھیا اس آدم پزار کے ہاں ڈیرہ لگائے تھے۔ عیرش اتنی خبر تو رکھتی تھی کہ وہ گاؤں گیا ہوا تھا۔

کمرے میں ملگجا اندھیرا تھا۔ اس نے جگ سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور دھواں اڑاتے قیس کو دیکھا..... اس کے دل کو کچھ ہوا..... جو ردا کو پانے کے لیے بے چین پھرتا تھا تو اسے پا کے بے سکون ہو چکا تھا۔ کیا اس کی پریشانی کی وجہ صرف ردا کی ضد تھی۔ وہ کارپٹ پر اس کے قریب ہی بیٹھ گئی۔ اس کے ذہن میں برسوں بعد بھی قیس بھیا کا لہجہ تازہ تھا۔

”ارے بھئی ہم کہاں کے نامحرم ٹھہرے۔ یہ وہی بچیاں ہیں جنہیں ہم کندھوں پر سوار کر کے شاخیں جھلاتے رہے ہیں۔ نیت کی پاکیزگی ہی اصل رشتہ ہے اور یہ چڑیاں تو میری بچیاں ہیں۔“

قیس کی اس بات پر رضا نے جو ٹکڑا لگایا تھا عیرش کو وہ بھی یاد تھا۔

”کاش یہ پھر سے اڑ جائیں۔“ عیرش کو اس کے ہاتھ کا لہرانا بھی یاد تھا۔

”بیویوں کی باتوں پر اتنا سیریس نہیں ہوا جاتا۔ انہیں بکنے جھکنے کی عادت ہوتی ہے۔“ قیس کے ہاتھ سے سکریٹ چھین کے وہ بیڈ سائیڈ پر آئی۔

”جدائی کے دنوں میں آپ کا ایک کمرہ جس کے لیے مثل جہان تھا، اب وصال کے ہوتے ہی کیسی شیرینی بن چکی ہے۔“

اس نے گلاس میں شربت ڈالا، قیس کا ہلکا سا

قہقہہ سننے لائق تھا اس کی بات کی تائید کرتا ہوا۔
”کسی دن پکڑ کے ایک لگانیں اور دھاڑ کے کہیں کہ بس..... تا عمر اسی ایک کمرے میں رکھوں گا مگر چھوڑوں گا نہیں۔“ اس نے جانے کس ہیر کی نقل اتاری تھی۔

تب ہی کوئی ہلکا سا کھٹکھارا..... اس نے گلاس میں شربت ڈالا اور پلٹ کے دیکھا۔ وہ ڈرینگ ٹیبل کے سامنے گیلے بال سلجھا رہا تھا، گویا وہ واش روم میں تھا۔ یہ کب واپس آیا؟ یعنی وہ خبر نہیں رکھتی تھی۔ وہ اس کے بیڈ روم میں منہ اٹھا کے چلی آئی ان کا ایک دوسرے کو سلام جواب کرنا بھی قابل دید ہوتا تھا کہ لو وصول کرو (احسان جتا کے) ہاں کر لیا (اب کہو) تم کون ہم کون۔

قیس کی طرف بڑھا شربت کا گلاس رضائے ایک شکریے کے ساتھ اس کے ہاتھ سے لیا وہ کلس کے رہ گئی۔

”یہ بیرسٹر ہاشم سے تمہیں کیا کام ہے؟“ وہ پلٹ کے قیس سے مخاطب ہوا۔ قیس نے بے ساختہ عیرش کو دیکھا جس کا رنگ اڑ چکا تھا۔ قیس جو پہلے ہی رضا سے مشورہ کرنا چاہتا تھا۔ اس نے عیرش کی آنکھوں کا اشارہ نظر انداز کیا۔

”میں نے اس سے ایک پراپرٹی کیس ڈسکس کرنا تھا۔“

”اف!“ عیرش گھبرائی۔ وہ یہ کام چپ چپاتے سرانجام دینا چاہتی تھی۔

”کیسی پراپرٹی؟“ اب رضا کی مکمل توجہ قیس پر تھی کہ عیرش کی حواس باختگی اسے اک نئی کہانی سنارہی تھی۔

”کم از کم میری تو نہیں ہے۔“ قیس ہنسا۔
”دراصل عیرش اپنے نانا کے بزنس میں سے اپنا مکمل حصہ چاہتی ہے۔“

عیرش کا دل ڈوبا۔ وہ دروازے کی جانب بڑھی۔

”کیا کوئی ایسی بات ہوگی جو قیس صاحب۔“

رضا سے شیرازہ کرتے ہوں۔ اس نے جالی کا دروازہ کھولا۔

اس کی پشت پہ گڑی رضا کی نگاہوں میں بے یقینی تھی، تاسف تھا۔ کیا عیرش اس قدر نادان بھی ہو سکتی ہے مگر اس کے قدموں کی مضبوطی اس کے فیصلے کی چٹنگی کا اعلان کر رہی تھی۔ رضا کی طویل آہ میں تفکر کی آمیزش تھی۔

☆☆☆

”اماں میں نے واشنگ مشین لگوائی ہے، ذرا دھیان رکھیے گا۔ میں ذرا ماریٹ تک جا رہی ہوں۔“
تائی نے ددیا کے سامنے سے دھاگے کا گولا اٹھا کے اپنے بیک میں ڈالا۔ ددیا ان کے دوپٹے پہ کر دیشے سے تیل بنا رہی تھیں تو انہوں نے تائی سے مزید دھاگے کا کہا تھا۔

”عیرش! تمہیں کچھ چاہیے۔“

تائی نے حسب معمول پوچھا اور ایسے میں ددیا نظر جھکا کے آس پاس کی چیزوں کو خواہ مخواہ کھنگالنے لگی تھیں۔ عیرش نے ہمیشہ کی طرح انکار کیا اور ددیا کے صندوقچے میں جھانکا جسے وہ کبھی کبھار ہی کھولتی تھیں۔ تائی زندہ تھے تو ماریٹ جانے سے قبل تائی ددیا سے بھی یوں ہی پوچھ لیا کرتی تھیں تب بھی وہ کون سا انہیں لسٹ تھا دیتی تھیں کہ سر ہمیشہ انکار کی صورت ہی ہلاتا تھا کیا تھا۔ جو تائی اب بھی ان سے پوچھ لیا کریں۔

”یہ دیکھو سچے موتی، کچھ دن قبل ٹرنک سے نکالے تھے، انہیں اپنی قیص یہ ٹانگ لینا۔“

”اللہ!“ عیرش کی آنکھیں خیرہ ہوئیں۔ اس قدر خوب صورت۔“

ددیا اسے اپنی لاجواب چیزوں سے نوازی رہتی تھیں۔ ددیا نے صندوقچہ بند کرتے ہوئے پاؤں نیچے لٹکائے۔

”آپ رہنے دیں، کپڑے، میں دھلوالوں گی۔ کل بھی بخت سے چن صاف کرواتے ہوئے دیر تک کھڑے رہنے سے آپ کے پاؤں سوچ گئے

تھے۔“ وہ آہستگی سے گویا ہوئی۔

”ارے نہیں بچی! اس عمر میں چلنا پھرنا ہی صحت ہے۔ بیٹھے رہنے سے بندہ جڑ جاتا ہے۔“

ہمیشہ کی طرح بات سہولت سے سنبھالتے ہوئے وہ صحن کی جانب چل دیں۔ عیرش سب سمجھتی تھی کہ روزمرہ کے کاموں کی نگرانی ددیا کے ذمے لگا کر انہیں مالکانہ احساس نہیں دلایا جاتا تھا بلکہ تائی یہ سب اپنی سہولت کے لیے کیا کرتی تھیں۔

”ارے اماں فارغ بیٹھی ہیں۔ سبزی ہی کاٹ لیں۔“

”اخبار ہی پڑھنا ہے تو وہاں بیٹھ کے پڑھ لیجیے۔ ساتھ ہی اسٹور کی صفائی بھی کروا لیجیے گا۔“

”ذرا یہ میلے غلاف تو اتار دیجیے۔“ ان کے سامنے تکیوں کا ڈھیر لگ جاتا۔

”نی وی دیکھتے ہوئے یہ کپڑے بھی تہ کر دیجیے گا۔“

اس قدر شیریں لہجہ۔ تائی کس قدر اچھی تھیں جنہوں نے خندہ پیشانی سے مفت خوروں کا بوجھ اٹھا رکھا تھا۔ وہ دونوں جنہیں تو زمین اور گھر میں حصہ دار تھیں اور واثق امید تھی کہ اپنا حصہ بھی نہیں لیں گی سو اپنی مرضی سے سوئی جاگتی تھیں۔ اپنا جو خرچ کرتی تھیں۔ قیس اور ددیا بھی اپنا خرچ خود اٹھاتے تھے مگر وہ مہیب دلا میں کسی چیز میں حصہ دار نہیں تھے سو اپنی مرضی سے آرام کا وقت کہاں سے ڈھونڈ لاتے۔ سچ ہے کسی کے گھر میں رہنا کوئی آسان کام نہیں ہے اور چھوٹی ددیا یہ مشکل کام تب سے کر رہی تھیں جب ان کی عمر صرف دو سال تھی۔

”اپنے نیکسن منڈیلا نے عراق جنگ شروع کرنے پر صدر بش سے بھلا کیا کہا تھا؟“ کافی سوچ بچار کے بعد بھی ددیا کے ذہن میں وہ جملے نہیں آئے تو کچھ فاصلے پہ بک ریک کی جھاڑ پونجھ کرنی عیرش سے پوچھا..... جبکہ پاس بیٹھارامس تو لفظ اپنے نیکسن منڈیلا پہ ہی لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔

اس وقت لاؤنج میں بخت کی ماں اور ددیا میں

سیاسی گفتگو ہو رہی تھی جو اس قدر پر لطف ہوتی کہ اگر آن لائن نشر ہو جاتی تو کوئی بھی مائی کا لال اور لالی (مونٹ) ہر کسی کا غم بھول جاتے۔

”چھوڑیں بھی ددیا! وہ اس قدر مشکل بات ماسی کی سمجھ میں کہاں آئے گی۔“

عیرش نے بخت کی ماں پہ غصہ تو نکالا ہی تھا بلکہ اسے کم عقل ہونے کا بھی احساس دلایا۔ کتنی چالاک تھی، جس کے پاس بیٹھتی اس کی ہو جاتی۔

عیرش کی بات پہ اس نے اچھا خاصا منہ بگاڑا۔
”آج ان سے آپ شہلا اعجاز کا کالم،“ سچ بچا کے“ ڈسکس کر لیں۔“

”اوئی ماں!“ بخت کی یاں سٹپائی۔ یہ عیرش نے اسے کیا جتلیا تھا۔ ہنسی دہانی عیرش اخبار اٹھا کے ان کے پاس چلی آئی..... اور رامس کو اپنے دانت اندر رکھنے کا اشارہ کیا۔

”وہ لکھتی ہیں کہ بہت سے پلان جو کسی بھی مقصد کے لیے بنائے جاتے ہیں۔ مئی کی مانند ڈھے جاتے ہیں پھر ہم حیران رہ جاتے ہیں کہ ایسا کیسے ہوا..... ایسا تو ممکن ہی نہیں تھا۔ اپنے قیس کے ساتھ بھی یہی مسئلہ ہوانا۔ خوابوں کا محل مسمار ہوا۔“ رامس نے بات کر کے ایک ساتھ کئی آہیں بھریں۔

”لو قیس تو وہیں کا وہیں بیٹھا ہے۔ خواب تو ردائے ٹوٹے ہیں۔“ سوئی میں دھاگا ڈالتے ہوئے تائی اچانک اماں کے پاس سرک آئیں۔ کافی ساری قیصوں پہ بٹن جو ٹنکوانے تھے۔ ”اور یہ سارا فساد رضا کا پھیلا ہوا ہے۔“

انہوں نے قیصوں کا ڈھیر پلنگ پہ پھینکا۔ عیرش نے تائی کو تحمل حواس سے دیکھا۔

”اس کالم میں رضا کہاں سے آ گیا؟“

”رضا کیوں نہیں آ سکتا۔ عورتیں تو اپنی سیاسی بات چیت میں مودی اور ڈونلڈ ٹرمپ کو کوئٹے میں کوٹ لیتی ہیں اور سیاسی ڈھانچے کو بنا تھن کے نذر قبر کر دیتی ہیں۔“ رامس اپنے قہقہے کی گردن دبوچ کر بولا۔

”اب میٹرک تک تعلیم حکومت کی ذمہ داری

ہے، اس میں ہمارے رضا کا کیا قصور۔“ دیا جو کسی اور کالم کی لائنیں پڑھ چکی تھیں، تائی کو بالا ہی بالا سمجھایا۔

”تو اور کیا، یہ رضا کی نہیں حکومت کی ناقص پالیسیاں ہیں، بخت کی ماں کو بھی تو اپنی سیاسی سوجھ بوجھ کا مظاہرہ فرمانا ہی تھا۔“

”اب بد قسمتی سے پاکستانی حکومت کی داخلی پالیسیاں کمزور تو خارجی تو بالکل ہی ناکام۔“ دیا کا لہجہ مایوس کن تھا۔

”مطلب کہ داخلی سے مراد گھر اور خارجی پھر ڈیرہ ہی ہوا۔“ بخت کی ماں نے کیا مطلب نکالا تھا کہ عیش کے لیے ہنسی روکنا محال ہوا۔

”رضانے اچھا بھلا اوپر کی منزل کا بیڈروم چھوڑ کے کارزروالے اسٹور پہ مستری مزدور لگائے تھے۔ اب اس نے تو وہ پلان اپنی پرائیویسی کو زندہ رکھنے کے لیے ہی کیا تھا (جوردا کی شراکت سے آخری دم پر تھی) مگر ردا کے دل میں تو۔۔۔ یہی خیال بیٹھنا کہ رضا

اسٹوری پہ ان کی شراکت برداشت نہیں کر سکا۔ بس اسی دن سے کڑی نے الگ گھر کی رٹ لگا رکھی ہے۔ ہم حیران ہیں کہ ردا کو یہ خیال سوجھا ہی کیونکر۔۔۔“

”اف!“ عیش کے کھلے منہ میں من بھر لڈو سما سکتا تھا۔ تائی نے بات کا سرا کہاں سے پکڑ کے کہاں جوڑ دیا تھا۔

”اسے کہتے ہیں اظہار خیال۔“ اس نے اخبار نہ کر کے عیش کے سر پہ مارا۔

”خیر، وہ ایسا غلط بھی نہیں۔ اب ہر کوئی تو پرانے گھر میں رہنا پسند نہیں کرتا۔“

بخت کی ماں اٹھتے اٹھتے بھی تیر چھوڑ گئی تھی عیش نے دیا کا رنگ اڑتے دیکھا تھا۔

☆☆☆

آج وہ اندر باہر کے سارے پودوں کو برش سے صاف کر رہی تھی۔ باہر کا کام پینا کے وہ ڈرائنگ روم میں آئی تو رضا وہاں موجود تھا۔ آج وہ وکیل سے ملنے گئی تھی اور وہ یقیناً اس بات سے باخبر تھا۔ عیش اس کی

موجودگی نظر انداز کرتی، اپنا کام کرنے لگی، وہ اس کی نگاہوں کی زد میں تھی۔ وہ اس ارتکاز پر چڑھی گئی کسی کو گھورنے کا بھی کوئی طریقہ ہوتا ہے۔

”میں تمہیں کافی عقل مند سمجھتا تھا۔“ وہ خوب صورت لب و لہجے کا مالک تھا، وہ قائل ہوئی۔

”تو میں کون سا مجنوں بنی پھرتی ہوں۔“ اس نے فوری اور سرسری جواب دیا۔

”عقل مند کا الٹ بے وقوفی بھی ہو سکتا ہے۔“ وہ ہنوز سنجیدہ تھا۔ ”کیس کرنا آسان ہوتا ہے، اس کی پیروی مشکل اور شیطان کی آنت جیسی ہوتی ہے۔ اپنے ذہن سے یہ خناس نکال دو تو بہتر ہوگا۔“ رضا اس کے لا پرواہ انداز سے چڑکے گویا ہوا۔

”جسے آپ خناس کہہ رہے ہیں، وہ میرا حق ہے۔“ وہ کام چھوڑ کے کھڑی ہوئی۔

”جن پہ کیس کرنے جا رہی ہو، تمہاری بہن اس گھر کی بہو ہے۔“ وہ بھی نشست چھوڑ کے اس کے مقابل آیا۔ ”جو تمہارے ذہن میں چل رہا ہے۔ ابھی باقی نہیں جانتے در نہ۔“

اس کے چہرے پہ پھیلا اطمینان دیکھ کے رضا کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ فی الوقت وہ کچھ بھی سمجھنے کے موڈ میں نہیں تھی۔ اس کا ہر انداز جتا رہا تھا کہ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ رضانے اس لڑکی کو نگاہ کا انداز بدل کے دیکھا تو آنکھ میں اک تعلق سا چھا۔

چلو ہم مان جائیں کہ دلوں کے صحن آنگن میں کوئی پتیل پرانا ہے

کہ جس کی سبز شاخوں پہ ہمارے دھیان کا چمچھی تمہارے گیت گاتا ہے

یہ رضا نگاہ کا کون سا نجل کھول رہا تھا۔ دل جھجک کے دھڑکا۔ اس سے پہلے کہ لاطقی کا بچ ثابت ہوتی وہ ہمیشہ کی طرح اس خوش آواز کے پہلو سے کترا کے گزر گئی۔

دھڑکنوں میں اک شور سا ٹوٹ کے اس شخص کا لب و لہجہ چرانے لگا تھا جسے سننے کو زمانے چاہیے تھے اور زمانے بھی کم تھے۔

☆☆☆

”یہ بیڈروم سیٹ کیے مجھے سال ہو چکا ہوگا اور آپ کو یہ خیال اب سو جھ رہا ہے کہ ردا میرے اس عمل سے ہرٹ ہوئی تھی۔ حد کرنی ہیں اماں۔“ وہ ماں کی بحث سے زچ ہوتا جھنجھلا کے بولا۔

”ہاں جیسے ماں تو تمہیں جانتی ہی نہیں جل کڑے!“ اب وہ بیٹے کو کیا بتائیں کہ ایک کالم کے چند جملوں نے میری آنکھیں کھول دیں۔

”یاد کرو مکمل اور عیش کی آمد پر تمہارا ری ایکشن کیا تھا۔ آزادی پر ست انسان۔“

ساتھ ہی بیٹے پر گہری نظر ڈالی کہ تمہیں اندر تک جانتی ہوں۔ ماضی کے ذکر پہ وہ بے ساختہ مسکرایا۔

”ذرا انصاف سے سوچیے۔ ہماری تمام روٹین کا کباڑا ہو گیا تھا۔ لبوں سے گیت تک چھن گئے اور وہ محترمہ عیش آج بھی پیپل کے پتوں پہ لکھی دل کی کہانیاں بانگ و دل گاتی پھرتی ہیں تو گھر میں کسی کو سنائی نہیں دیتا اور نہ ہی کوئی ان بی بی کو گھر میں موجود لونڈوں کا احساس دلاتا ہے۔“

اور اس کے کمرے کی کھڑکی کے پاس گلوں کو کھاد دیتی عیش جی جان سے مسکرائی۔ ایک تو اس کا شعبہ ہی پیڑ پتے تھا دوسرا ان پرانے درختوں کی چھایا زندگی کی پیش پہ جیسے ہاتھ رکھ دیتی تھی۔ اوپر سے ان کے تبصرے۔

”ہم تینوں بے چارے خود کو مصطفیٰ قریشی سمجھنے لگے تھے جو انہیں سرخ گھوڑوں پہ بگٹ اڑا لے جاتے۔“

وہ سر جھٹک کے ہنسا تو اس بات پہ تائی امی کا بھی تہقہہ چھوٹ گیا۔ وہ تہ شدہ شرنس اٹھانے کو جھکا تو ماں نے کان سے پکڑ کے پاس بٹھالیا۔ رضا کی نگاہ کھڑکی کے پار گئی۔ وہ اپنا سامان اٹھائے اب کسی اور سمت جا رہی تھی۔

وہ اس کی موجودگی سے باخبر تھا تب ہی گفتگو میں سرخ گھوڑوں کا ذکر چھیڑا تھا۔ وہ تو خوابوں اور گلابوں کے تذکرے بھی چھیڑنا چاہتا تھا۔

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

”جب اس بیڈروم میں کوئی آ جائے گی تو پھر کون سے کونے میں پناہ ڈھونڈو گے؟“ ماں کی بات پہ وہ مبہم سا مسکرایا۔ نگاہ نے کھڑکی کے پار کسی کو ڈھونڈا۔

”آپ چھوٹی دویا کی طرح بعد میں پچھتاہیں گی جس طرح اب ردا کہتی ہے کہ شوہر اور ساس کے علاوہ باقیوں کی خدمتیں کس حساب سے کروں، کل کو آپ کی بہو کا بھی یہی خیال ہوگا۔“

تائی امی نے بیٹے کی بات پہ بے چین ہو کے پہلو بدلا۔

”تو کیا قیس گھر لینے کا ارادہ نہیں رکھتا؟“ رضا نے ماں کو جھٹکا کھا کے دیکھا۔ ایک بے یقین اور حیران کن تاثر کے ساتھ۔

”کیوں اماں! ایک مدت گزار کے بھی دیا اور قیس اس گھر کو اپنا نہیں کہہ سکتے؟“

”اماں سے محبت اور رفاقت اپنی جگہ۔۔۔ مگر یہ سچ ہے کہ خاندان اور حلقہء احباب انہیں ہماری فیملی کا حصہ تصور نہیں کرتے۔“ واصفہ تائی کی آواز نہایت دھیمی تھی۔

”اور آپ؟“ بیٹے کا سوال مشکل تو لہجہ عجیب تر تھا۔ ماں نے نگاہ جھکائی تو اسے جواب مل گیا۔ وجود پہ اک بھاری بوجھ گرا۔

”اب اماں اس عمر میں کہاں جائیں گی مگر قیس۔۔۔۔۔ وہ جملہ کیسے مکمل کرتیں کہ مناسب الفاظ ذہن سے مٹ گئے تھے۔

وہ ماں کے پاس سے چپکے سے اٹھ گیا۔ واصفہ تائی کا دل اتھاہ میں اترا۔ وہ نادم بھی تھیں لیکن یہ بھی سچ تھا۔ برسوں کی سنگت اپنی جگہ لیکن محبت پہ حقیقت غالب آ جاتی تھی۔

☆☆☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

میں قیس، ردا اور دودیا کے بیچ گھمسان کارن پڑا تھا۔ کھڑکی سے ملحق گھنی نیل دھوتے ہوئے عیش نے جالی سے ماتھائیک کے اندر جھانکا۔ ردا اپنا کچھ سامان لیے سیڑھیاں اتر رہی تھی۔ عیش دل مسوس کے رہ گئی۔

بعد میں دونوں میاں بیوی گھر سے آگے پیچھے ہی نکلے تھے۔

کافی دیر سے نمل جانے کن دیس کے پرندوں کو تاڑ رہی تھی اور اب دودیا بھی اس کے اس مشغلے میں اس کا ساتھ دے رہی تھیں۔ چند منٹوں بعد قیس بھی چکور کا پنجرہ اٹھائے ادھر ہی چلا آیا۔

”بیوی کو ٹیکسی یا رکشہ کروا کے دے آئے ہو خیر سے؟“ دودیا نے بیٹے کو طنز کا خنجر چبھوایا لیکن قیس ماں کی بات نظر انداز کر کے عیش کی طرف مڑا۔

”ہر وقت پائپ لگا کے زمانے بھر کو دھوتی چمکاتی ہوان ڈربوں کا حال دیکھو۔“ وہ غم جاناں پہ مٹی ڈالتا اپنا پرانا سامان کا ٹھکباز سے اٹھالایا۔ عیش نے خالی پنجرہ اٹھایا اور درخت کے ایک موٹے تنے سے لٹکا دیا۔

”جن پرندوں سے اس کے دھیان کے پر باندھ کے آپ اڑایا کرتے تھے۔ وہ آپ کو مل گئی پنجرے خالی ہو گئے۔ اب انہیں چکانا یا بھول جانا ایک ہی جیسا ہے۔“ وہ تنک کے گویا ہوئی۔

ایک ہاتھ میں فائل اور دوسرے میں چائے کا کپ تھا۔ عیش نے عیش کو بہت دھیان سے سنا تھا۔ اس کا رخ ڈرائنگ روم کی طرف تھا۔

”کیا محبت کے جہان میں موسم وصال کی یہی وقعت ہے قیس صاحب! درگا ہوں پہ اڑتے پرندوں کے پر نوج کے کتاب میں رکھ لینا۔ محبت کا ایک یہ بھی رخ ہے۔ اس پر میں سے پھوٹی درگاہ کی خوشبو، محبت جیسی ہوتی ہے قیس صاحب!“

رضا کے قدم سست پڑے۔

”محبت اور عشق کا بھوت سر پہ سوار کرلو، پھر اسی لڑکی سے شادی کر کے زندگی حسین کرلو۔“ پھر زندگی

کو آسان بنانے کے لیے ایک دوسرے کی زندگیوں سے نکل جاؤ۔۔۔۔۔۔ یہ عجیب محبت ہے ہونہہ۔۔۔۔۔۔!“ اس نے کندھے جھٹک کے ایک نخوت زدہ ہنکارا بھرا۔ ”بنگ ہاتھوں سے چھین کے ایک لگاتے کہ خبردار جو گھر سے باہر قدم رکھا۔۔۔۔۔۔“

رضا نے اپنی مسکراہٹ نہایت قرینے سے سمیٹی۔ ایسے آج کل عیش پہ غصہ بھی تھا جو اپنی ضد پہ اڑی ہوئی تھی۔

”اب کہاں سے خریدوں گھر۔۔۔۔۔۔ کیا کوڑیوں کے مول بک رہے ہیں؟“ قیس جل بھن کے بولا۔

”کہتے رہے، گھر بھی بنا لوں گا۔ محبت کے ساتھ دو چار جھوٹ بول دیتے، بیوی خوش ہو جاتی۔ اب منہ پھاڑ کے انکار کر دو گے تو پھر یہی ہونا ہے جو آج ہوا ہے۔“ اس کی آواز ڈرائنگ روم تک آ رہی تھی۔

دودیا نے عیش کو سراہتی نگاہوں سے دیکھا۔ ”یہ تمام گر دوسروں پہ آزمانا آسان ہوتا ہے!“ نمل نے کافی صبر کرنے کے بعد قیس کے دل کی بات کی تھی۔ ”اپنی باری پہ یہ ٹوٹے اثر نہیں دکھاتے۔“ نمل اس سے خفا تھی۔

عیش نے ایک خوب صورت قہقہہ لگایا۔ اندر ڈرائنگ روم میں فائل پہ جھکے شخص نے اک ذرا گردن موڑ کے کھڑکی کا پردہ سرکایا تھا۔ قیس نے پنجرے کا دروازہ کھول کے پھر سے اڑا دیا۔

”میری بلا سے ہر چیز اڑ جائے۔“ وہ کسی ملال کی اتھاہ میں اتر کے بولا۔

”اسے اسیری چاہیے ہوگی تو آ جائے گا۔“ یہ آواز عیش کی تھی۔ اس نے آسمان کو دور تک دیکھا۔ ”اور اگر نہ آیا؟“ نمل زیادہ خوش فہم نہیں تھی۔ ”محبت اک خوشنما پرندہ ہے جس کے اندر رہائی کی خواہش نہیں ابھرتی جسے ہمیشہ اسیری چاہیے۔“ عیش نے چکور کے پنجرے پہ پانی کی دھاڑ ڈالی۔

قیس نے اسے معنی خیزی سے دیکھا۔ ”عیش آج کل کون سی کتابیں پڑھ رہی

ہے۔“ دودیا اس کی باتوں پہ حیران تھیں۔ اندر رضا کے سامنے لیپ ٹاپ کھلا پڑا تھا۔ وہ باہر آ کے اس لڑکی کو دیکھنا چاہتا تھا جو اپنی کتابوں میں خوش نما پرندے پر رکھ کے بہت مسرور تھی۔

☆☆☆

”لوجی۔۔۔۔۔۔ بہو گھر چھوڑ کے چلی گئی مگر عفت بیگم نے اپنا ٹھکانہ نہ بدلا۔ بیٹا سالوں سے یونیورسٹی میں پڑھا رہا ہے، ہزاروں کماتا ہوگا۔ کیا گھر کا کرایہ انور ڈ نہیں کر سکتا۔ پرائے پٹنگ توڑنے کی لت بڑی بری ہوتی ہے۔“

آس پڑوس سے دو چار عورتیں تائی کا حال پوچھنے آئی ہوئی تھیں جو ہفتے بھر سے بخار میں مبتلا تھیں۔

عیش کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ لوگوں کو دودیا سے کیا خار ہے۔ سب کو دودیا کا وہاں رہنا نظر آتا تھا جو ذمہ دار پائیاں ان پائیاں بیٹے نے اٹھا رکھی تھیں کسی کو وہ کیوں نہیں نظر آتی تھیں۔

گھر کے مسائل، بلوں کی ادائیگی، آئے دن کی مرمت۔ یہ سب قیس کے ذمہ تھا، تائی کئی دنوں سے بخار کے باعث منہ سر لپیٹ کے پڑی تھیں اور نزلہ زکام ہونے کے باوجود دودیا کچن میں بیٹھی کڑھی بنوا رہی تھیں۔۔۔۔۔۔ اور وہ دونوں کون سامفت کا کھاتے تھے۔ کچن کے ماہانہ اخراجات میں جتنے پیسے رضا دیتا تھا۔ اتنے ہی قیس بھی دیتا تھا۔ باقی سب کے کمروں میں اے سی لگے ہوئے تھے اور دودیا کے کمرے کی کھڑکی کے ساتھ ایئر کولر کی گھر گھر رستے گرمیاں گزر جاتی تھیں۔

آج کل موسم بدل رہا تھا تو نزلے زکام نے سب ہی کو لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ کچھ دیر ماں کے پاس چھینکوں پہ چھینکیں مارتا رضا اب اپنے کمرے میں جا چکا تھا۔

”عیش! رضا کو یاد سے جوشاندہ دے آنا ورنہ سچ آفس میں بھی چھینکیں ہی مارتا رہے گا۔“ دودیا کے پاؤں دبا بی عیش تائی کی آواز پہ باہر آئی تھی۔

”انہیں بھی اب یاد آیا ہے جب بخت بھی چلی گئی۔“ جوشاندہ بنا کے اس نے راس کے کمرے میں جھانکا جو بالکل خالی پڑا تھا۔ کچھ منٹوں بعد منہ بسورنی عیش اس کے کمرے پہ دستک دے رہی تھی۔

”آجائیں!“ آج رضا کی آواز خاصی بھاری ہو رہی تھی۔ وہ لیپ ٹاپ پہ کام کر رہا تھا۔

”شکریہ!“ اس کے ہاتھ سے کپ لے کر اس نے یوں کہا جیسے آرڈر دینے پر کچھ پیش کیا جائے تو ویٹرز کو کہا جاتا ہے۔ عیش نے اس کی سرخ آنکھوں میں گھورا اور پلٹ کے جانے لگی۔

”منع کرنے کے باوجود آپ کل وکیل سے مل آئی ہیں۔“ اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”آپ معاملہ سمجھنے کی کوشش بھی تو کریں۔“ لہجے میں اک ضدی درآئی تھی۔

وہ گھوم کے سیدھا ہوا اور اسے دیکھا۔

”اگر تمہیں پیسہ چاہیے۔ تو اپنے حصے کی زمین سیل کر سکتی ہو۔ میرے دوست کی فیکٹری میں میرے کچھ شیئرز ہیں میں، انہیں بیچ کے وہ رقم اس گھر کے حصے کی صورت میں دے سکتا ہوں۔ بس تم یہ ضد چھوڑ دو۔“ وہ بے حد سنجیدگی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں۔ یہ ضد نہیں ہے اور بات پیسوں کی بھی نہیں، نا انصافی کی ہے، اوپر سے ان کی دیدہ دلیری، اب مجھے بھی دینی بلانے کے کپے پلان بنائے جا رہے ہیں۔“

وہ یہ سب بتانا نہیں چاہتی تھی مگر رضا نے مجبور کر دیا تھا۔ وہ حیران ہوا۔ وہ ایسی کوئی خبر نہیں رکھتا تھا اس نے عیش کو توجہ سے دیکھا پھر ذرا لہجہ بدل کے بولا۔

”تو کیا تم نہیں جانا چاہتیں۔“ اس کے چہرے پہ جی ان نگاہوں کا تاثر حظ اٹھاتا ہوا۔ وہ کیا سننا چاہتا تھا کہ ہاں میرے لیے یہ گھر چھوڑنا سوہان روح ہے۔ اس کے چہرے پہ مسکراہٹ آئی۔

”میں جانا چاہتی ہوں۔ میں وہاں اپنے پاپا کا

آفس سنبھالنا چاہتی ہوں۔“ ایسا کہتے ہوئے اس کا لہجہ چمکا تھا اور یہ سب

www.bookspk.site

ان کا بی پی شوٹ کر چکا تھا۔
”یہ سودا مہینے بھر کا تو نہیں۔“ ددیا کی زبان بھی بے ساختہ ہی پھسل گئی۔
”خرچہ تو میرے ہاتھوں میں ہی آتا ہے نا۔ جس طرح کھینچ تان کے ایک مہینہ نکلتا ہے۔ یہ میں ہی جانتی ہوں۔“ تانی جھک جھک کرنے والی عورت نہیں تھیں اب بھی جواب سرد مہری اور متانت سے دیا۔

عیرش کے دل کو کچھ ہوا کہ ددیا کا چہچہاتا وجود اچانک جامد ہوا تھا۔ میوہ جات کی جانب بڑھتا رخصا کا ہاتھ بھی ٹھٹھکا۔
”معاف کیجیے گا اماں! لیکن ایک مخصوص بجٹ کے ساتھ بھرا پرا گھر چلانا کوئی آسان بات نہیں۔“ بخت کی ماں کا بات کرنے کا انداز ایسا تھا۔۔۔۔۔ کہ کبھی گھر چلایا ہو تو۔۔۔۔۔ تو پوچھتی۔

اس کی بات رضا کو انتہائی ناگوار گزری تھی۔ اس نے ماں پر اک شکایتی سی نگاہ ڈالی کہ کام والی کو یہ جرات کیونکر ہوئی۔ مالکوں کے معاملات میں بولنے والی یہ کون ہوتی ہے۔ لیکن ماں نظر چرا گئی تھیں۔

وہ بخت کی ماں سے بات کرتے کرتے سنہلا کہ وہ موسیٰ کی موجودگی میں بد مزگی نہیں پھیلاتا چاہتا تھا۔۔۔۔۔ رضا کا خراب موڈ بھانپتے ہوئے عیرش نے سوچا تھا کہ میوہ جات چرانے والی بلا ٹل چکی ہے۔ رضا نے اسے غافل جان کے مٹھی بھری تو وہ ششدر رہ گئی۔ لیکن ڈنر میں جب بیٹھا سرو کیا گیا تو رضا کے سامنے ڈیکوریشن سے فارغ ڈونگا آیا۔ اس نے مسکراہٹ دبا کے اس چڑچڑی لڑکی کو گھورا۔

”آپ اپنے حصے کا کھا چکے ہیں۔“ وہ ہمیشہ کی طرح تنک کے بولی تو وہ بھی ہمیشہ کی طرح ہی اس بے رونق کسٹر ڈکو گھورتا رہ گیا۔

☆☆☆

”موسیٰ کی بات الگ تھی۔ تم دونوں شروع سے ہی ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے لیکن کوئی میری پراپرٹی کی بنا پر اور پراپرٹی کے ساتھ مجھے بھی ہتھیانا

چاہے۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔“
ابھی کل ہی تو اس نے قطعی لہجے میں بہن کو اپنا فیصلہ سنایا تھا اور نمل بس خالی نگاہوں سے اسے دیکھتی ہی رہ گئی تھی۔ آج موسیٰ کی اچانک آمد اسی سلسلے کی ایک کڑی ہی تھی۔ عیرش خطرے کی بوسونگہ رہی تھی۔ تاہم وہ مطمئن تھی کہ موسیٰ اس کی بات سمجھ جائے گا۔ وہ اس سے بھائیوں جیسی محبت کرتا تھا۔ وہ نمل سے بے حد محبت کرتا تھا۔ وہ ان دونوں کے لیے ماں اور ماموں کے مقابل آسکتا تھا۔ دو دن بعد موسیٰ اور نمل کی واپسی تھی۔ اگلے دن موسیٰ انہیں شاپنگ کروانا چاہتا تھا۔ اسے اپنے چند عزیزوں سے بھی ملنا تھا۔ وہ اس وقت ہال کمرے کی عقی کھڑکی کے ساتھ لگ کے کھڑی تھی۔ وہ سب کو دیکھ رہی تھی۔

شکر ہے رضا کا رخ دوسری جانب تھا۔ تھوڑی دیر بعد موسیٰ نے بنا تمہید باندھے ان سب کے سامنے ماموں کی خواہش رکھ دی تھی کہ وہ عیرش کو اپنی بہو بنانا چاہتے ہیں۔
ہال کمرے میں اک گہمیر سکوت چھا گیا تھا۔

☆☆☆

رضا نے چند گہرے سانس لیے اور صوفے کی پشت سے ٹیک لگائی۔ اس نے کون سا کہیں باغ لگایا ہوا تھا۔ جسے موسیٰ کے ایک جملے نے اجاڑ دیا تھا۔۔۔۔۔ اسے اپنی بے قراری بلا وجہ کی ہی محسوس ہوئی۔
”ہم کہاں کے فیصلے کرنے والے ہوئے۔“ اس مختصر سکوت کو چھوٹی ددیا کی آواز نے درہم برہم کیا۔ ”آپ کی والدہ نے بچیاں ہمارے سپرد کرتے وقت ہی ہمیں ہماری اوقات چننا ہی تھی۔ پھر بھی مقام شکر ہے کہ بارات لانے سے قبل ہمیں بتا دیتی ہیں۔“

ددیا کے خائف اور گلہ آمیز لہجے نے موسیٰ کو شرمندہ کیا۔ ددیا کے لہجے نے عیرش کے دل پہ آریاں چلائیں۔ انہیں پالنے پوسنے والی۔ ان کے دکھ سکھ پہ نیندیں وارنے والی یوں ہاتھ جھاڑ کے بولی تھیں۔ ماں باپ کے بعد خالہ نے تو انہیں اپنے ساتھ ایک ماہ بمشکل رکھا تھا وہ بھی امتحانات کی وجہ

سے۔ اب کس حساب سے وارث بن کے حق جتانے چلے آتے تھے۔
”پلیز ددیا! ایسا تو مت کہیں، آپ کی رضا مندی کے بنا، بارات لانے کی مجال کون کر سکتا ہے اور آپ لوگ بھی تو کچھ کہیں نا۔“

وہ رخ موڑ کے تانی، رضا اور قیس سے مخاطب ہوا، تو رضا نے بند آنکھیں جبرائیل کھولی تھیں۔
”فرار کے لیے دینی میں لڑکیوں کی کمی تھوڑی ہے، کہ بے وقوف عیرش جسے حال دل سنانے کے لیے پھول پتے ہی ملتے ہیں۔ جو بچن میں کھڑے کھڑے خود کو ملکہ پھراج تصور کرتی ہے۔ ایسی بے سری لڑکی کا دینی میں کیا کام۔“ وہ یہ سب کہنا چاہتا تھا۔ اور جو کالج کی بوتلوں سے صندل اڑا کر ان میں میری آہٹوں کی دھول بھرتی ہے۔

جالی سے ماتھا ٹکائے کھنی بیل کے نیچے کھڑی لڑکی نے اسے بے آواز اکسایا کہ یہ بھی تو کہو۔۔۔۔۔ چکورو کا پیچرہ اٹھائے قیس کے آگے پیچھے پھرتی وہ نادان لڑکی وہ اس گھر کے بنا کہاں رہ پائے گی۔

وہ یہ بھی نہ کہہ سکا بس موسیٰ کا چہرہ دیکھتا رہ گیا۔
”اگر واقعی میں ہمیں بیٹی والوں کا رتبہ دیا جا چکا ہے تو پھر رسم و رواج کے مطابق سوچنے کی مہلت بھی دی جائے۔“ ددیا نے شیریں لہجے میں ایسی مناسب بات کی تھی کہ ہر ایک خوش ہوا۔

تو کیا وہ عیرش کی عادتوں سے واقف نہیں تھا۔ اگر وہ پلٹ کر اس کھڑکی کو گھور لیتا۔۔۔۔۔ تو اس لڑکی نے وہی کھڑے کھڑے مٹی ہو جانا تھا۔ اس کی بے قراری کی مانند اب چہرے پہ اتری مسکراہٹ بھی بلا وجہ ہی تھی۔

☆☆☆

”یہ پپیل کے نیچے کیا وقوع پذیر ہوا ہے ماشاء اللہ آوے کا آواہی یہاں جمع ہے۔“ رامس نے ہو بہو ددیا کا انداز اپناتے ہوئے بات کی تو باقی سب کے ساتھ ددیا بھی ہنس دی تھیں۔
وہ دونوں بھائی ایک ساتھ ہی گھر آئے تھے۔

اس کا ارادہ کرے کی طرف ہی جانے کا تھا مگر نثار چاچا کو دیکھا تو ادھر ہی چلا آیا۔ جو گاؤں سے اچاری آم لے کر آئے تھے تو اس جگہ کی وجہ وہ کھٹے اور کچے آم ہی تھے کہ نثار چاچا پہ نثار ہوا جا رہا تھا جو آموں کو کٹ کٹ کرتے ایک صاف کپڑے پہ اچھال دیتا تھا۔ ذرا جو پکی پھانک کسی کے سامنے گرتی تو فوری اچک لی جاتی۔ آج ردابھی وہیں موجود تھی جسے کل ددیا عیرش اور ہاشم سمجھا بھجا کر گھر واپس لے آئے تھے۔

ددیا دہائیاں دے رہی تھیں۔
”آئے ہائے سب اپنے ہاتھ قابو میں رکھو۔“
”لو جی۔۔۔۔۔ یہاں تو دل ہی مشکل سے قابو میں ہے۔“ عیرش نے رضا پہ ترجیحی نگاہ ڈالی جو اس تمام کارروائی سے محفوظ ہو رہا تھا۔ دور اور قریب کے راستوں پہ چلتا بھی وہ جان لیتا تھا کہ وہ کن نگاہوں کی زد میں ہے۔

”رضامیاں! سنائیں حال کیسا ہے؟“ نثار چاچا نے اسے محبت سے دیکھا۔

”جی بہت اچھا حال ہے۔“
”یوں سمجھیں ہمارے خراب ہالوں پہ خاموش ہونے والے مایوس پھر رہے ہیں۔“

حال تو رضا ہی نے بتایا مگر اگلا ٹکڑا قیس نے لگایا تھا کہ اس کی معنی خیزی پہ رضا جھینپ سا گیا۔ وہ کالے نمک کی ڈبیا گھٹنے کے نیچے رکھ کے دوزانو ٹیٹھی تھی۔ اسے کچے آم کھانا دیکھ کے رضا کے دانت کھٹے ہو رہے تھے۔

”ان آموں کو دھو دھا کے ہی بوری بند کیا تھا نا۔“ بخت کی ماں مسالہ جات لیے سر پہ کھڑی اب سہمہ بارہ پوچھ رہی تھی۔ نثار میاں کا ہاتھ کچھ بھر کورکا۔

”بوری اٹھانے سے پہلے سر بھی اچھے شیمپو سے دھویا تھا۔“ نثار میاں بھی چڑکے پولے۔ ان دونوں کی تکرار پہ ددیا کا دھیان بٹنے کی دیر تھی۔ عیرش کو کیریاں اڑانے کا موقع مل گیا۔

”انہیں کھانے کے بعد پھر بیمار ہو کے بستر پہ ایک ماہ گزارنا اچھا لگتا ہے۔“ وہ اس کے قریب سے

گزری تو وہ دھیمی آواز سے بولا۔ وہ دونوں ایک ہی روش پر تھے۔

”میری غیر حاضری سے آپ کا وہ ایک ماہ تو سکون سے گزرتا ہوگا۔“ وہ نگاہ ملا کے گویا ہوئی۔

”وہ پرانی بات تھی، اب ایسا نہیں ہوتا۔“ اس کے لہجے میں کوئی پارہ چکا تھا۔ وہ چند الفاظ سنبھال کے رکھنے جیسے تھے۔ وہ حیران ہوئی۔

چلو ہم مان جائیں کہ تمہاری آنکھ کا موسم جسے سرسبز رکھتا ہے اسی پتیل کے پتے پہ، محبت لفظ لکھا ہے، وہ ساتھ ساتھ بالکل سیدھ میں چل رہے تھے۔

”شاید میرا حافظہ اچھا ہے کہ پرانی باتیں اچھی طرح یاد رہتی ہیں۔“ وہ تیز چلتی دو قدم آگے ہوئی پھر کچھ اور دور..... رضائے اپنی رفتار نہیں بدلی تھی۔

آج ہوا قدرے تیز تھی، مگر پتوں کی کھن کھن کے ساتھ چند مزید آہٹیں بھی قریب سے ابھر رہی تھیں، اس نے پلٹ کے دیکھا اور گنگ رہ گئی۔ قیس کے ساتھ وکیل کا اسٹنٹ ڈرائنگ روم کی جانب بڑھ رہا تھا۔ اس نے شپٹا کے رضا کو دیکھا جس کی آنکھوں میں غبار سا بھر گیا تھا۔

”مان لیا کہ تمہارا حافظہ اچھا ہے۔ تمہیں ماضی میں گھومنا اچھا لگتا ہے۔“ اس کی پیشانی نے شکنوں کا جال بن رکھا تھا۔ عیرش نے چپکے سے نگاہ موڑی اور ہاتھوں سے لباس درست کیا۔ اب وہ پیچھے اور لمبے ڈگ بھرتا رضا، بہت آگے جا چکا تھا۔

☆☆☆

”غضب خدا کا بوری آموں سے بھری..... اور مرتبان دیکھو۔ گردن سے بھی نیچے۔“ ددیا کا صدمہ کم ہی نہیں ہو رہا تھا۔

”گردن سے اوپر کیسے جاتا، دین دھاڑے چوری ہو گئی اور آپ بخت کی ماں سے لڑتی رہ گئیں۔“ رامس نے دادی کو بھڑکا کے اپنا بدلہ لیا کہ عیرش نے بجائے پکوڑے یا کباب بنانے کے رامس کے دوستوں کو آج چائے کے ساتھ صرف بسکٹوں پہ ٹرٹا دیا تھا۔

”اب چور اندر تک مریج لگا کے مال ہڑپ کر رہے ہیں بلکہ مال تو ہضم بھی ہو چکا۔“ اس نے ہاتھ جھاڑ کے لہرائے۔

”اے ہے پیچھے ہو..... میں نے خود دیکھا تھا لڑکیاں ہاتھ جھاڑ کے آگئی تھیں۔“

”آپ نے ثابت کر دیا کہ پولیس کی ہمدردیاں چوروں کے ساتھ ہوتی ہیں ذرا سوچیں۔ جو عیرش صاحبہ تین ٹی جگ میں شربت بنائے لگتی تھیں تو کیا نثار چاچا کو اس سے نہلانا تھا۔“

پکن میں چائے بناتی عیرش نے دانت کچکچائے اور دروازے میں آئی کہ رامس کو زبان بند رکھنے کا اشارہ کرنا چاہیے۔ اس کینے نے کباب ہی بنوانے تھے۔ اس نے رضا کو ہال کمرے میں آتے دیکھا۔ کل سے اس کا موڈ خراب تھا..... ورنہ وہ آتے ہی اس سے چائے کا ضرور کہتا۔

”ہر وقت فضول کے ڈرامے نہ کرتے رہا کرو۔“ تمہاری جاب کا کیا ہوا؟“ اس نے آتے ہی رامس کی کلاس لی۔ مگر اس کا دھیان عیرش کی طرف تھا جو اسے اشاروں سے سمجھا رہی تھی کہ کباب بنادوں گی مگر زبان بند رکھو، دوسری صورت میں ددیا نے وہ کچے آم پاتال سے بھی نکلوا لینے تھے۔ وہ رضا کے چہرہ موڑنے پہ رکی جس نے اچھتی نظر ڈال کے رخ بدل لیا تھا۔

”اس ملک کی باگ ڈور تو کسی کے ہاتھ میں ہے نہیں، ہر کوئی کرسی کی فکر میں ہے، جاب کہاں سے ملے گی؟ ہر طرف اندھیر مچا ہے اندھیر اور میرا ذہن تو ابھی تک قلابازی کھا رہا ہے کہ لڑکیوں نے کیسا ہاتھ دکھایا ہے۔“ وہ رامس کی حمایت میں کافی بول چکھیں تو انہیں اپنا مسئلہ یاد آیا۔

”چھوڑیں ددیا! اچار بھی تو انہوں نے ہی کھانا تھا۔“ رشوت کا اشارہ ملتے ہی اس نے بیان بدل لیا۔ ”دل کو قلابازیوں سے روکیں، اب اس عمر میں چک دک پڑ گئی تو۔“ رامس کی کایا پلٹی۔ ددیا کی سمجھ میں تو نہیں آیا مگر رضا سمجھ چکا تھا۔

”تم سے کہا تھا میرے دوست ساجد سے ملو۔“ اسے اب واقعی رامس کی جاب کی فکر ستانے لگی تھی تب ہی عیرش نے وہاں آ کر ان دونوں کے سامنے چائے رکھی۔ وہ حیران ہوئی جب رضا وہاں سے اٹھ کے چل دیا۔

”میں اماں کی طرف جا رہا ہوں۔ رات کو انہیں لیتا بھی آؤں گا۔“

وہ ددیا سے مخاطب ہوا۔ تائی آج صبح سے اپنی بہن کے گھر تھیں۔

”پہلے چائے تو پی لیں پھر اکٹھا نکلتے ہیں۔“ رامس نے مشورہ دیا۔

رضایوں کھڑا رہا جیسے سنا ہی نہیں یعنی بہت سنجیدگی سے ناراض تھا۔ عیرش کمرے میں جانے کے بجائے واپس پکن میں آئی کہ تائی لوگوں نے اگرچہ ڈنر کے بعد ہی آنا تھا لیکن ردا دوپہر کا بچا سالن نہیں کھاتی تھی۔ اس نے فریزر سے گوشت کا پیٹ نکالا۔

”بابی! دوپہر کے کرپلے گوشت سے کام چل جائے گا۔“ بخت کا ارادہ ابھی نی وی دیکھنے کا تھا۔

”ہمارا کام تو چل جائے گا مگر ردا کا ریٹے کا بھی نہیں۔“ وہ مسکرائی۔

بخت جاتے جاتے رکی۔

”تو آپ کیوں دخت میں پڑ رہی ہیں اگر تازہ کھانے کی شوقین ہے تو اپنے لیے خود بنائے۔“

عیرش نے منہ بگاڑتی بخت کو ہلکا سا گھورا۔

”یہاں سے تھک کر جاتی ہو پھر کنیر کے کام یوں کرنی ہو؟“ (وہ اس کی مامی تھی)

”ہائے..... وہ تو صبور کی ماں ہے جی!“

”تو ردا..... ددیا کی بہو ہے۔“ بخت سے بات لرتے ہوئے بھی پیاز کاٹتے ہوئے بھی اس کا ذہن رضا میں ہی اٹکا ہوا تھا۔ بخت کافی ذہین تھی۔ تھوڑی سی سوچ بچار کے بعد اس نے ہاں..... کو کافی لمبا کھینچا تھا۔

☆☆☆

یہ اگلی شام کا ذکر ہے، وہ دونوں بازار سے تھک

ہار کے آئی تھیں۔ ددیا نے کیا کچھ نہیں خریدا تھا، ابھی وہ پانی پینے کے بعد قیمتیں ہی ڈسکس کر رہی تھیں کہ تائی اوئی گولوں کے ڈھیر سمیت چلی آئیں۔

عیرش نے ان گولوں پہ ایک ناگوار نظر ڈالی..... تائی جب بھی بہن کے گھر سے ہو کے آتیں تو پانچ چھ دوپے تو ضرور ہی اٹھلاتیں۔

”آج کل بازار میں کیا نہیں مل رہا۔“ عیرش نے ایک دو بار انہیں جتایا بھی تھا۔

”ارے بھی، آپا کو اماں کے ہاتھ کا کروشہ بہت پسند ہے۔“

بعد میں ددیا نے اسے گھر کا۔ ”فارغ ہی تو ہوتی ہوں۔“

”جتنا آپ فارغ ہوتی ہیں۔ سب جانتی ہوں۔“ وہ تپ کے بولی تھی۔ تائی آج کل ان سے تکیوں کے غلاف سلوار ہی تھیں۔

”بازاری غلافوں کا ناپ کہاں فٹ آتا ہے۔“ عیرش کے دل میں سکھے چلے۔

”تو ٹیلر سے سلوائیں، ناکس قدر اچھی پائپنگ کرتے ہیں۔“ اس نے ہمیشہ کی طرح فوری مشورہ دیا۔

”تو پائپنگ بھی لے آئی ہوں۔“ اب اس جواب پہ عیرش ہکا بکا ان کا منہ تکی رہ گئی۔

اب اون کے پھولے گولے دیکھ کے اس کا دل جیسے بھج سا گیا تھا۔ ابھی دو دن قبل ہی تو ددیا تکیوں کی سلائی سے فارغ ہوئی تھیں۔

وہاں اب شاپنگ دیکھی جا رہی تھی۔ تائی کے سوٹ کے ساتھ وہ بخت کی ماں کے لیے بھی ایک سوٹ لائی تھیں۔ عیرش منع کرتی ہی رہ گئی۔ وہ انہیں اس عورت کا دوغلا پن بھی کھل کے نہیں بتا سکی تھی..... مگر اشاروں کنایوں میں اس کی مخالفت ضرور کرتی تھی۔

”لوگ کہاں جھوٹ بولتے ہیں دراصل ہماری حقیقت قابل رحم ہوتی ہے۔ لوگ جس کی وضاحت کرتے ہیں۔ مگر بخت کی ماں مجھے ملکہ تصور کر لے تو

میں اپنے لیے محل ڈھونڈنے لگوں گی۔ بھلے سو سال تاج پہن کے بیٹھی رہوں گی۔ تو عفت اسلام اور تو اور تم بھی کہو کی بڑی آئیں ملکہ عالیہ۔“

دو دیا نے اپنا ہی مذاق اڑایا تھا۔ مگر عیش مسکرا بھی نہیں سکی تھی۔

”ہماری زندگی کسی شعر کی مانند ہوتی ہے اور لوگ بہت اچھے نثر نگار ہیں عیش! جوزیر، زبر، پیش تقدیر کے ہاتھوں رہ جاتے ہیں وہ زمانہ لگا دیتا ہے۔ جو ہوں، وہی تو کہتی ہے بخت کی ماں۔“ جب ددیا نے سوٹ دکھایا تو تائی کا چہرہ پھیکا پڑا تھا۔

”اس قدر اچھی لان بخت کی ماں کہاں پہنتی ہے۔“

”تحفہ کسی کی اوقات جتانے کے لیے نہیں، اپنی محبت میں دیا جاتا ہے۔“

دو دیا کی اس شان دار بات پہ پتا نہیں تائی کے چہرے پہ کیا گزرا ہوگا کہ اس کا رخ تو باہر کی طرف تھا۔ وہ لان کے مشرقی حصے میں چلی آئی۔ وہ لکڑی کے جھولے پہ بیٹھا کسی سے فون پہ بات کر رہا تھا۔ وہ وہاں چہل قدمی کی غرض سے نہیں آئی تھی کہ پاؤں تو پہلے ہی دکھ رہے تھے۔ وہ اسے دیکھ کے اپنی جگہ سے گھڑا ہوا۔ عیش کے دل کو دھکا سا لگا۔ وہ یوں اچانک اجنبی بن چکا تھا۔

”میں نے کچھ پیپر ز پہ سائن کیے تھے۔ ابھی تو کیس فائل ہوا ہے۔ ابھی تیار ہوگا اس تمام عرصے میں ممکن ہے مجھے آپ کا تعاون بھی درکار ہو۔ آپ ابھی سے۔“

وہ خاموش ہوئی۔ جانے وہ کیا کہنا چاہتی تھی وہ اس قدر حیرت میں مبتلا تھا کہ اسے دیکھے ہی گیا۔

”اس کے بعد تم جو لطفے انہیں سناؤ گی وہ انجوائے کرتے ہوئے تمہارا شکریہ ادا کریں گے۔ ابھی تو کیس فائل ہوا ہے۔“ رضائے اس کی نقل اتاری تو اسے شدید غصہ آیا۔

”وہ ہمیں مٹانے کے لیے ہم سے دست بردار ہوئے تھے اور اب اپنے مفاد کی خاطر ہمیں ڈھونڈ نکالا

ہے تو یہ کہاں لکھا ہے کہ ظالم ہی جیتے، غاصب ہی جیتے۔“ اگرچہ وہ کڑے ضبط کے ساتھ گویا ہوئی تھی لیکن اس کی آواز — ررندھ گئی۔

یہاں ظالم ہی جیتا — ہے۔ غاصب ہی جیت جاتا ہے، مظلوم قلم میں سمندر بھر کے لکھتا رہے کوئی بھی ہنس پڑے گا، بھلے قلم سارا سمندر لی جائے اور ظالم کے ایک نکتے کو پورا ہجوم بڑھ کے دیکھتا ہے کیونکہ وہ طاقتور ہوتا ہے۔“ وہ شخص اسے اپنے لہجے کے نرم پھندے میں لانے کی کوشش کر رہا تھا۔

اس نے رضایہ تیز نظر ڈالی۔ ”طاقتور کا چونکنا اور ٹھٹھکنا بھی کمزور کی جیت ہوتی ہے۔ جیت تو قسمت کی بات ہے لیکن میں انہیں چونکاؤں گی اور ڈراؤں گی ضرور۔“

وہ رضائی آنکھوں میں دیکھ کے بولی۔

”اور نمل۔۔۔۔۔ اس کا کیا ہوگا؟“ اس کی آواز میں تمسخر تھا۔ وہ آگے بڑھتے ہوئے رکی۔

”مجھے موسیٰ کا نہیں، نانا کی پراپرٹی میں سے اپنی ماں کا حصہ چاہیے۔“

اس میں نمل بھی حصے دار ہوگی۔“ وہ فوری بولا۔

”آدھا حصہ اس کو دے دوں گی۔“

”واہ کیا فراخ دلی تھی، جیسے ہاتھ بڑھا کے کسی درخت سے کوئی پھل توڑ لینا تھا۔ یہ نمل کا، یہ میرا، یہ لڑکی کس قدر خوش فہم ہے۔“ رضا کا دل قہقہہ لگانے کو چاہا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ کوئی مناسب موقع دیکھ کے اب ددیا کو اس کی حماقت سے آگاہ کرنا ضروری ہو چکا تھا۔

☆☆☆

وہ مناسب وقت اسے اگلے دن ہی میسر آ گیا۔ ”کل تمہارے ساتھ وہ پینٹ کوٹ والا کون تھا اور اس کی موجودگی میں عیش ڈرائنگ روم میں کیا کرنے گئی تھی؟“ فیس کو دیکھتے ہی ددیا کو وہ بات یاد آ گئی تھی۔ اب صورت حال یوں تھی کہ ددیا کی نگاہیں بیٹے پر۔ بیٹے کی نگاہ عیش پر۔۔۔۔۔ پر اور عیش اس نے رضا کو دیکھا۔ وہ اسے نگاہ سے کیا اشارہ کرتی۔

”ددیا آپ مجھے ایک قصہ سنایا کرتی تھیں جس میں ایک فقیر کو ایک شہزادی سے محبت ہو جاتی ہے جبکہ وہ شہزادی جانتی ہی نہیں کہ اس کے باغ میں وہ فقیر اس کی ایک جھلک دیکھنے کو آتا ہے۔۔۔۔۔ اور پھر۔۔۔۔۔ وہ بیسے سانس لینے کو رکی۔ رضائے اسے یوں دیکھا جیسے کوئی عقلمند سوداگر کو دیکھتا ہوگا۔

”ہائیں! ددیا خود حیران۔“ اس قصے سے اس لے تڑنگے آدمی کا کیا تعلق۔“

”بس ہے نا۔ آپ سنئے تو۔“ لیکن عیش کے ہونے سے قبل ہی رضائے انہیں ساری رام کہانی کہہ نائی۔ اب وہاں مکمل سکوت تھا۔ کافی دیر حیران ہوئے لے بعد ددیا نے فیس کے ہاتھوں پہ اپنی موسیٰ سٹیج پہنچ لے ماری۔

”وہ تو بچی ہے مگر تیرے منہ میں ابھی کتنے انگ اگنے باقی ہیں۔ تو بہ۔۔۔۔۔ تو یہ اس لڑکی کی دیدہ لیری تو دیکھو۔“ انہوں نے رضا کو گھورتی عیش کے لندھے پہ بھی ایک دھموکا جڑا۔ ”تیرا خیال ہے کہ ادھر تو نوٹس بھیجے گی ادھر وہ خوف خدا سے ہر تھر کاٹنے لگیں گے۔ دنیا میں اندھیر مچا ہے۔“ ددیا نے فکر آمیز سانس بھرا۔ ”غاصب، حق حقوق کی اس جنگ میں دنیا جیت کے آخرت ہار دیتے ہیں۔۔۔۔۔ اور انہیں اس بات کی پرواہ تک نہیں ہوتی، اس کام میں پڑنے سے پہلے تمہیں ہزار بار سوچنا چاہیے تھا جس کا نتیجہ صفر ہے عیش!“ ددیا بالکل گم صم ہو گئی تھیں۔ جس کے تیور تار ہے تھے کہ وہ ہر طرح کا نتیجہ بھگت سکتی ہے۔

☆☆☆

”موسیٰ کو آپ نے بتایا ہے؟“ وہ تلملاتی ہوئی اس کے سامنے آئی، جو کہیں جانے کے لیے بالکل تیار تھا اس نے کوئی بھی جواب دیے بنا خاصے اہتمام سے نود پہ پرفیوم چھڑکا۔۔۔۔۔ جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں تھی۔ وہ اس کی بے نیازی پہ مٹھیاں پہنچ کے رہ گئی۔

”میں نے آپ سے کچھ پوچھا ہے؟“ مختصر وقفے کے بعد وہ دوبارہ گویا ہوئی تو وہ آہستگی سے پاٹ کے اس کے سامنے آیا۔

”تمہارا کیا خیال تھا کہ وہ کیس فائل میں ہی پڑا رہے گا، وکیل کو تم نے لاکھوں روپے کس کام کے دیے ہیں؟“ وہ سنجیدگی سے کہہ کر اس کے قریب سے گزرا۔ ”موسیٰ سے کہہ دیجیے گا۔ میں کسی طور اب پیچھے نہیں ہٹوں گی۔“ ضد ہٹ دھرمی اور تباہی اس کے لہجے میں کچھ ایسا ہی تھا، وہ دو قدم پیچھے ہو کے اس کے روبرو ہوا۔

”تم غلط کر رہی ہو۔“ اس کا لہجہ شکن آلود تھا۔

”اور پلیز۔۔۔۔۔ ایسے مت کرو۔“ عیش کے چہرے پہ دنیا مٹا دینے جیسا تاثر پانے کے وہ ایک دم ہی سنجی ہوا۔

”ہر کوئی اپنی جگہ چھوڑ دے گا۔“

رضا کے لہجے کی حدت پہ۔۔۔۔۔ وہ چونکی پھر کسی جادو کے زیر اثر ہی مسکرائی۔

”جگہ چھوڑ دینے سے یا کچھ بھی چھوڑ دینے سے کسی کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

رضا ششدر ہوا۔ وہ کسی قدیم دکھ کے ساتھ جی رہی تھی۔

”فرق پڑتا ہے عیش! صرف انہیں فرق پڑتا ہے“ وہ لفظ چبا کے بولا۔ ”جو آپ کو زندگی سمجھتے ہیں اور آپ ان پہ پاؤں رکھ کے آگے بڑھ جاتے ہیں جیسے نمل جیسے موسیٰ اور۔۔۔۔۔“

رضائے ان ہلکی سیاہ آنکھوں میں جھانکا۔۔۔۔۔ عیش کا دل رفتار سے عاری ہوا۔۔۔۔۔ اور اس نے نگاہ پھیر کے سانس کی آمد و رفت بحال کی۔ پیتل کے تھال سے ریشمی رومال اڑ چکا تھا اور پیتل کے پتوں پہ تحریر داستان بہت قدیم تھی۔ ایک فقیر کو ایک شہزادی سے محبت ہو جاتی ہے اور وہ داستان ادھوری چھوڑ کے تیزی سے پلٹ آئی تھی۔ جالی کا بھاری دروازہ زور سے بج کے اب اس شخص کی طرح بالکل ساکن تھا۔

☆☆☆

کچھ لوگ خوف زدہ ہوتے ہیں تو منہ سے کوئی آواز تک نہیں نکالتے۔ ڈر کے مارے سہم جاتے ہیں۔ کچھ لوگ خوف زدہ ہو کے چیخنا شروع کر دیتے ہیں۔

عیرش کی خالہ اور ماموں کا شمار اس دوسری قسم میں کیا جاسکتا تھا، عیرش ایک کے بعد ایک کال ریسیو کرتی۔ کبھی مسکرا دیتی۔ کبھی خاموش ہو جاتی تو کبھی جتنا سنتی اس سے زیادہ سناتی۔

”عیرش! تمہیں کیا ہو گیا ہے ہم تو آج بھی تم دونوں سمیت خود کو پانچ بہنیں تصور کرتی ہیں۔ اس کی خالہ زاد) اونہ پانچ بہنیں، وہ تلخ ہنکارا بھرتی، ممانی اور ماموں زاد بہنوں کے شیریں لہجے، عیرش ان آوازوں کو انجوائے کرتی۔ اگر کوئی خاموش تھا تو موسیٰ اور نمل..... اور یہ بات اس کو بے چین کرتی۔

وہ جھنجھلا جاتی پھر نمل کو فون کرتی۔

”ہاں سناؤ عیری کیسی ہو، کوئی کام تھا؟“ نمل کا اجنبی، الہجہ، وہ پریشان ہو جاتی۔

”کیا مصیبت ہے ددیا! میں نے کون سا کسی کی ریاست بردھا دیا ہے، اپنا حق ہی تو مانگا ہے۔

”تمہیں پر یوں والی مووی یاد ہے عیرش، جہاں ایک پری کو ایک خوب رو شہزادہ قید کر لیتا ہے۔“ خالہ کی بیٹیاں ماضی کی باتیں کرتیں۔

”اف..... شہزادہ..... قید اور نمل“ وہ بدحواس ہو جاتی۔ ”مجھے کچھ یاد نہیں۔ مجھے اس فقیر کا قصہ یاد ہے۔

اس شہزادی کو ایک نجومی نے بتایا تھا کہ چالیس دن کسی فقیر کو پانی پلانے سے تمہاری مراد برائے گی۔ اب روز شہزادی سونے کی قیمتی صراحی میں پانی بھر کے فقیر کو پلاتی۔“

ددیا اس پر دم کر کے پھونکتیں۔ ”میری بچی یہ کسی نے جادو کر دیا ہے۔“ وہ قصہ ادھورا اچھوڑ کے اٹھ جاتی۔

”عیرش سنو تو، اس کے بعد پھر آگے کیا ہوا؟“ ردا آوازیں دیتی رہ جاتی۔ وہ کچن میں آ کے راہداری سے گزرتے رضا کو دیکھتی۔ اور تائی اس چھٹانک بھر کی لڑکی کو گھورتیں۔

”غضب خدا کا۔ اتنا بڑا قدم اٹھالیا۔ اگر انہوں

نے نمل کو بھیج دیا تو۔“ تائی کو اک نئی فکر گھیر لیتی۔

ان دنوں قیس کی حالت قابل رحم تھی۔ اسے دیکھتے ہی چپ کاروزہ رکھ لیتیں۔ رضا سے بات کرتا تو جواب ہوں یا ہاں میں ملتا۔ بس ایک عیرش تھی جو ہر کام میں پیش پیش، سب کو خوش رکھنے کی کوشش کرتی ہوئی خود اندر سے بہت ناخوش تھی۔

”میری سیدی سادی بھانجی جو ڈھنگ سے پوچھتا تو تک نہیں باندھ پانی اسے میرے مقابل لانے والے آپ سب ہیں۔“ اس نے سر جھٹکا اور اس کی خالہ کی بہو نقل اتاری۔ ہال کمرے کی کھڑکی کے ساتھ چپکے عیرش جالی سے ماتھا ٹکائے جیسے سوچتی تھی۔

”خالہ کی نظر میں بھانجی کی عمر پاکستان آگے کے بعد رک چکی ہے۔ انہیں کیا خیر، پونی تو کیا اب ان کی بھانجی صاحبہ گھوڑے اور ہانجی بھی باندھ لیتے ہیں۔“ رضا کے غصے کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ جانے چھروں کے کانٹے سے یا رضا کی اس بات سے حواسوں میں لوٹی تھی۔

”صہیب کی بچیوں کو یوں رہنا چاہیے۔ دوں رہنا چاہیے، اپنی نرمی کا نتیجہ دیکھ لیا نا۔“ اب اس نے پیچاری ددیا پر چڑھائی کر دی تھی۔

”اتنی جرات ہے تو آ کر مجھ سے بات کرے۔“ تملائی۔ ”تف ہے اس بندے پر ت کے ساتھ بھی طے ساتھ بھی۔“ اس نے دانت پس کر اپنی چند بھری لٹوں کانوں کے پیچھے اور دوبارہ جالی سے پیشانی لگائی۔

”مجھے اسی بات کا ڈر تھا کہ سارا الزام ہمارے سر آئے گا۔ لئیر اور لاپچی ہمیں ہی سمجھا جائے گا۔“ کس تن فن سے بول رہا تھا جیسے چلتے توے پر بیٹھ ہو۔ آج وہاں عیرش کی خالہ آئی تھیں اور تمام گھر والوں کو وہ کچھ سنا گئیں جو بیان سے باہر تھا۔

”آپ لوگوں پر تو پھر بھی ہاتھ ہولا تھا۔ رگڑا میرے شوہر تو گیا ہے۔“ ردا کے الفاظ نے عیرش تکلیف سے دوچار کیا کہ خالہ نے قیس کو کنگلا، بھک منگا اور جانے کیسے کیسے القابات سے نوازا تھا۔

”ددیا آپ اپنی چیتتی سے کہہ دیجیے گا کہ یہ تمام

اس گھر میں دوبارہ نہیں لگنا چاہیے ورنہ۔“ رضا نے اٹلی اٹھا کے دو ٹوک الفاظ سے تنبیہ کی۔ عیرش نے ہنسا کھایا۔

”ذرا جو بزرگوں سے بات کرنے کی تمیز ہو۔ بات ہے تو میرا سامنا کرے۔“ اس نے پیرنچ کے رنسا کو گھورا۔

”عیرش کیا سمجھتی ہے کہ پاپ لگا کر جیسے وہ پیڑ پودوں سے گرد دھو دیتی ہے تو بے عزتی کا احساس بھی کسی پانی سے دھل جاتا ہوگا۔“ وہ اپنی جگہ سے اپنا ٹک کھڑا ہوا۔ وہ بدک کے پیچھے ہوئی۔

”بھئی میں نے تو صاف صاف کہہ دیا تھا کہ آپ کی بھانجی کے کرتوتوں کی ہمیں تب خبر ہوئی جب پانی پلوں کے نیچے سے گزر چکا تھا۔“ تائی بھی بیٹے کے ساتھ ہی اٹھی تھیں۔

”تو کیا کرو گے۔“ ددیا جو کب سے گونگے کا گڑ لہا کے بیٹھی تھیں۔ اب جیسے مرچیں چبا کے بولیں۔

”اسے گھر سے نکال دو گے۔“ وہ جم سا گیا۔ پھر کھڑکی پر سرسری تیرتی ہوئی سی نظر ڈالی۔ ”جو بھی ہوگا وہ بعد کی بات ہے۔

اس نے قیس کو بغور دیکھا جس نے صاف نگاہ پڑائی تھی۔

وہ عیرش کا ساتھ کسی صورت نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ اگلے چند دن رضا کے لیے پریشان کن تھے کہ عیرش نے کیس واپس لینے سے انکار کر دیا تھا۔ اس نے ناکہ قیس بھی آج کل کرائے کا گھر ڈھونڈ رہا ہے۔

☆☆☆

اس نے کئی منٹ انتظار کیا مگر وہ کچن میں نہیں آیا تھا۔ اس بندے کی ناراضگی اسے ڈسٹرپ کر رہی تھی ورنہ تو سب ٹھیک تھا۔ آج اس کی بات نمل سے ہوئی تھی۔ موسیٰ کا رویہ اس کے ساتھ ٹھیک تھا۔

”دیکھا آپ کے خدشات بے کار کے تھے۔“ اس نے ددیا کو خوش ہو کے بتایا تھا جنہوں نے خاموش انہوں کے ساتھ عیرش کی سب ٹھیک ہے جیسی خوش

فہمی کو برقرار رہنے دیا تھا ورنہ دریا کو رضا کی زبانی علم ہو چکا تھا کہ موسیٰ پر ماں کا دباؤ بڑھتا جا رہا ہے۔ موسیٰ رضا سے رابطے میں رہتا تھا۔

وہ چائے لے کر آئی تو رضا کے سوا وہاں سب ہی موجود تھے۔ قیس گھر کا ایڈوائس دے چکا تھا۔

”بھئی ردا کی خواہش تو بنا کسی فقیر کو پانی پلائے پوری ہو گئی۔“ ردا کسی دھیان سے نگلی۔ اس نے خواب یاد دلایا۔

”عیرش پھر آگے کیا ہوا تھا۔“ ردا ابھی تک تجسس میں تھی۔

”پھر جب چالیس دن ختم ہوئے تو اکتالیسویں دن اس باغ میں سے گھوڑے پر سوار شہزادے کا گزر ہوا۔ جو شہزادی کے خواب میں آتا تھا۔

”میں ابھی آئی۔“ وہ سونے کی صراحی اس فقیر کے پاس چھوڑ کے خود شہزادے کے ساتھ چلی جاتی ہے۔ اور وہ فقیر خالی صراحی ہاتھ میں لیے شہزادی کے انتظار میں بیٹھے بیٹھے زندگی تمام کر دیتا ہے۔“

رامس اور ردا کے چہروں پر پھیلی اداسی دیکھ کر وہ مسکرائی۔

”ہر قصے کا اینڈ ہی کہاں ہوتا ہے۔“ اس نے بے نیازی سے کندھے اچکائے۔

”اگر شہزادی کے علم میں ہوتا کہ وہ فقیر اسے چاہتا ہے تو وہ پھر کیا کرتی۔“ رامس نے عجیب سوال داغا تھا۔

اس نے تب بھی انتظار ہی کرنا تھا۔“ جواب ردا

نے دے کر عیرش کو مشکل سے نکال لیا تھا۔ چونکہ جانتی تھی کہ وہ جس کا انتظار کچن میں کرتی رہی تھی وہ تھکا ہوا شخص آج برسوں بعد ہال کمرے کے کونے میں بڑے صوفے پر آ کے چپکے سے لیٹ گیا تھا اور اب قدیم قصوں کے کرداروں میں خود کو ڈھالتی اس لڑکی کو بے دھیانی میں ہی سوچے جا رہا تھا جو بے حد نادان تھی۔

☆☆☆

علی الصباح ہال کمرے میں سے باتوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ اور یہ خلاف معمول تھا کہ دوسرا وقت تلاوت کیا کرتی تھیں۔ اس نے بحس کے بارے وہاں جھانکا اور منجھد ہوئی۔ اس کے سامنے نمل تھی۔ جس نے آہٹ بر مڑ کر دیکھا تھا۔ وہ عیش کو وہیں جمادیکھ کے پھیکا سا مسکرائی۔

موسیٰ نمل کو گیسے چھوڑ سکتا ہے؟ کوئی بے یقینی سی بے یقینی تھی۔ وہ نمل سے محبت کرتا تھا۔ اب بھی اسے چاہتا ہوگا وہ اس کے بچے کی ماں بننے والی ہے۔ اس کے اندر ایک ساتھ کئی اعتبار ٹوٹے۔ نمل نے ہی آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگایا۔ عیش نے اسے بغور دیکھا۔ جس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔

”آپ کو بڑی بی بی بلارہی ہیں۔“ بخت وہاں اچانک نازل ہوئی، اس کا ارادہ فی الحال کچن میں جانے کا نہیں تھا لیکن وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے ساتھ ہوئی۔ وہاں تائی نے چولے پر سالن چڑھا رکھے تھے۔

”خیر تو ہے۔“ اس نے آتے کے ساتھ پوچھا۔ ”خیر کہاں ہے۔“ مٹی بابارات سے کارڈیا لوجی سینٹر میں ہیں۔ وہاں ان کے بھائی بہنوئی بھی ہوں گے تو رضانے صبح فون کیا تھا کہ دوپہر سے قبل کھانا بھجوا دیجیے گا۔“ تائی کے انداز میں ایک واضح بیزاری تھی لہجہ بھی کلفت زدہ تھا۔

”آٹا بخت گوندھے گی پلاؤ تم بنا دو۔“ وہ پریشان سے زیادہ حیران ہوئی۔ کیا تائی نہیں جانتیں کہ میری بہن کو گھر سے نکال دیا گیا ہے اس وقت میرے دل پر کیا بیت رہی ہے۔ انہیں احساس ہونا چاہیے لیکن انہیں پلاؤ کی پڑی ہوئی ہے۔ وہ کاموں سے بالکل بھی نہیں گھبراتی تھی، لیکن آج تائی کا رویہ اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ قصور ان کا بھی نہیں تھا۔

”تمہاری ہمت ہے واصفہ! خواہ مخواہ کا ٹبر پال لے۔“ تائی کے نمل اور برداشت کو لوگوں کی ایسی ہی

باتوں نے کمزور کر دیا تھا وہ انہیں کوئی بھی جواب دیے بنا خاموشی سے واپس ہوئی تھی۔

☆☆☆

”میرا گھر تمہاری وجہ سے خراب ہوا ہے میری ماں میں تمہیں بھی معاف نہیں کر سکتی۔“ اس وقت ہال کمرے میں موجود تمام گھر والے نمل سے کچھ ایسے ہی جملوں کی توقع کر رہے تھے لیکن جو کچھ اس نے کہا۔ وہ ناقابل یقین تھا۔

”تم حق بجانب ہو عیسیٰ، اور اب میں تمہارے ساتھ ہوں۔“

نمل کی اس بات نے سب کو حواس باختہ کر دیا تھا کہ بات عیش کو شہ دلانے جیسی تھی۔ اس وقت وہاں رضا اور چھوٹی ددیا کے ہوش اڑ چکے تھے۔ ”لیکن یہ بھی سچ ہے کہ تم یہ کیس ہار جاؤ گی۔“ نمل کی اس بات پر عیسیٰ کا دل انتہائی مدہم رفتار سے دھڑکا۔ اس نے بہن کو بے یقینی سے دیکھا۔ ”مگر کیوں؟“

”ان کے پاس بے تحاشا پیسے ہیں وہ وکیل، ججز، ہر چیز خرید لیں گے پھر یہ کیس بمعہ نقلی اور جھوٹے ثبوتوں کے کچھ اس طرح تیار ہوگا جس سے ثابت ہوگا کہ ہم دونوں اپنا حصہ وصول کر چکی ہیں۔“ نمل کی آواز مایوس کن تھی جن نے عیش کو بے بسی کی اتھاہ میں گرایا۔

”پاپا کے دوست انکل ضمیر نے ہی مجھے یہ حقیقت بتائی ہے اور وہ اب ہم سے ملنے پاکستان بھی آئیں گے۔“ اس نے سکت بیٹھی بہن کے سرد ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا جیسے دلاسا دیا ہو۔

”جب موسیٰ اس سارے معاملے سے باہر اور خاموش تھا تو تمہیں گھر چھوڑ کر کے نہیں آنا چاہیے تھا۔“ رضانے چند بے سکون سے سانس لیتے ہوئے گفتگو میں مداخلت کی کہ عیش کی پریشان حالی سے وہ ڈسٹرب ہو رہا تھا۔

کچھ دیر پہلے اس کی موسیٰ سے بات ہوئی تو اس نے بتایا تھا کہ نمل اپنی مرضی سے گئی ہے۔ نمل کا لہجہ

ایک بیاں خواں کا سا تھا خشک۔

”لیکن موسیٰ تو کہہ رہا ہے کہ۔“

”جو وہ فرما رہا ہے وہ سچ ہے۔ اور میری بہن جھوٹی۔“ وہ رضا کی بات کاٹ کے ایک دم چپٹی تھی۔ کہ وہاں ہر کوئی ساکن رہ گیا۔ وہ اس کیس پر لاکھوں لگا چکی تھی جس کیس کا وجود اب مٹنے والا تھا۔ اس پر موسیٰ کی خاموش ناراضی، نمل کی واپسی۔

دوپہر کوتائی نے بھی اسے بہت کچھ سنایا تھا کہ وہ کھانا لیے بنائی پکن سے آگئی تھی۔ بھوک غصہ بے بسی، بے چارگی ان تمام کیفیات میں گھری اس لڑکی کا ضبط دھیوں میں اڑا۔

”موسیٰ کی طرف داری تو ہوگی کہ اس کے پاس سب کچھ ہے۔ اور ہم دونوں، ہمارا کیا ہے۔“ وہ جانے کس سے مخاطب تھی۔ ”ہمارے ساتھ کوئی کیوں کھڑا ہوگا۔“ اس نے گرم چائے کو ہاتھ مار کے گرایا کیا وہ اپنے حواسوں میں تھی؟ قیس نے اسے تھامنا چاہا تھا مگر ددیا نے اشارے سے منع کر دیا۔

وہ اسے چیخنے دینا چاہتی تھیں۔ رونے دینا چاہتی تھیں۔ وہ عیش میں خود کو دیکھ رہی تھیں۔ ضبط کو بھی ٹوٹنا چاہیے۔ خاموشی آنکھ کے پانی کی مانند ہوتی ہے، بہہ جائے تو وجود ہلکا ہو جاتا ہے ”وہ میرا بھائی ہونے کا دعوے دار تھا۔ وہ نمل سے محبت کا دعوے دار تھا۔ مگر یہ سچ نہیں ہے“ وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے چلائی۔

”یہ سب جھوٹ ہے محبت اب کہاں ہے۔“ اس نے راہ میں پڑی تپائی کو ٹھوکر ماری۔ ”عیش میری بچی۔“ تائی لپک کے آئیں۔ جو بھی تھا وہ ان کے ہاتھوں پٹی بڑھی تھی۔

”محبت فقیر کے انتظار کے ساتھ ہی مرجاتی ہے۔“ اس نے تائی کے ہاتھ جھٹکے رضا کے منجھد وجود پر نگاہ ڈالی۔

☆☆☆

”جو ہوتا تھا ہو چکا اب مجھے کسی انجام کی پرواہ نہیں۔“

اس نے یہ کہتے ہوئے لا پرواہی سے کندھے اچکائے اور سوئی میں دھکا ڈالا۔ اس وقت وہ ددیا کے کرتے کی ترپائی کر رہی تھی۔ یعنی نمل گھر چھوڑ کے آگئی بات ختم، اس کی بات کے معنی بھانپ کے، ددیا کا دل اپنا ماتھا بیٹنے کو چاہتا تھا۔ نمل کون سا کیلی جان تھی بھلے وہ اکیلی بھی ہوئی۔ تو رشتوں میں بگاڑ آنے پر معاملہ صرف گھر چھوڑنے پر ہی نہیں رک جاتا۔ ایسے میں عورت کا بچ کا بل ناپتی رہتی ہے۔ انہوں نے ایک تلخ آہ بھری۔ اور عیش کو ناقہ نہ نگاہوں سے گھورا۔

”افوہ ددیا! مجھے گھورنا آسان کام نہیں۔“ وہ جزبز ہوتے ہوئے بھنا کے بولی تھی۔

”بالکل بجا فرمایا، تمہیں گھورنا اور دیوار کو گھورنا ایک ہی بات ہے۔“ قیس نے اس کی بات کو قہقہہ لگاتے ہوئے انجوائے کیا۔

”ایسی جی دار لڑکی کو اب دیوار و در ہی گھورتے ہیں۔ قیس چائے دیکھ کے ویسے ہی باغ و بہار ہو جاتا تھا۔ آج کل بیوی کے ہاتھ کی بنی چائے پی کر خوب ترنگ میں جاتا تھا۔ وہ قیس کی بات پر گزشتہ روز کا تصور کر کے قدرے جھپک کے ذرا سا شرمندہ ہوئی۔

ان سب کا خیال تھا اپنی اس کارروائی کی بدولت عیش اب دو چار دن تو کمرہ نشین ہی رہے گی۔ لیکن سب کے خیالات کی نفی کرتے ہوئے اس نے اپنی صبح کا آغاز معمول سے ہی کیا تھا۔ موسیٰ کی وجہ سے اس کے دل پر یوں کاری ضرب پڑی تھی کہ محبت سے اعتبار ہی اٹھ گیا تھا۔ کل اس کے دماغ نے کام کرنا چھوڑا تھا یا پھر کام کر دکھایا تھا، اسے اب قطعاً پرواہ نہیں تھی۔

اس تمام قصے میں غلط چیز رضا کے اوپر چائے کا گرنا تھا۔ جس پر وہ رات کو نیند غالب آنے تک کچھ بے چین سی رہی تھی۔ صبح کچن میں وہ نہایت محتاط سی ہو کر گئی تھی لیکن تائی کا خوش گوار موڈ دیکھ کے رات والی بے چینی بھی رفو چکر ہوئی۔

”آج میری ضمیر انکل سے کافی دیر بات ہوتی

رہی ہے۔ وہ فہد کے ساتھ جلد ہی پاکستان آئیں گے ان کے تعلقات بہت اوپر تک ہیں۔ وہ اس مسئلے کا حل نکال لیں گے۔“ قیس کے بیٹھے ہی وہ اپنی کرسی قریب گھسیٹ لائی۔ اور یہ سب بتاتے ہوئے خاصی پر جوش تھی۔

اس کی گفتگو سن کے ددیا کو ٹھنڈے پسینے آنے لگے تھے۔

”ان شاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔“ قیس نے اس کی تمام باتوں پر بھرپور رد عمل دیا۔

”تم جو بھی فیصلہ کرو گی، مجھے ہمیشہ اپنے ساتھ پاؤ گی۔“

ددیا نے اپنے نا سمجھ بیٹے کو حیرت کا جھٹکا کھا کے دیکھا۔ اور ناگواری سے وہاں سے اٹھ گئیں۔ وہ کسی چیز سے الجھ کے لڑکھڑائیں تو بیٹے نے فوری بڑھ کے سنبھالا۔

”شدید چکر آرہے ہیں اگر فرصت میں ہو تو کمرے تک چھوڑ آؤ۔“ تو تمہاری خبر تو لیتی ہوں دل غصے سے بھرا تھا۔

”اب ایسی بھی بات نہیں۔“ لفظ فرصت پر وہ جھل سا ہوا۔

ایک تو گھر کے سلسلے میں ردا اور وہ آج کل چھوٹی موٹی شاپنگ کر رہے تھے پھر اس کیس کی انجنوں میں گھر کے اب وہ ماں کے پاس کم ہی نکلتا تھا۔

☆☆☆

”میں تو انہیں دیکھ کے حیران ہی رہ گئی۔ ضمیر انکل بالکل پہلے کی طرح ہی اسمارٹ اور ڈشنگ لگ رہے تھے۔“ کمرے میں آتے ہی وہ اپنا پسندیدہ موضوع چھیڑ چکی تھی۔

ددیا نے اس پر کڑوی نگاہ ڈالی اور اپنے سامنے کھلے جہازی سائز ایچی کیس پر دوبارہ جھک گئیں۔ وہ اگرچہ تھکی ہوئی تھی لیکن انکل نامہ سنانے کے لیے پورا رات کی نہیں انسانوں کی ضرورت تھی۔

”ان کی گاڑی دیکھی۔“ اس

کے لہجے کا اشتیاق محسوس کر کے ددیا کا دل ٹھنکا۔ ”کل ہم نے جو تو لیے خریدے تھے۔ ذرا الماری سے نکال دو۔“

عیرش دوپہر سے محسوس کر رہی تھی کہ ضمیر انکل اور ان کے بیٹے کا گھر میں آنا کسی نے بھی اچھا محسوس نہیں کیا تھا خصوصاً ددیا کا رویہ سمجھ سے باہر تھا۔ وہ الماری سے تو لیے نکال کر لائی تو پلنگ کی پانٹی پر ہی ٹک گئی۔ دوسرے پلنگ پر سوئی نمل ہلکے خراٹے لے رہی تھی۔ عیرش بد مزہ ہوئی کہ وہ تو اس سے کہیں لگانے آئی تھی۔

”نمل کا سامان اٹیچی سے نکال کر ٹرنک میں کیوں رکھ رہی ہیں؟“ وہ ددیا کے جانب متوجہ ہوئی تو چونکی۔ پھر لکڑی کی ٹیبل پر پڑے نئے نکور ٹرنک کو گھورا۔

”سارا سامان تھوڑی رکھ رہی ہوں کچھ قیمتی اشیاء ہیں جو الگ سے رکھنا ضروری ہیں۔“

ددیا نے اسے کن اکھیوں سے دیکھا جو ایک دم پریشان ہو چکی تھی۔ یعنی کہ لوہا گرم ہو چکا تھا۔

”آج جب ٹرنک خرید کر لائی تو بجیا کی یاد آگئی۔ کبھی میرا ٹرنک بھی بالکل نیا نکور ہوتا تھا۔ اب میری طرح بوڑھا ہو چکا ہے۔“ انہوں نے اک طویل آہ بھری پھر ٹرنک کے پینڈے پر اک تولیہ پھیلا یا۔ اٹیچی سے دو گرم شالیں اٹھا کر ٹرنک میں رکھیں۔

”دادی عمر میں آپ سے بہت بڑی تھیں کیا؟“ عیرش کا لہجہ گم صم سا تھا۔

سالوں کا تو پتا نہیں، ہم اور ہمارے ماں باپ کہاں حساب کتاب رکھتے تھے۔ لیکن ہماری اماں کی وفات کے بعد جب ابا نے دوسری شادی کی تو بجیا کوئی پندرہ کے لگ بھگ ہوں گی میں ان سے کافی چھوٹی تھی۔

اپنے بیاہ کے بعد ابا نے بجیا کو بھی جلد ہی بیاہ دیا تھا۔ ہماری سوتیلی ماں کے تیور دیکھتے ہوئے شادی کے چند ماہ بعد بجیا مجھے اپنے ساتھ لے کر آگئی

تھیں۔“

”کچھ ان سلعے ریشمی کپڑے جو نمل سلوانے کے لیے لائی ہوگی۔ انہیں ٹرنک میں رکھنے کی کیا ضرورت ہے؟“ عیرش نے ددیا کے ہاتھ سے ان شوخ رنگ کے کپڑوں کو چھین لینا چاہا تھا۔ ددیا کا ٹرنک اور ان سلعے کپڑے دیکھ کر اس کی رنگت متغیر ہوئی۔

”بجیا کے سسرال میں پیسے کے فراوانی تھی۔ گھر میں نوکر چاکر سب کچھ تھا پھر خیر سے خدا نے آگے پیچھے دو بیٹوں سے نواز دیا تو گھر کی رونق کا الگ ہی سماں تھا۔ میں اپنے بھانجوں کی سنگت میں کھیل کود کے بڑی ہوئی۔ بہنوئی صاحب نے مجھے ہمیشہ بیٹی ہی سمجھا۔ جب میں میٹرک کر چکی تو انہوں نے اپنی طرف سے میرے لیے ایک بہترین گھر کا انتخاب کیا۔ میرا شوہر جانے کس لحاظ سے اچھا تھا۔ شاید بھی میں جان ہی لیتی کہ ایک دن دل کا دورہ پڑنے سے بہنوئی صاحب ملک عدم سدھا رہ گئے۔ ان کے بعد میرے سسرال والوں کو سوائے بجیا کا دکھ بانٹنے کے اور کوئی کام ہی نہیں تھا۔“

حبیب اور صہیب کی تعلیم مکمل ہونے والی تھی۔ انہیں اپنی پڑھائی سے فرصت ملتی تو ہی گھر کے مسائل پر توجہ دیتے۔ انہیں ماں کی خواہش پر بڑا افسر بننا تھا۔ اس صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میرے شوہر نے غیر محسوس انداز میں گھر کی کافی ذمہ داریاں اپنے سر لے لی تھیں تو زمینوں وغیرہ کے معاملات میں بجیا بھی جیسے بے فکر ہو چکی تھیں دیکھو ذرا، اس لڑکی کو دیکھو، زیور کپڑوں میں گھسایا ہوا ہے۔“

ددیا نے یہ کہتے کے ساتھ ہی سوئی ہوئی نمل پر ایک میٹھی سی نگاہ ڈالی۔

”اچھا کیا آپ نے یاد دلادیا۔ نمل کئی دنوں سے مجھے زیور کی بینک لاکر میں رکھوانے کا کہہ رہی تھی۔“

عیرش نے اپنی بات سرعت سے مکمل کی کہ دھیان تو ددیا کے ماضی میں بھٹک رہا تھا۔ ددیا نے اسے بغور دیکھا اور ایک گہرے سی آہ بھری۔ جیسے اسے

کچھ جتنا مقصود ہو۔

”پھر آئے دن کہے گی یہ نکلو الاؤ، وہ نکلو الاؤ۔“ وہ زیورات کے ڈبے ٹرنک کے گونے میں سیٹ کرنے لگیں۔ ”یہ عورت کے کڑے دنوں کا سا بھی ہوتا ہے۔“ اس پہاڑ جیسی بات نے عیرش کا دل مسلا۔

”وہ آئے دن زیور کیوں نکلو آئے گی ہمارے اکاؤنٹ میں اچھی خاصی رقم موجود ہے پھر ماہانہ پچاس ہزار بھی تو۔“

”وہ اب کس حساب سے ملیں گے؟“ ددیا نے اس کی بات تیزی سے کاٹی۔ ”تمام شواہد اور ثبوت یہ ہی کہتے ہیں کہ تم دونوں اپنا حصہ وصول کر چکی ہو۔“ ددیا کی رخ سی مسکراہٹ نے اسے حیرت کے کسی جہاں میں دھکیلا تھا۔ جہاں حقیقتیں منہ پھاڑ کے ہنس رہی تھیں۔

”ہاں تو میں بتا رہی تھی کہ اسلام کو (ددیا کا شوہر) جانے کس چیز کی جلدی تھی۔ وہ زمینوں کے حساب کتاب میں ڈنڈی مارنے لگا۔ ٹھکے داروں سے وصول کی جانے والی رقم کا چوتھا حصہ بجیا کو ملتا۔“ یہ بھی بڑی مشکل سے نکلو لایا ہوں۔“ تکرار کر تو آگے سے رونا روتے ہیں فصلیں اچھی نہیں ہو رہیں مکمل وصولی اگلے سال ہی ہوگی اور پر تفکری بجیا اس کی سنائی کہانی پر بس سر ہلا دیتیں۔

ہوشیار شخص کا غذاات پر بجیا کے سائن لے کر کچھ زمین بھی فروخت کر چکا تھا قبل اس کے کہ یہ سلسلہ چلتا رہتا۔ بجیا کے چند خیر خواہوں نے انہیں اسلام کی دھوکا ہی سے باخبر کر دیا۔ بس اسی دن سے اسلام اور بجیا میں ٹھن گئی۔ بجیا نے سیدھی اور میٹھی انگلیوں سے بھی گھی نکالنا چاہا۔ ٹھیکے داری کی رقم نہ سہی لیکن ہماری فروخت شدہ زمین ہمیں واپس چاہیے۔ اب وہ ادائیگی کرتا تو زمین واپس ملتی۔ لیکن وہ بدنیت انسان ایسا کیوں کرتا۔ نتیجتاً بجیا نے اسلام پر کیس کر دیا تھا۔“

وہاں یک لخت خاموشی چھا گئی۔

”یہ تمہاری دادی نے تمہاری ماں کو بری میں دیا تھا۔“

ددیا نے یا قوت سے جڑ سیٹ اس کے سامنے رکھا۔

عیرش نے اسے عجب کیفیت میں چھوڑا۔
”یہ ہماری اماں کا تھا۔“ وہ ہلکی سرگوشی میں بولیں، عیرش کی گرفت مضبوط ہوئی۔ ”یہ ہمارا خاندانی سیٹ ہے۔ اسے تم نمل سے خرید لینا عیرش!“ وہ ایک ضرب نما سرگوشی تھی۔ عیرش کا وجود نیلونیل ہوا۔ لیکن نمل اسے کیوں بیچے گی۔ کئی لمحوں بعد وہ جرح کے انداز میں گویا ہوئی۔

”دو دیا نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ پھیکا سا مسکرائیں۔ بہت سال پہلے جب میری شادی کی تاریخ رکھی گئی تو بابا نے میری ماں کا تمام زور میرے سپرد کر دیا تھا شاید اپنی غفلت کا ازالہ کیا تھا۔ کئی سال پہلے یہ میرا تھا۔“
وہ آواز کسی گہرے کنویں سے ابھری تھی۔

”پھر..... پھر میں..... نے..... ای..... اسے بچیا کو بیچ دیا۔“ اب لب و لہجے نے عیرش کے وجود میں برف بودی تھی۔

”ارے دیکھو تو ذرا۔ یہ موسیٰ کی شرٹ ہے۔ کہیں نمل کے کپڑوں میں ہی یہ شدہ رہ گئی۔“
عیرش کو ان کے ٹرنک میں یہ شدہ کرتا یاد آیا۔ وہ وہاں اب بھاگ جانا چاہتی تھی۔ نمل کے ٹرنک میں موسیٰ کی یہ شدہ شرٹ کہانی کا اگلا باب کھول رہی تھی۔

”جو ہونا تھا ہو چکا مٹی ڈالو۔ تمہاری بہن کا گھر ٹوٹ جائے گا۔ بچیا کو اپنوں پر ایوں نے سمجھایا اس بچے کا سوچو جو ابھی اس دنیا میں آنے والا ہے۔“
”اللہ نے بہت نواز رکھا ہے بہن اور اس کا بچہ بال سکتی ہوں“ بچیا کندھے اکڑا کے جواب دیتیں۔ وہ رگیں۔ اب ان کے ہاتھ میں نمل کے گنگن تھے۔

”نمل کو انہیں اپنے رکھنا چاہیے تھا۔ اس کی کلائیوں میں بہت جچتے ہیں۔“ پھر بات کا سلسلہ جوڑا۔ ”وہ بے ایمان تھا۔ دھوکے باز تھا لیکن میرے بچے کا باپ تھا۔ میری زندگی میں آنے والا پہلا مرد تھا۔ میں اسے چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ میں اپنے اہلکار میں گنگن پہنے رکھنا چاہتی تھی لیکن جدائی کے

وہموں میں وہ مجھے بوجھ لگتے تھے۔ بچیا انہیں کبھی ہاتھ روم سے اٹھاتیں تو کبھی تکیے کے نیچے سے، پھر ٹرنک میں رکھا یہ ضروری تھا عیرش۔ دریا نے ٹرنک کا کنڈا اٹھا۔

عیرش کے وجود پر چھت گری تھی۔ ٹرنک کے بند ہوتے ہی اک داستان نے ختم ہو جانا تھا۔ عیرش نے حرکت کی اور ان کا ہاتھ کنڈے سے ہٹایا پھر کیا ہوا؟ وہ جیسے نیند میں گویا ہوئی۔ دیا نے اپنے ہاتھ کو دیکھا۔ پھر اسے دیکھا۔

”بچیا کو پیچھے ہٹنا کسی صورت گوارہ نہیں تھا۔ حالانکہ وہ شخص اب معافی مانگ رہا تھا۔ اپنے کرتوتوں کو شیطان کا بہکاوا کہہ رہا تھا تو بچیا کو بھی کیس ختم کر دینا چاہیے تھا۔ اسلام کے گھر والوں نے بھی مفاہمت کی کافی کوشش کی۔ لیکن ادھر سے بچیا کا غصہ ختم نہ ہوا۔ اسلام نے ان کا اعتبار جو توڑا تھا۔ پھر یہ رشتہ کیوں کرتا مہتا۔“

دو دیا کا بے رنگ لہجہ، وہ ان کا آنسوؤں سے بھیگا چہرہ دیکھتی رہ گئی۔ دیا نے عیرش کا ہاتھ پرے کرتے ہوئے ٹرنک بند کر دیا۔ اب وہ اسے تالا لگا رہی تھیں۔

”تمہاری وہ قصے سننے کی عادت ابھی تک بھی نہیں گئی نمل نیند میں بڑبڑاتی۔“ چاہے تمام رات سنتی رہو مگر یہ لائٹ بند کر دو یاں!“
عیرش نے تالے کو برستی آنکھوں کے ساتھ دیکھا۔

”وقت بدل جاتا ہے، پیارے پھڑ جاتے ہیں تو ان کے دعوے بھی ان کے ساتھ مٹی میں مل جاتے ہیں۔ اس کے بعد ٹرنک کا تالا کھلتا اور بند ہوتا رہتا ہے کہ انسانی ضرورتیں جانے والوں کے ساتھ کہاں ختم ہوتی ہیں۔ جیتی جانوں کو پھر اپنا بوجھ خود اٹھانا پڑتا ہے۔ بہت پتہ بنا پڑتا ہے۔“

☆☆☆

وہ اندر آیا تو پہرے پر برہمی تھی۔ وہ زیر لب مسکرائی اور تمام نگاہ اٹھا کے اس نمل کو دیکھا۔

پھر نگاہ بے نیازی سے جھکا بھی لی۔ وہ میز پر پالک پھیلانے اس کے پتے چن رہی تھی۔

وہ کرسی گھسیٹ کے اس کے قریب لے آیا۔ رضا کا یہ عمل غیر متوقع تھا۔ اس کے لباس سے اٹھتی خوشبو پر وہ چونک کے سیدھی ہوئی۔ اپنی کرسی پیچھے کھسکانا چاہی۔ آگے نیل پیچھے دیوار، وہ سلگ کے رہ گئی۔ وہ اسے دیکھ رہا تھا گھور رہا تھا وہ اندازہ لگائے بناتوں کو چھتی جا رہی تھی۔

”مجھے گھورنا اتنا آسان نہیں۔“ کتنی دیر بعد اس نے چھری میز پر پٹخ کے کہا۔ وہ شخص ہمیشہ کی طرح چہرے کے تاثرات کے برعکس نگاہ کے الگ تاثر کے ساتھ اسے تک رہا تھا۔

”بہت خوب..... اب تمہیں گھورنے کی جرات کون کر سکتا ہے۔ ایک کپ اور دو چار گلاس توڑ کے تم جھکتی ہو کہ اب تمہیں ڈاکورانی یا پھولن دیوی تسلیم کر لیا جائے۔ تو یہ تمہاری خام خیالی ہے۔“ اس نے اپنی مخصوص ڈھیٹ مسکراہٹ کے ساتھ اسے غصہ دلایا۔ اور کامیاب بھی ہوا۔

عیرش نے ایک ذرا بروچڑھا کے اسے دیکھا۔ پہلی بات کہ میں نے کیس ختم کر دیا تھا دوسری بات یہ کہ میرے پیچھے ہٹتے ہی آپ کے موسیٰ صاحب کی یادداشت واپس لوٹ آئی۔ اس نے اپنی پھڑی بیوی کے لیے ایک لمبا سفر طے کیا۔ اب ایک ہفتے سے بیوی کو جھوٹی محبت کا یقین دلا کر بدھو بنا رہا ہوگا! وہ موسیٰ سے اس قدر متنفر ہو چکی تھی کہ ملنا تو کجا وہ اس کے سامنے بھی نہیں آئی تھی۔

”اب آپ سب کو مجھ سے کیا مسئلہ ہے۔ وہ جان چھڑانے والے انداز میں بولی۔
”مسئلہ ہے عیرش!“ وہ خفگی کے ساتھ گویا ہوا۔
”تم اپنے انکل ضمیر صاحب اور ان کے بیٹے کے ساتھ بھلے بچ کر ویا ڈنر مجھے کچھ اعتراض نہیں۔ مگر ان کو اتنی شہ دینے کی کیا ضرورت تھی کہ نوبت رشتہ داریاں گانٹھنے تک آگئی۔“

اس نے جلتے سگتے رضا کو دیکھا تو دل پر پھواری

پڑی۔

”شہ دینے کی کوئی بات ہی نہیں۔ پاپا کی زندگی میں ہمارا ان سے فیملی تعلق تھا۔ ہم سب نے دینی میں اچھا وقت گزارا تھا۔“ اس نے گردن سیدھی کی اور اتر کے جتایا کہ اب کہو۔

رضا اسے گھورتا رہا۔ ”اگر وہ اچھا وقت انہیں پندرہ سال بعد یاد آ ہی گیا ہے تو اب واپس جا کے انہیں ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے یہاں رشتے داری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ سنجیدگی پر غصہ غالب تھا کہ رضا نے بات دائیں بائیں دیکھ کے کی تھی۔

”یہ کس نے کہا ہے کہ سوال پیدا نہیں ہوتا۔“ وہ مسکراتے ہوئے اس کی کشادہ آنکھوں میں جھانک کے گویا ہوئی۔

”یہ میں کہہ رہا ہوں۔“ وہ لفظ چباتا، سلگ کے گویا ہوا۔

”یہ میری زندگی ہے۔ فیصلہ بھی میرا ہوگا رضا حبیب!“ وہ ان ایک دم تن فن سے کھڑی ہوئی۔

”یہاں کوئی لوٹ نار نہیں مچی کہ عیرش صہیب کسی کا بھی ہاتھ تھام کے کہیں بھی چل پڑیں۔ اس گھر کی راہداریوں کے سوا، اسے ہر راستہ بند ملے گا۔“ وہ لہجہ مدت آمیز تھا۔

اللہ کیا دھولس تھی۔ عیرش کا دل قہقہہ لگانے کو چاہا۔ اس نے رضا کو ٹھہرے ہوئے مضبوط قدموں کے ساتھ جاتے دیکھا۔ گویا فیصلہ ہو چکا اس کی چال میں جیت تھی۔

”یہ تمہاری بھول ہے کہ اب محبت راہداریوں کی دھول میں دھول بن چکی ہے۔ رضا حبیب! پیپل کے وہ پتے جن پر لفظ محبت لکھا تھا۔ نمل کی واپسی کے بعد ہی جھڑ گئے تھے۔ عیرش صہیب کے لیے اب ہر راستہ کھلا سمجھو۔“

ان جملوں نے دہلیز پر کھڑے اس شخص کو اک بے پایاں ہجوم کی طرح گھیرا۔ وہ کس قدر سیدھی اور اٹل کھڑی ہوئی وہ پلٹ کے دیکھے بنا بھی دیکھ سکتا تھا۔ یہ کیسا اظہار کیا تھا اس شخص نے ہر موسم میں گھر کی

راہداریاں ناپتی اس لڑکی کو اس وقت روکنا چاہتا تھا۔ جب وہ ان راستوں پر کھڑی کسی اور کی راہ دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

”کیا یہ سب عیرش نے کہا؟“ ددیا نے پوری آنکھیں کھول کے اسے دیکھا۔ رامس اور قیس کا بھی حال ددیا سے مختلف نہیں تھا۔

”کیا ہے یار؟“ وہ ذرا جھینپ کے بولی اور باری باری سب کو دیکھا۔ تائی جو آج کل اپنی چھوٹی ساس سے کروشنہ سیکھ رہی تھیں۔ اب دھاگا گود میں رکھے عیرش کو تنگے جارہی تھیں۔ وہاں ہر ایک الگ تاثر کے ساتھ بس حیران تھا۔ کافی وقت خاموشی کی نذر ہوا۔

”آپ سب تو یوں بیٹھے ہیں جیسے عیرش کی شادی کرنے کا ارادہ ہی نہیں تھا۔“ ردا کی آواز نے گہرے سکوت میں پتھر پھینکا۔ پہلے تو اس کی خالہ یا ماموں کی جانب سے کسی کمٹ منٹ کا مسئلہ تھا جب وہ بھی نہیں رہا۔ تو اب اس کی شادی کہیں تو ہونی ہے نا۔ پھر اس قدر اچھے رشتے پر غور کرنے میں کیا حرج ہے۔“

ردا نے بات کے اختتام پر اس جزبہ ہوتے مجھے کو قائل کرتی نظروں سے دیکھا کہ کیا میں نے غلط کہا ہے۔ تو سب کا انداز آئیں بائیں شائیں جیسا ہی تھا۔

”ہم سب اب تک اسی کمٹ منٹ کی بدولت ہی خاموش تھے۔ اور اب گھر میں لڑکوں کے ہوتے ہمیں ان اچھے یا برے رشتوں پر غور کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔“ تائی کی نہایت شانت سے کی گئی بات نے ددیا کے سینے میں ایک ٹھنڈا اٹھار شاہور کھول دیا تھا۔

”تو اور کیا۔“ بخت کی ماں نے بھی اس بات کی بھرپور تائید کی۔

تائی اپنے بیٹے کو گہرائی تک جانتی تھیں کہ رضا کا شادی سے پہلو تپی کا سبب یہ لڑکی ہی تھی۔ تائی کے پروپوزل نے عیرش کے اندر اک شور سا برپا کیا۔ اس کے برعکس اس نے انتہائی سکون سے رامس کو گھورا۔

”اس نیگے سے کون شادی کرے گا۔“ عیرش نے اسے کشن کھینچ کے مارا۔

”آج کل پاکستان میں ہر طرف سڑکوں پر کام ہو رہا ہے۔ محنت مزدوری کر لوں گا تم ہاں تو کرو۔“ وہ بھی شرارت پر اتر آیا۔

”اتنے میں تو بخت بھی گزارا نہیں کر سکتی۔“ وہ ہنسی اور محنت مزدوری کرنے والے پر تباہ کن نظر ڈالی۔

”اس گھر میں ایک برس روزگار بندہ بھی ہے۔“ قیس ایک مسکراہٹ کے ساتھ معنی خیزی سے گویا ہوا۔ اس برس روزگار کے لیے دل عجب مستانہ انداز سے دھڑکا تھا۔ عیرش نے بھرے حواسوں کو سمیٹ کے چکور کے مالک قیس صاحب کو نگاہوں سے جتایا کہ میں بھی اڑنا چاہتی ہوں مگر قیس کی نگاہوں کے تمام رنگ رضا کے ہی حمایتی تھے۔

عیرش نے اپنی گلہ آمیز نگاہ چپکے سے پھیر لی۔ ددیا اور تائی اسے آس بھری نگاہوں سے تنگ رہی تھیں۔

”پہلا حق رشتہ داروں کا ہی ہوتا ہے بیٹا!“ اسے تذبذب میں پا کر بخت کی ماں نے فیصلہ رضا کے حق میں کروانا چاہا۔

”اگر میں کیس واپس نہ لیتی تو اسلام کی طرح موسیٰ بھی نمل کو چھوڑ دیتا۔“ وہ اپنے ہم زاد سے مخاطب ہوئی۔

”چلو محبت کی سکھی سے اترو۔“ دل میں ٹیس سی اٹھی۔ موسیٰ کو بس رشتے عزیز تھے بیوی کا کیا تھا، دوسری مل سکتی تھی۔ بچے کا کیا تھا، قیس بھی تو پرانے دوارے پل بڑھ گیا تھا۔

چلو دور دیس سے آئے اس گھڑسوار کے پیچھے بیٹھ جاؤ، پتیل کے تھال تھامے ان کینروں کی طرف پلٹ کے مت دیکھنا۔ ریشمی رومال اڑ بھی سکتا ہے۔ اس نے اپنی ہم زاد کو کھینچ کے گھوڑے پر بٹھایا پتیل کے پتوں پر سمنی محبت کی باس طلسمی محلات کو مبارک ہو۔ وہ جھر جھری لے کر چوکی اور ہلکا سا کھنکھار کے گویا ہوئی۔

”تائی امی باقی تو سب ٹھیک ہے آپ سب جو بھی فیصلہ کریں۔ لیکن۔“ وہ سانس لینے کو رکھی تھی یا

سانس جوڑنے کو رکھی تھی۔ ہال کمرے میں آتا رضا بھی ٹھہر گیا تھا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ ان آہٹوں کی خوشبو نہ پانی۔ وہاں ہر ایک سانس روک کے بیٹھا تھا۔ لیکن کے بعد اک گلاز بھی تھا۔ لیکن کے بعد اک الاؤ بھی تھا۔

”ہر لڑکی کی طرح میں بھی ایک سپر لکڑی گھر کی خواہش رکھتی ہوں۔“

ساکت کھڑے اس شخص کے وجود کو ایک آنچ نے چھوا تھا۔ اس نے ہر ایک سے نگاہ چرا کے میز پر پڑے میگزین کو دیکھا۔

”اس قدیم گھر میں مجھے کشش محسوس نہیں ہوتی۔ میں یکسانیت کو پسند نہیں کرتی۔ میں اب تبدیلی چاہتی ہوں ددیا!“

اس کے الفاظ خشک تھے مگر آنکھ میں اک ذرا نمی تھی۔ گھوڑا سپر پٹ دوڑ رہا تھا مگر محبت کی باس ان کے تعاقب میں تھی۔ اب وہاں سب کی نگاہ رضا پر تھی جو دبے پاؤں ہی لوٹ گیا تھا۔

ساکن بیٹھی تائی کو کروشی کی نوک چھبی، جہاں سارے گھر الٹ پلٹ ہو چکے تھے۔ وہاں رامس اور ردا ہی پر سکون تھے کہ عیرش کی باتیں حقیقت سے قریب تھیں۔

چکور کا مالک ابھی تک حیران تھا کہ چاندنی راتوں سے محبت کرنے والی وہ لڑکی ان مادی خواہشوں کے اندھیروں میں کیوں نہ بھٹکنے لگی تھی۔ لفظ لیکن سے آگے جو بھی عیرش نے کہا تھا چھوٹی ددیا نے جیسے سنا ہی نہیں تھا۔ ان کے دل و دماغ میں لیکن سے پہلے کا ادا کردہ جملہ، ”آپ جو بھی فیصلہ کریں۔“ کسی نیون سائن کی طرح جل بجھ رہا تھا۔

☆☆☆

ان آہٹوں کو پہچان کے عیرش کا دل تیزی سے دھڑکا۔ وہ فی الوقت اس شخص کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ اس سے کچھ فاصلے پر ٹھہر گیا۔ مگر اس کے وجود سے پھٹنے والی خوشبو کو شاید ٹھہرنا نہیں آتا تھا۔

”پیچھے مت دیکھنا پتھر کے ہو جاؤ گے یہ ضرب المثل عام تھی اور وہ لڑکی۔ ان ہری بیلوں کو، کبوتروں

کے خالی ڈربوں کو، برانے درختوں سے لپٹی امرتیل کو اور سامنے چمکتے چاند کو دیکھتے بھی ہوئے بھی پتھر کی ہو چکی تھی۔

”موسیٰ نے نمل کو گھر چھوڑنے کا نہیں کہا تھا پھر بھی تم اس کی شکل دیکھنے کی روادار نہیں ہو۔ جب وہ پاکستان نمل کو لینے آچکا تھا تو تمہارا کیس واپس لینے کی خبر اس نے تب سنی تھی۔“ عیرش کو کسی بے چینی نے گھیرا۔

”میں موسیٰ کی طرف داری اس کے اسٹیشن یا اس کی دولت کی بنا پر نہیں کرتا تھا۔ اس کیس کے سلسلے میں تمہارا ساتھ، صرف نمل کی وجہ سے نہ دیا۔ موسیٰ جس قدر بھی مضبوط تھا لیکن ماں باپ کی ضد، اسے فیصلے کی کسی سولی پر لٹکا سکتی تھی۔ اور میں یہ بھی کسی طور پر نہیں چاہتا تھا عیرش! کہ آنے والے کسی وقت میں نمل کو بڑی ددیا کے نام سے پکارا جاتا۔“

وہ گھوم کے اس کے سامنے آیا۔ ان ہلکی سیاہ آنکھوں کا اضطراب واضح تھا۔ عیرش نے نگاہ جھکائی۔

وہ اسے تادیر دیکھتے رہنا چاہتا تھا۔ جو ددیا سے دیو مالائی قیسے سنتے سنتے خود کو ان ہی قدیم داستانوں کا حصہ سمجھتی تھی کہ وہ کافی باغوں کی طلسمی راہداریوں میں آوارہ پھرتی یہ شہزادی جادوئی پتوں پر محبت نامے لکھ کر انہیں شہزادوں کی نذر کرنا چاہتی تھی۔ جو راستے میں کسی جادوگر کی گئی کے ہاتھ لگنے کی صورت غائب ہو جاتے تھے ہر بار شہزادی جب بیدار ہوتی تو وہ محبت نامے اپنے تنکے کے نیچے پانی۔ کیا کبھی یہ شہزادوں تک پہنچ پائیں گے؟ وہ ہر بار مایوس ہوتی۔

عیرش مشکل ترین لمحوں کی زد میں تھی۔ وہ سوچتی تھی یہ آدم بیزار سا بندہ کیا کسی کا ہو سکتا ہے اس لفظ کسی میں خود کو نہ پا کر روح بیابان سی ہو جاتی تھی۔ اسے اپنے قدموں چلے جانا چاہیے۔ وہ یہ سوچ سکتی تھی مگر اپنی محبت کو کسی سوئے ہوئے محل کے سپرد کرنے والی وہ لڑکی اب کسی کے سامنے پتھر کی ہو چکی تھی۔

رضا آج بھی اس جامد خاموشی کے لمحوں میں ددیا کے پرانے گیت اس لڑکی کی آواز میں سن رہا تھا۔ پتیل کے پتو یہ سن او جانیاں..... ہم نے لکھی

ہیں دل کی کہانیاں.....

پھر وہ کیسے مان لیتا کہ وہ لڑکی ایک لکڑی گھر کی خواہش مند ہے۔ وہ اب تک بے یقین تھا۔ سونے کی صراحی چھوڑ کے اس شہزادی کا کسی مسافر کے ساتھ اپنی محبت میں جانا ہی اس داستان کی خوب صورتی ہے۔ وہ ہنس اور ان اعصاب شکن لمحوں کو اپنی ہلکی میں اڑا دیا۔ اس نے رضا کا چہرہ دیکھا وہ کیا کہہ رہا تھا۔ اس نے نگاہ ملائی۔

”کیسی محبت؟“ وہ پیشانی کی ایک نمایاں سلوٹ کے ساتھ بولی۔

”تم جانتی ہو عیش..... کہ محبت..... رضا حبیب کی کھڑکیوں سے لپٹی بیلوں میں بھی سانس لیتی ہے یہ ہاتھ ان بیلوں کے مساجو ہیں۔“

اس نے عیش کا ہاتھ بس لمحہ بھر کو چھوا۔ عیش نگاہ ہٹانے لگی۔

”ضروری نہیں کہ وہ جادوئی پتے ہر بار جادو گرنی کے ہاتھ لگ جائیں اکثر شہزادوں تک بھی پہنچ جاتے ہوں گے۔“ وہ سرگوشی عیش کے بے حد قریب سے ابھری تھی۔ وہ کندھے کو چھوٹا آگے بڑھ گیا۔

عیش نے جانے والے کو گہرے سانس بھر کے دیکھا۔ وہ آج بھی کانچ کی شیشوں سے صندل اڑا کے ان میں اس کے قدموں کی دھول بھرنا چاہتی تھی۔ آنکھ کی سطح بھیگی۔ اب اس کے لیے اپنے فیصلے سے پھرنا ناممکن تھا۔ شاید ضمیر انکل کو ددیا نے جواب ہاں میں دے دیا تھا۔ اس نے ایک مایوس کن سانس لیا داستان کی خوب صورتی اب ختم ہو چکی تھی۔

☆☆☆

”تم یا کوئی بھی اور، یہ سوچ بھی کیسے سکتا ہے کہ عیش میرے کنٹرول سے باہر ہے۔ وہ ہمارے خاندان کا اٹوٹ حصہ ہے۔ ہم اس کے ورثا میں سے ہیں۔ نہ تو ہمیں اس کے فیصلوں سے اختلاف ہے نہ ہی اسے ہمارے فیصلوں پر اعتراض ہے۔“

کیا یہ کڑک آواز ددیا کی ہی ہے۔ اس نے کتاب جھولے پر رکھی۔ اور بے یقینی سے چلتی بیلوں

سے ڈھکی ہال کمرے کی کھڑکی طرف آئی اور ماتھا ٹکا کے اندر کا منظر دیکھا۔

”حد کرتی ہیں بی۔ میں نے تو صرف اتنا کہا تھا کہ اس طرح آنا فانا نکاح پر لڑکی رضا مند بھی ہوگی کہ نہیں جواب میں آپ کی آواز تو آدھے محلے میں سنائی دی ہوگی۔“

بخت کی ماں نے حسب عادت کان چھوئے۔ ادھر لفظ نکاح پر اندر جھانکتی لڑکی کا دل حلق سے باہر آنے والا تھا۔

”کیوں نہیں، میں تو چاہتی ہوں کہ میری آواز پورا محلہ سن لے۔ میری عیش جیسی فرماں بردار، سعادت مند، اللہ میاں کی گائے پورے محلے میں ایک بھی ہو تو ڈھونڈ کے لاؤ۔“

عیش نے سر پر ہاتھ پھیرا۔ شکر ہے سینگوں سے خالی تھا۔

”میری بچی کے منہ میں تو زبان ہی نہیں۔“ اس نے فوری زبان کو چھوا۔ صد شکر منہ کے اندر ہی تھی۔

”صابر شاکر، زندگی کی تمام ڈوریاں میرے ہاتھوں میں تھما رکھی ہیں اور مجھ بڑھیا کا مان توڑ ہی نہیں سکتی..... اور، اور.....“

ددیا خاموش ہوئیں..... اب کوئی جملہ ذہن میں نہیں آرہا تھا۔

”ارے بہو! کوئی اس طرح کے چند جملے تم ہی بتا دو۔“

”ہیں۔“ عیش نے آنکھیں پٹپٹائیں۔ ”کیا میں ان تمام خوبیوں کی مالک ہوں یہ ایک بریلنگ نیوز تھی۔“

”چند جملے کیوں اماں! عیش جیسی لڑکی کی تعریف میں تو زمین آسمان کے قلابے بھی کم ہیں۔ نی الحال تو یہ ہی کہوں گی کہ آپ کا عیش نہایت تابعدار ہے نکاح کے ساتھ بھلے رخصتی کر دیں آپ کے کسی حکم سے انکار کر ہی نہیں سکتی۔“

ردا کی اس بات پر رامس نے ایک فلک شکاف قہقہہ لگایا تھا اور عیش کا دل ردا کا سر پھوڑنے کو

چاہا تھا۔ اندر سب کو اچانک مجھ میں وہ خوبیاں نظر آرہی ہیں جو مجھ میں سرے سے ہیں ہی نہیں۔ وہ اب پریشان ہو چکی تھی۔ یہ ددیا اور ان کی بہو بازار سے بھنگ پی کے تو نہیں آئیں۔

اس کی نگاہ رامس پر بڑی جو قیس کے پاؤں دباتے ہوئے شادی کے گیت گنگنا رہا تھا۔ اسے قیس سے ہمدردی ہوئی کہ ددیا کے ساتھ شاپنگ کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔

”اب بس کریں اماں! بچی پر اتنا بوجھ ہی کافی ہے۔“ تائی نے خوب ہنس چکنے کے بعد کہا۔ اور شاپنگ بیگ کی طرف متوجہ ہوئیں۔

”جن محترمہ کی خوبیوں پر یہاں کتابیں لکھی جا رہی ہیں۔ ذرا ان سے بات تو کر کے دیکھیں۔ فرماں بردار یوں اور تابعدار یوں کے دعوے اس ہال کمرے میں منہ چھپاتے پھریں گے۔ بالکل ددیا ہی طرح۔“ وہ اس ادا سے مسکرایا تھا کہ عیش نے اس کا بھی سر پھاڑنا چاہا۔

”خدا خواستہ میں کا ہے کو منہ چھپاؤں گی۔“ ددیا نے اسے تیوری چڑھا کے گھورا۔ جو عین کھڑکی کے رخ بیٹھا تھا بس جالی کو گھورنے کی دیر تھی۔

”اس لکڑی گھر کے خواب دیکھنے والی کو ذرا بلائیں تو، بھلے ضمیر انکل کے گن گاتی نہیں تھکتی۔ مگر وہ دیکھیے گا وہ اس نکاح وکاح سے صاف انکار کر دے گی۔“ رضا نے کرسی سے ٹیک لگا کے ددیا کو چیلنج کیا۔

عیش کا سکتہ ٹوٹا۔ یہ کس قدر ریلکس ہے۔ میرے پچھڑ جانے کا کوئی دکھ ہی نہیں۔ اس نے چھوٹی انگلی سے آنکھ کا کونا صاف کیا۔

اور رضا کا سنجیدہ چہرہ حسرت کے ساتھ دیکھا۔ وہ ددیا کے دعوؤں کو ہال کمرے میں منہ چھپاتے نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔

☆☆☆

اندر آکر اس نے تائی کے سامنے پھیلے کام دار جوڑوں پر سنجیدہ سی نگاہ ڈالی۔ وہاں بیٹھتے ہی ددیا کی بات نے اس کے ہوش اڑا دیے تھے۔

”کل شام تمہارا نکاح ہوگا اور یہ تمہارے سرال والوں کی خواہش ہے۔“ اس سے یہ بات کرتے ہوتے ددیا کی نگاہ فر فر جلتے پنکھے پر تھی۔

عیش نے بھی اپنے۔ دھڑکتے دل کو بمشکل کنٹرول کیا ورنہ ضمیر انکل کی اس خواہش پر دل۔ حلق پھاڑ کے رونے کو چاہ رہا تھا۔ اس نے کافی دیر بعد ذرا کی ذرا، رضا کو دیکھا۔ تو کیا اب رضا حبیب کی کھڑکیوں سے لپٹی بیلوں پر محبت مردہ ہو چکی ہے اندر دل نے والی تباہی مچا رکھی تھی۔

”ایسا ہے تو ایسا ہی سہی۔“ اس نے گردن اکڑائی۔ اسے رضا کی پیش گوئی کو جھٹلانا تھا۔ سونگاہ جھکا کے سعادت مندی سے کہا۔

”جیسے آپ کی مرضی۔“ ساتھ ہی سر جھکایا، آنکھوں کی نمی کہیں بھانڈا ہی نا پھوڑ دے کہ وہ سنگدل اسی پر نگاہ مرکوز کیے بیٹھا تھا۔

”اب شام کو ردا کے ساتھ جا کے ہاتھ منہ صاف کرو آنا۔“ ددیا کی اس بات پر ایک مشترکہ قہقہہ پڑا تھا۔ اس کا دل جلا۔

کل میرا فیصلہ سن کے ایسے ہی سب نے منہ لٹکا رکھے تھے اور آج خوشی کا یہ عالم! عیش کی سمجھ سے باہر تھا۔

☆☆☆

”تم ہمیشہ سے میرے اس گھر سے دفع ہونے کے خواہش مند رہے ہو۔ تو سنو۔ اب خوش ہو جاؤ۔“ وہ کسی کام سے ددیا کے کمرے میں آیا تو وہ سامنے کھڑی تھی۔ لائے گیلے بال اس کے شانوں پر پریشان تھے اس کی آنکھوں کی لالی اور بوجھل پن بتا رہا تھا کہ وہ تمام رات جاگتی رہی تھی، رضا کے دل کو کچھ ہوا۔ چند لمحوں بعد وہ جیسے حواسوں میں آ کے مسکرایا۔

”وہ ایک پرانی بات تھی۔ اس کے بعد تو میں تم سے۔“ وہ چار قدم قریب ہوا۔

”اب تم یہاں سے جاؤ رضا!“ وہ اس کا جملہ مکمل ہونے سے قبل ہی گلابی چہرے کے ساتھ سلگ کے گویا ہوئی۔

”تم ہاتھ منہ صاف کروا کر کے واقعی پیاری لگ

رہی ہو۔ ورنہ تو پھول پتوں میں وقت گزرتے ہوئے تمہارا حلیہ کسی گرد آلود بھانڈ کی طرح ہی ہوتا تھا۔ وہ اپنی جگہ جم کے بولا۔ وہ غصے سے پلٹنے لگی تو وہ سرعت سے مقابل آیا۔

”کل تم نے کچن میں بخت سے کہا..... جاؤ..... رضا کی خبر لے آؤ۔ یہ الفاظ سن کے چائے کی طلب مٹ گئی تھی اور میں کل سے اپنی خبر دینے کو بے تاب ہوں عیری!“ وہ تھوڑی دیر ساکت کھڑا اسے چمکتی آنکھوں سے دیکھتا رہا۔

”گیٹ سے ذرا دور گھوڑا باندھ کے آیا ہوں۔ تم سونے کی صراحی پھینک کے میرے ساتھ چلو۔“ اس کی آواز مدہم اور فسوں خیز تھی۔

”تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے۔“ وہ بھی سرعت سے پیچھے ہٹی تھی۔ ”اب خبر لینے اور دینے کا وقت گزر چکا ہے رضا حبیب!“ وہ دروازے کی جانب لپکی۔

”اف..... یہ رضا.....“ اور باہر جاتے ہوئے اپنے کمرے کے اندر اور باہر تک کسی نا دیدہ شے کے کھڑے۔ اسے پاؤں میں بری طرح چبھے تھے۔

☆☆☆

”اب تک نمل کیوں نہیں پہنچی۔“ دلہن بنی عیرش نے کوئی چوتھی بار پوچھا تو مصروف ترین ددیا کچھ دیر کو اس کے پاس نکلیں۔ قریب کے تمام رشتے دار وہاں موجود تھے گھر میں شادی والی چہل پہل تھی۔ تو ددیا کے بے حد اصرار پر اس نے مکمل اہتمام تو نہیں لیکن کچھ کچھ دلہنوں کا سا اہتمام کیا تھا۔ اس پر ددیا کی طعنہ بازی کہ سب کچھ تمہاری مرضی سے ہو رہا ہے پھر یہ جھنجلاہٹ اور بے زاری کیوں؟

”تمہاری خوشی کون ہے اور تمہاری ضد کون ہے یہ میرے سوا کون جان سکتا ہے۔“ ددیا نے اس کا سونا، سونا روپ جی بھر کے دیکھا۔ ”نہد سے رشتہ تو محض خالہ کو نیچا دکھانے کے لیے اور موسیٰ کے برابر آنے کے لیے جوڑا جا رہا تھا۔ یہ تمہاری خوشی تو نہیں ہے نہ عیرش نے فوری رخ موڑا۔

”یقین نہیں آئے گا لیکن تمہاری خالہ تمہاری

پر اپنی اس شرط پر دینے کو تیار ہوئی ہے کہ تمہیں شادی اس کی مرضی سے اس کے انتخاب سے کرنی ہوگی۔ مگر موسیٰ اور نمل ایسا نہیں چاہتے۔ یہ نہد کا پروپوزل اور تمہارا اقرار، تمہارے خیال والے یہ قصہ سن کے باؤ لے ہوئے جارہے ہیں اور پاکستان آکر جانے کس کس کے گلے پڑنا چاہتے ہیں۔ اس لیے ہم نے نمل کو بلایا ہی نہیں۔“

اف ددیا نے یہ کیسا بم پھوڑا تھا۔ ”یعنی میری سگی بہن اس موقع پر موجود ہی نہیں ہوگی۔“ آنکھوں سے آنسوؤں کا ریل پھوٹا۔

ددیا نے دلا سے تسلی کے بجائے نگاہ جھکالی۔ ”ایک ہفتے بعد وہ تمہارے ویسے پر آئیں گے۔“ وہ رونا بھول گئی کہ لفظ ولیمہ حلق میں اٹکا تھا۔

وہ ضد اور ہٹ دھرمی میں کیا کچھ کھور ہی تھی۔ ”نکاح خواں اور گواہان نکاح پڑھانے آرہے ہیں اماں!“ قیس نے اطلاع دینے کے بعد ایک دو چیزیں راستے سے ہٹائیں۔ عیرش کا ٹھنڈا وجود سن ہوا۔

کیا اس کے پاس رامس کھڑا تھا؟ اس نے جھکی نگاہ کا زاویہ بدلا۔ وہ کتنے سالوں سے ہی گھڑی پہنتا تھا۔ دوپہر کے بعد وہ اسے دوبارہ نظر نہیں آیا تھا۔ کیا اس کا گواہ بننا ضروری تھا۔ نگاہ گھڑی پر جم چکی تھی۔ اور ساتھ کھڑا شخص ہمیشہ جان لیتا تھا کہ وہ کن نگاہوں کی زد میں ہے۔ ماں ہوتی تو دل کا حال جان کر کسی ایرے غیرے کے حوالے نہ کرتی۔ آنسو لڑیوں کی صورت بہنا چاہتے تھے۔ وہ نکاح خواں کی آواز پر سیدھی ہوئی۔

”میں داستان کی خوبصورتی برقرار رکھنا چاہتی ہوں گھوڑا ایسا بھی جو بھی میسر ہے لے کر آؤ۔“ وہ پہلو کے ساتھ کھڑے شخص سے بے آواز مخاطب ہوئی۔

”عیرش! تمہارا دھیان کدھر ہے“ ددیا کان میں گھسی۔

”سکر رائج الوقت بمعہ شرعی حق مہر کے.....“ وہ گھڑی جان گسل تھی اور وہ فرشتے کی طرح اب بھی کندھے سے جڑ کے کھڑا تھا۔

”رضا حبیب ولد حبیب اللہ کیا تمہیں قبول

ہے۔“ وجود سے باہر دھڑکا۔ یہ کیسا مذاق تھا جھٹ سے چہرہ اونچا کر کے ددیا کو دیکھا۔ ”ماں ہوں دل کا حال جانتی ہوں۔“ ددیا کی مسکراہٹ وجود میں روح پھونکنے جیسی تھی مولوی نے وہ جملہ دوبارہ دہرایا۔

”اب کہہ بھی چکو کہ قبول ہے۔“ ددیا کی نرمی رخصت ہوئی تو اس نے جھٹ سے سر اثبات میں ہلایا۔ ”ارے بیٹھو میاں!“ وہ رضا سے مخاطب ہوئیں۔

”آپ نے مجھ سے کہا ہے ددیا؟“ رامس جھٹ سے آگے بڑھا۔ وہاں مولوی سمیت سب ہی ہنس دیے رونا تو صرف دلہن کو آرہا تھا سب نے اسے کس خوبصورتی سے بے وقوف بنایا تھا۔

”نکاح ہو رہا ہے لڈو نہیں بٹ رہے کہ لینے آ پہنچو۔“ ددیا کا دھوکا خاصا زور دار تھا۔

”یہ رضا..... یہ اس قدر بے ایمان ہے۔“ وہ اس کے پہلو میں بیٹھا تو غصے کا ایک ریل پھوٹا جو سونامی سے کہیں بڑا تھا۔ پچھلے دو دن اس نے جس اذیت میں گزارے تھے وہی جانتی تھی۔

”کہا تھا نا۔ یہاں کوئی لوٹ مار نہیں مچی کہ عیرش صہیب کسی کا بھی ہاتھ تھا۔ اور چل دے۔“ اس کے لبوں سے چپکی مسکراہٹ..... عیرش نے نگاہ موڑ لی۔

”دلہن کم شیرنی زیادہ لگ رہی ہو۔“ ردا نے ہنستے ہوئے اس کا گھونگھٹ گرایا۔ ”رضا کو تو یہاں بیٹھے بیٹھے ہی چبا جاؤ گی۔“

رضا کا ہلکا فہمہ شان دار تھا۔ نکاح ہو چکا تھا۔ ہر طرف سے مبارک سلامت اور دعا کی آوازیں نکلیں۔ اب وہ باری باری سب سے گلے مل رہا تھا۔

”مجھے نہیں گھونگھٹ اوڑھنا۔“ اس نے دوپٹا پیچھے سر کا یا اور کھڑی ہوگئی، ہائے اس کو ہال کمرے کی کھڑکی سے چھپ کے جھانکنا مار گیا وہ سب اس کی خوبیاں کہاں بیان کر رہے تھے۔ وہ تو اسے ہر صورت ددیا کا حکم ماننے پر اکسارہے تھے۔ جانتے تھے کہ وہ کہیں کھڑکیوں کے پاس ہی ہوگی۔

”ارے ارے رکو عیرش! کہاں بھاگی جا رہی

ہو۔“ ددیا نے اس کی کلائی تھام لی۔ اور وہ اپنی سہیلی اپنی عم خوار ماں جیسی ددیا کو بے بسی سے دیکھتی رہ گئی۔

اگلے لمحے منظر بدلا۔ دلہن کا رونا دھونا ددیا کی منت سماجت، وہاں دولہا کی ماں اپنا سر پکڑ کے بیٹھی تھی۔ ”لو جی..... آپ کو اپنا گھر بار مبارک ہو۔“ ردا نے اسے صوفے پر بٹھایا۔ وہ ددیا کی ہزار منت سماجت کے بعد رخصتی کے لیے تیار ہوئی تھی۔ یہ سب اس نے بھی میرے ہی حکم پر کیا ہے اب رضا سے جھگڑا امت کرنا۔“ ددیا نے رخصت کرتے وقت التجا کی تھی۔ ددیا نے سوطر ح سے یقین دلایا تھا مگر وہ ماننے کو تیار نہیں تھی۔

”اس ایک کمرے کو کوئی کیسے گھر کہہ سکتا ہے۔“ وہ بلند آواز کے ساتھ بولی۔ کہ رضا اندر آرہا تھا۔

”بیوی کے لیے شوہر کا ایک کمرہ بھی پورا جہان ہوتا ہے عیرش رضا۔“ ردا ہونٹ پھیلا کے مسکرائی۔ عیرش نے اسے پہلو بدل کے دیکھا کہ اسی ادا کردہ جملہ دہرایا گیا تھا۔

”ازے یہ بخت بس ایک بیگ ہی لے کر آئی ہے۔“ ردا لی نگاہ بھی پردھرے سامان کی طرف گئی۔

”کیونکہ یہ کمرہ ہے گھر نہیں یہاں ٹرک بھر سامان لانے کی حماقت کون کر سکتا ہے۔“ وہ طنز یہ انداز میں ہنسی۔ رضا نے پلٹ کے دیکھا، اس کی دلہن زبان کے ہتھیار تیز کیے بیٹھی تھی۔

”مجھے قیس نے سمجھا دیا تھا کہ بیویوں کی بات پر سیریس نہیں ہوا جاتا انہیں کہنے جھکنے کی عادت ہوتی ہے۔“ وہ بات کر کے وارڈروب کی جانب بڑھا۔

”ہائیں۔“ وہ دھک سے رہ گئی۔ قیس نے کب؟ یہ تو خود اس نے اسی کمرے میں کھڑے کہا تھا۔

”اور جہاں تک گھر کی بات ہے تو میں انکاری تو نہیں۔ محبت کے ساتھ کہتا رہوں گا۔ بنالوں گا۔ اب منہ پھاڑ کے انکار کر دوں تو یہ ایک کمرہ تمہیں عذاب میں مبتلا کر سکتا ہے۔“ وہ اسے دیکھ کے مسکرایا۔ جو منہ کھول کے بیٹھی تھی۔

آخر مجھے دوسروں کے معاملات میں بولنے کی

ایسے ہی سر ہل گیا۔“
وہ ذرا دھیمی پڑی۔ وہ کیا شاہانہ ملا تھا۔

”یہ دیا کا حکم تھا جو میں نہیں ٹال سکا کہ انہوں
 کے ساتھ فرش کو تک رہی تھی۔“

”دیکھو۔ محبت رضا حبیب کی کھڑکیوں سے کھڑی کھول دی۔

☆ کا حصہ بن جانا چاہتا تھا۔

ہم کھالے ہیں

امی نے کن اکھیوں سے اس کی طرف دیکھا، موڈ برہم لگ رہا تھا۔ چہرے سے جھکن مترشح تھی۔ اس نے گاڑی کی چابی اٹھا کر بیڈ سائیڈ پر پھینکی اور خود بھی بیڈ پر گر گئی۔

”کیا ہوا؟“ امی نے پوچھا، ”تھک گئی ہو؟“ ”جی“ اس نے مختصر ترین جواب دیا۔ ”تائی امی نے فون کیا تھا، بازار جانے کے لیے، تین گھنٹے خوار کیا اور گھر پہنچے تو پتا ہے کیا ہوا؟“

امی کے چہرے پر مسکراہٹ در آئی جسے انہوں نے بدقت چھپایا، وہ ویسے ہی بہت حساس تھی۔

”ہادی اے سی چلا کر آرام فرما رہا تھا اور مومنہ اس نواب کے لیے چائے بنا رہی تھی۔ تائی امی کے ساتھ تین گھنٹے میں خوار ہوئی، بازار میں پارکنگ کہاں تھی، گاڑی چلا کر میری ٹانگیں ٹوٹ گئیں اور ان کا نواب بیٹا آرام فرما رہا تھا۔ وہ جلی بھنی بولے چلی گئی، امی سے بھی رہا نہ گیا۔“

”جب تم نے نئی نئی گاڑی چلانا سیکھی میں نے کتنا سمجھایا تھا۔ ہر وقت میں آجاتی ہوں تائی امی، میں لے جاؤں گی تائی امی، اب جب عادتیں خراب کر دیں تو شکوہ کیسا؟“

”ہاں ہاں آپ کو تو ہر بات میں میری ہی غلطی نظر آتی ہے،“ ہانیہ نے بستر سے اٹھ کر پاؤں پٹختے ہوئے کہا۔ ”اب میں روٹی نہیں ڈالوں گی۔“

”کیسے نہیں ڈالو گی۔“ امی کو بھی غصہ آ گیا، ”تمہارا تو باپ بھی ڈالے گا۔“ انہوں نے جلال میں آتے ہوئے کہا۔ لیکن وہ بھی ہانیہ کی کہاں ان کے رعب میں آتی۔

”ابا ہی سے ڈالو لیس امی، میں جا رہی ہوں سونے۔“ اس سے پہلے کہ امی کی چپل اس کا مزاج پوچھتی وہ کمرے سے بھاگ گئی۔ بکتے جھکتے عصمت بیگم نے خود ہی روٹی ڈالی۔ اسپتال سے تو جلدی آگئی تھیں مگر سو کام پڑے تھے دیکھنے کے لیے، عورت کتنی ہی بڑی طرم خان کیوں نہ ہو جائے، باہر کتنے ہی اس کے نام کے ڈنکے بج جائیں، گھر کے

ہے ہیں؟ (خواتین) hum kha ja rhe he

کاموں سے خلاصی ممکن نہیں، فرق سے پرانے سالن نکالتے ہوئے انہوں نے ساتھ ہی چائے چڑھائی۔

”ابھی وقار صاحب چائے کے لیے آواز لگائیں گے۔ وہ سوچ رہی تھیں تب ہی کمرے سے آواز آئی۔“

”ارے ابھی آج چائے نہیں ملے گی کیا؟“ مسکراہٹ ان کے لبوں کو چھو گئی۔

”ابھی حاضر ہوتی ہے کنیرا!“ وہ بھی کہاں چھیڑنے سے باز آنے والی تھیں۔ اتنی دیر میں وقار صاحب بھی کمرے سے نکل کر پکچن میں پہنچ گئے۔

”ملکہ عالیہ کنیر کیسے بن گئیں؟“ ان کے چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ تھی۔ آخری کام والی لڑکی فون پر لگی رہتی تھی۔ گزارا تھا۔ ایک دن بندے کو گھر ہی بلا لیا۔ عصمت بیگم نوکری کے سلسلے میں سارا دن باہر ہوتی تھیں۔ جوان بیٹی گھر میں تھی۔ انہوں نے کھڑے کھڑے نکال دیا۔ اب تو خیر عادت سی ہو گئی تھی۔ چار دن کوئی اچھی مل جائے تو صبح ورنہ کوئی

بری! زندگی گزر گئی۔ انہوں نے ٹھنڈی آہ بھری اور سوچا، پھر کہنے لگیں۔

”اب تو ہم ہی ہم ہیں سرکار عالی وقار، بیگم بھی، ماسی بھی، ڈرائیور بھی، مالی بھی۔“

چائے خوش گوار ماحول میں پی لی گئی۔ ہانیہ اپنی ضد کی پکی تھی جب تک نیند پوری نہ ہوئی کمرے سے نکلی نہیں۔ پھر اس کا موڈ بڑا خوش گوار تھا۔ ہاتھ میں چپس کا تھیلہ لیے وہ عصمت بیگم کے ساتھ ساتھ گھوم رہی تھی۔ عصمت بیگم نے باریک اور ککائی، گرین لی چڑھائی، پکچن سمیٹا، صبح کے کپڑے استری کرتے کرتے انہوں نے اس کی ساری لن ترانیاں سنیں۔ ٹیوشن کے قصے، کالج کے مسئلے، ساتھ میں چپس کی کچر کچر۔

”ساری دنیا کو تمہاری ماں سکھاتی ہے کہ یہ چیزیں صحت کی بربادی ہیں اور اپنے گھر کا حال دیکھو۔“

عصمت بیگم نے اسے جھاڑنے کی کوشش کی۔ ایک ہی بیٹی تھی وہ بھی سر پھری، انہوں نے ٹھنڈی آہ بھری۔

”میں تو کہتی ہوں آپ بھی زیادہ دل نہ جلایا کریں۔ دواؤں کی کمپنیوں سے جو نمائندے آتے ہیں بھر بھر کر ان کی دوا میں مریضوں کو دیا کریں پھر ورلڈ ٹور لگائیں۔ نئی گاڑیاں نکلوائیں، عیش کریں اماں عیش۔“

جب وہ اپنی جون میں ہوتی تو ایسی ہی باتیں کرتی۔ عصمت بیگم نے اسے ایک دھموکا جڑا اور ساتھ ہی آرڈر جاری کیا۔

”گرین لی کپ میں نکالو اور اپنے بابا کو نیچے دے آؤ اور میرا کپ ادھر ہی لے آنا۔ وہ سوچ رہی تھیں۔“ کافی کپڑے جمع ہو گئے ہیں ساتھ ہی ایک لوڈ مشین کا چلا لوں۔“

اگلا پورا ہفتہ انہیں بات کرنے کی بھی فرصت نہ ملی، کام والی ملی نہیں، گھر اور باہر کا ذمہ داریاں

نبھاتے نبھاتے وہ گھن چکر بنی ہوئی تھیں۔ ہانیہ کو عادت تھی، وہ اے لیول کے پیپر دے کر فارغ ہوتی تھی۔ ماں کو اس نے مصروف ہی دیکھا تھا۔ ابا ٹھنڈے آدی تھے۔ سیدھی سادی نوکری پر جاتے، واپس آتے۔ ہانیہ کو ضرور ٹائم دیتے ورنہ دوستوں میں چلے جاتے، امی کو بڑی خواہش تھی وہ ایک آدھ پارٹ ٹائم نوکری اور کر لیتے لیکن ابا کہتے۔ ”میں اپنی زندگی کو مشین نہیں بنا سکتا۔“

امی عالی دماغ خاتون تھیں، ایک زمانے میں دو دو اسپتالوں میں بھی نوکری کی مگر پھر تھک گئیں۔ انہیں اس بات کا بڑا قلق تھا کہ ابا نے ان کا بھی ساتھ نہ دیا۔ ہانیہ سوچتی اگر ابا بھی ان کا ساتھ دیتے تو شاید وہ بالکل ہی اکیلی پڑ جاتی۔ امی کا سارا خاندان ہی اعلیٰ تعلیم یافتہ بلکہ ڈگری یافتہ لوگوں سے بھرا پڑا تھا۔ بڑی بڑی ڈگریاں، بڑی بڑی نوکریاں تاکہ اس سے بنا سکیں پڑے گھر اور گاڑیاں اور ہانیہ کو اس تصور سے ہی نفرت تھی۔



”کیا فائدہ ایسے علم کا! جو صرف دنیا کمانے کا ذریعہ بنے اور جتنے بڑے گھر ہوتے ہیں۔ اتنے ہی دل تنگ ہو جاتے ہیں انسانوں کے۔“

وہ بڑے حساس دل کی مالک تھی اور چیزوں کو بڑی گہرائی میں جا کر دیکھتی تھی۔ اسی لیے جب اگلی بارتائی امی کا فون آیا۔ ”آ جاؤ ہانیہ، تمہاری پھپھو کی طرف چلتے ہیں۔“ تو وہ پوری طرح تیار تھی۔

”تائی امی میرا بھی بڑا دل تھا پھپھو کی طرف جانے کا، پلیز ہادی سے کہیں، پہلے آپ کو بٹھائے پھر مجھے بھی پک کرے۔“

تائی امی سیدھی سی خاتون تھیں فوراً مان گئیں۔

”سچ کہہ رہی ہو، چھٹی کا دن ہے آخر یہ ناکارہ کب تک سوئے گا۔“ اور وہ دو دن تک خوشی خوشی عصمت بیگم کے سر پر گاتی رہی۔

”کیسا مزاج ٹھکانے لگایا ہادی صاحب کا۔“

آخر کو امی کا ہونے والا داماد بھی تھا اور ہانیہ کو دوسری عصمت بیگم بننے سے خوف آتا تھا۔ شوق کی بات الگ تھی مگر ماں کی زندگی سے اور کچھ سیکھا ہو یا نہ سیکھا ہو۔ یہ ضروری سمجھ لیا تھا کہ اللہ کی عطا کردہ فطری تقسیم پر راضی ہو جانا ہی سمجھ داری ہے۔ بالآخر رات کو کپڑے استری کرتے عصمت بیگم نے اس سے پوچھ ہی ڈالا۔

”تو تمہیں یہ خیال کیسے آیا کہ یہ ہادی کی ذمہ داری ہے؟ کہاں تو تم گاڑی لے کر اڑی اڑی پھرتی تھیں۔ بس کوئی موقع مل جائے ڈرائیو کر کے جانے کا۔“ وہ مسکرائی پھر کہنے لگی۔

”غالباً ارسطو سے کسی نے پوچھا تم نے عقل مندی کس سے سیکھی تو اس نے جواب دیا بے وقوفوں سے! بس امی یہ جو عورتوں کے لیے نعرہ لگایا ہے ناں! ہم سب کچھ کر سکتی ہیں۔“ ایک تصویر ہے جس میں اس کے چہ ہاتھ ہیں۔ بچے بھی سنبھالے، کمپیوٹر بھی چلائے، جھاڑو پوچا بھی کرے تو اس سے مجھے عقل آگئی، جس کا کام اسی کو سناجھے۔ اگر میں بھاگ بھاگ کر ہر ذمہ داری اپنے سر لیتی رہی تو ہادی

صاحب کا وہی حال ہو جائے گا جو آپ کے صاحب کا ہے۔“ اس نے شرارت سے کہا۔

امی نے ٹھنڈی آہ بھری۔

وہ مسکرائی، امی کا ہاتھ تھام، استری کا سوئچ آف کیا اور ان کو کرسی پر بٹھایا۔

”تھوڑی دیر بیٹھ بھی جایا کر س۔“ اس نے محبت سے ان کا ہاتھ دبایا اور عصمت بیگم کے پیروں میں بیٹھ کر، سران کی گود میں رکھ دیا۔ گہری سانس اندر اتاری تو سکون ہی سکون پھیل گیا۔ اس کا دل جاہا کائنات یہیں ٹھم جائے اور اس لمحے کا طاسم کبھی نہ بھرے مگر وائے رے قسمت اس کی ماں کوئی عام عورت تو تھی نہیں، فون بجا، پریش کر کر کی سیٹی بجنا شروع ہو گئی۔ عصمت بیگم ہڑبڑا کر اٹھ گئیں جیسے انسان گہری نیند سے جاگ جائے۔

”ارے ہٹو! تم بھی کیا چونچلے لے کر بیٹھ گئیں۔“ پھر وہ جواٹھ کر بھاگیں تو پورا ہفتہ نہ مل سکیں۔

اتوار کے دن جب ان کا ایک پیرچن میں دوسرا کمرے میں تھا۔ پورے ہفتے کے سالن بنانا، کچھ رول سمو سے آئے گئے کی خاطر مارت کے کے لیے پھر پورے ہفتے کی لائڈری، ایسے میں گھنٹی بجی اور ہادی صاحب فروٹ لے کر حاضر ہو گئے۔ انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

”یہ کس سلسلے میں بیٹے؟“ ہادی نے جھینپ کر کہا۔

”گھر کے لیے لینے گیا تھا تو یہاں بھی لے آیا۔“

ہانیہ ٹھنڈے ٹھار آم کے جوس کے ساتھ، گھر کے بنے رول سمو سے لے کر پندرہ منٹ میں حاضر ہو گئی سلتے سے اوڑھا ہوا دوپٹا، جھکی جھکی نظریں، عصمت بیگم کے کلیجے میں ٹھنڈ پڑ گئی۔

اپنے ابا کو بلاؤ، ہادی آیا ہے۔ انہوں نے ہانیہ سے کہا، ہادی رول سموں سے انصاف کرنے لگا اسے بچپن سے اپنی چچی کے ہاتھ کا ذائقہ پسند تھا۔

سارا گھر پھیلا پڑا تھا۔ عصمت بیگم کا دل برا

ہو رہا تھا۔ رہ رہ کر ہولی اٹھ رہے تھے، وہ گھڑی کے ساتھ چلنے والی عورت تھیں۔ دل تو کہہ رہا تھا۔ سب چھوڑیں اور یاؤں پسار کر بیٹھ جائیں۔ ہادی کے چٹکلے، ہانیہ کے جزیئے، وقار صاحب کی لن ترانیاں ڈاکٹر ہونے کی وجہ سے ان کی شفٹ بھی بدلتی رہتی تھی۔

”بس یہ رول بنانا ضرور سیکھ لینا۔“ اس نے پلیٹ سے آخری رول بھی اٹھاتے ہوئے کہا۔

”آپ باہر کے کام کر لیں پھر گھر کے کاموں کے لیے بندی حاضر ہے۔“ ہانیہ نے سر تسلیم خم کر کے کہا۔ ”ایک بار باہر نکل جاؤں پھر گھر کا کام مجھ سے نہیں ہوتا بھئی! ہانیہ نے باتوں باتوں میں بتایا۔

”چچی امی کو دیکھو گھر، باہر سب کتنے بہترین طریقے سے بیلنس کیا ہوا ہے۔“ وہ کہہ رہا تھا۔ پھر اس نے عصمت بیگم کو مخاطب کیا۔ ”آپ کتنی کمزور ہوئی جا رہی ہیں کم از کم پارٹ ٹائم کر دیں اپنی جاب کو۔“ پھر اس نے ہانیہ کو مخاطب کیا۔ ”پارٹ ٹائم جاب تو آرام سے کر سکتی ہیں خواتین۔“

”گھر خود ایک فل ٹائم جاب ہے، عورت کے لیے تو پارٹ ٹائم بھی ڈیڑھ ڈیوٹی کی طرح ہو جاتی ہے۔ اور پھر ایک بار کیریئر کی ریس میں داخل ہو جاؤ تو واپسی کے دروازے بند ہوتے چلے جاتے ہیں۔“ وہ کہہ رہی تھی، عصمت بیگم خاموشی سے سنتی گئیں۔

”لیکن اگر خدا خواستہ کچھ ہو تو عورت کے پاس ڈگری تو ہونی چاہیے؟“ اب وہ اپنی کنفیوژن دور کرنا چاہ رہا تھا۔

اب وقار صاحب کو د پڑے گفتگو میں۔

اسلام کے لحاظ سے دیکھو تو رشتہ داروں کی ایک طویل لسٹ ہے جو ایک کے بعد ایک عورت کے ولی مقرر ہوتے ہیں۔ سرمایہ دار ملکوں میں پورا سیٹ اپ ہے جو عورت کے کام کرنے کو سپورٹ کرتا ہے اور ایسا ماحول بناتا ہے۔ جہاں وہ یکسوئی سے کام کرے، رہ گئے ہم؟ انہوں نے ٹھنڈی آہ بھری۔ ”تو بھائی ہم ہیں چولہ چولہ کا مربہ، عقیدہ اسلام کا لے کر بیٹھے ہیں۔ زندگی سرمایہ دارانہ نظام کے تحت چلائی پڑتی

ہے۔ تو ہمارے نہ مرد یکسو ہو پاتے ہیں نہ عورت۔“ اور ذرا گہرائی سے دیکھو، وہ پھر گویا ہوئے۔ ”ڈگری دو چار سال کام نہ کرو تو خود بھی بے کاری ہو جاتی ہے۔ ایک کاغذ کا پرزہ جو بتاتا ہے آپ اس کام کے ماہر ہو اور پھر اگر آپ کام ہی نہ کرو تو وہ مہارت ضائع ہو جاتی ہے۔ ہر فیلڈ میں تبدیلیاں بھی تو آتی رہتی ہیں۔“ وقار صاحب نے سمجھانے کی کوشش کی۔

”ایک اور بات ہے۔“ عصمت بیگم نے اضافہ کیا۔ ”ایک کام جو زندگی میں آپ کو کرنا ہی کرنا ہے۔ اس کی تیاری کیوں نہیں؟“ خدا خواستہ کے لیے پوری زندگی لگا دیں؟“

ہادی نے نہ سمجھنے والے انداز میں ان کی طرف دیکھا۔ ”میری ایک دوست انجینئر ہے۔“ وہ گویا ہوئیں۔

”ہمارے زمانے میں دو ہی چیزیں زیادہ فیشن میں تھیں۔ ڈاکٹر یا انجینئر۔“ وہ خود ہی اپنی بات پر ہنسیں۔ ”تو میری وہ دوست اپنی چھوٹی بچی کو دودھ خوب پکا کر، کاڑھ کر پلائی تھی تاکہ چار اولس کے دو اولس کر کے اسے پلائے بچی دواؤں ہی پیتی تھی۔ اسے کتنے عرصے بعد پتا چلا زیادہ پکانے سے دودھ کی غذائیت ضائع ہو جاتی ہے۔ تو میرے بیٹے، بچوں کی تربیت، شوہر کی اطاعت، اسنے رب کی پہچان اور اس کے احکامات کی سمجھ اور گھر، ایک مسلمان عورت کے پاس تو کرنے کا کام بہت ہے کجا کہ غیر ضروری ذمہ داریاں اپنے سر لے لے۔“

”یہ کہہ کر عصمت بیگم نے گھٹنوں پر ہاتھ رکھا اور کھڑی ہو گئیں۔ چوبے پر سالن رکھے تھے۔ مشین میں کپڑے انتظار کر رہے تھے۔ سبزیاں صاف کر کے فراہم کرنی تھیں۔ سلا تیار کر کے، گرم روٹی ڈال کر کھانا لگانا تھا اور پھر پورے ہفتے کی استری انہوں نے ٹھنڈی آہ بھری، ”شاید آنے والی نسلیں کچھ سیکھ لیں۔“ انہوں نے سوچا اور بچن کی راہ لے لی۔



نعیمہ ناز

گمشدہ شادی

عاطف کو اس کی پھوپھی زاد، آرزو بڑے پراسرار انداز میں اپنے گھر لاتی ہے جہاں عاطف کے والد شہید احمد کی حالت قابل رحم اور عبرت ناک تھی۔ گھریلو حالات بھی دگرگوں تھے۔

عاطف کی پھوپھی عظمیٰ اپنے ماضی کو یاد کرتی ہیں۔
ثمینہ بیگم کی اپنی نند حمیرا سے کبھی نہیں بنی تھی۔ مگر حمیرا کے دونوں بچے ثمینہ بیگم کے بچوں سے محبت کرتے ہیں اور حمیرا ان کی شادی کی خواہاں تھی۔ ثمینہ اپنے بیٹے شہید کی شادی اپنی بیٹی سے جبکہ ان کے شوہر اپنی بھانجی مہربانو سے کرنا چاہتے ہیں۔

ثمینہ اپنے مرتے ہوئے بھائی کی خواہش پر شہید کا نکاح عفت سے کروادیتی ہیں۔ یہ خبر حمیرا اور بچوں پر بجلی بن کے

مکمل ناول



گرتی ہے۔ عظمیٰ کی شادی پھوپھی کے گھر ہو جاتی ہے جبکہ مہربانو کا رشتہ امیر کبیر اور حسین معیز سے ہو جاتا ہے۔ مہربانو کی بد مزاجی، بد لحاظی کی وجہ سے روز گھر میں جھگڑے ہوتے ہیں۔ وہ ناراض ہو کر میکے آ جاتی ہے۔ شہید احمد کے دل میں مہربانو کی محبت کا احساس عفت کو بے چین رکھتا ہے۔ وہ مزاجاً اپنی ساس کی طرح لڑا کا اور شکی ہے۔

عاطف کو پھوپھی کے حالات رنجیدہ کر دیتے ہیں، وہ ماں کے علم میں لائے بغیر روز والد کی خدمت کرنے جاتا ہے اور آرزو کے لیے نوکری کا بندوبست کرتا ہے۔

دوسری قسط

مہربانو کا مزاج اگر آسمان پر رہتا تھا تو حمیرا کا سوا نیزے پر۔ مہربانو کو سمجھانے کے بجائے وہ الٹا اسے شہہ دے رہی تھیں۔ میاں دتو اور زن مرید قسم کے تھے۔ ان کی مجال نہیں تھی کہ بیوی کے آگے یا ان کی مخالفت میں کچھ بول سکتے۔ انہیں بیوی اور بیٹی سے اختلاف تو تھا مگر بیٹی سے پیار بھی تھا۔ اس کا گھر اور زندگی بٹائی ہوئی دیکھنا چاہتے تھے، اسی لیے اکیلے میں اسے بٹھا کر پیار سے سمجھانے کی کوشش کی مگر مہربانو کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا، اسے تو شوہر کی یہ لاپرواہی اور بے نیازی بری طرح کھل رہی تھی کہ وہ اب تک یعنی ایک ہفتہ گزرنے پر بھی نہ اسے منانے آیا نہ واپس لے جانے، رہ رہ کر غصہ آ رہا تھا۔ معیز عالم پر اس شادی پر اور اپنی زندگی پر۔

اس سے اچھا تو شہید تھا، کیسے میرے آگے پیچھے پھرتا تھا، ناز خڑے اٹھاتا تھا، یہ کم بخت عفت بیچ میں نہ آتی تو آج میں یوں جل جل کے نہ مر رہی ہونی بلکہ شہید احمد میرے آگے پیچھے پھر رہا ہوتا، مجھے سر آنکھوں پہ بٹھا رہا ہوتا۔ مہربانو کے دل سے آہیں نکل رہی تھیں اپنے لیے اور بد دعا میں نکل رہی تھیں ان لوگوں کے لیے جن کی وجہ سے اس کی خوشیاں اس سے روٹنے لگی تھیں دور جا رہی تھیں۔ ان لوگوں میں اس کی ساس بھی شامل تھیں، معیز عالم بھی اور عفت بھی۔ اس کے روٹھ کر میکے آنے کا معاملہ اب کسی سے ڈھکا چھپا نہیں تھا۔ بات باہر اگل پٹی تھی اور پھیل رہی تھی تب ہی تو ثمنینہ اپنی نند کے کہ آئی ہیں، ہمدردی کی آڑ میں، زخموں پر نمک

میں پڑ گئی کہ جو بات محلے اور خاندان میں پھیلی ہے وہ سچ ہے یا حمیرا بیگم کا کہا درست ہے؟ مگر اگلے ہی لمحے مہربانو کی اتری ہوئی صورت نے ان پر سب کچھ واضح کر دیا تھا گو کہ مہربانو اچھے لباس، زیور اور میک اپ میں تھی مگر میک اپ کی تہوں سے پریشانی چھلک کر باہر آ رہی تھی۔ جسے ان کی جہاں دیدہ نظروں نے بھانپ لیا تھا۔

”چلو، تم کہہ رہی ہو تو پھر ٹھیک ہی کہہ رہی ہو گی، ویسے بھی بھئی بیٹیاں تو اپنے گھروں میں ہی اچھی لگتی ہیں، میکے میں تو بس مہمان سامان ہوتی ہیں۔“ ثمنینہ بیگم تو بول بال کر چل دیں، اگلے دن عظمیٰ گھر آ کر ماں پر خوب غصہ ہوئی۔

”آپ کو کیا ضرورت تھی میرے گھر آ کر یہ سب فضول باتیں کرنے کی۔ مہر، ایک ہفتہ کے میکے میں یا چار ہفتے، آپ کو کیا۔ آپ کے جانے کے بعد دونوں ماں بیٹی میرے پیچھے پڑ گئیں کہ میں نے ہی آپ کو بتایا ہوگا، ارسلان کو بھی بھڑکا دیا، وہ بھی مجھ پر غصہ کر رہے تھے کہ میں سسرال کی ساری رپورٹیں میکے میں دیتی ہوں۔“ بولتے بولتے عظمیٰ رو پھانسی ہو گئی پھر دوبارہ بولنے لگی۔

”اپنے کام سے کام رکھیں آپ، کیا ضرورت ہے کسی کے معاملات میں بولنے کی، ہر کوئی اپنا اچھا برا خوب سمجھتا ہے، یہ تو سوچ لیتیں کہ وہ بیٹی کا سسرال بھی ہے۔“

”اچھا بس، اتنی باتیں سنانے کی ضرورت نہیں ہے اور سسرال والوں سے اتنا دبنے کی اور انہیں سر پر چڑھانے کی۔ ضرورت بھی نہیں ہے۔ اس میں تو کوئی شک نہیں ہے کہ وہ میکے میں بیٹھی ہوئی ہے، میں نے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔“ ثمنینہ بیگم بیٹی کی کھٹکی پر ناراض ہونے لگیں۔

مہربانو اب شدت سے معیز کا انتظار کر رہی تھی مگر وہاں بالکل خاموشی تھی۔ فون کرنے کا سوچا مگر آٹا آڑے آ رہی تھی۔ حمیرا نے بھی بیٹی کی کمر ٹھونکی۔

”کوئی ضرورت نہیں ہے فون کر کے بلانے کی،

ایک بار مرد کے آگے عورت جھک جائے تو ساری عمر جھکا کے رکھتا ہے۔ بڑے بد ذات ہوتے ہیں یہ مرد کم بخت، خصوصاً جب وہ شوہر ہو۔“ حمیرا اپنے فرمودات بیٹی کے کانوں میں انڈیل دیتیں۔ یہ سوچے بغیر کہ ہر مردان کے شوہر کی طرح نہیں ہوتا۔ ان کے شوہر فطرتاً دتو کمزور اور جی حضور قسم کے تھے، حمیرا دوسروں کو دباؤ میں رکھنے والی دنگ قسم کی عورت، سوائے شوہر کی ناک میں ٹیل ڈال رکھی تھی جہاں چاہے گھما لیتیں، معیز عالم ایک مختلف انسان تھے وہ اپنے سر سے بالکل الگ تھے اور مہربانو، اپنی ماں جیسی بننا چاہ رہی تھی، شوہر کو اپنے اشاروں اور مرضی پہ نچانے والی۔

معیز عالم اپنے گھر اور گھر کی عزت کے حوالے سے بہت حساس تھے۔ ان کے رشتے داروں میں بھی چہ میگوئیاں ہونے لگی تھیں۔ ایک آدھ دن میکے میں رہنے والی بیوی کو ایک ماہ سے زائد ہو جائے میکے میں رہتے ہوئے تو دوسرے لوگوں کو تشویش تو ہوگی ہی، ان کی فیملی کے متعلق ہونے والی سرگوشیاں ان کے کانوں تک بھی پہنچ رہی تھیں۔ یوں تو مہربانو کو لینے وہ بھی جاسکتے تھے کہ بات ختم ہو جاتی، وہ گھر آ جاتی مگر وہ سوچ رہے تھے کہ اگر ایک بار اپنی انا اور خود داری کو بالائے طاق رکھ کر اسے لینے چلے گئے تو اس کی خود سری مزید بڑھ جائے گی۔

اور سچ تو یہ تھا کہ مہربانو سے جو نکاح کا بندھن قدرت نے باندھا تھا اس کی وجہ سے ان کے دل میں بیوی کا ایک مقام تھا، خیال تھا مگر مہربانو نے کوئی ایسی خاص کوشش اور جتن نہیں کیے کہ ان کے دل میں موجود مقام کو اپنے لیے خاص بنا سکتی یا اپنے رویے زبان اور سلوک سے شوہر کے دل میں محبت کی جوت جگانی۔ مہربانو نے بس یہ سوچ لیا تھا کہ اس کا خوب صورت چہرہ محبت کو خود بخود اس کے قدموں میں ڈال دے گا مگر دلوں میں گھر کرنے کے لیے صورت کی نہیں سیرت کی خوب صورتی ضروری ہوتی ہے، زبان اور حسن سلوک کی مٹھاس دوسروں کو گرویدہ بنالیتی ہے۔

مہربانو کی تلخ زبان اور روئے نے معزز عالم اور ان کی ماں کو سخت مایوس کیا تھا۔ انہیں نہیں لگتا تھا کہ مہربانو میں کوئی تبدیلی آ سکتی ہے۔ وہ اپنے اصل رنگ ڈھنگ کے ساتھ ان کے سامنے آ گئی تھی۔ یہ رنگ ڈھنگ ان دونوں کے لیے قابل قبول نہیں تھے۔ پھر بھی وہ ایک طرفہ فیصلے کر کے کسی پہ ظلم نہیں کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے ایک معتبر ذریعے سے مہربانو کو پیغام بھجوایا کہ وہ اسے لینے کے لیے گاڑی بھیجیں گے، وہ بیٹھ کر آ جائے، مہربانو اس پر راضی نہیں تھی، اس کی زخمی انا کو تسکین تب ہی ملتی جب معزز عالم خود اسے لینے آتے، ماں سے مشورہ کر کے اس نے پیغام لانے والے کے ذریعے کہلوایا کہ معزز عالم خود لینے آئیں اور واپس جانے کے لیے اس کے کچھ مطالبات اور شرائط ہیں وہ تسلیم کر س تو وہ واپس آئے گی۔

معزز عالم کو بیوی کی ہٹ دھرمی پہ غصہ آیا اور ان کی والدہ کو افسوس ہوا۔ مگر دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں کہ جن کے لیے تقدیر نے بد قسمتی نہیں لکھی ہوتی بلکہ اپنی شامت اعمال سے وہ اپنی بدبختی کو خود دعوت دیتے ہیں۔ مہربانو بھی ان ہی میں سے ایک تھی۔ وہ اپنی بد نصیبی کو خود آوازیں دے کر بلارہی تھی۔

جس دن اسے پتا چلا کہ اس کے وجود میں ایک اور زندگی پرورش پا رہی ہے اس کا مزاج اور ساتویں آسمان پر پہنچ گیا۔ اس نے معزز عالم کو خود فون کیا۔ ”کیسی ہو؟“ وہ کچھ حیران اور کچھ بے یقین سے تھے۔

”ٹھیک ہوں، ایک خوش خبری ہے آپ کے لیے۔“ مہربانو نے چند لمحوں کا ڈرامائی وقفہ دیا۔ ”آپ باپ بننے والے ہیں۔“

معزز عالم نے ہمیشہ کی طرح اپنے جذبات کا کھل کر اظہار نہیں کیا۔ کہا تو فقط اتنا کہ ”یہ تو بہت اچھی خبر ہے۔ امی سن کر بہت خوش ہوں گی۔ گھر آ جاؤ مہر، بہت تماشا ہو گیا ہے ہمارا۔“ ”آؤں گی مگر ایک شرط یہ۔“

”پھر وہی شرط؟ معزز زچ ہو گئے، تم ابھی تک بچی بنی ہوئی ہو۔ تمہیں سمجھانے والا کوئی نہیں؟ زندگی اس طرح گزاری جاتی ہے، شرطوں پر؟“ ”میں بچی نہیں ہوں، سب عقل ہے مجھے۔“ مہر بانو کو غصہ آرہا تھا۔ معزز کا رد عمل اس کی توقع کے برخلاف تھا۔ وہ تو سوچ رہی تھی کہ خوشخبری سنتے ہی معزز خوشی سے پاگل دیوانہ ہو جائے گا۔ جو کہہ گی مان لے گا مگر وہ تو اب بھی ماش کا آٹا بنا اینٹھ رہا تھا۔ ”مجھے الگ رہنا ہے۔“ مہربانو نے توپ کا گولہ داغ دیا۔

”کس سے الگ؟ مجھ سے الگ تو تم رہ رہی ہو۔“ ”آپ کے ساتھ رہنا ہے مگر آپ کی ماں سے الگ۔“

”میری ماں تمہاری کچھ نہیں لگتیں؟ تم بات کس طرح کر رہی ہو؟ معزز عالم کو ٹھیک ٹھاک غصہ آ گیا۔ اس کی شرط پر بھی، اس کے الفاظ پر بھی اور اس کے لہجے پر بھی۔

سیدھی سی بات ہے کہ وہ مجھے پسند نہیں کرتیں، میں کب تک ان کی زبان برداشت کروں؟ زبان سنبھال کر بات کرو، تم میری ماں کے متعلق بات کر رہی ہو۔“ معزز غلٹے وہ ان بیٹوں میں سے تھے جو اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اپنی ماں کو مرکز محبت بناتے ہیں۔ ان کے ادب و احترام میں کوئی کسر، کوئی کمی نہیں چھوڑتے، وہ اپنی ماں کے متعلق اس طرح کی باتیں کیسے برداشت کر سکتے تھے۔

”میں اپنی بات کر رہی ہوں، مجھے الگ رکھیں گے یا نہیں؟“ مہربانو کو دبا نہیں آتا تھا۔ ”اگر تمہاری یہی ضد ہے تو پھر دیکھو میں تمہیں ایسا الگ رکھتا ہوں کہ ساری زندگی یاد کرو گی۔“

☆☆☆

صاف رنگت دہلا پتلا سراپا، کندھوں سے ذرا نیچے تراشیدہ بال، مستعد اور پھر تیلی سی خاتون تھیں جن کا نام ثاقبہ خان زادہ تھا۔ ایک مختصر اور ہلکے پھلکے

انٹرویو کے بعد انہوں نے اپنی ساس سے بھی ملوایا تھا۔ گوری چٹی، بھاری بھر کم سی خاتون تھیں۔ بہت زیادہ عمر رسیدہ تو نہیں تھیں مگر مختلف بیماریوں نے وقت سے پہلے ہی بوڑھا کر دیا تھا۔ بلند فشار خون کی مریضہ تھیں۔ دو تین مختلف آپریشن بھی ہو چکے تھے۔ ان کی دیکھ بھال، خوراک اور دوائیوں کا خیال رکھنا تھا۔ بلکہ چوبیس گھنٹے ان کے ساتھ ہی رہنا تھا۔ گھر

میں ملازم تھے، صاحب خانہ ملک سے باہر اور بیگم صاحبہ ملازمت پیشہ تھیں۔ بیگم ثاقبہ نے آرزو کر رکھنے کا عندیہ دے دیا تھا۔ ساتھ میں اس کی امی اور ماموں کو رہنے کی بھی اجازت تھی۔ تنخواہ معقول تھی۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ فی الحال ان کے رہنے کا ٹھکانہ ہو گیا تھا جہاں انہیں کرایہ دینے، بجلی، گیس کے بل اور پانی بھرنے کی فکر نہیں تھی۔ عاطف مطمئن تھا، عظمیٰ پھپھو بھی، مگر آرزو شاید ناخوش تھی یا پھر یہ شاید اس کے چہرے کا مستقل حصہ بن گیا تھا۔

واپسی پر عاطف معمول سے زیادہ تیز ڈرائیو کر رہا تھا۔ انہیں اورنگی ٹاؤن پہنچا کر اسے واپس ماڈل کالونی اپنے گھر آنا تھا۔ چھ بجے کا وقت دیا تھا ماں نے، اس وقت چھ بجنے میں پانچ منٹ تھے۔ انہیں پہنچانے میں اور گھر واپسی میں آدھ، پون گھنٹہ تو لازمی لگنا تھا۔ ”کھانا کھا کر چلے جانا۔“ گھر پہنچ کر عظمیٰ پھپھو گاڑی سے اترتے ہوئے کہنے لگیں۔

”گھر پہ مہمان میرا انتظار کر رہے ہیں، بس ابھی تھوڑی دیر میں امی کا فون آنے والا ہے۔“ عاطف نے معذرت کی۔

”کسے مہمان؟“ ”کوئی لڑکی دیکھی ہے میرے لیے، ان ہی

لوگوں کو بلایا ہے۔“ ”اچھا،“ عظمیٰ پھپھو کا چہرہ نہ جانے کیوں تاریک سا ہو گیا۔

”ٹھیک ہے پھر تم جاؤ، اللہ خوش رکھے تمہیں۔“ انہوں نے ایک گہری سانس لی۔

”میں کل آؤں گا، اپنا سامان ریڈی رکھیے گا، شفتنگ کروادوں گا۔ ٹھیک ہے؟ خدا حافظ۔“ ”خدا حافظ۔“ وہ کھڑکی چھوڑ کر گاڑی سے پیچھے ہٹ گئیں۔

عاطف نے واپسی پہ گاڑی کی رفتار اور بھی تیز کر رکھی تھی۔ موبائل بج رہا تھا۔ اس نے گاڑی ایک طرف روک کرامی کی کال سنی۔ حسب توقع وہ غصہ کر رہی تھیں۔

”کہاں ہو تم، تمہارے چھ نہیں بجے ابھی تک؟“ ”ٹریفک میں پھنسا ہوا ہوں امی، جیسے ہی کھلتا ہے میں آ رہا ہوں۔“ عاطف نے پہلی بار کراچی کے شدید ٹریفک جام کو دعائیں دیں جس کی بدولت اس کا جھوٹ چل گیا ورنہ امی کی ڈانٹ اور غصہ، اللہ دے اور بندہ لے! موبائل بند کر کے اس نے گاڑی اور تیز بھگائی۔ گھر پہنچا تو پونے سات بج رہے تھے۔ نہاد دھوکہ دوسرے کپڑے پہن کر جب وہ مہمانوں سے ملا تو سات بج رہے تھے۔ پانچ منٹ وہ مہمانوں سے دیر سے آنے کی معذرت کرتا رہا اور وہ خوش اخلاقی سے ہنس ہنس کر ”کوئی بات نہیں۔ ٹریفک ہی ایسا ہے یہاں کا۔ دیر ہو ہی جاتی ہے۔“ قسم کی باتیں کر کے اس کا احساس جرم کم کرنے کی کوشش کرتے رہے۔

فیملی اچھی تھی، ملنسار، خوش اخلاق بننے ہنسانے والے لوگ۔ لڑکی کے والدین تھے، ایک بڑا بھائی اور بڑی بہن دونوں شادی شدہ تھے۔ ثانیہ سب سے چھوٹی اور سب کی لاڈلی تھی۔ بی ایس سی آنرز کر رہی تھی، بڑی بہن ثانیہ اور اس کے مشاغل، تعلیم اور دلچسپیوں کے بارے میں تفصیل سے بتا رہی تھیں، امی خوش ہو کر سن رہی تھیں۔

مہمانوں کے جانے کے بعد وہ عاطف سے مخاطب ہوئیں۔

”اگلے ہفتے منگنی کی رسم ادا کر دیں؟“

”فائل کر لیا آپ نے؟“ عاطف کا دل بہت زیادہ تو نہیں مگر تھوڑا سا افسردہ ہو رہا تھا اور وہ اپنے دل کی اس افسردگی کی وجہ جاننا نہیں چاہتا تھا۔ جو راستے اور منزلیں دسترس سے باہر نظر آئیں، ان پہ قدم رکھنا اور سفر کرنا، خود کو بھی اذیت میں مبتلا کرنا ہے اور اپنے ہم سفر کو

بھی۔ وہ ماں کا خوش و خرم چہرہ دیکھ رہا تھا اور بس۔
 ”فائل کر کے ہی تو ان لوگوں کو بلایا ہے۔“ امی
 ہنس پڑیں ”پگلا ہی ہے تو۔“
 ”جیسے آپ مناسب سمجھیں۔“ عاطف کا دُوح پہ
 لیٹ گیا۔

”تم تو خوش ہونا؟“
 ”آپ خوش ہیں تو میں بھی خوش ہوں۔“
 ”جیتا رہ میرے چاند۔“ امی بہت خوش تھیں،
 عاطف ان کی امیدوں کا واحد مرکز تھا، زندگی کی ساری
 خوشیاں اسی سے وابستہ تھیں۔

عاطف آج رات بہت دیر تک جاگتا رہا، کچھ عرصے
 پہلے تک زندگی کسی حد تک سیدھے سادے انداز میں گزری
 تھی۔ پھر اچانک ہی آرزو اس کے سامنے آئی اور پھر عظمیٰ
 پھپھو، شہید احمد۔ ایک ست روی سے، دھیرے دھیرے
 بہتی ہوئی ندی اچانک ہی بھرتے سمندر کے کسی بھنور میں
 جاگری تھی۔ وہ اکثر سوچتا تھا کہ یہ سلسلہ کب تک یونہی چلے
 گا وہ جانتا تھا کہ اس دنیا میں، اپنی زندگی میں کسی راز کی
 حفاظت کرنا بڑا کھن کام ہے۔ راز تو ہوتے ہی فاش ہونے
 کے لیے ہیں۔ اگر امی کو پتا چل گیا کہ وہ..... اس سے آگے
 عاطف کچھ نہیں سوچتا تھا۔

ایسے دکھوں کے بارے میں وہ نہیں سوچتا تھا، جو
 اسے یا ماں کو درپیش ہونے والے ہوں، جن غموں کے
 پہنچنے کا امکان ہوا نہیں اپنے خیالات سے پرے جھٹک
 دیتا تھا جیسے کوئی تریلی کو دیکھ کر اپنا سر ریت میں چھپالے،
 آرزو کے متعلق دل نے خواہش کی، سوچنے کی کوشش کی،
 مگر وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ بعض خواب محض خوش فہمی
 ہوتے ہیں جن کے پورا ہونے کا کوئی امکان نہیں ہوتا اور
 اسے یہ بھی علم تھا کہ اس خواہش کے آگے صرف اور
 صرف دکھ ہے، صرف اس کے لیے نہیں بلکہ اس سے
 وابستہ اور بھی لوگوں کے لیے۔

اس کے تصور میں بار بار عظمیٰ پھپھو کا چہرہ آ رہا تھا،
 جب اس نے اپنے رشتے کا ذکر کیا، کیسی مایوسی اور بے
 چارگی پھیلی تھی ان کے چہرے پہ، عاطف کو دیکھ کر بہت

افسوس ہوا تھا، اب تک ہو رہا تھا، اور اس بات پر بھی ہو رہا تھا
 کہ وہ اس مایوسی اور بے چارگی کو ختم نہیں کر سکتا تھا۔ بہت دیر
 سوچنے کے بعد اس نے بالآخر خود کو بستر پہ ڈال دیا۔ بس اللہ
 ہی ہے جو سب پر تمام معاملات میں رحم کرنے والا ہے۔
 سونے سے پہلے وہ بس یہی سوچ رہا تھا۔

اگلے روز آفس سے وہ سیدھا اورنگی ٹاؤن گیا۔ آج
 ان تینوں کو، بیگم ثاقبہ کے گھر پہنچنا تھا۔ عظمیٰ پھپھو کے گھر پہنچا تو
 وہ تیار ہی بیٹھی تھیں۔ ایک چھوٹا سا بیگ ان کے قریب رکھا
 تھا۔ یہ بیگ عاطف نے ہی دو چار دن پہلے انہیں لا کر دیا
 تھا۔ اپنے اور آرزو کے مختصر سے جوڑے اور دوسرا اسباب
 انہوں نے اس بیگ میں رکھ دیا تھا۔
 ”باقی سامان، میں کل پہنچا دوں گا۔“ عاطف نے
 ان سے کہا۔

”کون سا سامان؟“ پھپھو دھیرے سے
 مسکرائیں۔

”یہ سب تو مالک مکان کا ہے، انہوں نے دیکھا
 کہ ہمارے پاس کچھ نہیں ہے تو ہمارے استعمال کے
 لیے یہیں چھوڑ دیا۔ ہم تو بس اپنے تن کے کپڑوں کے
 ساتھ آئے تھے یہاں۔“

”چلیں؟“ عاطف نے ایک گہری سانس لی اور
 شہید احمد کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ ان کی حالت
 میں کافی بہتری آتی جا رہی تھی۔ عاطف کے سہارے
 چل کر وہ باہر آئے اور اس کی مدد سے گاڑی میں بیٹھ
 گئے۔ آج ان کی سہولت کی خاطر اس نے گھر کے سامنے
 ہی کار کھڑی کی تھی۔ آرزو خاموش تھی، بالکل چپ، جیسے
 کسی نے منہ پہ تالا لگا دیا ہو۔

بیگم ثاقبہ کو عاطف نے فون کیا تھا، وہ گھر پر ہی تھیں۔
 عاطف ان تینوں کو لے کر ملیر کینٹ ان کے بنگلے پہ پہنچا،
 شہید احمد کو سرونٹ کوارٹر میں پہنچایا۔ دو کمروں کا مختصر سے
 لاؤنج، کچن اور باتھ روم پہ مشتمل وہ کوارٹر ضروری سازو
 سامان سے بھی آراستہ تھا۔ ایک بیڈ پڑا ہوا تھا۔ ایک الماری
 بھی تھی۔ عاطف گھوم پر کر پورے کوارٹر کا معائنہ کر کے دل
 ہی دل میں طے کر رہا تھا کہ اسے ضرورت کا کیا کیا سامان

مہیا کرنا ہے۔ گو کہ اسے اچھی طرح اندازہ تھا کہ اس کی اس
 عنایت کو آرزو نہ تو پسند کرے گی نہ ہی قبول۔ ”ٹھیک ہے
 میڈم، آپ اپنے مزاج سے مجبور ہیں اور میں اپنی عادت
 سے۔“ عاطف مسکرایا۔

”اپنے اور امی کے لیے آرزو نے بستر نیچے ہی لگا
 لیا تھا۔ ابھی تو پچھلے گھر سے ہی ٹھیک سے مانوس نہیں
 ہوئی تھی کہ پھر سے اگلے پڑاؤ کی طرف اذن سفر، ایک
 باتھ گال کے نیچے رکھے پہلو کے بل لیٹی وہ سوچ رہی
 تھی۔ تو اب زندگی اس طور گزرے گی؟ جو مانوس تھے
 کبھی، اجنبی بن گئے اور اجنبی جو ہیں آہستہ آہستہ مانوس
 بننے جا رہے ہیں۔ چاہے وہ مقامات ہوں یا چہرے
 سوچتے سوچتے اس نے گھبرا کر روٹ بدلی۔

جورائیں ہمارے لیے نہ ہوں ان پر قدم رکھنا بے
 دُونی کے سوا اور کچھ نہیں، سختی سے آنکھیں میچے وہ اس
 سے بھی زیادہ سختی سے دل کو باور کر رہی تھی، جس رستے پہ
 واضح طور پر ”نو گو ایریا“ اور ”آگے راستہ بند ہے“ کے
 بورڈز لگے نظر آ رہے ہوں، وہاں قدم رکھنا، آگے بڑھنا
 اور منزل کی توقع رکھنا حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔

آرزو کے باہر سختی اور سختی کا خول دیا ہی تھا مگر اندر
 سے یہ خول کچھ ٹوٹ رہا تھا۔ آرزو نہیں چاہتی تھی، یہ خول
 تڑنے مگر کوئی اور طاقت بھی تھی جو اس پر اثر انداز ہو رہی
 تھی۔ یہ کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ؟ وہ حیران بھی ہو رہی
 تھی اور خوفزدہ بھی، وہ جو بالکل ہی دسترس سے باہر اتنے
 فاصلوں پر ہے کہ زندگی ختم ہو جائے گی مگر فاصلے ختم نہیں
 ہوں گے، پھر ایسی خواہش کیوں بے دار ہو رہی ہے،
 ایسی تمنا کیوں جاگ رہی ہے؟

”خود کو سنبھالو آرزو بی بی۔“ آرزو نے اپنے آپ کو
 انا۔ ”کیوں آگ میں کودنے چلی ہو، جل جاؤ گی، خاک
 ہو جاؤ گی۔“ دماغ ڈانٹ بھی رہا تھا، سمجھا بھی رہا تھا، دل
 ایسی بے بسی اور بے کسی سے دم سادھے بیٹھا تھا کہ بس، نہ
 بھی آئے تو رحم آ ہی جائے ترس آ ہی جائے۔

”کسی پہ بھروسہ نہیں ہے مجھ کو نہ اپنوں پر نہ
 ”سروں پر اور نہ ہی خود پر، بہتر ہے کہ قدم زمین پر ہی

رہیں، زیادہ ہواؤں میں اڑنے کی کوشش کی تو منہ کے
 بل گروگی۔“ جب تک نیند کی پریاں مہربان نہیں ہوتیں،
 وہ خود کو ملامت کرتی رہی۔

اگلے دن باقاعدہ اس کی نوکری کا آغاز تھا۔ آج
 رات سے اسے سونا بھی بڑی بی کے ساتھ تھا، ان کے
 کمرے میں، اب تو عرصے سے علی الصباح بیدار ہونے
 کی عادت پڑ گئی تھی۔ بیگم ثاقبہ نے سات بجے آنے کو کہا
 تھا اس نے پہلے امی اور ماموں کو ناشتہ بنا کر دیا کہ وہ
 دونوں بھی اس نئی جگہ بہت جلدی بیدار ہو گئے تھے۔
 سات بجے وہ بنگلے میں اندر گئی۔ بیگم ثاقبہ اپنی ساس کے
 کمرے میں تھیں۔

”آؤ، میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی۔“ آرزو کو
 دیکھ کر وہ دوستانہ انداز میں مسکرائیں۔ پھر انہوں نے
 آرزو کو وہ سب کچھ ایک بار پھر سمجھایا جو وہ کل بھی بتا چکی
 تھیں۔ اپنی ساس کے معمولات، خوراک، دوائیں،
 احتیاط سب کچھ اسے اچھی طرح ذہن نشین کر کر وہ اپنی
 تیاری کرنے چلی گئیں۔

آرزو کچن میں آ گئی۔ بڑی بیگم صاحبہ کے لیے
 ناشتہ بنانے۔ وہاں مسرت پہلے سے موجود تھی، وہ بھی
 ملازمہ تھی، بیگم ثاقبہ نے اس سے بھی تعارف کرایا تھا۔
 ”بی بی صاحبہ کا ناشتہ بنانا ہے۔“ آرزو اس کے پاس
 جا کر کھڑی ہو گئی۔

”وہی بنارہی ہوں۔“ مسرت پورج بنارہی تھی۔
 سانولی رنگت کی لمبی تڑنگی مضبوط کاکھی کی عورت تھی۔ لہجہ
 کھر در اگر مزاج اچھا تھا۔ وہ آرزو سے مخاطب تھی۔
 ”آج تو میں بنا دیتی ہوں، کام سمجھ لو، کل سے کر
 لیتا۔“

”اچھا۔“ آرزو اس کے پاس کھڑی اسے دیکھتی
 رہی۔ تمام خیالات، دماغ سے جھٹک دیے، جو کام
 آگے جا کر کرنا ہے، اسے پوری لگن، ایمان داری اور دل
 جمعی کے ساتھ سیکھنا چاہیے۔

☆☆☆

مہربانوں نے جانے سے انکار کر دیا تھا۔ معیز عالم

نے لے جانے سے انکار کر دیا تھا۔ مہربانو کے غرور کو بڑی سخت چوٹ پہنچی تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ خوشخبری سنتے ہی وہ کچے دھاگے کی طرح بندھا چلا آئے گا اور مہربانو جیسے چاہے اس دھاگے کو اپنی مرضی کے مطابق موڑ لے گی مگر معیز عالم تو جیسے لوہے کی دیوار بن گیا تھا، سر پھوڑ کر اپنا ہی سر زخمی کر لیا۔ دراصل معیز عالم کے پندار کو بھی تو خاصی چوٹ پہنچی تھی اپنی خانگی زندگی کے متعلق قریبی لوگوں کی سرگوشیاں، باتیں اور افواہیں سن کر انہیں بہت خفت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اپنے گھریلو اور نجی معاملات کا اپنے کمرے سے باہر جانا پسند نہیں کرتے تھے کجا یہ کہ وہ گھر سے باہر لوگوں کی زبان کے چٹخاروں کا سبب بنے، وہ چاہتے تو تھے کہ مہربانو گھر آ جائے اور لوگوں کی زبانیں اور منہ بند ہوں مگر مہربانو نے واپس آنے کی جو شرط رکھی تھی وہ انہیں ذرہ برابر بھی قبول نہیں تھی۔ ناراضی اور فاصلے بڑھ رہے تھے، معاملہ طوالت اختیار کر رہا تھا۔ مصالحت کی راہ پر چلنے کو دونوں میں سے کوئی تیار نہ تھا۔

حمیرا نے بیٹی کو یہ بات سمجھائی کہ بچے کی پیدائش تک انتظار کر لے بس پھر معیز عالم چاروں شانے چت ہوا کہ ہوا، مہربانو نے یہ بھی کر لیا۔ کڑکتی سردیوں کی ایک بہت ہی ٹھنڈی رات میں بہت پیارے سے گل گو تھنے بیٹے کو جنم دے کر اس نے سوچا کہ اب اس کے اور معیز عالم کے درمیان سرد مہری کی جو برف ہے وہ پگھل جائے گی اور اس برف کے ساتھ ساتھ معیز عالم بھی پگھل جائے گا۔ اس کی توقع کسی حد تک پوری ہوئی، پوتے کا سن کزدادی آئیں، ڈھیروں ڈھیر مٹھائی لے کر، پوتے کو دیکھ کر بہت ہی خوش تھیں، ساری باتیں فراموش کر دیں۔

”گھر چلو مہربانو، اللہ نے خوشی کا موقع دکھایا ہے۔ اسے سب کے ساتھ مل کر مناؤ۔ بچے کو تمہارے ساتھ ساتھ باپ کی بھی ضرورت ہے۔“ وہ بڑی بن کر ہنسا رہی تھیں۔

”معیز اب آئیں گے؟“ مہربانو نے سخت

سے سوال کیا۔

”میں معیز سے بڑی ہوں، میں آگئی، کیا یہ کافی نہیں؟“ وہ ابھی تک بردباری سے کام لے رہی تھیں۔

”جی نہیں، یہ کافی نہیں ہے۔“ مہربانو نے بے حد تنفر سے اپنی ساس کو دیکھا۔ بڑھیا سے جتنا پیچھے چھڑانے کی کوشش کر رہی ہوں اتنا ہی مجھ سے چپک رہی ہے۔

”آپ ہی سمجھائیں مہربانو کو۔“ انہوں نے مدد طلب نظروں سے اپنی سدھن کو دیکھا۔

”ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے بچی، اتنے مہینوں خبر نہیں لی، پلٹ کر نہیں دیکھا کہ کس حال میں ہے اب بھی آپ کے بیٹے کی اکڑ نہیں گئی، اپنے بچے دیکھنے تک نہیں آیا۔ خدا جانے، کس نے بھڑکایا ہر ہے، کیا تعویذ گنڈے کروائے ہیں کہ بیوی کی فکر نہیں ذرا بھی نہ بچے کو دیکھنے کا ہوش برا مت مانیے گا، رشتہ اصل میں آپ کے بیٹے سے ہے۔ نکاح کے دو بول

اسی کے ساتھ پڑھوائے تھے۔ آپ سے بھی جو واسطہ تعلق بنتا ہے وہ اسی کی وجہ سے بنتا ہے۔ بیٹے کو بھی چاہیے تھا، بجائے اس کے، خود اٹھ کر چلی آئیں حمیرا نے ایسے کڑوے لہجے میں یہ سب کہا کہ وہ جہاں کی تہاں بیٹھی رہ گئیں۔

آئی تھیں خوشی خوشی، واپسی بڑے بوجھل اور بچھے بچھے دل کے ساتھ ہوئی۔ بیٹا منتظر تھا کہ شاہ بزرگی کا لحاظ کر کے مہربانو مان جائے، واپس آ جائے، مگر ماں کو اکیلا دیکھ کر اتنا جھٹکا نہیں لگا جتنا انہیں اداس بلکہ رنجیدہ دیکھ کر وہ ٹھٹک گیا۔

”کیا ہوا امی؟“ معیز نے سنجیدگی سے انہیں دیکھا۔

”بیٹا، میرا خیال ہے کہ مہربانو کو لینے تم کو ہی جا چاہیے، آخر کو شوہر تم ہو، اصل رشتہ تو تم سے ہے۔“ وہ دل گرفتگی کے عالم میں گویا ہوئیں۔

”کیا کہا ہے ان لوگوں نے؟“ معیز کے سوال پر انہوں نے یہ سوچ کر سب کچھ بتا دیا کہ شاید یہ سب

ان کر معیز اپنی بیوی کو لینے چلا جائے کہ وہ شوہر کے بغیر آنے پر راضی نہیں تھی۔

”ویسے دیکھا جائے تو ایک طرح سے ٹھیک ہی لہہ رہی ہیں وہ، بیٹا تم چلے جاؤ بہو کو لینے، سب گلے شکوے ختم کرو، خیر سے ماں بن گئی ہے تمہارے بچے لی، اب تم بھی اپنی ضد چھوڑ دو۔“ وہ لمبی لہجے میں بیٹے سے مخاطب تھیں اور بیٹے کی آنکھوں میں خون اتر ا ہوا تھا۔ ماں کی عزت اور محبت کے حوالے سے وہ بتنا حساس تھا، خود ماں کو بھی اس کا اندازہ نہیں تھا۔

”ان لوگوں کی ہمت کیسے ہوئی آپ کو ذلیل کرنے کی۔“ مٹھیاں بھینچ کر وہ کھٹی کھٹی آواز میں ماں سے مخاطب ہوا، چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔

”ان سب باتوں کو چھوڑو معیز، معاملہ بنانے کی بات کرو۔“ بیٹے کا چہرہ اور حالت دیکھ کر وہ بھی گھبرا سی گئیں۔ انہیں اندازہ نہیں تھا کہ معیز کا رد عمل اتنا

”معاملہ بنانے کے لیے چھوڑا ہی کیا ہے ان لوگوں نے۔“ انتہائی سخت لہجے میں بولتا ہوا وہ ایک ہٹلے سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

”معیز، معیز، بات تو سنو۔“ وہ پیچھے سے آوازیں دیتی رہ گئیں، مگر معیز نہیں رکا۔

☆☆☆

منگنی کی تقریب گھر میں ہی رکھی گئی تھی، ثانیہ کی بیٹی نے عاطف اور اس کے مہمانوں کو اپنے گھر ہی بلا لیا تھا کہ ایک ہی جگہ دونوں کی رسم ہو جائے گی، ویسے عاطف کی طرف سے مہمانوں کی تعداد بس گنی مانی ہی تھی۔ سسرال سے تو سارے رشتے اور رابطے تم تھے ان کے، میکے میں بھی والدین رہے نہیں اور اُن بہن بھائی، تینوں ملک سے باہر شادی یہ آنے کا سب نے وعدہ کیا تھا۔ فی الحال کسی کا بھی آنا مشکل تھا امی نے محلے کے چند افراد بلا لیے تھے اور ایک دو مالٹے کے دوست تھے۔

ثانیہ کا گھر ٹھیک ٹھاک بنگلہ تھا جس کی بڑی ساری

چھت پہ تقریب کا اہتمام کیا گیا تھا۔ معیز، اپنی امی کی خوشی میں خوش تھا۔ وہ خود بھی دل سے خوش ہونا چاہتا تھا۔ ضروری تو نہیں کہ دل کی ہر خواہش پوری ہو اور یہ بھی ضروری نہیں کہ ادھوری خواہش کے پیچھے انسان جوگ بجوگ میں مبتلا ہو جائے، روگ لگا لے خود کو، عاطف یہاں آنے سے پہلے تھوڑا سا پریشان تھا، منتشر ذہن کے ساتھ وہ یہاں آیا تھا پھر دھیرے دھیرے ساری کلفت ڈھلنے لگی، اداسی زائل ہونے لگی ماحول کا اثر تھا یا اس اجتماع کا جو یہاں فقط دو مہمانان خصوصی کے لیے اکٹھے ہوئے تھے، عاطف اور ثانیہ، عاطف ہنستے، بولتے، مسکراتے چہروں کو دیکھ رہا تھا اور پھر یہ مسکراہٹ سفر کرتی ہوئی اس تک بھی آن پہنچی۔ ثانیہ کو اس کے پہلو میں لا کر بٹھا دیا گیا۔ پور پور سنگھار، نک سک سے تیار، جیتی جاگتی خوب صورت سی لڑکی، اس کے پہلو میں منگیتر کی حیثیت سے بیٹھی تھی۔ ماحول کا فصول تھا یا اس کی

حقیقت پسندی کہ کچھ دیر کے لیے وہ سب کچھ فراموش کر بیٹھا تھا۔ بڑوں نے انگوٹھیاں پہنا دیں۔ سب نے مٹھائی کھلائی۔ دعائیں دیں، تبصرے کیے۔

”ماشاء اللہ چاند سورج کی جوڑی ہے۔“ امی نے باری باری دونوں کی پیشانی چومی، تھوڑی دیر میں باری کیو کی مزے دار خوشبو نے سب کو بے چین کر دیا اور پھر کھانے کا دور شروع ہو گیا۔ کھانا لذیذ تھا۔ سب نے ہی تعریف کی۔ امی بہت خوش تھیں۔ ان کے ساتھ جو مہمان گئے تھے سب نے ان کی پسند اور عاطف کی قسمت کو خوب ہی سراہا۔ اس کے سسرال والوں نے مہمانوں کی آؤ بھگت میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ بڑی عزت اور محبت کے ساتھ خیر مقدم کیا اور اسی طرح رخصت کیا۔

رات گئے جب عاطف سونے کے لیے لیٹا تو دماغ پھر مختلف خیالات کی آماجگاہ بن گیا۔

”ایک تو میں سوچنے بہت لگا ہوں۔“ اس نے جھنجھلا کر روٹ لی، اسی وقت موبائل بجنے لگا۔ عاطف نے موبائل دیکھا، کوئی اجنبی نمبر تھا۔

”ہیلو۔“
”ہیلو، جناب عاطف صاحب بات کر رہے ہیں۔“

”جی جی وہ حیران ہوا۔“

”پہلی ایجنٹ۔“

”شکریہ، مگر آپ..... کون ہیں؟“

”میں.....؟“ شوخ آواز کھلکھلائی۔

”میں..... وہ ہوں، جسے آج، آپ کی امی نے انگوٹھی پہنائی ہے۔“ عاطف تیزی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔
”آ..... آپ۔“ اس کی سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ آگے کیا کہے۔

”ہیلو، کیا ہوا، آپ چپ کیوں ہو گئے۔“
”میں تو چپ ہی تھا، بول تو آپ رہی تھیں۔“
”اتنی دیر سے میں ویٹ کر رہی تھی کہ شاید آپ فون کر کے مبارکباد دین مجبوراً پھر مجھے ہی کال کرینی پڑی۔“ وہ اتنے مان اور اپنائیت سے بات کر رہی تھی جیسے پتا نہیں کتنی پرانی جان پہچان ہو۔

”میں کیسے کال کرتا، میرے پاس تو نمبر ہی نہیں تھا آپ کا۔“ عاطف نے نہ چاہتے ہوئے بھی صفائی پیش کی۔ اچانک سے فون بند کرنا بھی بداخلاقی لگ رہا تھا۔
”دیکھ لیں، ہم نے تو آپ کا نمبر حاصل کر لیا۔“
”کہاں سے؟“

”بس، کہیں سے بھی۔“ اس کی آواز میں شوخی کے ساتھ ناز بھی تھا۔

”اچھا ایک بات بتائیں۔“
”جی۔“ (پتا نہیں کیا پوچھنے والی ہے؟)
”آپ خوش تو ہیں نا اپنی ایجنٹ پر؟“
”بات تو خوشی کی ہے۔ اس لیے خوش ہوں میں بھی۔“ عاطف نے ایک گہری سانس لی۔

”میں بھی بہت بہت..... بہت خوش ہوں۔“
”اتنی بے تشاوشی کی وجہ پوچھ سکتا ہوں؟“
”نہیں، میں نے اپنی ساری فیلوز اور دوستیں...

گئی ہیں یا منگنیاں اور نہیں تو کم از کم افیئر تو ضرور ہی ہیں۔ ایک میں ہی تھی اکیلی، لنڈوری، نہ منگنی، نہ شادی نہ کوئی اور.....“ وہ ہنار کے بولتی چلی گئی۔

”پھر تو آپ سرخرو ہو گئیں آج اپنی دوستوں میں۔“ عاطف بے ساختہ ہنس پڑا۔

”میں نے فوراً اپنی فیس بک آئی ڈی پر اسٹیٹس لگا دیا ہے، ہم دونوں کی جو سب سے اچھی پک (تصویر) ہے وہ لگا دی۔ باقی داوے آپ کی آئی ڈی کیا ہے؟“
”سینڈ کر دوں گا۔“

”ٹھیک ہے، میں بھی آپ کو اپنی آئی ڈی اور پک سینڈ کرتی ہوں جو میں نے لگائی ہے۔“
”اچھا، اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو مجھے صبح آفس جانا ہے تو میں۔“

”اوہ..... شیور۔“ اس نے جلدی سے عاطف کی بات کاٹی، پھر خدا حافظ کہہ کے لائن کاٹ دی۔
عاطف نے ایک نظر ہاتھ میں پکڑے موبائل پر دیکھا پھر ایک گہری سانس لے کر آنکھیں بند کر لیں۔
اگلے روز عظمی پھپھو کی طرف گیا تو مٹھائی۔

”اب فاصلہ کافی کم ہو گیا تھا۔ وہاں کچھ دیر بیٹھ کے بعد گھر واپس آ جاتا، پندرہ بیس منٹ لگتے تھے شہید احمد کی حالت میں کافی بہتری آ چکی تھی۔ بس ایک بات تھی کہ وہ اب تک کچھ بولتے نہیں تھے۔ اپنی زبان کو انہوں نے خود ہی خاموشی کے ہاتھوں گروہ رکھا ہوا تھا۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ اب ان کی آنکھیں اتنی دیر ان اتنی خالی نہیں رہی تھیں، ان میں کوئی نہ کوئی تاثر نظر آنے لگا تھا، ہلکی سی حیرانی کا، خوشی کا، اطمینان کا۔
عاطف ان کے قریب بیٹھ کر انہیں اپنے ہاتھ سے کچھ کھلاتا تو ان کی آنکھوں میں طمانیت اور شکر کے ساتھ ہلکی سی ایک خوشی کی لہر بھی نظر آتی مٹھائی لے کر پہنچا تو آرزو بنگلے کے اندر بھی بڑی بیگم صاحبہ کے ساتھ، سرونٹ کوارٹر میں عظمی پھپھو اور شہید احمد تھے۔ پھپھو نے اسے مبارک باد دی۔ عاطف نے شہید احمد کو مٹھائی کھلائی۔ انہوں نے سوا لیہ نظروں سے اسے دیکھا۔“

”میری منگنی ہو گئی ہے۔“ عاطف نے انہیں بتایا۔
وہ کچھ دیر حسرت بھری نگاہوں سے عاطف کو دیکھتے رہے۔ دو دن پہلے ہی عاطف نے ان کی شیو بنائی تھی۔ غسل کروا کر کپڑے بدلوائے تھے۔ ان کے لیے چند نئے جوڑے لے کر آیا تھا۔ ان ہی میں سے ایک پہنایا تھا۔ ان کا چہرہ اور مجموعی حالت پہلے سے بہت بہتر لگ رہی تھی۔

”کیا ہوا؟ آپ خوش نہیں ہوئے میری منگنی کا سن کر؟“ عاطف نے ان کی آنکھوں میں حسرت دیکھی تو بے اختیار پوچھ بیٹھا۔
شہید احمد نے یک ٹک اسے دیکھتے ہوئے اپنا ہاتھ اٹھا کر اس کے کندھے پر رکھا اور اس کا شانہ دبایا، ان کا ہاتھ لرز رہا تھا، کمزوری سے بھی اور شدت جذبات سے بھی اور پھر ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

”ابو پلیز، ایسے مت کریں، مجھے سچ سچ تکلیف ہو رہی ہے۔“ عاطف ان کے گلے لگ گیا۔
”مجھے معلوم ہے میں سب کچھ ٹھیک نہیں کر سکتا مگر تھوڑا بہت جو میرے اختیار میں ہے اسے تو بہتر کر سکتا ہوں۔ گزرا وقت نہیں لا سکتا مگر جو وقت میرے پاس ہے وہ آپ کو دے سکتا ہوں، جتنا ہو سکتا ہے اپنا آپ دے سکتا ہوں۔ میں آپ کو خوش اور صحت مند دیکھنا چاہتا ہوں۔“ عاطف دھیرے دھیرے بول رہا تھا۔ آہستہ سے وہ ان سے الگ ہوا۔

جیب سے رومال نکال کر ان کا چہرہ صاف کیا۔
”ایک گفٹ لایا ہوں میں آپ کے لیے۔“
عاطف نے اپنی جیب سے نیا موبائل نکالا اور اسے ان کے ہاتھ میں لگا کر اسے دے سکا۔ وہ اس میں سم ڈال کر لایا تھا۔
چارجر نکال کر عظمی پھپھو کو دیا۔

”یہ دیکھیں۔“ اس نے اپنی منگنی کی کچھ تصاویر اور مودی اس میں ڈالی تھی، وہ انہیں دکھا رہا تھا۔ اس کے علاوہ اس میں اس کی بہت ساری تصاویر تھیں اور وائی فائی کنکشن کے بعد تو ایک پوری دنیا اس میں آباد تھی۔

”اچھا۔“ عاطف کچھ مایوس سا ہو گیا۔
”کسی شے کی ضرورت ہو تو آپ بلا جھجک کہہ سکتی ہیں۔ دراصل مجھے خود سے اندازہ نہیں ہوتا، کیا ضروری ہے کیا غیر ضروری۔“ عاطف دونوں سے ہی مخاطب تھا۔

”اتنا کچھ تو کر چکے ہو۔ میرا سگا بیٹا بھی یہاں ہوتا تو شاید یہ سب نہ کرتا۔“ پھپھو جذباتی اور آبدیدہ ہو گئیں۔
”افوہ، میرا یہ مطلب تھوڑی تھا۔“ عاطف نے خفیف ہو کر اپنا سر کھجایا۔ ان سے رخصت لے کر گھر پہنچا تو خلاف معمول امی لٹی ہوئی تھیں۔ ورنہ اس وقت وہ عموماً یا تو کچن میں ہوتی تھیں اس کے لیے گرم گرم تازی روٹی ڈالنے کے لیے یا پھر پی وی دیکھ رہی ہوتیں۔

”کیا ہوا امی، آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔“
عاطف ان کے قریب پہنچ کر جھکا۔
”پتا نہیں کیا ہو رہا ہے۔“ بند آنکھیں کھولے بغیر وہ بڑبڑائیں۔ ”طبیعت گری گری ہو رہی تھی، میں سمجھی بی بی پی لو ہو رہا ہے، انڈا ابال کر کھا لیا مگر طبیعت اور بھی عجیب سی ہو گئی، سر میں سوئیاں سی چھ رہی ہیں۔“

”آپ انہیں، میں ڈاکٹر کے پاس لے چلتا ہوں۔“

”چھوٹی بیگم صاحبہ نے آرزو کو بھی ایک فون دیا ہے۔“ عظمی پھپھو نے بتایا۔ ”دن میں ایک دو بار فون کرتی ہیں بڑی بیگم صاحبہ کی طبیعت پوچھنے کے لیے۔“

”اچھا، اچھی بات ہے۔“ عاطف نے کمرے کا جائزہ لیا۔ ایک دو نئی چیزیں نظر آ رہی تھیں۔ یہ شاید نہیں بلکہ یقیناً مالکوں کی دین تھی۔
”آرزو کب آتی ہے یہاں؟“

”دو تین چکر لگاتی ہے، دن میں اور شام میں، کھانا ہمارے ساتھ ہی کھاتی ہے۔“
”ابھی، کب آئے گی؟“

”کوئی ٹائم نہیں ہے۔ خود ہی آ جاتی ہے جب فارغ ہو۔“

”اچھا۔“ عاطف کچھ مایوس سا ہو گیا۔
”کسی شے کی ضرورت ہو تو آپ بلا جھجک کہہ سکتی ہیں۔ دراصل مجھے خود سے اندازہ نہیں ہوتا، کیا ضروری ہے کیا غیر ضروری۔“ عاطف دونوں سے ہی مخاطب تھا۔

”اتنا کچھ تو کر چکے ہو۔ میرا سگا بیٹا بھی یہاں ہوتا تو شاید یہ سب نہ کرتا۔“ پھپھو جذباتی اور آبدیدہ ہو گئیں۔

”افوہ، میرا یہ مطلب تھوڑی تھا۔“ عاطف نے خفیف ہو کر اپنا سر کھجایا۔ ان سے رخصت لے کر گھر پہنچا تو خلاف معمول امی لٹی ہوئی تھیں۔ ورنہ اس وقت وہ عموماً یا تو کچن میں ہوتی تھیں اس کے لیے گرم گرم تازی روٹی ڈالنے کے لیے یا پھر پی وی دیکھ رہی ہوتیں۔

”کیا ہوا امی، آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔“
عاطف ان کے قریب پہنچ کر جھکا۔
”پتا نہیں کیا ہو رہا ہے۔“ بند آنکھیں کھولے بغیر وہ بڑبڑائیں۔ ”طبیعت گری گری ہو رہی تھی، میں سمجھی بی بی پی لو ہو رہا ہے، انڈا ابال کر کھا لیا مگر طبیعت اور بھی عجیب سی ہو گئی، سر میں سوئیاں سی چھ رہی ہیں۔“

”آپ انہیں، میں ڈاکٹر کے پاس لے چلتا ہوں۔“

عاطف نے فوراً ان کا بازو پکڑ کر اٹھانے کی کوشش کی۔
”ابھی تو تم جاب سے آئے ہو تھکے ہارے،
بھوکے پیاسے، کھانا کھالو، پھر لے چلنا۔“
”کھانا میں آ کر کھالوں گا، آپ بس ابھی
اٹھیں، فوراً۔“ عاطف بدستور ان کا بازو پکڑے ہوئے
تھا۔

”ایک تو تم ضد بہت کرتے ہو۔“ اٹھ کر بیٹھتے
ہوئے انہوں نے بمشکل آنکھیں کھولیں۔
”اور آپ لا پرواہی بہت دکھاتی ہیں اپنی تکلیف
کے بارے میں۔“ عاطف انہیں سہارا دے کر باہر لایا
اور گاڑی میں بٹھا کر ڈاکٹر کے پاس لے آیا۔ فوراً امیر جنسی
میں دکھایا۔ وہ باہر بیٹھا تھا۔ ڈاکٹر نے کچھ دیر بعد اسے
اندر بلایا۔

”کیا ہوا ہے انہیں۔“ عاطف کچھ گھبرا سا گیا،
ڈاکٹر کے چہرے پر انتہائی سنجیدگی دیکھ کر۔

”آپ کو اندازہ ہے کیا ہوا ہے ان کے
ساتھ؟“ ڈاکٹر عاطف کے بیٹھتے ہی شروع ہو گیا۔

”بی بی کو سمجھ کر انڈا ابال کر کھالیا جبکہ بی بی ہائی
تھا۔ ان کا انڈا کھانے کے بعد اور ہائی ہو گیا۔ تھوڑی
دیر اور نہ لاتے تو خدا نخواستہ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ فالج کا

ایک بھی اور برین ہیمیرج بھی۔ اسی لیے ہم لوگ منع
کرتے ہیں کہ سیلف میڈیلیشن نہ کیا کریں۔ خاص
طور پر بلڈ پریشر کے بارے میں خود سے بھی فیصلہ نہ
کریں جب تک چیک نہ کروائیں۔“ ڈاکٹر نے لمبی
چوڑی ڈانٹ نما تقریر کے بعد دواؤں کا نسخہ اس کے
ہاتھ میں تھما دیا۔

گھر واپس آیا تو امی کی حالت کچھ بہتر تھی یا وہ
خود کو بہتر ظاہر کر رہی تھیں۔ بیٹے کا مزاج معلوم تھا۔ وہ
کتنی جلدی، کتنا زیادہ پریشان ہو جاتا ہے۔

”سن لیانا ڈاکٹر نے کیا کہا ہے، اب ذرا سی بھی
طبیعت میں اونچ نیچ ہو آپ فوراً مجھے بتائیں گی۔ میں
ڈاکٹر کے لے چلوں گا، خود سے کوئی علاج کرنے کی
کوشش نہیں کریں گی، ٹھیک ہے۔ اب آپ تھوڑا کھانا

کھائیں اور یہ میڈیسن ڈاکٹر نے لکھی ہے میں لے آ
ہوں، اسے کھا کر سو جائیں اور صبح اگر نیند آ رہی ہو تو اٹھنے
کی ضرورت نہیں ہے اپنی نیند پوری کیجیے گا۔ میں اب
ناشتہ بنالوں گا۔ آپ کے لیے بھی رکھ جاؤں گا۔“

عاطف ایک دم ہی بہت پریشان سا ہو گیا تھا
وہ بار بار یہی سوچ رہا تھا کہ اگر اسے آنے میں دیر ہو
جانی یا معمول کی طبیعت سمجھ کر ڈاکٹر کے نہیں لے جا
تو..... اس تو کے آگے کا خیالی منظر بہت بھیانک
جس کی تصویر ڈاکٹر نے چیتھی تھی۔ اپنی سوچوں میں
الجھا سلیجھا اس نے اپنے کھانے پہ کم اور امی کے کھانے
پہ زیادہ توجہ دی۔

دوائی کھلا کر وہ ان کے پاس بیٹھا رہا، جب تک
سو نہیں گئیں۔ ان کے پاس سے اٹھ کر وہ سونے لیٹا تو دل
میں ایک فیصلہ کر چکا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ امی کا مکمل
چیک اپ اسی ہفتے کروائے گا۔ نیند کی پرہیز مہربان ہو کر
اپنی بانہوں میں لینے ہی والی تھی کہ موبائل بجنے لگا۔

”ہیلو۔“ نمبر دیکھے بغیر اس نے خمار آلود آواز
میں ہیلو کیا۔

”ہیلو السلام علیکم! کیا ہو رہا ہے؟“ ثانیہ کی چہک
ہوئی آواز آئی۔

”رات کے بارہ بجے ایک شریف آدمی کیا
رہا ہوتا ہے؟“ عاطف نے منہ پہ ہاتھ رکھ کر جماد
روکی۔

”ہر شریف کے الگ الگ شوق اور مشاغل
ہوتے ہیں۔ ہم بھی کوئی بد معاش نہیں ہیں مگر جاگ
رہے ہیں۔“

”آپ کو صبح آفس نہیں جانا اس لیے۔“
”ہمیں صبح یونیورسٹی تو جانا ہوتا ہے جناب۔“
”اس کی چھٹی ہو سکتی ہے۔ جاب کی طرف
پابندی نہیں ہے۔“ عاطف نے ایک اور جمائی لی۔

”آفس سے آنے کے بعد آپ کیا کرے
ہیں!“ ثانیہ تو بہت فرصت سے فارغ ہو کر بیٹھی تھی
اس کا انٹر ویو کرنے کے لیے۔

”کبھی کبھی کچھ، کوئی خاص روٹین نہیں
ہے۔“

”آج کیا کیا؟“
”آج..... آج امی کو ڈاکٹر کے لے گیا تھا۔“
”خیریت؟“

”ہاں، خیریت ہے، طبیعت خراب ہو گئی تھی ان
کی، اب تو ٹھیک ہے۔“

”اچھا، مجھے لگ رہا ہے آپ کو نیند آ رہی
ہے۔“

”ٹھیک پہچانا خدا کی بندی، اب تو موبائل کا
پچھا چھوڑ دو۔“ عاطف دل ہی دل میں کرا رہا۔

”ہے نا، ٹھیک کہہ رہی ہوں نا میں۔“ بلبل سے
اس کا قریبی رشتہ تھا چپکنے کے معاملے میں۔

”چلیں آپ سوئیں، میں نے خواہ مخواہ
ڈسٹرب کر دیا، خدا حافظ۔“

”خدا حافظ۔“ عاطف نے ایک گہری سانس
لے کر فون بند کیا اور پھر سے آنکھیں بند کر کے نیند کی
مہربان پری کو ڈھونڈنے لگا جو غائب ہو گئی تھی۔

☆☆☆

مہربانو کارور کر برا حال تھا۔ یہ سب تو اس نے
خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ معزز عالم اتنا انتہائی
قدم بھی اٹھا سکتا ہے۔ حمیرا بھی جیسے سکتے کے عالم میں
بیٹھی کی بیٹھی رہ گئیں۔

”سارا قصور آپ کا ہے، آپ سمجھتی ہیں کہ ہر کوئی
ابو کی طرح آپ کے رعب میں آ جائے گا، دوسرے کی
زنی اور شرافت کو آپ کمزوری اور بزدلی سمجھتی رہیں۔
دیکھ لیا نتیجہ اپنی من مانی کرنے کا، ابونے، ہم سب نے
آپ کو سمجھایا کہ مہربانو کو گھر جانے دیں، آپ پہ پتا نہیں
کیا ضد سوار تھی، اسی ضد کو مہربانے بھی اپنے پلو سے باندھا
ہوا تھا اپنی بھی زندگی تباہ کی، بچے کی بھی، ساتھ میں ہم
سب کو خوار کر دیا۔“ ارسلان اپنا سارا غصہ، ساری
جھنجھلاہٹ ماں پہ نکال رہا تھا اور اس کے بس میں تھا بھی
کیا۔ جتنا عرصہ مہربانو بیٹھی رہی وہ اسے بھی سمجھاتا رہا

اور ماں کو بھی، مگر دونوں ہی ضدی اور ہٹلی فطرت کی
تھیں۔ اب اپنی ضد کا نتیجہ دیکھ رہی تھیں۔

”مجھے کیا پتا تھا وہ نامراد یوں فٹ کاغذ بھیج
دے گا، کم بخت کو فیصلہ دیتے ہوئے ذرا لاج نہ آئی۔
بچے کا بھی خیال نہ کیا۔ ایسے بھی کوئی کرتا ہے بھلا،
لڑائی جھگڑے تو سب کے گھروں میں ہوتے ہیں ذرا
ذرا سی باتوں پر کیا لوگ طلاق دے دیتے ہیں۔“ منہ
پہ دوپٹا رکھ کر سسکتے ہوئے وہ بچوں کی طرح شکوہ
کر رہی تھیں۔

”ڈیڑھ سال کی شادی میں ایک سال سے تو
آپ نے بیٹی کو گھر بٹھایا ہوا ہے۔ اوپر سے آنٹی
آئیں تو ان کا کوئی لحاظ نہیں کیا۔“

ارسلان دونوں ہاتھوں سے سر تھامے بیٹھا تھا۔
”سب آگ اسی بڑھیا کی لگائی ہوئی ہے بیٹے
کا گھر برباد کر کے ہی چھوڑا۔ بڑھیا سے میری معصوم
بچی برداشت نہیں ہوئی۔“ حمیرا کیم کا تانتا اور وتیرہ وہی
تھا۔ سارا الزام اپنی سدھن پر رکھ کر خود بری الذمہ
ہو گئیں۔

”آپ کبھی نہیں سدھریں گی۔“ افسوس اور
کوفت کے عالم میں سر جھٹکتا ہوا وہ وہاں سے اٹھ
گیا۔

”اب کیا ہو گا امی؟“ رورو کر مہربانو کی آنکھیں
سوچ گئی تھیں۔

ذردموم

راحت جبین



قیمت -/1000 روپے

مکمل کرنا
مکمل کرنا
32735021 فون نمبر

”کچھ نہ کچھ تو ہوگا ہی بچی، اللہ مالک ہے۔“
سارے کام اور گھر لگاڑنے کے بعد اب حمیرا خاتون کو
اللہ یاد آ رہا تھا۔

”یہ تم نے کیا کیا معیز؟ کم سے کم بچے کا تو خیال
کیا ہوتا۔“ معیز کی والدہ دونوں ہاتھوں سے سر تھامے
شدید صدمے کی کیفیت میں بیٹھی تھیں۔ ”اسی لیے
غصے کو حرام کہا گیا ہے۔ اس میں انسان کو پتا ہی نہیں چلتا
وہ صحیح کر رہا ہے یا غلط۔“ وہ ایک ٹک مٹے کو دیکھتی
جار ہی تھیں اور بولتی جار ہی تھیں۔ معیز عالم محض پہلو
بدل کر رہ گئے۔ چند لمحوں بعد بولے تو ان کی آواز
ہموار اور لہجہ پرسکون تھا۔

”میں نے جو فیصلہ کیا ہے وہ یوں ہی غصے میں
آکر قدم نہیں اٹھایا بلکہ سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ کئی مہینوں
سے میں اس معاملے پر سوچ بچار کر رہا تھا اور بہت
سوچ سمجھ کر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مہربانو کا اس گھر
میں ہمارے ساتھ گزارا مشکل ہے۔ ہمارا کیا ہے بیٹا،
آج ہیں۔ کل نہیں ہوں گے۔ مجھے کون سا قیامت
کے بورے سیٹھے ہیں طویل عرصے تک زندہ رہ کر،
سب مل بیٹھ کر کوئی مصالحت کی راہ نکال لیتے۔ بیوی کا
نہ سہی بچے کے بارے میں تو سوچتے، اس کا کیا
ہوگا؟“

”بچے کے لیے جو ہو سکے گا کروں گا۔“
”اور اس کی شخصیت میں جو ٹوٹ پھوٹ ہوگی؟
باپ سے الگ ماں نے کہیں اور بیاہ کر لیا تو سمجھو ماں
سے بھی محروم۔“

”سارا قصور میرا نہیں ہے امی، اس وقت ہم
مصالحت کی کوئی راہ نکال بھی لیتے تو آگے جا کر پھر خرابی
ہونی تھی۔ بچے کے ذریعے وہ بار بار ہر بار بلیک میل کرتی
اور اپنی بات منواتی۔“ معیز بے بسی سے ماں کو سمجھانے کی
کوشش کر رہے تھے۔ ”میں ایسی عورت کے ساتھ اپنی
زندگی جہنم نہیں بنا سکتا۔ ہر وقت میں ٹینشن کا شکار رہتا۔“
”اپنی اولاد کے بارے میں کیا سوچا ہے۔“ امی
نے ایک گہری سانس لے کر سوال کیا۔
اسے میں عدالت سے بھی لے سکتا ہوں۔“

”معیز۔“ امی نے تنہی نظروں سے اسے دیکھا۔
اس عورت پر ایک ظلم تم کر چکے ہو اب دوسرے
مت کرو۔ مہر تم دے چکے ہو۔ بچے کا خرچا باندھو اور
اس سے ملنے کے بارے میں کوئی ایگریمنٹ کرو۔“
”ٹھیک ہے۔“ معیز نے بغیر کسی چوں چرا کے
ان کی بات سن لی۔

”کتنے ارمانوں سے بہو بیاہ کر لائی تھی۔
سارے ارمان خاک میں مل گئے۔ آئندہ کے لیے
مسائل اور کھڑے ہو گئے۔ امی کو بار بار اپنے پوتے کا
خیال آ رہا تھا۔ خدا جانے کیسی قسمت لکھوا کر لایا ہے وہ
معصوم، وہ تاسف سے سوچ رہی تھیں۔

☆☆☆

شمینہ بیگم اپنے پوتے کی دوسری سالگرہ کا نیوہ
دینے آئی تھیں۔ خود ہی بولتی رہیں سارا وقت، حمیرا
بیگم کی بولتی بالکل بند تو نہ ہوئی تھی مگر کم ضرور ہو گئی تھی۔
بے دلی اور بے زاری کے ساتھ شمینہ بیگم کی چرب
زبانی پر ہوں ہاں کرتی رہیں۔

”مہر کو بھی ضرور لانا۔ اچھا ہے بچی کا دل بہل
جائے گا۔ گھر میں بند اتنے مہینے گزارنا آسان ہے
کیا۔ مہر کی وجہ سے تو سالگرہ کا فنکشن دو ہفتے آگے
کر دیا تھا کہ چلو بچی کی عدت بھی ختم ہو جائے گی۔ وہ بھی
شرکت کر لے گی۔“ بولتے بولتے وہ ایک لمحے کے لیے
سانس لینے کو رکیں پھر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے سوال کیا۔
”شہزادہ نظر نہیں آ رہا؟“ مہربانو نے اپنے بیٹے
کا نام شہزادہ رکھا تھا۔

”اپنی دادی کے گھر گیا ہوا ہے۔“ مہربانو
دھیرے سے بولی۔

”اچھا۔“ انہوں نے حیرت کا مصنوعی اظہار
کیا۔ پھر بولیں۔

”چلو اچھا ہے۔ ناخن سے گوشت جدا تھوڑی
ہوتا ہے۔ رشتہ تو اپنی جگہ موجود ہے۔ باپ اور دادی
سے چاہے کتنا ہی الگ رہے۔ نام کے آگے تو باپ کا
نام ہی آئے گا۔ ہاتھی پھرے گاؤں گاؤں جس کا ہاتھی
اس کا ناؤں۔“

”اف، یہ امی بھی کیا باتیں لے کر بیٹھ گئیں۔“ اپنی
بیٹی کو سیریلیک کھلاتے ہوئے عظمیٰ جزبہ زور ہی تھی۔ کتنی
بار سمجھایا ہے امی کو ایسی باتیں نہ کیا کریں۔ بعد میں اماں
بیٹی اور ساتھ میں شوہر صاحب بھی تجھے باتیں سناتے
ہیں۔ مگر امی کی سمجھ میں ہی نہیں آتا بیٹی کے منہ میں جلدی
جلدی وہ ایک کے بعد ایک چچہ ڈال رہی تھی تاکہ ماں
کے پاس جا کر بیٹھے اور ان کا موضوع تبدیل کرے۔
ادھر شمینہ بیگم اور شوشا چھوڑنے لگی تھیں۔

”سنا ہے، معیز کی شادی ہو رہی ہے؟“
”جس سے سنا ہے اسی سے باقی تفصیلات بھی
معلوم کر لیتیں، ہم سے کیوں پوچھ رہی ہیں؟“ حمیرا
بیگم نے جل بھن کر جواب دیا۔ ان کے صبر کے پیمانہ
لبریز ہو چکا تھا۔ مہربانو کے چہرے پر مایوسی اور اداسی
کے گہرے بادل چھا گئے۔ عظمیٰ لپک کر آئی اور آرزو کو
اپنی امی کی گود میں دیا۔

”چلو بھئی گگو! ثانی سے باتیں کرو۔“
”ساری باتیں تو ثانی نے کر ہی لیں۔ اب
نوا سے کیا کریں گی۔“ حمیرا تن فن کرتی، اٹھ کر
چل دیں۔ عظمیٰ نے چور نظروں سے مہربانو کو دیکھا۔
رج اور بے بسی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔
”میں ابھی آتی ہوں۔“ وہ بھی اٹھ کر چل دی۔
”کیا ضرورت تھی معیز کا ذکر کرنے کی، دیکھا
کیسے منہ بن گئے دونوں کے؟“ عظمیٰ نے دبی دبی آواز
میں ماں کو مخاطب کیا۔

”کوئی نئی بات ہے۔ منہ تو ہر وقت بنا کر رکھتی
ہیں دونوں ماں بیٹی۔“ شمینہ بیگم نے ناک سے مکھی
اڑائی۔

”سالگرہ والے دن ذرا جلدی آنا، یہ نہیں کہ
مہمانوں کی طرح عین وقت پر آؤ۔“ شمینہ بیگم نے
دزدیدہ نظروں سے بیٹی کو دیکھا۔

”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، اب کوئی اور بات
کریں۔“ حمیرا بے شک عظمیٰ کی پھپھو تھیں مگر سانس
بننے کے بعد وہ فقط سانس ہی تھیں پھپھو کا رشتہ کہیں گم
ہو گیا تھا۔ شمینہ کی زبان کا شاخسانہ اکثر و بیشتر عظمیٰ کو

بھگتنا پڑتا۔ پھر جب سے مہربانو کے ساتھ طلاق جیسا
سانحہ ہوا تھا وہ بات بات پر بکھر جاتی۔ رونے بیٹھ
جاتی۔ ارسلان نے بیشتر مردوں کی طرح دوغلی پالیسی
اپنائی ہوئی تھی۔ بیدروم میں وہ بیوی کا دم بھر تھا۔ تھا۔
ماں بہن کے سامنے ان ہی کی جی حضوری کرتا اور عظمیٰ
کو لتاڑ دیتا۔ عظمیٰ کے لیے ان تینوں کو سنبھالنا بلکہ
بیک وقت ان تینوں سے نمٹنا بڑا مشکل اور صبر آزما
مرحلہ ہوتا۔ ماں سے دبی زبان میں چپ رہنے کی
استدعا کرتی۔ مگر وہ عظمیٰ کو اس کی اور اپنی نازک
پوزیشن کو ذرا خاطر میں نہ لاتی تھیں۔

عظمیٰ زیادہ کھل کر انہیں اپنے حالات سے
آگاہ نہیں کرتی تھی۔ ان سے بعید نہ تھا آستینیں
چڑھا کر لڑنے آجاتیں، خود تو لڑائی میں فاتح بن کر
اپنے گھر لوٹ جاتیں۔ شامت عظمیٰ کی آتی۔ شادی
کے بعد لڑکیاں صرف اپنی بدزبانی اور بددماغی کا
خمیازہ نہیں بھگتیں۔ کبھی اپنی ماں کی بدزبانی اور
بددماغی کا خمیازہ بھی انہیں ہی بھگتنا پڑتا ہے۔ عظمیٰ
کے ساتھ یہی صورت حال تھی۔

سالگرہ کی تقریب میں عظمیٰ لاکھ چاہنے اور ماں کی
ہدایت کے باوجود بھی جلدی نہیں جاسکی۔ آرزو کو الٹی اور
موشن لگے ہوئے تھے۔ اسے دوائی دلا کر لائی۔ گھر کے
کام نمٹاتے نمٹاتے شام ہی ہو گئی۔ آرزو الگ چڑ چڑی
ہو رہی تھی، اس کے دانت نکل رہے تھے۔ اس کا رونا بند
نہیں ہو رہا تھا۔ ناچار اسے ہی سنبھالے رہی۔ خدا خدا
کر کے وہ سوئی تو عظمیٰ تیار ہوئی۔

مارے باندھے حمیرا اور مہربانو بھی تیار ہو ہی گئیں
جانے کے لیے۔ حالانکہ حمیرا کا تو بالکل دل نہیں تھا
جانے کا، کچھ ایسا ہی حال مہربانو کا بھی تھا مگر دنیا کا سامنا
تو کرنا ہی تھا۔ کب تک گھر میں منہ چھپائے بیٹھی رہتی۔
تقریب کا اہتمام گھر پر ہی کیا گیا تھا۔ قریبی رشتہ دار مدعو
تھے اور اڑوس پڑوس والے، سنہری شیردانی میں ملبوس
عاطف بڑا پیارا اور بھولا بھالا سالگ رہا تھا۔ عفت نے
بھاری بناری ساڑھی باندھی تھی۔ شہید احمد کے پہلو میں
کھڑے ہو کر، دونوں میاں بیوی نے بچے کے ہاتھوں

ایک کٹوا۔ پیہی برتھ ڈے کا شور اٹھا، بچوں نے غبارے پھوڑنے شروع کر دیے۔ عفت سب کو ایک کھلا رہی تھی۔ مہربانو اپنے بیٹے کو گود میں لیے پتا نہیں کیوں دل مسوس کر رہ گئی۔

”پھپھو آپ نے ایک کھایا؟“ شہید احمد ان کے قریب آیا۔ مخاطب وہ پھپھو سے ہوا تھا مگر اس کی نگاہوں کا مرکز مہربان تھی۔ مہربانو سے شادی کے بعد ایک دوبارہ ملاقات ہوئی تھی۔ اسے خوش و خرم دیکھ کر شہید احمد کا احساس جرم بڑی حد تک ختم ہو گیا تھا اور اب اسے اس طرح لٹے پٹے حال میں دیکھ کر ترس، رحم، ہمدردی پتہ نہیں کون کون سے جذبات اس کے دل میں اٹھ رہے تھے۔

”تمہاری بیوی جب سارے مہمانوں کو کھلا کر فارغ ہو جائے گی تب شاید آئے گی اور تمہارا کالہجہ جلا کٹا تھا۔“

”اچھا میں لے کر آتا ہوں۔“ شہید احمد میز کے قریب گیا اور دو پلیٹوں میں ایک کے دو ٹکڑے رکھ کر لے آیا۔

”یہ لیں“ ایک پلیٹ اس نے مہربان کی اور ایک حمیرا پھپھو کو عفت بے خبر اور لا پرواہ نہیں تھی۔ کن اکھیوں سے سب پر خصوصاً اپنے شوہر پر نگاہ رکھے ہوئے تھی۔ حمیرا پھپھو اور مہربانو کی موجودگی سے اس کے دل کو کھٹکا ہی لگا رہتا تھا اور عجیب بات تھی کہ اسے جو بھی دھڑکا ہوتا اپنے شوہر کے متعلق وہ اسے سچ کر دکھاتا۔ ابھی وہ شہید احمد کو ایک لے جا کر، دیتا ہوا دیکھ رہی تھی۔ اس کی پیشانی پر شکلیں ابھر آئیں اور آنکھوں میں ناگواری، تھوڑی دیر میں یہ ناگواری غصے میں بدل گئی۔ جب کھانے کے دوران بھی شہید ایک اچھا میزبان بنا اپنے ”خاص الخاص“ مہمانوں کو ہی توجہ دیتا رہا۔

پتا نہیں کیوں مہربانو کی اس حالت کا ذمہ دار شہید احمد خود کو سمجھ رہا تھا۔ اسے ایسا نہیں سوچنا چاہیے تھا مگر وہ سوچ رہا تھا۔ خود کو مجرم مان رہا تھا۔ جیسے مہربانو کے ساتھ جو کچھ ہوا، اس میں قصور شہید احمد کا ہے۔ اپنے قصور، غلطی اور جرم کی تلافی کے لیے وہ ان

دونوں آگے پیچھے گھوم رہا تھا۔

”ذرا اسے پکڑیے گا۔ تنگ کر رہا ہے بہت۔“ عفت سے ضبط نہیں ہوا، وہ عاطف کو اور شہید احمد کو تھما گئی لیکن جاتے جاتے ایک کٹیلی اور جتاتی ہوئی نگاہ مہربانو پر ڈالنا نہیں بھولی تھی۔

تقریب رات گئے ختم ہوئی۔ سب مہمان اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے مگر ثمنینہ بیگم نے شہید احمد کی خوب کلاس لی۔ وہ عفت سے زیادہ چونکی تھیں۔ تقریب کے دوران، بیٹے کو حمیرا اور مہربانو کے ارد گرد منڈلاتے دیکھ کر ان کا بھی خون کھولتا رہا۔ اس وقت تو کچھ نہ کہہ سکیں مگر اب اسے لتاڑ رہی تھیں۔

”شادی شدہ ہو، ایک بچے کے باپ ہو۔ کچھ عقل ہے کہ نہیں، دونوں ماں بی بی کے سوا تمہیں اور کوئی نظر نہیں آیا۔“ خاطریں کرنے کو؟ لوگوں کو اندھا سمجھتے ہو یا گونگا، مریج مسالے لگا کر باتیں ایک منہ سے دوسرے منہ پھیلتی ہیں۔ خبردار جو میں نے آئندہ تمہیں مہربانو کے آس پاس بھی دیکھا۔ تمہارا بھی مزاج درست کر دوں گی اور اس کا بھی۔“

ثمنینہ بیگم خوب گرج رہی تھیں۔ عفت کے دل کو ٹھنڈک مل رہی تھی۔ شہید احمد بھیگی بی بی بن کر بیٹھا ان کی صلواتیں سن رہا تھا۔

”میں تو بس انہیں کمپنی دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ اتنے عرصے بعد آئی تھیں پھپھو۔“ شہید احمد منمنایا۔

”کسی کو بھی کمپنی دینے کے لیے تمہاری ماں اور بیوی موجود ہے۔ تم زیادہ اتاؤ لے ہاؤ لے نہ بنو۔“ سخت لہجے میں بول کر وہ اٹھ گئیں۔

☆☆☆

مہربانو کے دل کو گھر پہنچ کر بھی قرار نہ آیا تھا۔ سارے زخموں کے دھاگے جیسے پھر سے ادھر گئے تھے۔ شہید احمد کے پہلو میں کھڑی خوش و خرم عفت سے ایک عجیب جلاپا اور حسد سا محسوس ہو رہا تھا اسے۔ اگر یہ چڑیل درمیان میں نہ آئی تو آج شہید کے ساتھ میں راج کر رہی ہوتی۔ چت لیٹے لیٹے وہ

سوچ رہی تھی۔ اب وہ بہت کچھ سوچنے لگی تھی۔ خصوصاً اپنے مستقبل کے بارے میں، آگے زندگی کے بارے میں سوچتی تو تاریکی اور خلا کے سوا اسے کچھ نظر نہ آتا۔ ہاں اس اندھیرے میں روشنی کی ایک کرن تھی۔ مگر وہ کسی اور کی تھی۔ کسی اور کے لیے تھی نہ وہ اس کرن کو اپنا کہہ سکتی تھی نہ اپنا بنا سکتی تھی۔ سوچتے سوچتے وہ ثمنینہ کی طرح خود ترسی میں مبتلا ہو گئی۔

”اللہ، میرے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوا؟ میرا کیا قصور تھا جو یوں میری زندگی تباہ ہو گئی، آنکھوں میں آنسو بھرے وہ اپنے رب سے شکوے کر رہی تھی۔ اس حقیقت کو فراموش کر کے، کہ عموماً انسان کے اوپر جو مصیبت آتی ہے وہ اس کے کرتوتوں کے سبب آتی ہے۔ جو مصیبت رب کی طرف سے آزمائش کے طور پر آتی ہے۔ اس میں ”اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو صبر بھی دیتا ہے اور اس مصیبت سے نمٹنے کا حوصلہ بھی۔“

مہربانو کو خود یہ آئی مصیبت کے لیے نہ صبر آرہا تھا نہ اس سے نمٹنے کے لیے حوصلہ خود وہ تو ایسا حساس اور نازک آئینہ بن گئی تھی جو ذرا سی ٹھیس پر ٹوٹ کے بکھر جاتا ہے چور چور ہو جاتا ہے۔ گھر میں بھی اس کا مزاج رخ ہوتا جا رہا تھا۔ غلطی سے الجھنا، اس کا معمول بنتا جا رہا تھا۔ معمولی معمولی باتوں پر بھی غصہ آنے لگتا۔

عظمتی ساس اور شوہر کے دباؤ میں تھی۔ مہربانو کو تو کچھ نہ کہہ سکتی تھی، جی ہی جی میں ٹکس کر رہ جاتی۔ ابھی اسے مہربانو پر ترس بھی آ جاتا۔ خدا نخواستہ میں مہربانو کی جگہ ہونی اور میرے ساتھ ایسا ہو جاتا تو شاید میں بھی بد مزاج ہو جاتی، غصہ اور کئی میرے اندر بھر جاتے۔ عظمتی ایمان داری سے سوچتی اور مہربانو کے رویے اور مزاج کو نظر انداز کرنے کی کوشش کرتی۔

☆☆☆

”لڑکی، یہاں آؤ۔“ بڑی بی بی کا لہجہ بڑا بارعب تھا۔ بعد میں آرزو کو پتہ چلا تھا کہ وہ کالج کی ریٹائرڈ پرنسپل تھیں۔ ہڈیوں کے کسی عارضے میں مبتلا تھیں۔ زیادہ چل پھر نہ سکتی تھیں۔ الماری میں ان کے کپڑے

ترتیب سے رکھتی ہوئی آرزو نے الماری کا پٹ بند کر دیا اور ان کے پاس گئی۔

”جی۔“

”اخبار پڑھ لیتی ہو؟ انگریزی میں ہے۔“

”جی۔“

”آج کا اخبار لے آؤ، پڑھ کر سناؤ مجھے۔“

انہوں نے حکم دیا۔

آرزو لاؤنج کی میز پر رکھا اخبار اٹھا کر ان کے کمرے میں لے آئی۔ دو گھنٹے تک ان کی فرمائش کے مطابق پڑھتی رہی۔ حلق خشک ہو جاتا تو پانی پی لیتی۔ اپنے لیے جو پانی کی بوتل وہ لائی تھی وہ تقریباً پوری ہی ختم ہو گئی جب مطالعہ پورا ہوا۔

”تمہارا تلفظ خاصا خراب ہے۔ کیوں؟“ وہ کسی ٹیچر کی طرح ہی باز پرس کر رہی تھیں۔

”پتا نہیں۔“ آرزو نے بے زاری سے جواب دیا۔ تلفظ خراب ہو نہ ہو مزاج ضرور خراب ہونے والا تھا۔

”جس لاؤں آپ کے لیے۔“ آرزو نے جان چھڑانی چاہی۔

”بازار کا نہ لانا، فریش نکال کر لاؤ۔“

”جی اچھا۔“ جیل سے چھوٹے قیدی کی طرح وہ کمرے سے نکل پھاگی۔ سب کا تازہ جوس نکالتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی، مجموعی طور پر تو بڑی بی بی اچھی ہیں بس ابھی کبھی ناقابل برداشت ہو جاتی تھیں۔ ان کا لباس بد لوٹا بھی ایک بڑا مشکل اور صبر آزمایہ مرحلہ ہوتا تھا۔

ایک ایک کر کے وہ الماری سے تقریباً سارے ہی لباس نکالوا لیتیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کون سا لباس پہنیں اور آرزو کی سمجھ میں یہ نہیں آتا تھا کہ یہ لباس منتخب کرنے میں اسے انتہائی رنج کر کیوں کرتی ہیں اتنے گھنٹے کیوں لگاتی ہیں جب کہ انہیں لباس بدل کر اسی کمرے میں رہنا ہے یا پھر زیادہ سے زیادہ لان میں بیٹھ جانا ہے۔ کسی کی بارات میں تو جانا نہیں۔

انہیں جوس دے کر ان سے اجازت لے کر۔ آرزو اپنے کوارٹر میں آئی۔ عظمتی کچن میں کھانا پکا رہی

تھیں۔

”میں نے منع کیا تھا آپ کو بچن میں گھسنے سے میں آتو گئی ہوں، چڑھادی“ آرزو ماں پہ خفا ہونے لگی۔ رات سے عظمیٰ کی طبیعت خراب تھی۔ آرزو صبح ناشتہ بنا کر دے گئی تھی۔ دوپہر کا بول گئی تھی کہ آکر پکائے گی۔ یہاں آئی تو ماں کو بچن میں دیکھا۔

”اب تو بہتر ہے طبیعت پھر فارغ بیٹھے بیٹھے بھی جی گھبراتا ہے۔ میں نے سوچا کھانا ہی پکالوں“ عظمیٰ نے جیسے صفائی پیش کی بیٹی کے آگے۔

”اچھا آپ یہاں سے نکلیں۔ میں کرلوں گی۔“ آرزو چوپلے پر ہنڈیا کی طرف متوجہ ہوئی۔ وہ قیمہ بھون رہی تھیں۔

”ماموں کو جوس دیا تھا؟“ ہنڈیا میں چمچ چلاتے ہوئے عظمیٰ سے سوال کیا۔

”دے دیا تھا۔ میں نے بھی پی لیا تھا۔“ انہیں معلوم تھا کہ بیٹی کا اگلا سوال کیا ہوگا اس لیے پہلے ہی جواب دے دیا۔

”عاطف نہیں آیا کل۔“

”مصرف ہوگا۔“ آرزو نے لا پرواہی سے کہا۔ ”فون بھی نہیں کیا۔ ورنہ روز کرتا ہے۔“ عظمیٰ کے لہجے میں تشویش تھی۔

”اس کی مگنی ہوگئی ہے۔ ذمہ داریاں بڑھ گئی ہوں گی۔ کس کس کے لیے وقت نکالے وہ۔“ آرزو نے اچھی طرح سالن بھون کر اس میں آلو ڈال دیے۔

”میں نے سوچا شاید آج آجائے اس لیے قیمہ چڑھا دیا تھا۔“ عظمیٰ کے لہجے میں تھوڑی آس تھی۔ کچھ حسرت اور کچھ باؤسی۔

”آپ کیوں فضول میں انتظار کرتی ہیں اس کا، وہ اپنے باپ کے لیے آتا ہے یہاں۔“ آرزو بولتے ہوئے بچن سے باہر آگئی۔ اب وہ دونوں لاؤنج میں تھیں۔

”بھتیجا تو ہے میرا، پھوپھی ہوں اس کی۔“ ”سکے بیٹے نے تو اپنا اور آپ کا رشتہ نہ یاد رکھا نہ نبھایا۔ دوسرے کی اولاد سے کوئی رشتہ اور توقع نہ ہی

رکھیں تو بہتر ہے۔“ آرزو دو ٹوک اور بے لچک انداز میں بول رہی تھی۔

”میرا بیٹا ایک دن ضرور آئے گا مجھے لینے۔ دیکھنا تم۔“ عظمیٰ کے لہجے میں اتنا یقین اور مان تھا کہ ایک لمحے کو وہ ماں کی صورت دیکھ کر رہ گئی۔ پھر اگلے ہی لمحے خود کو سنبھالتے ہوئے بولی تو لہجہ بدستور کاٹ دار تھا۔

”معجزہ ہو جائے گا پھر تو۔“

”معجزے اسی دنیا میں، اسی زمین پر ہوتے ہیں۔ کسی اور دنیا اور آسمان پر نہیں ہوتے۔“

”معجزے منتخب لوگوں کے لیے ہوتے ہی۔ ہر ایک کے لیے نہیں۔“

”میری آس کو قائم رہنے دو گوگو، میں امید میں زندہ ہوں تو تمہارا کیا جاتا ہے۔“ عظمیٰ کی آنکھوں میں لہجے میں درد تھا۔

”آپ کی زبان یہ بھی یہ نام چڑھ گیا؟ میرا نام آرزو ہے۔ گوگو نہیں۔“ آرزو جھلا کر وہاں سے اٹھ گئی۔

پتا نہیں آج بھی آئے گا یا نہیں۔ عظمیٰ عاطف کے بارے میں سوچ رہی تھیں۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ عاطف کس مشکل بلکہ مصیبت میں گرفتار ہے۔

☆☆☆

کل کی بات تھی۔ عاطف دن میں امی کا مکمل چیک اپ کروانے کلینک لے گیا تھا۔ وہیں جہاں اس کے دوست کے بڑے بھائی ڈاکٹر تھے۔ بڑے مہربان، ہمدرد اور انسان دوست، ان کی خاص بات یہ تھی کہ وہ فیس سے زیادہ مریض پر توجہ دیتے تھے۔

”یہ میری امی ہیں۔ گزشتہ دنوں ان کا بی پی بہت ہائی ہو گیا تھا۔ میں ان کا مکمل چیک اپ کروانے آیا ہوں۔ ان کا ڈائٹ پلان، پرہیز احتیاط، سب بتا دیں۔“ عاطف نے اپنے آنے کی وجہ بیان کی۔ ڈاکٹر احسن خوش خلقی سے مسکرائے اور امی کی طرف متوجہ ہو گئے۔ پہلے ان کا تفصیلی معائنہ ہوا۔ کچھ ٹیسٹ

لکھے ان کی رپورٹس دیکھ کر وہ عاطف سے مخاطب ہوئے۔

”ویسے تو ماشاء اللہ آپ کی والدہ کی مجموعی صحت ٹھیک ہے۔ بی پی اگر کبھی ہائی ہو جاتا ہے تو احتیاط کی ضرورت ہے۔ میں نے سب کچھ اس پرچے پر لکھ دیا ہے احتیاط پرہیز اور کچھ ٹانگ، یہ آپ رکھ لیں۔“ ڈاکٹر احسن نے پرچہ عاطف کی طرف بڑھایا۔ معاہدہ نہیں کچھ یاد آیا۔ عاطف کی شکل دیکھ کر بولے۔

”آپ کے والد صاحب اب کیسے ہیں؟ کچھ بہتری تو آئی ہے ان میں پہلے کے مقابلے میں، تھوڑا سا فرق لگا تھا مجھے بھی۔“

”جی..... وہ.....“ عاطف بری طرح سٹ پٹایا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ڈاکٹر احسن اپنے مریضوں کو یوں یاد رکھتے ہوں گے۔ ان کے پاس تو روزانہ کتنے ہی مریض آتے ہیں مگر عاطف یہ بھول گیا کہ وہ شہید احمد کو ایک سے زیادہ بار ان کے پاس لایا تھا۔ ابھی بھی دو ہفتے پہلے ہی تو وہ انہیں لے کر آیا تھا یہاں۔

ڈاکٹر صاحب کو بتانے کے لیے اسے کوئی جواب نہیں سوچ رہا تھا۔ امی الگ حیران پریشان سی ڈاکٹر صاحب کو دیکھ رہی تھیں۔

”ڈاکٹر صاحب! آپ کس کی بات کر رہے ہیں؟“

”آپ کے ہزبینڈ شہید صاحب کی، ان کا علاج بھی پچھلے کئی ماہ سے میں ہی کر رہا ہوں۔“ ڈاکٹر نے خاصے لا پرواہ لہجے میں کہا تھا اور امی یہ گویا بجلی گر پڑی تھی۔ ان کا چہرہ یہ نام سن کر یوں سفید ہو گیا جیسے سارا خون خچر گیا ہو۔

”گھر چلیں امی، میں بتاتا ہوں سب۔“ عاطف نے ماں سے نظریں ملائے بغیر دھیرے سے کہا اور کرسی سے کھڑا ہو گیا۔ ناچار وہ بھی کھڑی ہو گئیں۔ گاڑی تک پہنچتے پہنچتے ان کا یہ حال تھا کہ پاؤں کہیں رکھتی تھیں اور وہ پڑتا کہیں اور تھا۔ وہ جیسے نیم بیہوشی کی حالت میں تھیں۔ عاطف نے انہیں

تھامنے کے لیے ان کا بازو تھامنا چاہا مگر انہوں نے جھٹک دیا۔

”دور رہو مجھ سے۔“ وہ غرائیں، عاطف ہونٹ بھیج کر رہ گیا۔

تمام راستے اس کی ہمت نہیں ہوئی ماں کو مخاطب کرنے کی یا ان کی طرف دیکھنے کی بھی۔ گھر پہنچ کر وہ اندر گئیں اور صوفے پر ڈھے گئیں۔

”میری سمجھ یہ میں نہیں آرہا کہ تم اس شخص تک پہنچے کیسے، اور کب سے؟ کب سے چل رہا ہے یہ معاملہ۔“ عاطف کو مخاطب کیے بغیر وہ بڑبڑائیں۔

”امی۔“ عاطف ماں کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

”امی، مجھے معاف کر دیں، میری وجہ سے آپ کا دل دکھا مگر یقین کریں میں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا۔ میری نیت آپ کو دھوکا دینے کی اور ہرٹ کرنے کی نہیں تھی۔ مجھے کسی نے ان کے بارے میں بتایا تھا کہ ان کی حالت بہت خراب ہے۔ میں نے انہیں دیکھا تو مجھے لگا کہ انہیں میری مدد اور تعاون کی ضرورت ہے۔ میں بس ان کی مدد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔“ اٹکتے اٹکتے عاطف نے اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔

”تمہیں کس نے بتایا اس کے بارے میں؟“

ماں کا انتہائی سرد لہجہ اسے مزید خائف کر گیا۔

”ایسے ہی کوئی تھا۔ آپ نہیں جانتیں۔“ عاطف ان کی طرف دیکھے بغیر بول رہا تھا۔

”عاطف، ادھر دیکھو میری طرف، اور شروع سے آخر تک ایک ایک بات، ایک ایک سچ مجھے بتاؤ۔“

”امی! چھوڑیں جانے دیں، کیا کریں گی سب کچھ سن کر۔“ عاطف آہستہ سے بولا، مگر وہ اس کی ایک نہیں سن رہی تھیں۔

”جب تک نہیں بتاؤ گے میں یوں ہی بھوکی پیاسی بیٹھی رہوں گی۔“

”امی!“ عاطف نے دہل کر ماں کو دیکھا۔ وہ

اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کی ماں اپنے فیصلوں میں کتنی اٹل ہے اور اپنے معاملات میں کتنی ہٹ دھرم ہے۔ اب عاطف کے پاس کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ ماں کو سب کچھ سچ سچ بتا دے اور اس نے بتا دیا۔ عاطف چہرے پر شرمندگی سجائے دھیرے دھیرے اٹک اٹک کر بول رہا تھا۔ وہ سن رہی تھیں اور ان کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا۔ ایک جا رہا تھا۔ عاطف خاموش ہوا تو یک ٹک اس کا چہرہ دیکھ رہی تھیں۔

”تم میرے ہی بیٹے ہونا؟ میرے عاطف!“

”امی پلیز!“ عاطف تو تڑپ ہی گیا ان کی بات سن کر۔ ”مجھے اندازہ نہیں تھا کہ آپ اس بات سے اتنا دکھی ہوں گی۔ آپ مجھے معاف کر دیں پلیز۔“ ماں کے پیر پکڑے وہ معافیاں مانگ رہا تھا۔

”تمہیں میرے دکھ کا اندازہ نہیں تھا؟“ امی بڑبڑائیں۔ ”کیا تم وہ سب بھول گئے جو بچپن سے لے کر آج تک تمہیں بتاتی چلی آئی ہوں؟ میں نے سب کچھ بتایا تمہیں۔ اس بے غیرت انسان کے سارے کرتوت، اس کی ذلیل بہن کی ساری حرکتیں۔ اس نے دوسری عورت کو مجھ پر ترجیح دی، کسی اور کے لیے مجھے چھوڑ دیا۔ دوسرے کی اولاد کو گلے لگا کر اپنی سگی اولاد کو چھوڑ دیا۔ ایسے جانور سے تمہیں نفرت کیوں نہیں ہوئی میری طرح؟“ عفت کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور لہجے میں شعلوں کی آغوش تھی۔

”صرف اور صرف نفرت کے قابل ہے وہ شخص، صرف نفرت کے، تم نے کیسے اسے گلے لگا لیا۔“ وہ پھٹ پڑی تھیں۔ عاطف سر جھکائے ماں کے پیروں کو تھامے بیٹھا تھا۔ وہ زور زور سے رو رہی تھیں۔ چیخ چیخ کر رو رہی تھیں۔ ایک ہڈیانی کیفیت ان پر طاری تھی۔ عاطف ان کی حالت دیکھ کر ڈر سا گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ دوڑ کر ایک گلاس پانی لے آیا۔

”پانی پی لیں۔“ بے چارگی سے کہتے ہوئے

اس نے گلاس ماں کے آگے کیا۔

”ہٹاؤ اسے۔“ انہوں نے زور سے ہاتھ مار کر گلاس دور پھینک دیا۔

”چھوڑ دو مجھے، مرنے دو مجھے، اکیلے، تم جاؤ اس مردود کے پاس اس کی خدمتیں کرو، اس سے ہمدردی کرو۔“ وہ اب بھی بری طرح رو رہی تھیں۔

”امی آپ مجھے مار لیں۔ مگر ایسے مت کریں پلیز، میں آپ سے جتنی محبت کرتا ہوں دنیا میں کسی سے نہیں کرتا، آپ بھی اچھی طرح جانتی ہیں، اس حقیقت کو۔“ عاطف ان کے سامنے ہاتھ جوڑے ہوئے تھا۔

”مجھ سے محبت کرتے ہو تو میرے سر پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاؤ، خدا کی قسم کھا کر کہو کہ تم ان دونوں بہن بھائی سے نہ کبھی ملو گے نہ بات کرو گے۔“

انہوں نے اپنی جذباتی اور ہیجانی کیفیت میں عاطف کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سر پر رکھا۔ ”کھاؤ قسم، خدا کی قسم کھا کر کہو۔“ وہ انتہائی مضطرب نظروں سے بیٹے کو دیکھ رہی تھیں۔ عاطف کا ہاتھ انہوں نے اپنے سر پر رکھا ہوا تھا۔

عاطف نے ایک نظر انہیں دیکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔ جس میں پانی جمع ہونے لگا تھا۔ آنکھیں بند کیے اس نے وہ سب دہرا دیا۔ جو ماں کی خواہش تھی۔ آج کی رات بڑی عجیب تھی۔ اتنی سیاہ، اتنی ہی خاموش اور ستم بالائے ستم، گزرنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔

کیا ضروری تھا یہ سب ہونا، جو ہوا۔ انسانوں کی غلطیاں کبھی ان ہی تک محدود نہیں رہتیں۔ نسل در نسل چلتی ہیں۔ نسلوں کو بھگتنی پڑتی ہیں۔ پہلی نسل کا کیا، اگلی نسل بھگت رہی تھی۔ باپ کا بھگتان بیٹا بھر رہا تھا۔ دل میں تمام غموں کو سمیٹے وہ چپ چاپ لیٹا ہوا تھا۔

اسے اپنی ماں سے محبت تھی شدید محبت، مگر نہ جانے کیوں ان کے لاکھ چاہنے پر بھی باپ کی ہزار زیادتیاں گنوانے پر بھی، اسے اپنے باپ سے نفرت

نہیں ہو سکتی تھی۔

کبھی لڑکپن میں جب ماں سے ان کی داستان حیات سنتا تو سوچتا تھا جذباتی ہو کر، کہ باپ سے جب بھی ملاقات ہوگی تو ان کا گریبان پکڑ کر ان زیادتیوں اور مظالم کا حساب لے گا جو اس کی ماں پر ہوئے مگر جب وہ ان سے ملا تو پتا نہیں وہ کیسے بھول گیا کہ اسے اپنے باپ سے نفرت کرنی ہے۔ ماں کے ساتھ ہوئے ظلم کا حساب لینا ہے۔

وہ بھول گیا۔ فراموش کر دیا اس نے اسے بس اتنا یاد تھا کہ وہ ایک بیٹا ہے اور پلنگ پر پڑا یہ لاچار اور بے بس بوڑھا اس کا باپ، رگوں میں دوڑتے لہو کا اثر تھا یا اس شخص سے بندھے رشتے کی کرامت تھی کہ وہ صرف اور صرف ہمدردی کر سکا اس شخص سے، نفرت نہیں۔ مہربان ہو سکا اس پر، بے اعتنائی نہیں برت سکا۔

اب لیٹا لیٹا یہ سوچ رہا تھا کہ یہ بات امی کو کیسے سمجھائے کہ وہ کس وجہ سے مجبور ہوا باپ کے ساتھ ہمدردی کرنے پر، کیوں مجبور ہوا ان کا خیال رکھنے پر، شاید اپنی مہربان فطرت اور عادت کی وجہ سے؟ یا خون کی کشش کی وجہ سے؟ عاطف خود بھی سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ ماں کو کیا سمجھاتا۔

نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ خیالات کے بھنور میں دل و دماغ سمیت پورا وجود ہی چکرایا ہوا تھا۔ پھر بھی آنکھیں بند کر کے سونے کی ناکام کوشش کر رہا تھا کہ موبائل بجنے لگا۔ جب سے اس کی منگنی ہوئی تھی۔ روزانہ موبائل بجنا معمول بن گیا تھا۔ دیر سو ری، ثانیہ کی کال روز آتی تھی۔

”ہیلو کیا حال ہے آپ کا؟“ عاطف کی ہیلو کے جواب میں ثانیہ شروع ہو گئی۔ وہ امی کیسی ہیں؟ چیک اپ ہو گیا ان کا؟ کیا رہا؟“ اس کے سوال پر سوال جاری تھے۔ دن میں روزانہ اپنی ہونے والی ساس سے باتیں کرتی تھی جنہیں ابھی سے ہی امی کہنا شروع کر دیا تھا۔ رات میں سونے سے پہلے بیٹے کا دماغ چاٹتی تھی۔ عاطف کبھی کبھی یہی سوچتا تھا حالانکہ بے

چاری اتنی اچھی تو تھی خوش مزاج، خوش اخلاق، بس ذرا بات تو نہ تھی۔ تو کیا ہوا، امی کو تو اس کی یہی عادت اچھی لگتی تھی۔

”مینا کی طرح چہچہاتی رہتی ہے۔ اچھا ہے۔ میرا دل تو لگا رہے گا بہو کے ساتھ۔“ امی ایک روز عاطف سے ہونے والی بہو کی تعریف کر رہی تھیں۔

”ہم لوگ کل آئیں گے امی کو دیکھنے۔“ عاطف کے جواب کا یا کچھ کہنے کا انتظار کیے بغیر وہ اگلی بات اگلا سوال شروع کر دیتی تھی۔

”اچھا۔“

”مجھے تو امی سے زیادہ آپ کی طبیعت خراب لگ رہی ہے۔ آپ ٹھیک تو ہیں؟“

”میں ٹھیک ہوں۔“

”آپ کہتے ہیں تو یقین کر لیتی ہوں چلیں آج اپنی پسند ناپسند بتائیں۔ کھانے میں کیا پسند ہے آپ کو؟“

عاطف کا انٹرویو شروع ہوا۔

”ہر وہ شے جو اچھی لگتی ہوئی ہو۔“

”مثلاً کریلے، بھنڈی، توری، کدو، لوکی، دالیں اچھی لگتی ہوں تو کھا لیتے ہیں آپ؟ وہ مذاق نہیں کر رہی تھی سچ سچ حیران ہو رہی تھی۔

”بالکل کھا لیتا ہوں۔ میری امی یہ سب چیزیں گوشت کے ساتھ پکاتی ہیں۔ میں کھا لیتا ہوں۔“

”مگر مجھے تو یہ سب نہ پکانا آتا ہے نہ میں کھاتی ہوں۔“

”پھر آپ کو کیا پکانا آتا ہے اور آپ کیا کھاتی ہیں؟“

”میں..... پیزا، شورما، برگر.....“ ایک ایک کر کے اس نے کتنے ہی جنک فوڈ کے نام گنوا دیے اور ساتھ میں یہ بھی کہ یہ سب اسے بنانے بھی آتے ہیں۔

”آپ ایسا کیجیے گا کبھی اپنی پسند کا پکا لیجیے گا کبھی میری مرضی کا۔“

”ہاں۔ یہ بھی ٹھیک ہے۔ ویسے آپ ہیں بہت اچھے، کسی بات پر نہ غصہ دکھاتے ہیں نہ خڑہ، ایسی

ٹیوٹ نہیں ہے آپ میں، ورنہ میری ایک سہیلی کا فیانی تو اتنا کھڑوس، نخریلا اور اتراتی شکل ہے کہ کیا بتاؤں، بات بات پر عجب جماتا ہے۔ غصہ دکھاتا ہے پابندیاں لگاتا ہے۔ یہ کرو، وہ نہ کرو، ایسے کرو، ویسے نہ کرو، بے چاری ہمارا جان مصیبت میں آگئی ہے۔“ وہ اپنی سہیلی کا ڈکھڑا کر رہی تھی۔

”کیا پتا میں بھی ایسا ہی نکلوں، تھوڑی دیر کی بات چیت سے کسی کے بارے میں کیا پتا چلتا ہے؟“

”جی نہیں، مجھے پتا ہے آپ ایسے نہیں ہیں۔ ویسے بھی سب لوگ آپ کی اتنی تعریفیں کرتے ہیں۔“

”اچھا!“ عاطف کے لبوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔

”اب سونے کی اجازت ہے؟“

”اوہ، بالکل، خدا حافظ۔“

اگلے روز ثانیہ کے گھر والے امی کی عیادت کرنے آئے۔ امی، ابو، بہن اور بھائی، ساتھ میں بہت سے لوازمات بھی لائے تھے۔ پھل، جوس اور دودھ کے پیکٹ شہد کی بوتل،

”یہ سب تکلف کرنے کیا ضرورت تھی، آپ لوگ آئے بس کافی تھا۔“ عفت بیگم سدھیانے کے اعلا اخلاق کی قائل بلکہ گھائل ہو گئی تھیں۔

”تکلف کیسا بس آپ جلد از جلد یہ سب ختم کر دیجیے گا۔ ہمیں خوشی ہوگی۔ ویسے بھی آپ بہت کمزور اور زرد ہو رہی ہیں۔“ ثانیہ کی امی نے عفت بیگم کا ستا ہوا چہرہ دیکھا جو اتنی کمزور اور زرد ہو رہا تھا۔

”کمزوری ہے، ڈاکٹر نے ٹانک لکھے ہیں صحت کے۔“ عفت کل والی ساری کلفت اور اپنے اندرونی اضطراب و بے چینی کو بڑی کامیابی سے چھپائے سدھن کے ساتھ محو گفتگو تھیں۔ لیکن باتیں کرتے کرتے انہیں گزری کل کا خیال آ جاتا اور ان کے چہرے کا رنگ بدل جاتا۔

”آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی عفت بہن! ثانیہ نے آپ کے لیے خاص طور پر سوپ بنا کر بھیجا ہے۔ اور تاکید کی تھی کہ آپ کو پلا کر ہی آئیں۔“

میں نکال دیتی ہوں۔ ابھی گرم اور تازہ ہے۔“ سدھن صاحبہ نے خوش اخلاق سے بولتے ہوئے فلاسک نکالا جس میں سوپ تھا۔

”دل تو تمہیں چاہ رہا مگر بچی نے اتنی محبت اور اصرار کے ساتھ بھیجا ہے تو تھوڑا سا پی لیتی ہوں۔“

عفت ثانیہ کی توجہ اور خیال رکھنے کے خیال سے ہی مسرور ہو گئیں۔ ملازمہ کو آواز دی چونکہ میں مہمانوں کی خاطر تواضع کا بندوبست کر رہی تھی۔ وہ فوراً آگئی۔

”یہ لے جاؤ، اس میں سوپ ہے نکال کر لے آنا۔ میری بہو نے بنا کر بھیجا ہے۔“ عفت نے خیرہ بولتے ہوئے اسے فلاسک تھمایا۔

”جی اچھا۔“ سر ہلاتی ہوئی فلاسک لے کر چلی گئی۔

مہمانوں کے جانے کے بعد عفت پھر سوچ میں پڑ گئی تھیں۔ اب انہیں بار بار عاطف کا خیال آرہا تھا۔

”میرا بچہ کیسا رو پڑا تھا میرے آگے۔ ہاتھ جوڑ کے معافیاں مانگ رہا تھا، میں نے بھی اتنا غصہ دکھایا اسے۔ کہیں زیادتی تو نہیں کردی اس کے ساتھ؟“ ان کی مامتا بے چین ہو رہی تھی۔

وہ تو شروع سے ہی ایسا ہے، گداز دل کا مالک، نرم خور اور حساس، بلی کے اور پرندوں کے گرے پڑے بچے اٹھا کر گھر میں لے آتا تھا ان کا خیال رکھنے کے لیے۔ دیکھ بھال کرنے کے لیے۔ پھر یہ بھی تو نہیں معلوم کہ ان چلتے بازوں نے کیا کہانیاں سنا کر میرے معصوم اور سیدھے سادے بیٹے کو قابو میں کر لیا کہ ماں کو بتائے بغیر ان کی خدمت میں حاضری دینے لگا۔

ان دونوں بہن بھائیوں کے مکرو فریب اور چھل سے تو میں ہی واقف ہوں۔ عاطف بے چارے کو کیا خبر اس کا باپ اور پھوپھی کتنے گن اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں چالباز، دھوکے باز، مکار، سازشی، میری زندگی برباد کر کے اب میرے بیٹے پر قبضہ جمانے چلے ہیں دونوں، میں ہونے دوں گی ایسا؟ مگر بھی رہے ہوں میرے بیٹے کے سامنے تو حلق میں پانی نہ ٹپکانے دوں؟ بیٹے کو دل کی عدالت میں بے گناہ بری

کر کے وہ ان دونوں کو اسی شدت اور نفرت کے ساتھ سوچ رہی تھیں جیسے سوچتی چلی آئی تھیں۔

عاطف بہت پریشان تھا۔ ویسے تو شہید احمد اب اس قابل تھے کہ اپنے ہاتھ پاؤں استعمال کرنے لگے تھے۔ غسل اور حوائج ضروریہ سے فراغت، کھانا کھانا، اب اپنے ہاتھوں سے کرنے لگے تھے۔ بولتے اب بھی نہیں تھے مگر کبھی کبھی عاطف کی باتوں پر مسکرا دیتے تھے، جب وہ ان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر نہ جانے کیا کیا باتیں کرتا رہتا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ شہید احمد بہت بے چینی سے اس کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ مگر وہ جان نہیں سکتا تھا۔ وہاں بات نہیں کر سکتا تھا۔ ان سے۔

پھر اسے بار بار امی کا خیال بھی آرہا تھا، ان کی ہسٹریائی کیفیت، ان کا زار زار رونا، ان کی بے یقین نگاہیں انہیں کسی طور یقین نہیں آرہا تھا کہ جس شخص سے وہ شدید نفرت کرتی تھیں۔ اس شخص سے ویسی نفرت ان کا بیٹا نہیں کر سکتا۔ عاطف چاہ کر بھی انہیں یہ بات کبھی نہیں سمجھا سکتا تھا کہ اس نے محض اپنے بیٹے ہونے کا فرض نبھایا ہے۔ تھوڑی سی ذمہ داری اٹھانے کی کوشش کی ہے اپنے باپ کی۔ جو ایک بیٹے پر فرض ہے۔

ہاں ٹھیک ہے کہ چھ سال کی عمر کے بعد انہوں نے باپ ہونے کا حق ادا نہیں کیا۔ اسے ماں کے ساتھ چھوڑ دیا تو پھر پلٹ کر خبر نہیں لی۔ وہ محرومیوں کا شکار رہا۔ باپ کی شفقت محبت سے محروم رہا۔ باپ کی انگلی پکڑ کے اسکول جانا، پارک جانا، آکس کریم کھانے یا جھولا جھولنے جانا، محرومیاں تھیں اس کی زندگی میں جن کا اس نے سامنا کیا، ایک دو نہیں بہت ساری مگر پھر بھی اس کا دل اس شدت سے شہید احمد کے خلاف نہیں ہوسکا۔ اتنا کھوڑا اور سنگ دل نہیں ہوسکا کہ باپ سے اس بات کا بدلہ لیتا کہ انہوں نے اپنے فرائض سے غفلت برتی۔ انہیں ادا کرنے سے پہلو تہی کی، مگر عاطف پیچھے نہیں ہٹ سکا۔ نظر انداز نہیں کر سکا انہیں۔

مگر یہ سب باتیں وہ خود ہی سوچ سکتا تھا۔ اس معاملے پر وہ اپنے آپ سے ہی بات کر سکتا تھا۔ اپنی امی کو اگر یہ سب بتا بھی دیتا تو جانتا تھا کہ انہیں اس بات سے تکلیف ہوگی۔ شہید احمد کے لیے عاطف کی اعلا ظرفی نرم دلی انہیں صدمہ پہنچائے گی۔ غصہ دلائے گی۔ عاطف خاموش رہنے پر مجبور تھا۔ اب تو امی نے زبردستی قسم دلا کر اس سے وعدہ بھی لے لیا تھا۔

پتا نہیں اب کیا ہوگا۔ وہ انتہائی بے بسی کے عالم میں تھا۔

☆☆☆

مہربانوں نے شہزادے کو چاند گاڑی سے نکال کر کھڑا کیا۔ وہ اب کھڑا ہو جاتا تھا۔ دو چار قدم آگے بڑھتا، لڑکھڑاتا اور مہربانوں سے تھام لیتی، شہزادے کو کھڑا کر کے وہ سامنے بیٹھ گئی۔

”آؤ!“ مہربانوں نے اسے بلایا۔ وہ مسکرا کے ایک قدم آگے بڑھا۔ اس وقت آرزو بھاگتی ہوئی اندر آئی اور شہزادے سے ٹکرائی۔ دونوں گر پڑے اور رونے لگے۔ مہربانوں نے جھپٹ کر شہزادے کو گود میں اٹھایا۔

”ہائے میرا چاند، کتنے زور سے دھکا دے کر گرایا ہے۔ اندھی ہے کیا، دیکھ کر نہیں بھاگتی۔“ آرزو کو قہر آلود نظروں سے دیکھتے ہوئے ایک پھٹر اس کے جڑ دیا۔ بلکتی ہوئی آرزو اور زور زور سے رونے لگی۔ عظمیٰ جو آرزو کے رونے کی آواز سن کر آئی تھی۔ مہربانوں کو پھٹر مارتے دیکھ چکی تھی۔

”یہ کیا کر رہی ہو، ماریوں رہی ہو بچی کو؟“ عظمیٰ نے اپنی روٹی ہوئی بیٹی کو گود میں اٹھایا اور چپ کرانے لگی۔ چہرے پر ناگواری تھی۔

”بچی کی حرکت دیکھی، آکر میرے بیٹے کو گرا دیا۔“ مہربانوں نے ترائخ کر جواب دیا۔

”وہ تو کھیلنے آئی تھی، خوشی خوشی بھاگ کر آئی تھی کہ بھائی کے ساتھ کھیلنے جا رہی ہوں۔“ عظمیٰ کو غصہ آرہا تھا۔

”اتنی سی بچی کو کون مارتا ہے؟“

”اپنا بھائی ہے تو اس کے ساتھ کھیلے، یہاں کیوں آئی ہے“ مہربانو انتہائی بدتمیزی سے بول رہی تھی۔
”اس کا بھائی ابھی سو رہا ہے ورنہ اس کے ساتھ کھیل لیتی۔ یہاں نہ آتی“ عظمیٰ بیٹی کو لے کر چلی گئی۔“

رات میں وہ اپنا دکھڑا ارسلان کے آگے رو رہی تھی۔

”برداشت کر لو، اب کیا کریں، جب تک اس کی کہیں اور شادی نہیں ہو جاتی تب تک یہی سیا پے چلتے رہیں گے گھر میں۔“ ارسلان نے بے زاری سے جواب دیا تھا۔ آئے دن کے جھگڑوں سے وہ بھی تنگ آچکا تھا۔

”آئندہ اگر اس نے میرے کسی بھی بچے کو ہاتھ لگایا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔“ عظمیٰ بھر کر بولی۔
”اچھا جو تمہارے بچے کو مارے تو تم بھی اسے دو چار تھپڑ لگا دینا۔ چاہے تمہاری نند ہو، ساس ہو یا شوہر، ارسلان بھی جوتے مارنے میں کم نہیں تھا۔

”ارسلان!“ عظمیٰ نے اس کے طنز پر شکایتی نگاہوں سے اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آنے لگے۔

”میرا میکہ نہیں رہا تو سب نے مجھے بے وقعت سمجھ لیا۔“

”میکہ کیوں نہیں ہے۔ بھائی بھانج ہیں تو سہی۔“ ارسلان نے جمائی لیتے ہوئے تکیہ ٹھیک کیا۔
اس وقت دن بھر کا تھکا ہارا ہوتا تھا۔ نیند کا غلبہ ہوتا تھا اور عظمیٰ دن بھر کی روداد انتہائی باریکیوں سے تفصیلات کے ساتھ اس کے گوش گزار تھی۔

”میکہ ماں باپ کے دم سے ہوتا ہے۔ بھائی بھانج کا کیا ہے۔ ایسے آنکھیں بدل لیتے ہیں جیسے جانتے نہیں، اب ذرا عفت کو دیکھو، سگی گزن ہے بھابھی تو بعد میں بنی ہے۔ مگر اب تو ایسی غیریت برتی ہے کہ کیا بتاؤں، میرا گھر جانا تو اس سے بالکل برداشت ہی نہیں ہوتا۔“

عظمیٰ نے نیا دکھڑا رونا شروع کر دیا۔

”ہوں۔“ ارسلان نے آنکھیں بند کے ہنکارا بھرا۔

”کتنی جلدی چلی گئیں میری امی یوں اچانک، رات کو اچھی بھلی سوئیں اور صبح ختم، جب تک میری امی تھیں۔ عفت کی مجال بھی کہ مجھے ایک لفظ بھی کہہ سکتی۔ اب تو دھڑلے سے بول رہی تھی کہ روز روز آنے سے قدر کم ہو جاتی ہے۔“ بولتے بولتے عظمیٰ نے ارسلان کی طرف دیکھا۔ جس نے اب خرائے لینے شروع کر دیے تھے۔

لو یہ بھی سو گئے۔ عظمیٰ نے مایوسی سے شوہر کو دیکھا۔ اکثر ہی ایسا ہوتا تھا۔ وہ اپنے دکھڑے رو رہی ہوتی ارسلان کے آگے اور وہ سنتے سنتے سو بھی جاتا اور خرائے لینے شروع کر دیتا۔

بیوی کی باتوں کے جواب میں شوہر کے پاس خرائے ہی ہوتے ہیں۔ عظمیٰ نے ذرا تلخ ہو کر شوہر کو دیکھا۔

حمیرا کوششوں میں لگی ہوئی تھیں کہ کسی طرح مہربانو کی کسی اور جگہ شادی ہو جائے مگر ہزار جتن کے باوجود بھی ان کی کوششیں بار آور نہیں ہو رہی تھیں۔ ان کی خواہشات اور مطالبات کی اثر ان اوچی تھی۔ وہ چاہتی تھیں کہ معیز عالم جیسا بلکہ اس سے بھی بڑھ کر کوئی ملے۔ وہ اس حقیقت کو فراموش کر گئیں کہ آج کل کنواریوں کے لیے برملا سنا ایک سنگین مسئلہ بن چکا ہے تو طلاق یافتہ، ایک بچے کی ماں کو اپنی مرضی اور پسند کا رشتہ کیسے ملے گا؟ چاہے لڑکی کتنی خوب صورت ہی کیوں نہ ہو مگر طلاق کے داغ اور بچے کے ساتھ حسن کچھ گہنا جاتا ہے۔

مہربانو کے لیے رشتے کرانے والی سے رابطہ کیا گیا تھا۔ وہ جتنے بھی رشتے لائی سب دوسری، تیسری شادی والے تھے۔ ادھیڑ عمر، معمولی نوکری یا چھوٹا موٹا کاروبار، کسی کے دو بچے، کسی کے تین چار، کوئی ایک رشتہ بھی حمیرا کی نظر میں نہ بچا۔

”یہ کیسے رشتے لائی ہو میری بچی کے لیے، نہ دولت، نہ شکل، نہ کچھ، اور اوپر سے بال بچوں والے،

مہربانو تو پھول سی نازک ہے، اس نے اپنے بچے کو سنبھالنے کے لیے آیا رکھی ہے، وہ دوسروں کی اولادیں سنبھالے گی؟ تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے کیا؟ حمیرا ”وچلون“ پہ برس پڑی۔

”دنیا والے بڑے سیانے ہیں جی، خوب صورت تو کنواریوں میں بھی بہت ہیں، جیسے آپ کو پیسے والا داماد چاہیے۔ ایسے ہی مردوں کو بھی اپنے سے اونچا گھرانہ چاہیے، کم بخت لوگ دوسرے کی تجبوری سے فائدہ اٹھانے کا سوچتے ہیں۔ جیسا داماد آپ چاہ رہی ہیں وہ تو اللہ نے پہلے ہی دے دیا تھا، آپ نے قدر نہ کی، اب بہت مشکل ہے ویسا ملنا، کوئی اپنی مرضی اور چاہ سے بیاہ لے جائے تو الگ بات ہے۔“ حمیرا کے چپ ہوتے ہی وچلون نے ایک سانس میں سب کچھ کہہ دیا، حمیرا خاموش بیٹھی رہ گئیں۔

مہربانو کی اذیت اور بڑھ گئی تھی۔ اس نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا اس کی زندگی میں یہ وقت بھی آئے گا۔ اس نے نو عمری سے ہی اپنے سپنوں کے تار شہید احمد کے تصور سے بنے تھے۔ وہ خواب چکنا چور ہو گیا۔ سپنوں کے سارے تار آپس میں الجھ کر رہ گئے پھر قسمت نے معیز عالم کے ہاتھ میں اس کا ہاتھ دے دیا اس کی بد قسمتی تھی جو خود چل کر اس کے پاس آئی یا اس نے خود اسے آواز لگائی، بہر حال معیز عالم کا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ دونوں کے رستے جدا ہو گئے۔

اب زندگی عجیب دورا ہے پہ کھڑی تھی۔
کبھی تو اسے لگتا کہ اس کی ساری خواہشیں مر گئی ہیں، سارے خواب جل گئے ہیں، اب کوئی تمنا دل میں باقی نہیں رہی، اور کبھی.....؟

کبھی اس کا دل چاہتا اس دنیا کو آگ لگا دے، اس کا دل چاہتا کہ معیز عالم کا منہ نوچ لے ایسے کہ پھر وہ کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہ رہے، خود ترسی کی اسی کیفیت میں اسے عفت پر بھی شدید غصہ آتا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ اگر عفت اس کے اور شہید احمد کے درمیان نہ آتی تو اس کی زندگی یوں اندھے کنویں میں

نہ گرتی جس میں اب گری ہوئی ہے، ایسا اندیہا کنواں جس سے باہر نکلنے کا نہ کوئی در ہے نہ امکان، جی کا زہر آہستہ آہستہ اس کے رگ و پے میں سرایت کرتا جا رہا تھا۔

عظمیٰ اور ارسلان کا التفات دیکھتی تو اس کے تن بدن میں آگ لگ جاتی۔ عفت اور شہید احمد کے بارے میں سوچتی تو جلن، حسد کے مارے پر حال ہو جاتا، میرے ہی نصیب میں یہ بربادی لکھی تھی، آخر کیوں؟ اگر وہ ایمان داری سے اپنا بے لاگ احتساب کرتی تو اسے اس کیوں کا جواب مل جاتا مگر وہ اپنے آپ کو بالکل بے گناہ، اور بے قصور سمجھتے ہوئے اپنی ہر مصیبت اور تکلیف کا ذمہ دار دوسروں کو ٹھہرا بھی رہی تھی اور سمجھ بھی رہی تھی۔

عظمیٰ نے شہید احمد کو فون کیا تھا۔

”بھائی، مجھے بہت تیز بخار ہے ڈاکٹر کے جانا ہے، لے چلیں گے، ارسلان تو اس وقت آفس میں ہیں۔ رات تک ہی آئیں گے۔“ فون پہ عظمیٰ کی نقاہت بھری آواز سن کر شہید دکان ملازموں پر چھوڑ کر فوراً ہی پھوپھی کے گھر آ گیا۔ مین روڈ پر اس کی الیکٹرونکس کے سامان کی بہت بڑی دکان تھی۔ اچھا خاصا چلتا ہوا کاروبار تھا۔ ملازم ابا کے زمانے کے تھے، پرانے اور قابل بھروسہ، اسی لیے شہید احمد دکان ان کے حوالے کر کے آرام سے آ گیا تھا۔

عظمیٰ کو بہت تیز بخار تھا۔ دونوں بچوں کو دادی کے پاس چھوڑ کر وہ بھائی کے ساتھ قریبی کلینک آئی۔ ڈاکٹر کے پاس مریضوں کی لائن لگی ہوئی تھی۔ ڈیڑھ دو گھنٹے لگ گئے۔ میڈیکل اسٹور سے دوائی لے کر اسے گھر چھوڑا۔

”اندر آ جائیں بھائی، آپ نے تو آنا ہی چھوڑ دیا۔ ہمارا میکہ آنا، آپ کی بیوی نے چھڑوا دیا۔“ عظمیٰ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”کیا ہوا، عفت نے کچھ کہا ہے کیا؟“ شہید احمد چونک پڑا۔

”انہیں لگتا ہے کہ میں گھر آؤں گی تو مہربانو

کے قدم بھی اس کے گھر میں پڑیں گے جو وہ چاہتی نہیں ہیں۔“ عظمیٰ نے اپنے آنسو صاف کیے۔ اب تو موقع ملا تھا بھائی کے سامنے وہ ساری باتیں کہنے کا جو کب سے دل میں سلگ رہی تھیں۔

”مہربانو کہاں سے آگئی بیچ میں۔“ شہید احمد گڑبڑا گیا۔

”آئی تو کہیں سے نہیں، مگر انہیں یہی لگتا ہے کہ وہ بیچ میں ہے۔“ عظمیٰ اسے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر ساس کے کمرے میں گئی۔ وہ فوراً ہی آگئیں۔

”ارے اندر آؤ نا، ڈرائنگ روم میں کہاں بیٹھ گئے بہانوں کی طرح۔“ حمیرا اسے لاؤنج میں لے آئیں۔

”اب تو تم نے شکل دکھانا بھی چھوڑ دی، ایک وہ وقت تھا جب دن میں دو تین چکر لگائے بغیر تمہارا کھانا ہضم نہیں ہوتا تھا۔ سارا سارا دن یہیں رہتے تھے، ہائے، وہ بھی کیا وقت تھا۔“ حمیرا نے ایک آہ بھری۔

”ہاں، وہ بھی کیا وقت تھا۔“ شہید احمد کی نظر بلا ارادہ ہی سامنے مہربانو پر پڑی جو کچن میں اپنے بچے کے لیے دودھ گرم کر رہی تھی۔

”مہربانا، ذرا جائے بنا لینا، دیکھو کباب رکھے ہوں گے، تل لودرا۔“ عظمیٰ تو بخار میں پڑی ہے، اس سے کہاں ہوگا یہ سب۔“

”نہیں نہیں، میں بس اب چلوں گا، دکان ملازموں پر چھوڑ کر آیا ہوں آپ یہ تکلف رہنے دیں۔“ شہید احمد اٹھنے لگا۔

”ملازم دیکھ لیں گے دکان، نئے ملازم تھوڑی ہیں، سب پرانے ہیں۔“ حمیرا بیگم نے ناک سے کھٹی اڑائی اور تکلیف کی کیا بات ہے، جیسے پہلے تھے۔“ ایسے ہی آیا کرو، تمہارا اپنا گھر ہے۔“

”جی۔“ شہید احمد ان کے اصرار اور باتوں کے آگے فقط جی کہہ کر رہ گیا۔ وہ کیا بتاتا کہ عفت کو اس گھر کے کمین کتنے ناگوار گزرتے ہیں۔ مگر خیر عورت ذات ہونے کی حیثیت سے، ایک بیوی ہونے کی حیثیت سے یہ اس کا حق تھا کہ وہ اپنے حقوق کی

حفاظت کے لیے چوکنا رہتی مگر کبھی حد سے زیادہ احتیاط اور بے جا شکوک و شبہات زندگی اور تعلقات کے خوب صورت رنگوں میں بھنگ ملا دیتے ہیں۔

شہزادے کو دودھ دے کر مہربانو کباب تنے لگی، چائے اور کباب کی خوشبو فضا میں مہک رہی تھی۔ اس نے چائے اور دیگر لوازمات لاکر میز رکھے اور خود چپ چاپ صوفے پر بیٹھ گئی۔ قریب رکھی چھوٹی سی کرسی پر اس کا بیٹا بیٹھا دودھ پی رہا تھا۔ شہید احمد خاموشی سے کباب اٹھا کر کھانے لگا۔ بھی وہ وقت تھا کہ بے تکان اور لگاتار باتیں کیا کرتے تھے دونوں، اب مخاطب کرنے کے لیے کوئی موضوع ہی نہیں مل رہا تھا۔

”ماموں..... آرزو پتا نہیں کب کمرے سے نکل کر آئی تھی۔ بال بکھرے ہوئے، سوئی سوئی خمار آلود آنکھیں۔“

”ارے میرا بیٹا۔“ شہید احمد نے اسے گود میں بٹھالیا۔

”ماموں کو اپنا نام بتاؤ۔“ دادی نے ہدایت کی۔ ”گوگو“ وہ ابھی چھوٹی تھی اپنا پیار کا نام گگو ٹھیک سے ادا نہیں ہوتا تھا۔ بڑے پیارے اور بھولے انداز میں گوگو کہتی تھی۔ گھر میں سب یہی سوال بار بار اس سے کرتے تھے اور اس کا جواب انجوائے کرتے تھے۔

اب بھی اس کی تو تلی زبان سے گوگو سن کر سب ہنس پڑے۔

”کھانا کھا کر چلے، جاتے؟“ جائے پی کر شہید احمد نے جانے کے لیے پرتو لے تو حمیرا بیگم بولیں۔

”پھر کبھی سہی۔“

”اچھا پھر ایسا کرو کل رات کا کھانا یہاں کھا لینا، عفت اور عاطف کو بھی لے آنا۔“ حمیرا بیگم کے آگے بچھی بچھی جا رہی تھیں۔ شادی کے بعد تو شمینہ اور عفت نے اس کی لگا میں ایسی کسی تھیں کہ وہ یہاں کا رخ بھی بھول گیا تھا۔

”جی اچھا۔“ شہید احمد کو دکان پہنچنے کی جلدی تھی، سب کو جلدی جلدی خدا حافظ کہہ کے، عظمیٰ کو ایک بار پھر پوچھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر وہ گھر سے

نکل آیا۔

پتا نہیں مہربانو کے ساتھ زندگی نے، قسمت نے ایسا سنگین مذاق کیوں کیا؟ مہربانو کا اداس حسن بار بار نظروں میں آ رہا تھا۔ اس کا سوگوار چہرہ شہید احمد کو ایک الجھن بلکہ اذیت میں مبتلا کر رہا تھا۔

رات میں کھانا کھانے بیٹھا تو اس کا دماغ منتشر تھا۔ اس نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ میز پر اس کے پسندیدہ کوفتوں کی ڈش بھی موجود تھی۔ اس نے ماش کی دال پلیٹ میں نکالی اور کھانا شروع کر دیا۔ جس پر اس کی پہلی نگاہ پڑی تھی۔

”آج دن بھر کہاں تھے؟ دوبار ملازموں کا فون آیا تھا گھر پر، سامان کی ڈیلوری آئی ہوئی تھی اور آپ غائب تھے۔“ عفت نے اچانک ہی سوال کیا تھا۔

”عظمیٰ کو ڈاکٹر کے پاس لے گیا تھا۔ بیمار ہے وہ۔“ شہید احمد نے گڑبڑائے بغیر آہستہ سے جواب دیا۔

”اس کا شوہر نہیں لے جاسکتا؟ آپ کی ذمہ داری ہے یہ؟“ عفت کا منہ بن گیا۔

”ارسلان آفس میں تھا۔“

”ساس تو ہیں۔ وہ لے جاتیں۔“

”میری بہن ہے وہ، مجھے بلا لیا تو کیا ہوا؟“ شہید احمد چھوٹے چھوٹے نوالے لیتا ہوا کسی سوچ میں گم تھا۔

”وہاں جانے سے ہوا یہ کہ آپ کو اپنے سامنے کی نہ چیزیں نظر آتی ہیں نہ انسان۔“ عفت نے ایک ایک لفظ چبا کر کہا اور اس کے سامنے کوفتوں کا ڈونگا تقریباً ہی دیا۔

”یہ آپ کے لیے بنائے تھے، آپ نے دال کھانا شروع کر دی، جو آپ کو پسند بھی نہیں۔“

”نا پسندیدہ چیزوں کو بھی، قبول کر لینا چاہیے۔“ نہ جانے کیسے شہید احمد کے منہ سے نکلا۔

”اوہ، جیسے آپ نے کیا ہے، اپنی ماں کی پسند کو قبول کر کے؟“ عفت کا لہجہ انتہائی کنٹریلا تھا۔ وہ آج تک اس احساس کمتری سے باہر نہیں نکلی تھی کہ وہ شہید احمد کی پسند نہیں مجبوری تھی۔ ”مجبوری“ کی اختراع

بھی اس کے دل و دماغ نے خود ہی گھڑی اور اسے پال پوس کر بڑا ہی کرتی گئی۔

”پتا نہیں کیوں تم ہر وقت لڑائی جھگڑے پہ تلی رہتی ہو۔“ شہید احمد نے پلیٹ میں کوفتے نکالتے ہوئے بے بسی سے اسے دیکھا۔

”کچھ دیکھتی ہوں، سوچتی ہوں تب ہی بولتی ہوں، کوئی پاگل نہیں ہوں میں۔“ شہید احمد نے خاموشی کو غنیمت سمجھا اور اختیار کر لیا۔ ورنہ وہ یہ سوال بھی پوچھ سکتا تھا کہ وہ کیا دیکھتی ہے یا کیا دیکھا ہے اس نے، جو وہ ”کچھ“ سوچنے پر مجبور ہوئی ہے۔ سر جھکائے سکون سے وہ کھانا ختم کرتا رہا۔ پانی پی کر اس نے عفت کی طرف دیکھا اور اسے مخاطب کیا۔

”کل حمیرا پھپھو نے ہمیں رات کے کھانے پہ بلایا ہے۔“

”کس خوشی میں؟“ عفت نے انتہائی کڑوے لہجے میں کڑوا سوال کیا تھا۔

”رات میں تیار رہنا، جانا ہے۔“ شہید احمد نے اس کا سوال فضول سمجھ کر نظر انداز کیا اور شوہرانہ استحقاق کے ساتھ حکم جاری کیا۔

”میری جوتی بھی نہ جائے وہاں۔“ عفت بھڑک اٹھی۔

”تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے؟ ہوا کیا ہے آخر؟ ان لوگوں سے کیا تکلیف ہے تمہیں؟“ شہید احمد کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ ”میری بہن کے لیے بھی تم اس گھر کے دروازے بند کرنا چاہتی ہو اس کے ساتھ تمہارا رویہ.....“

”کان بھر دیے بہن نے؟“ عفت نے سلگتی ہوئی نگاہوں سے شوہر کو دیکھا، جو کبھی اسے بہت اجنبی اور خود سے دور محسوس ہوتا تھا۔

”سیدھی سی بات یہ ہے کہ مجھے عظمیٰ کا سسرال بالکل پسند نہیں اور پھپھو (شمینہ) بھی یہی تاکید کرتی تھیں کہ ان لوگوں سے دور رہو اور ویسے بھی آپ کی امی تو اتنا میل ملاپ نہیں رکھتی تھیں ان لوگوں سے، پھر آپ کیوں اتنا گھٹتے ہیں؟“

سنبل اپنے مقابل کھڑی لڑکی کو نگاہوں سے تصور مٹائے جا رہے تھے۔ سنبل نے اپنے چاہ سے ٹٹول رہی تھی۔ موازنہ اور رقابت آہستہ آہستہ اپنی بسائے گھر کو ایک ترازو میں بدل دیا تھا۔ جہاں ایک جڑیں پھیلائے ہوئے سنبل کے ذہن سے منصفی کا پلڑے میں وہ خود بھی اور دوسرے میں اس نے اس

سنبلہ عمیر

آہستہ



”میری پھپھو کا گھر ہے وہ، آج سے نہیں، شروع سے ہی آنا جانا ہے میرا۔“

”تو یہ آنیاں جانیاں کب تک جاری رہیں گی؟ آج آپ جائیں گے، کل کو مہربانو یہاں آئے گی، مجھے تو آج تک نہ آپ کی پھوپھی سمجھ آئیں نہ ان کی بیٹی، اپنا گھر تو برباد کر چکی ہے اب لگتا ہے کہ دوسرے کا گھر برباد کرے گی۔“ عفت کے اندر جو کینہ اور بغض بھرا ہوا تھا، باہر آ رہا تھا۔

”بکو اس مت کرو، تمہیں نہ کسی کی عزت کرنا آتی ہے نہ اپنی کروانی۔“ شہید احمد رنج کے مارے زیادہ بول بھی نہیں سکا۔

جب سے شمیمہ بیگم کا انتقال ہوا تھا۔ عفت کی زبان کچھ زیادہ ہی چل پڑی تھی۔ وہ خود ہی سوچ سوچ کے رائی سے پہاڑ بنا لیتی اور پھر اس پہاڑ کے بوجھ تلے شہید احمد کو بھی پیستی اور خود بھی روتی کراہتی۔

اسے معلوم نہیں تھا یا شاید اندازہ نہیں تھا کہ بعض الزامات ایسے ہیں جنہیں کبھی بھی مرد سچ بھی ثابت کر دیتا ہے محض اس ضد میں کہ اس پہ الزام لگایا کیوں گیا۔ بار بار شکوک و شبہات کا اظہار کرنے سے ہر مرد ہر بار اپنی صفائی پیش نہیں کرتا یہ اس کی انا اور مردانگی کے خلاف ہے۔ وہ اپنی شان پھر اس میں سمجھتا ہے کہ اس شک کو سچ ثابت کر دے تاکہ عورت کو نیچا دکھایا جا سکے۔ عفت اپنی زبان کے تیر چلا چلا کر اسے اکسار ہی تھی کہ وہ اس راستے پہ قدم رکھے اور چلے، جس کے بارے میں وہ سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا۔

”تم تیار نہیں ہو میں؟“ رات میں وہ واپس آیا تو عفت اسی گھر کے حلیے میں پھر رہی تھی۔

”کھانا لگا رہی ہوں، ہاتھ منہ دھو کر آجائیں۔“ عفت نے اس کا سوال یوں نظر انداز کیا جیسے سنائی نہ ہو۔

”کس پاگل عورت سے واسطہ پڑا ہے؟“ شہید احمد بے بسی سے اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

”تمہیں بتایا تھا کہ آج پھپھو نے کھانے پہ بلایا ہے۔“

”کوئی جھوٹے کو بلائے تم سچے کو دوڑ پڑتے

”ہو۔“ عفت نے ایسی مضحکہ خیز نظروں سے اس کا مذاق اڑایا تھا کہ اپنے دل میں اٹھتے اشتعال کو اس نے بمشکل دبایا ورنہ دل تو یہی چاہ رہا تھا کہ اس عورت کی اس زبان کو ہی کاٹ دے جس سے وہ زہر اگلتی ہے۔

”تمہیں نہیں جانا تو عطف کو تیار کر دو۔“ شہید احمد نے اس پاگل عورت سے نہ الجھنے کا فیصلہ کیا۔

”جہاں میں نہیں جاؤں گی وہاں میرا بیٹا کیسے جائے گا؟“

”وہ صرف تمہارا نہیں میرا بھی بیٹا ہے۔“

”اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اسے لے جا کر دوسری عورت کی جھولی میں ڈال دو۔“ عفت کی اکڑ ختم ہو رہی تھی نہ طنطنہ۔

شہید احمد کے سینے میں وہ آگ بھڑک اٹھی جو عفت کی زبان بھڑکار رہی تھی، اس نے قہر آلود نگاہوں سے اس الٹی کھوپڑی کی عورت کو دیکھا اور بولا۔

”میں اپنا بیٹا کیوں کسی کی جھولی میں ڈالوں گا، اس کی گود پہلے ہی بیٹے سے بھری ہوئی ہے۔“

”دیکھا! تمہارے دل میں کھوٹ تھا نا، زبان پہ آہی گیا۔“ عفت ایسی بھڑکی کہ اس کے ہاتھ شہید احمد کے گریبان تک پہنچ گئے۔

”پیچھے ہٹو پاگل عورت۔“ شہید احمد نے ایک جھٹکے سے گریبان چھڑا کر اسے پیچھے دھکا دیا۔

”تیرے دل میں شک ہے نا اور میرے دل میں کھوٹ، اب دیکھنا، ان دونوں کو سچ کر کے دکھاؤں گا۔“ وہ فیصلہ اس کی شرارے اگلتی آنکھوں اور غم و غصے سے بھرے دل سے نکلا تھا۔

عفت نیچے گری ہوئی پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کا یہ روپ پہلی بار دیکھ رہی تھی۔

☆

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

لڑکی کو لا بٹھایا تھا۔ اپنے دلائل سے اپنے پلڑے کو وزنی کرتے ہوئے وہ بھول رہی تھی کہ ترازو کی رسی اس نے اس مرد کے گلے میں باندھ دی تھی جس سے محبت کے ان دونوں کے بلند و بانگ دعوے تھے۔

نوبیا ہٹا لڑکی کی بھری کلاں چھلتا دمکتا لباس اور جگمگاتے چہرے کو دیکھ کر سنبل کو ناگواری محسوس ہوئی پھر جب اس کی نظر تہام بناؤ سنگھار کوٹھلی اس کی آنکھوں پر آ کر ٹھہری تو وہ ٹھٹھک گئی۔ وہاں اس کا اپنا عکس تھا۔ اتنا اجنبی کہ وہ پہچان نہ پائی۔ سنبل جس کے ہاتھ کے ٹٹھے پکوان دور دور تک مشہور تھے۔ اپنے ہی چہرے کی کڑواہٹ دیکھ کر گڑبڑا گئی۔ اس عکس میں اس کا حال تو قید تھا ہی مگر اس سے کہیں نمایاں اس کا ماضی تھا جو آج اس پر نئے سرے سے عیاں ہوا تھا۔

☆☆☆

وہ بھی ایسی ہی ہوا کرتی تھی۔ کم عمر، زندگی سے بھرپور، ایسی ہی ادا سے مسکراتی اور ناز سے قدم دھرتی تھی۔ خوب صورت تو وہ بھی ہی پھر اپنی خوب صورتی سنوارنے کے لیے اس کے پاس دولت اور ذوق دونوں ہی بہت تھے۔ جب ایک بڑے سے کئے سے اس کے لیے رشتہ آیا جہاں ایک ہی تین منزلیں گھر میں سب دیورائیاں، جھٹائیاں ایک ساتھ رہتی تھیں اور لان میں درجن بھر مٹی جلتی صورتوں کے بچے طوفان مچاتے پھرتے تھے تو کسی کو ایک آنکھ نہ بھایا۔

کوئی بھی نازوں ملی سنبل کو اس خیال پورے میں بیاہنے پر راضی نہ تھا جہاں گن کر روٹیاں پکتی تھیں۔ پھر سنبل کے ابا نے گھر کے بڑوں کو بٹھا کر تصویر کا نیا رخ دکھایا۔ خاندان بہت امیر نہ سہی لیکن کھانا پیتا اور شریف تھا۔ لڑکا تو خاندان کا سب سے ہونہار سپوت تھا گویا ہیرا تھا۔ بہت بڑی کمپنی میں انجینئر تھا اور ملازمت کے سلسلے میں دوسرے شہر میں مقیم تھا۔ ابا نے انگلی اٹھا کر سب کو نصیحت کی کہ گمان پر فیصلہ ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔ اس لیے روایتی انداز میں

بات چل پڑی۔

لڑکے والے سنبل کو دیکھنے آئے تو ایک گاڑی سے اتنی سواریاں نکلیں کہ پورا کرا بھر گیا۔ جب لڑکی والے احمد کو دیکھنے گئے تو ایک بندے کی آؤ بھگت میں چار چار بندے لگے ہوئے تھے جو منٹ منٹ بعد لوازمات کی پلیٹیں لا کر پیش کرتے رہے اور اپنی ملنساری سے ان کو سیر کر کے بھیجا۔ پھر بھی اطمینان کرنے کے لیے سنبل کے ابا دوسرے شہر جا کر احمد کا اصل ٹھکانا اور ٹھاٹھ باٹھ دیکھ کر تسلی کر آئے اور پھر ہامی بھری۔

منگنی کی تقریب میں اتنے بچوں نے دہن بنی سنبل کے ساتھ جڑ جڑ کر تصاویر بنوائیں کہ اگر سب کے نام بغیر وقفے کے بولیں تو یوں لگے کہ کلاس میں استانی حاضری لے رہی ہے۔ کئی رشتہ داروں نے لمبا چوڑا سسرال دیکھ کر سنبل کو ڈرانا چاہا مگر وہ نہ ہی سسرال والوں کی طرف سے کسی بدگمانی کا شکار ہوئی نہ ہی احمد کی طرف سے کسی خوش فہمی میں مبتلا ہوئی۔ اس لیے شادی کے بعد احمد کو توقع سے بھی بہتر پا کر اسے اپنے ابا کے فیصلے پر ناز ہوا۔

احمد سب سے چھوٹا بیٹا تھا جو پہلے پڑھائی پھر نوکری کے باعث گھر میں مسافروں کی طرح ہی رہتا تھا۔ سنبل پر بھی زیادہ ذمہ داریاں نہ تھیں کیونکہ گھر کا نظام ان دونوں کے بغیر بھی ملل تھا۔ البتہ گھر کے خرچ میں احمد کی تنخواہ کا پلڑا ہی سب سے بھاری تھا۔

بڑے گھر سے آنے والی سنبل کی تعلیم اور حسن کا پہلے ہی گھر والوں پر رعب تھا۔ جب اس رعب میں اس کے اخلاق کی خوشبو اور خلوص کی چاشنی ملی تو دونوں میں اس نے سب کا دل موہ لیا۔ ساس صاحبہ کا کمرہ پہلی منزل پر تھا اور سنبل کو تیسری منزل کا کمرہ ملا تھا جہاں احمد کے کالج کے دنوں کی کتابیں بھری ہوئی تھیں۔ جب رات کو لائٹ جاتی تو گرمی سے اکتا کر وہ اور احمد چھت پر بیٹھ کر کسوٹی کھیلنے لگتے۔ شخصیت یوچنے میں تو پندرہویں سوال کی نوبت بھی نہ آتی لیکن

غلطی سے کوئی واقعہ پوچھ لیتے تو سوال پوچھ پوچھ لاڈ لے ہونے لگتے۔

”باقی کرہ ارض تو میں نے چھان لیا ہے۔ اب یا تو تمہارے خاندان کا واقعہ ہے یا میرے خاندان کا۔“ احمد رنج ہو کر کہتا۔

”اب آپ کا اور میرا خاندان ایک ہی ہے۔“ سنبل لاڈ سے یاد دلاتی۔

”ابھی نہیں ہوا لیکن جلد ایک ہو جائے گا۔“ شریعت اور قانون سے جڑے تعلق خونی رشتوں پر بھی فوقیت نہیں پاسکتے۔ اس لیے احمد یہی سوچتا تھا کہ جب ان کی اولاد ہوگی تو وہ دونوں طرف کا خون ہوگی۔ وہی حقیقی معنوں میں دونوں خاندانوں کو جوڑے گی۔

شادی کے ابتدائی دن سسرال میں رسم و رواج کی طرح ہی گزرے۔ صبح سنبل کلاںیاں بھر بھر چوڑیاں پہن کر تیسری منزل سے چھن چھن کرتی اترتی دوسری منزل پر پھلی جھٹائی کو سلام کرتی ان کے بچوں کو پچکاری پھر پہلی منزل پر بڑی جھٹائی کو اپنے کپڑے دکھاتی، تعریف بھرتی اور پیار لینے کے لیے ساس کے کمرے میں جا بیٹھتی۔ سارا دن بچے اسے گھیرے رہتے۔ جب اس کے ہاتھوں کی مہندی ہلکی ہوئی تو انگریزی طرز کا تہوں والا میٹھا بنا کر بچن کی بسم اللہ کی نت نئے اجزاء والی تہوں کے اس میٹھے کا نام آدھے لوگوں کے منہ پر نہ چڑھا پر ذائقہ سب کو ایسا بھایا کہ بار بار پیالی بھر کر کھایا۔

مہندی اترنے سے پہلے ہی وہ احمد کے ساتھ رخصت ہو کر دوسرے شہر چلی گئی جہاں اسے کمپنی سے ایک آراستہ گھر ملا ہوا تھا۔ وہاں بیشتر افراد ان ہی کی طرح دوسرے علاقوں کے تھے۔ اس لیے سلوک سے ایک فیملی کی طرح رہا کرتے تھے۔ جلد ہی ان کے احباب میں مسز احمد اپنی شوخی، خلوص اور باتونی طبیعت کی وجہ سے رنج بس گئیں۔ پہلے نئے نئے جوڑے کی دعوتوں کا اہتمام ہوا۔ جب وہ رسم نپٹی تو شکر گزاری کے طور پر احمد اور سنبل نے ملنے والوں کو

دعوت پر مدعو کیا۔ پر تکلف اہتمام سے زیادہ لوگوں کو میاں بیوی کا بے تکلف انداز محفوظ کر رہا تھا۔

”روسٹ تو بے حد لذیز ہے۔“ ایک خاتون نے تعریف کی۔

”مجھے روسٹ بنانا نہیں آتا۔ یہ تو میس کے خانساں تو صیف سے بنوایا ہے۔ احمد نے خود کھڑے ہو کر بنوایا ہے۔“ اس نے بلا جھجک اقرار کیا۔

”لیکن نان تو تو صیف کے ہاتھ کے نہیں لگ رہے اس کو نرم کہو تو کچا چھوڑ دیتا ہے۔ خستہ کہو تو پا پڑنا دیتا ہے یہ تو بالکل مناسب ہیں۔“ کسی اور نے لقمہ لیتے ہوئے کہا۔

”تو صیف نے ہی بنائے ہیں۔ اچھے اس لیے بنے ہیں کیونکہ احمد نے خود کھڑے ہو کر بنوائے ہیں۔“ سنبل فخر سے بولی۔

”ہم تو میٹھے کے شوقین ہیں ہماری پسند تو یہ رینبو (Rainbow) ٹرائفل ہے۔“ احمد کے دوست نے ٹھنڈا ٹھارڈونگا اپنی طرف کھینچا۔

”ہاں احمد نے خود کھڑے ہو کر بنوایا ہے۔“ بے خیالی میں بول کر سنبل ایک دم ٹھکی۔ ٹرائفل تو اس نے خود بنایا تھا اور وہ واضح طور پر گھر کا بنا ہوا نظر آ رہا تھا۔ سب ہی اس کی زبان کی پھسلن پر ہنس پڑے۔

”تو گویا احمد صاحب بچن میں آپ کی نگرانی بھی کرتے ہیں۔“

سنبل جھینپ کے چپ ہو گئی۔ بڑے عرصے تک ان کے جاننے والوں میں یہ جملہ یاد رکھا گیا۔ جب بھی کسی کو اس بات پر زور دینا ہوتا کہ کوئی کام بہت محنت اور لگن سے کیا گیا ہے۔ تو اقوال زریں کی طرح بولتے کہ احمد نے خود کھڑے ہو کر کر دیا ہے۔

اس نوبیا ہٹا جوڑے کے لاڈ دوسروں کی نسبت زیادہ اٹھائے گئے اور زیادہ دیر تک اٹھائے گئے۔ کیونکہ ان کی ناز برداریاں بانٹنے کے لیے کوئی اولاد نہ آئی۔

پانچ سال تک سنبل اپنی باتوں کے تڑکے اور ہاتھوں کے میٹھے بنا بنا کر احمد کی زندگی میں لذت بھرتی

رہی۔ جب ناز برداریاں کرنے والوں نے سوال جواب شروع کیے تو زندگی کے ذائقے مدھم ہونے لگے۔ علاج معالجے نے بھی کوئی افادہ نہ کیا۔ الٹا مایوسی کی بجائے ان کی زندگی میں شامل ہو گئی۔ سنبل نے وقت گزاری کے لیے ایک اسکول میں نوکری کر لی۔ دن بھر شرارتی، پھرتیلے بچوں میں گھری رہ کر جب گھر آتی تو اپنا سلیقے سے سجا سجا یا گھر دیکھ کر کوفت ہوتی۔ قیمتی سجاوٹی اشیاء میزوں پر دھری تھیں۔ قالین پردے سب بے داغ تھے۔ یہ سب اسے اب مصنوعی اور بے رونق لگنے لگا تھا۔ جس دن دل زیادہ دکھتا، وہ کمر باندھ کر بچن میں احمر کے لیے کچھ میٹھا بنانے کھڑی ہو جاتی۔ اب تو وہ حلوؤں کی کئی قسموں میں بھی ماہر ہو گئی تھی۔ کئی سالوں تک وہ یوں ہی زندگی کا پھیکا پن اپنے ہاتھوں کے بنے بیٹھے سے بدلنے کی کوشش کرتے گزار گئی۔

☆☆☆

لاکھوں میں تنخواہ لینے والے بڑے بڑے عہدوں پر فائز افسر بھی سال میں کم از کم ایک دفعہ اسکول کی سادہ سی نوکری کرنے والی نیچر کو حسرت سے ضرور دیکھتے ہیں اور وہ گرمیوں کی چھٹیوں کا وقت ہوتا ہے۔ سنبل عید، بقرعید میں فرض کی طرح سسرال جاتی تھی۔ اس کے علاوہ بھی کوئی تقریب ہو تو موقع سے دو تین ہفتے پہلے ہی پہنچ کر تیاریوں میں مدد کروانی تھی۔ گھر والے اس کی پسند اور انتظامات کے ہمیشہ سے قائل تھے پھر بچے بھی سنبل چاچی سنبل چاچی کی گردان کرتے نہ تھکتے تھے۔ وقت گزرتا رہا۔ وہ وہیں ٹھہر گئی۔ ارد گرد سب کچھ بدلنے لگا۔ بچے بڑے ہونے لگے۔ ان کی مصروفیات تبدیل ہونے لگیں۔ ان کے نئے روز و شب میں ماں باپ بھی ثانوی کردار بن گئے تھے تو چاچی کی گنجائش مزید کم ہو گئی تھی۔

تقاریب تو اب بھی چاچی کی بے ساختہ گفتگو اور رونق کے بغیر ناممکن تھیں۔ مگر ان کے پہلے کے

انتظامات میں گھر کے پہلے کے بچے اور اب کے جوانوں کی ہی مرضی چلتی اور بعد کے معاملات تو پہلے ہی ان کے والدین بہت اچھے سے سنبھالتے تھے۔ جب بڑی جھٹائی کی بیٹی کی منگنی ہوئی تو احمر اور سنبل نے زیور اور جوڑے دیکھے۔ رشتہ داروں کی تفصیل پوچھی پھر بھی فراغت کا بہت وقت مل گیا۔ جب سنبل کا رشتہ طے ہوا تھا تو اس کی چھوٹی بہن نے شرارت سے کہا تھا۔

”آپی! جب ہم آپ سے ملنے آیا کریں گے تو لان میں اودھم مچاتے بچوں کی فوج میں سے آپ کا بچہ کیسے پہنچائیں گے۔“

اب وہ لان خالی پڑا تھا۔ اس کی ویرانی پر سنبل شرمسار ہونے لگی۔ وہ گھاس پر ٹپکتے ٹپکتے چھٹی سمت نکل آئی جہاں اس کی ساس کے کمرے کی کھڑکی کھلتی تھی۔

”اولاد تو ایسی نعمت ہے جس کی طلب سے انبیاء کو بھی انکار نہیں۔ کیا حضرت زکریا علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے گڑگڑا کر خدا سے اولاد کی دعا نہیں مانگی۔ تم خود کو کیا سمجھتے ہو؟ جو اولاد کے بغیر خوش رہنے کے دعوے دار ہو؟“ اندر سے اس کے بڑے جیٹھ کی آواز آئی یعنی کمرے میں پہنچایت لگی تھی۔

”میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ میں انصاف نہیں کر سکوں گا۔ آٹھ سال ہو گئے ہیں ہمارے ساتھ کو میں، سنبل سے راستہ الگ کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔“ احمر نے بہت مستحکم آواز میں جواب دیا پھر بھی سنبل کے قدم لرز گئے۔

”سنبل ہمیں بھی عزیز ہے لیکن ہم نے ثوبیہ کا انتخاب بھی بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ ایک کو یہاں رکھو۔ ایک کو وہاں۔ شرعاً اور قانوناً تمہیں حق ہے۔“

اس مختصر سی محفل میں جذباتی پن، دلیلیں اور حکم ہتھیار بنے ہر سمت سے احمر پر حملہ آور تھے اور اسے دوسری شادی پر رضامند کرنے کی جان توڑ کوشش کر رہے تھے۔ یہ جنگ ان دونوں کی تھی مگر لڑا احمر تنہا رہا تھا۔ سنبل گھر والوں کی ہر دلیل پر لمحہ بھر کوسن ہوئی مگر

احمر کے جواب پر تو گویا برف بن جاتی۔ وہ وفادار محبت کرنے والی بیوی تھی مگر سب بیویاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ وہ فرمائشیں بھی کرتی تھی لڑتی بھی تھی۔ اس میں تو کچھ ایسا خاص نہ تھا جو احمر اپنے خاندان سے اس کے لیے لڑ پڑا اور انکار کر کے سرخرو ہو کر نکلا۔

سنبل آٹھ سال سے اولاد کے لیے دعا گو تھی۔ اس رات بھی اس نے رورو کر دعا کی مگر اپنی نہیں احمر کی اولاد کی۔ وہ اس شخص کو اولاد کی خوشی دینا چاہتی تھی جو اس کی ڈھال بنا کھڑا رہتا تھا اور محرومیوں کا چرچا بھی نہیں کرتا تھا۔ اس لیے سنبل کو گمان بھی نہ ہوا کہ وہ بھی ادھورا پن محسوس کرتا ہے۔ وہ اسے مکمل دیکھنا چاہتی تھی اور کہیں یہ آرزو بھی تھی، کہ وہ ہی اس کو اولاد کی خوشی دے مگر دعا کے اس حصے پر آ کر اس کی زبان میں لڑکھڑاہٹ پیدا ہونے لگتی تھی۔

احمر نے سنبل پر ظاہر نہ ہونے دیا کہ اس کے گھر والے اس پر کس قسم کا دباؤ ڈال رہے ہیں۔ سنبل کا دل تقریباً ہی رونقوں سے اٹھ گیا تھا۔ احمر حج کہتا تھا کہ اس کا اور سنبل کا خاندان ابھی ایک نہیں ہوا اور اس کے ایک ہونے کے آثار بھی نہیں تھے۔

منگنی کی تقریب میں بہت زیادہ لوگ نہیں تھے۔ اس لیے جب اس کی جھٹائی نے ایک چھوٹے قد کی درمیانی صورت لڑکی کو دیکھ کر اپنی سمت بلایا تو سنبل کے کان کھڑے ہو گئے۔

”امی! یہ ثوبیہ ہے۔ ہماری ہمسائی فرحت آنٹی کی بھانجی، کچھ مہینوں سے ان کے پاس آگئی ہے۔“ اس کی جھٹائی نے یوں تعارف کروایا جیسے نام کے علاوہ باقی تفصیل صرف مروت ہو یعنی بات ہر سمت پھیل چکی تھی۔

سنبل نے غور سے اس کا بناؤ سنگھار دیکھا۔ ایک ایک چیز پر توجہ دی گئی تھی۔ وہ بہت خوب صورت نہیں تھی مگر کم عمر تھی اور بھوپن کی چمک اس کو پرکشش بنا رہی تھی۔ اس محفل میں سنبل اکیلی نہیں تھی جو احمر کی ستائشی نظروں کی خواہاں تھی۔ بٹوارے کی ابتداء ہو چکی تھی۔ پورے فنکشن میں وہ شاکی نظروں سے ٹٹولتی

رہی کہ کوئی اس سے نظر بچا کر ثوبیہ اور احمر کی ملاقات نہ کروادے۔ احمر مردانے میں ہوتے ہوئے بھی اس کی نظروں کے حصار سے دور نہ گیا۔ رسم و رواج کے بعد کھانا لگا تو سب کی نشستیں بدل گئیں۔ احمر پلیٹ تھامے کسی رشتہ دار سے گفتگو کر رہا تھا۔ مگر ثوبیہ اور دوسری لڑکیاں اندر کمروں میں جا بیٹھی تھیں۔ وہ خطرہ ٹل جانے پر سکون کا سانس لے کر خود بھی کھانے لگی۔

”میں تو بس یہی دعا کرتی ہوں میرے بچے اور ان کے بچے جتنے فرماں بردار ہیں۔ اللہ ان کے نصیب اتنے ہی اچھے کرے۔“ اس کی ساس تعریفیں بٹور رہی تھیں اور دعائیں نچھاور کر رہی تھیں۔

اچانک سنبل کی جھٹائی کی بیٹی نے دادی کے کان میں آ کر کچھ کہا تو وہ سنجیدہ ہو کر فوراً اٹھ گئیں اور اس کمرے کی طرف بڑھیں جہاں ثوبیہ اور باقی لڑکیاں بیٹھی تھیں۔

سنبل کو اپنا دل بیٹھتا محسوس ہوا اس سے رہا نہ گیا آدھے کھانے کی پلیٹ وہیں دھر کے وہ بھی پیچھے ہوئی۔ پہلے وہ دروازے سے ہی داخل ہونے لگی مگر یہ سوچ کر رک گئی کہ اس کو آتا دیکھ سب ہی چپ ہو جائیں گے۔ نہ ثوبیہ نمبر بنائے گی نہ جھٹائی چاچوسی کر کے ثوبیہ کی راہ ہموار کرے گی۔ اس لیے قدم روک کر باہر سے ہی کان لگا کر سننے لگی۔

”آنٹی! کوئی کام ہے تو مجھے بتائیں۔ میں آپ کے گھر کا فرد ہی تو ہوں۔“ ثوبیہ نے انہیں تیزی سے آتا دیکھ بڑھ کر خدمات پیش کیں۔

”نہیں بیٹا! وہ تو میں ملنے ملانے میں اس قدر بوکھلائی ہوئی تھی کہ خبر ہی نہ ہوئی، میرا زار بند لٹک رہا تھا۔ ابھی بچی نے بتایا۔ نظر کے ساتھ عقل بھی کمزور ہو گئی ہے۔“ وہ سادگی سے شرمندہ ہوئی ہوئی ہاتھ روم میں چلی گئیں۔

دروازے سے ٹپک لگائے سنبل اپنی ہی بدگمانی کی کھودی کھائی میں گرے لگی، وہ ایسی تو نہ تھی۔ اتنی شکی مزاج، بے اعتماد، بے اعتبار اور اسے ایسا بننا بھی

نہیں تھا۔ وہ بچوں کو پڑھاتی تھی اور ان کو بدگمانی مایوسی چغل خوری جیسی عادتوں سے دور رہنے کی جتنی نصیحت کرتی تھی اب اپنے گمان کے باعث خود ان کو اپنے ذہن سے چمٹائے جا رہی تھی۔ اس نے جھرجھری لی جیسے خود سے ان بری عادتوں کو جھٹکنا چاہتی ہو۔ اسے احمر پر بھروسہ تھا اور خود پر بھی وہ ہر قسم کا حالات کے مقابلہ کر سکتی تھی۔ وہ پلٹ آئی مگر تب وہ ناواقف تھی کہ مقابلہ بازی کیسا جان جو کھم کا کھیل ہے۔

اگلے روز اپنی کوفت کو کم کرنے کے لیے اس نے میٹھے میں دودھ دلاری بنائی جو دیسی انداز کا تہہ دار میٹھا تھا۔ اس میں لڑکے والوں کی طرف سے آئے پھل اور چم چم ڈال کر اس کو خوب ڈالتے دار بنایا۔ کچن میں اب بھی استحقاق سے کام کرنا اکثر لوگوں کے منہ کڑوے کر گیا مگر اب اسے احمر کے سوا کسی کی پرواہ نہیں رہی تھی۔ احمر کا وہ پہلے سے بھی زیادہ خیال رکھنے لگی تھی۔ ہر چند دن بعد تفریح کا کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈ لیتی تاکہ فراغت، احساس محرومی جگانہ سکے۔ دو ماہ بعد ہی اس کی ساس کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی۔ اسکول میں امتحانات ہو رہے تھے۔ اس لیے سنبل کے پاس نہ جانے کا مضبوط بہانہ تھا۔

اب سسرال میں اس کا دل نہیں لگتا تھا۔ اس نے احمر کا سامان باندھ کر اس کی ماں کی خیریت کی ڈھیروں دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا۔ احمر کو بھی یہی لگا کہ سنبل کی دعائیں بہت کارگر ہیں کیونکہ جب وہ گھر پہنچا تو اس کی ماں بستر کے بجائے اسٹور میں لوہے کے اسٹول پر چڑھی ٹرنک سے سامان نکال رہی تھی۔

”بھائی نے فون کیا تھا کہ امی کی طبیعت خراب ہے۔ کہیں اپنی ساس کا ذکر تو نہیں کر رہے تھے؟“ احمر کوچ میں اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔

”دل کی تکلیف ہے مجھے ٹانگوں کی نہیں۔“ وہ ان سلی بناری ساڑھی نکال کر اسٹول سے اتر آئیں۔

”اب دل کو کیا ہوا؟“

مجھے نظر نہیں آتا۔“ وہ کمرے کی طرف گئیں تو احمر بھی پیچھے ہو لیا۔

”اب دوبارہ یہ بحث نہ چھیڑیں۔“ وہ ان جھمیلوں سے تنگ آ گیا تھا۔

”نہیں ہوگی بحث، میری طرف سے وعدہ ہے اور تو بھی بحث نہ کرنا۔ کل جمعے کے ساتھ تیرا نکاح ہے۔“

احمر شپٹا گیا مگر وہ ہر طرف سے گھیرا جا چکا تھا۔ نکاح کے تمام انتظامات مکمل تھے۔ اس کی بھانجی اور بھتیجیاں لڑکی کو مہندی، جوڑا سب دے آئی تھیں۔ وہ رشتہ دار جو پیٹ میں بات رکھنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ انہیں دعوت نامے بھی جا چکے تھے۔ ہر کوئی تقریب کے انتظامات میں جتا ہوا تھا۔

احمر نے احتجاج کیا تو ماں نے پہلے یہ کہہ کر چپ کر دیا کہ اب انکار کیا تو گزرے ہوئے باپ دادا کے سر میں خاک جھونکو گے۔“ فرماں برداری تو اس کی رگوں میں دوڑتی تھی۔ بس سر جھکا کر بیٹھ گیا تو ماں نے لاڈ سے سمجھایا۔

”میں نے بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے۔“ ثوبیہ کی شادی ہوئی تھی۔ لڑکے نے پہلے ہی باہر گوری بیاہی ہوئی تھی۔ ماں باپ کی خوشی کے لیے شادی کی اور دو ماہ میں فارغ کر دیا۔ اب اپنی خالہ کے رہ رہی ہے۔ خدمت گزار ہے اور کم پڑھی لکھی بھی۔ جہاں سنبل کا پلڑا تعلیم اور رکھ رکھاؤ سے بھاری رہے گا وہاں اس کا اولاد سے جھک جائے گا۔ دونوں میں برابری کا احساس رہے گا۔ ابھی تو اسے رخصت کروا کر ادھر ہی رکھنا تب تک، جب تک حالات سازگار نہ ہو جائیں۔ مظلوم کو سہارا دینا اللہ کی رضا حاصل کرنا ہے۔“ دین و دنیا و گناہ ثواب، کئی بیڑیاں اس کے قدموں میں ڈال دی گئیں تو وہ بھی ہکا بکا بیٹھا رہا۔

سنبل تو سب کی لاڈلی تھی اور سب کی پسند سے آئی تھی صرف اولاد نہ ہوئی تو وہ دلوں سے کیسے نکل گئی۔ احمر رات اپنے کمرے میں بیٹھا سوچ رہا تھا۔ یہ کمرہ اس

نے پڑھائی کے دنوں میں خود چنا تھا تا کہ سکون سے اوپر پڑھتا رہے۔ جب شادی ہوئی تو اس کی ماں نے کہا۔ نیچے کمرے لو۔ تیسری منزل سے تو پانی پینے کے لیے بھی چائیس سیڑھیاں اتر کر آنا پڑتا ہے۔ احمر اپنے وقتی ٹھکانے کی خاطر بھتیجے کا مستقل ٹھکانا خراب نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے ہنس کر جواب دیا۔

”پہلی سیڑھی پر قدم پڑتے ہی چاپ پورے گھر میں گونج جاتی ہے۔ سب کو خبر ہو جاتی ہے کہ میں آ رہا ہوں۔ چار سیڑھیاں اترتا ہوں تو کوئی مدد کو آ جاتا ہے اور ہر چوٹی سیڑھی پر کوئی نہ کوئی آ کر پوچھتا ہے، کہاں جا رہے ہیں۔ کچھ چاہیے تو ہم لا دیتے ہیں۔ آج تک پانی کا گلاس خود پینے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ آگے بھی نہیں آئے گی۔“

یہی حقیقت تھی۔ ان سیڑھیوں پر آواز بہت گونجتی تھی۔ اس لیے رات کے آخری پہر احمر بہت احتیاط سے اپنا مختصر سامان لیے سیڑھیاں اتر رہا تھا۔ ایک قدم نیچے اترتا تو دل دس دس بار ڈولتا اور اگلے قدم پر وہی دل ملامت کر کے پلٹنے کا کہتا۔ مگر وہ انصاف کرنے والوں میں سے ہونا چاہتا تھا اور منصفی کا تقاضا یہی تھا کہ پہلے سنبل سے کیا عہد نبھائے۔ سنبل پڑے گھر میں چرچہ کرنی سیڑھیاں مدھم قدموں سے اتر کر اس نے بہت ہمت سے چوکھٹ پار کی اور ویران سڑکوں پر واپسی کی راہ ٹوٹا رہا۔ اس کا ہر قدم اسے اصل سے دور کرتا گیا۔

☆☆☆

”امی جی تو ٹھیک ہیں؟“ سنبل دروازے کھولتے ہی گھبرا گئی۔

”میں آیا تو ٹھیک تھیں۔ اب کا حال فون کر کے پتا کروں گا۔“

”اتنی جلدی کیوں آ گئے؟“ وہ اب بھی مشکوک تھی۔

”تم ہی میری منزل ہو، جلد یا بدیر پلٹنا تو یہیں تھا۔“ وہ سنبل کے پیچھے کچن میں ہی آ گیا جہاں سنبل اسٹاف روم کی پارٹی کے لیے کپ کیک بنا رہی تھی۔

”گئے تھے تو دو دن تو رکنا تھا۔“ وہ احمر کو پانی تھا

کر پھر کام کرنے لگی۔

”گھر جاتا تو واپسی ممکن نہ رہتی۔“ وہ اس کو چاہ کر بھی حقیقت نہیں بتا پارہا تھا کیونکہ یہ فیصلہ کرنا دشوار تھا کہ یہ غم بانٹنے سے ہلکا ہوگا یا بڑھ جائے گا۔

سنبل کام میں مگن ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی اور احمر دروازے سے ٹیک لگائے بے ربط تبصرے کرتا رہا۔ جب اوون سے کپ کیک کی پہلی گرم گرم ٹرے نکلی تو سنبل نے ایک ٹکڑا کاٹ کر چکھا۔

”مزے کے بنے ہیں۔“ اس نے دوسرا ٹکڑا احمر کے منہ میں ڈالا۔

”ایچھے تو بننے تھے، ہی احمر نے خود کھڑے ہو کر بنوائے ہیں۔“ وہ بھکی مسکراہٹ سے کہہ کر پلٹ گیا۔ اس میں اپنے گھر والوں کی کمزوری بیان کرنے کی ہمت نہ تھی۔

ایسی باتیں کہاں چھپتی ہیں۔ سنبل کو چند گھنٹے بعد ہی پتا لگ گیا جب لعن طعن اور طیش بھرا فون موصول ہوا اور احمر نے کرب سے اس کا سامنا کیا۔ پھر وہاں گہرا سناٹا چھا گیا۔ واپسی کا وقت گزر گیا تھا۔ جیسے آدم اور حوا نے ممنوعہ شجر سے پھل کھایا تھا اور وہ دونوں جنت سے نکال دیے گئے تھے۔ ویسے ہی یہ احمر اور سنبل بھی اس دنیا کے باسی تھے۔ مشقت کے عادی اور سکون کے متلاشی۔

سنبل نے غموں کی پیوندکاری چھوڑ دی تھی۔ اب وقت بے وقت تفریح نہیں کرتے تھے۔ شادی کی سالگرہ پر بھی خوش ہونے کے بجائے گویا شرمندہ ہونے لگے تھے۔ اس لیے جب ان کی شادی کی نویں سالگرہ آئی تو احمر تاریخ سے آنکھ بچا کر کام بناتا رہا۔ پر جب گھر پہنچا تو بستر پر لیٹی سنبل جھکے سے جاگ اٹھی۔

”مجھے اسپتال جانا ہے۔“ وہ بالوں میں تیز تیز برش کرنے لگی۔

”طبیعت ٹھیک ہے؟“ وہ فکر مند ہوا۔

”ٹھیک ہے، ویسے ہی کام ہے۔“ اس نے بات ٹالنے کی سعی کی۔

”کوئی بیمار ہے؟ کسی کی عیادت کو جانا ہے؟“

احمر کے اوسان خطا ہونے لگے۔
”نہیں، کچھ بھی نہیں جائیں گے۔ تو خود ہی واضح ہو جائے گا۔“ وہ شکی کو الفاظ میں ڈھال کر خوش فہمی کا شکار نہیں ہونا چاہتی تھی۔

احمر سوال پہ سوال کیے گیا اور سنبل نے ادھر سے ادھر جانے کا سلسلہ نہ توڑا تو وہ زچ ہو کر بولا۔
”باقی تو کرہ ارض میں نے چھان لیا ہے۔ اب یہاں تمہارے خاندان میں کچھ واقعہ ہوا ہے یا میرے خاندان میں۔“

”ہمارے خاندان میں۔“ بہت عرصے بعد سنبل نے یہ بات کہی تھی اور سچ کہی تھی۔
شادی کی دسویں سالگرہ سے پہلے خدا نے ان کی جھولی بھردی۔ ان کے بیٹے نے چھٹی سانس لیتے ہی ہر ٹوٹے رشتے کو جوڑ ڈالا۔ ایک بار پھر اس کے سرال میں جشن منایا گیا۔

ساس صاحبہ نے پھر اسٹول پر چڑھ کر ٹرنک کھولا۔ سالوں سے سنبھالے ان سلعے کپڑے نکال کر ننھے سعد کے لیے کئی جوڑے بنوائے۔ سب ایسے ہو گیا تھا جیسے کچھ بگڑا ہی نہ ہو۔

وہ لوگ جو اپنی زندگی کے منفرد ہونے پر اتراتے ہیں، اصل میں خود اس بھیڑچال نما عام زندگی کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ سنبل اور احمر بھی زندگی کی بھیڑچال میں لگ کر خود کو دنیا کا سب سے خوش قسمت جوڑا گردانتے تھے۔

بچے کو پالنا، بڑا کرنا تربیت کرنا، اچھے کام پر انعام دینا، بڑے کام پر سزا دینا۔ بچے کے بارے میں فیصلہ کرتے ہوئے آپس میں الجھنا اور اس کے مفادات کا دفاع کرتے ہوئے دنیا سے جھگڑنا، ان کا معمول بن گیا اور سالوں بیت گئے۔

☆☆☆

اکھوتے ہونہار اور خوب رو بیٹے کی دلہن ڈھونڈنے کے لیے سنبل نے شہر چھان مارا اور جس روز حنا کو منگنی کی انگوٹھی پہنا کر گھر آئی تو اپنی ہی پسند پر ناز ہونے لگا۔
”خوب صورت“ قابل اور رکھ رکھاؤ والی ایسی

ہی لڑکی ہونی چاہیے تھی ہمارے سعد کے لیے۔“ اس نے گردن اکڑا کر احمر سے کہا۔
”ہاں مگر قریب میں کھیر بہت بے ذائقہ تھی۔ تم نے بڑے دنوں سے زردہ نہیں بنایا۔“ احمر کو لگ رہا تھا کہ بہو ڈھونڈنے کے چکر میں سنبل اسے نظر انداز کر رہی ہے۔
”ہاں جس دن وقت ملا بنا دوں گی۔“ سنبل نے مسکرا کر کہا پر اس کو وقت نہیں ملا۔ شادی کی تیاریوں، دعوت ناموں کی تقسیم پھر بہو بیاہ لانے تک اس کو فرصت ہی نہ ملی۔

پھر تب فرصت ملی جب سعد اور حنا گھومنے پھرنے گئے ہوئے تھے تو بارونق گھر ایک دم سناٹے میں گھر گیا۔ پسند کی شادی کرنے والے لڑکے کی ماں کو شراکت داری کا احساس اسی لمحے ہو جاتا ہے جب وہ اپنے بیٹے کی پسند پر نظر ڈالتی ہے۔

اپنی پسند سے بیاہ کر لائی ہوئی بہو تو تب آنکھوں میں کھلتی ہے جب شادی کے چند دن بعد شوہر کے دفتر سے آنے سے چند منٹ پہلے وہ زرق برق کپڑوں میں مہکتی، چوڑیاں کھنکھاتی دروازے کے گرد منڈلاتی ہے، اور بیٹا ہیلا سلام ماں کو نہیں بیوی کو کرتا ہے۔

سنبل پر بھی حسد کی نیل چڑھنے لگی اور اس کو اپنی کیفیت پر اختیار نہیں تھا۔ سعد دفتر سے لیٹ ہو جاتا تو سنبل بے فکر ہو کر کھانا کھا لیتی تھی پر حنا کے ساتھ باہر جاتا تو سنبل کے لیے نوالے حلق سے اتارنا دو بھر ہو جاتا۔ اس کی عمر بھر کی ایک ہی پونجی تھی اس کا بیٹا، وہ اس میں شراکت داری کیسے برداشت کر سکتی تھی۔ چند ہفتوں صبر کے بعد ضبط کا پیانا لبریز ہو گیا۔ گھڑی کی سوئیاں نو سے دس پھر گیارہ بجانے لگیں تو سنبل بھی غصے سے بھرے طعنوں سے لیس تیار تھی کہ اس نئے جوڑے کی بے قاعدگیوں کو لگام ڈالے۔

ان دونوں کے قہقہے گیٹ سے ہی اندر تک آ رہے تھے اور سنبل کھولنے لگی۔ اپنے لا پرواہ انداز میں دونوں مسکراتے ہوئے آگے بڑھے تو حنا، سنبل کے مقابل آکھڑی ہوئی اور سعد دونوں کے بیچ کھڑا تھا۔ سنبل کو حنا کا بناؤ سنگھار روشن چہرہ سب کاٹنے

لگا اور اسی نخوت سے اس نے اس کی آنکھوں میں جھانکا جہاں دنیا بھر کی خوشی کے فریم میں اس کا اپنا ہی تلملانا عکس تھا جس نے سنبل کی نظر زنجیر کر دی۔ یہ ماتھے پر تیوری سجائے، چہرے پر غصہ لیے، غصے سے پھٹ پڑنے کو تیار عورت کیا وہ خود بھی؟

سنبل نے الجھ کر ماحول کا جائزہ لیا۔ وہ گھر نہیں ایک ترازو لگ رہا تھا۔ جس کے ایک پلڑے میں وہ خود تھی اور دوسری میں حنا تھی۔ اب وہ مقابلہ بازی کر کے ثابت کرے کہ سعد کے لیے کون زیادہ اہم ہے تو اس کے نازوں پلے بیٹے کی گردن اس ترازو کے وزن سے ڈول ڈول کر جھک جائے گی۔

سنبل خیال جھٹک کر دو قدم پیچھے ہوئی۔ حنا اپنے انداز میں اپنی تفریح کا قصہ سنار ہی تھی اور سنبل کو کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ پھر سے مقابلہ کرنے لگی تو احساس ہوا۔ اس کا اور حنا کا مقابلہ ہے ہی نہیں۔

ماں اور بیوی دونوں الگ مقام رکھتی ہیں۔ مقابلہ بازی تو تب شروع ہوتی جب احمر اپنے خاندان کے گھیرے میں ہتھیار ڈال کر دوسری شادی کر لیتا۔ تب حنا کی جگہ ٹوبہ ہوتی اور ترازو وزنی کرنے کے لیے سنبل کو بل بل پتھر چننے پڑتے۔ یہ سالوں کی خوش گوار زندگی جو اسے ملی تھی۔ یہ ایسی نہ ہوتی۔ احمر جو زمانے سے اس کے لیے تنہا لڑتا رہا تھا۔ اب بھی کمرے میں تنہا بیٹھا تھا۔ سنبل کو اس پر بے اختیار پیار آیا۔ ایسا پیار جو اس حدیث کی تشریح کر دیتا ہے کہ اگر خدا کے علاوہ کسی کو سجدہ کرنے کا حکم ہوتا تو وہ شوہر ہوتا۔ اس کی زندگی بھر کی پونجی تو اس کا شوہر تھا۔ اس کا سانبان اس کا رکھوالا تو پھر سعد کیا تھا؟

سنبل کو یاد آیا۔ شادی کے پہلے سال وہ رونق کے غرض سے اولاد کی منتظر تھی پھر لوگوں کے سوال اور تجربے کی خواہش سے اولاد چاہنے لگی۔ مگر آخری سال وہ صرف احمر کی اولاد کی دعا کرتی تھی۔ وہ احمر اور اپنے رشتے کو بچانے کے لیے اور اسے مکمل کرنے کے لیے اولاد مانگتی تھی۔

وہ بے خیالی میں حنا کو آرام کرنے کا کہہ پلٹ

گئی۔ ایک بار پھر احمر کی محبت نے اسے بھٹکنے سے روکا تھا۔ وہ کمرے میں آئی تو احمر سو چکا تھا۔ اب وہ جلد تھک جاتا تھا۔ سعد اس کا مضبوط سہارا بننا کھڑا تھا اس لیے وہ جلد بے فکر ہو کر سو سکتا تھا۔ سنبل مسکرانے لگی۔ اس کی زندگی کے دونوں مرد اپنا فرض بخوبی نبھا رہے تھے۔

احمر صبح اٹھا تو سنبل بستر پر نہ تھی اور کچن میں سے آوازیں آرہی تھیں۔ کچن میں پہنچا تو حنا میز پر ناشتہ لگا رہی تھی اور سنبل چوڑے کے پاس دیکھنے کو ڈھک رہی تھی۔

”کیا پک رہا ہے؟“ اس نے بلند آواز میں کہا۔
”زردہ..... آپ بہت دن سے فرمائش کر رہے تھے۔“ سنبل نے مسکرا کر کہا۔

”یہ معجزہ ہی ہے کہ اتنے سالوں آپ کے ہاتھ کے میٹھے کھا کر بھی میں شوگر کا مریض نہیں بنا۔“ اس نے محبت سے مسکرا کر سنبل کو دیکھا۔

معجزہ تو یہ ہے کہ آپ کی زندگی میں میرے بنائے میٹھوں کی جگہ کوئی نہ لے سکا۔“ اس نے سکون سے سوچا اور شکر کیا۔

حنا شرارت سے انہیں دیکھ بے مقصد دور جا کھڑی ہوئی اور مسکرانے لگی۔ نئے نوے جوڑے کو بڑی عمر کے جوڑے کے محبت بے موقع محل ہی لگتی ہے کیونکہ وہ جانتے نہیں کہ زندگی کے جو نشیب و فراز ایک جوڑا ساتھ رہ کر گزارتا ہے اس کے باعث محبت ایک فطری عمل بن جاتی ہے۔

سنبل نے اعتماد سے پلٹ کر احمر کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں اس کا مکمل عکس تھا۔ اپنی زندگی کی کہانی کے علاوہ ان آنکھوں میں ایک معتبر باوفا عورت کی شبیہ بسی تھی جو گھر کو گھر بنانا جانتی تھی اور اسے دوبارہ ترازو میں بھی بدلنے نہیں دے گی۔



حکایت

تالیہ خواب میں فاتح کے سن باؤ والے گھر میں، خود کو ایڈم کے ساتھ خزانہ تلاش کرتے ہوئے دیکھتی ہے۔ فاتح تالیہ سے اپنی فائل کی واپسی کا مطالبہ کرتا ہے اور اسے اپنے گھر آنے سے منع کر دیتا ہے۔ تالیہ کو عصرہ سے پتا چلتا ہے کہ وہ سکے ایڈم کے پاس ہے۔ ایڈم اسے ایک جیولر کو بیچ دیتا ہے۔ تالیہ اس کے حوالے سے اسے الجھا دیتی ہے اور جیولر کو بلیک میل کر کے سکے نکال لیتی ہے، مگر سکے اس کے ہاتھ میں دینے کے بجائے ایڈم اپنے قبضے میں کر لیتا ہے۔

فارض صاحب کے ذریعے فاتح کو عالم کا پتا چلتا ہے۔ فائل کی واپسی کے لیے عالم صبح تک کا وقت مانگتا ہے اور اس منصوبے میں فاتح کو بھی شامل کرتا ہے۔ فاتح اس کی باتوں سے متاثر ہو کر راضی ہو جاتا ہے۔ ایڈم پر سکے کا اسرار کھلتا ہے۔ عالم پتا چلا لیتا ہے کہ فائل اشعر کے آفس میں ہے۔

صبح، تالیہ کو بلیک میل کرنے آتا ہے۔ بازار میں داتن، سمیع کو خوف زدہ کر دیتی ہے۔ عالم جان پہ کھیل کے اگلے روز ہی فائل اشعر کے سیف سے چرا کر لادیتا ہے۔ فاتح، عالم سے بے حد متاثر ہوتا ہے۔

ایڈم کو تالیہ مشکوک لگتی ہے۔ وہ تالیہ کی گردن پہ نشان دیکھتا ہے تو اسے تاریخی کہانی یاد آ جاتی ہے اور وہ سمجھ جاتا ہے کہ تالیہ اس سکے کے پیچھے ہے جو ایڈم کے پاس ہے۔ عصرہ سے فاتح جھوٹ بولتا ہے۔ عصرہ کو فاتح اور اشعر دونوں پہ غصہ آتا ہے۔ فاتح سن باؤ کو بیچنے سے پہلے وہاں ایک دن گزارنے جاتا ہے۔ عصرہ، تالیہ کی فرمائش یہ اسے بھی بلا لیتی ہے۔ فاتح سن باؤ کے گھر کی کہانی سناتا ہے۔ تالیہ اس گھر کے کنویں کو دیکھ کر سمجھ جاتی ہے کہ خزانہ کہاں ہے۔ وہ فاتح سے اس گھر کو خریدنے کی خواہش کا اظہار کرتی ہے۔



باقی ہے۔ وہ دونوں فاتح کو چھوڑ کر فرار ہو جاتے ہیں۔ فاتح کو ایک قید خانے میں منتقل کر دیا جاتا ہے۔ جہاں ایک ”الیہو“ قیدی کے ساتھ براسلوک کیا جاتا ہے۔

قید میں فاتح کو ادراک ہوتا ہے، وہ ماضی میں کسی خاص مقصد سے بھیجا گیا ہے۔ وہ خود کو حالات کے رحم و کرم پہ چھوڑنے کے بجائے ان کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ تالیہ کی ذہانت سے وہ دونوں اپنے اغوا کاروں کو جلے کر بھیس بدل کر شہر میں ہی پھرتے ہیں۔ جہاں تالیہ یہ انکشاف ہوتا ہے کہ وہ خود شہزادی تاشہ ہے اور بندہ ہارا کی بیٹی ہے۔ بندہ ہارا مراد اپنے ساتھیوں سے غداری کر کے انہیں پکڑوا دیتا ہے اور خود بادشاہ سے جو اس کا ماموں زاد ہے مل جاتا ہے۔ تالیہ صدے سے چور ہو کر خزانے کی چابی حاصل کر لیتی ہے اور وقت کا دروازہ پار کر جاتی ہے۔ راجہ مراد، تالیہ کو اپنی بیٹی تاشہ کی حیثیت سے تسلیم کر لیتا ہے۔

ایڈم، وان فاتح کو ابوالخیر کی غلامی میں کام کرتے ہوئے، موقع پا کر تالیہ کے بارے میں بتاتا ہے فاتح اسے تالیہ کی کہانی سمجھتا ہے تالیہ یہ جان کر غصے میں آ جاتی ہے اور طاقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے تین بے گناہ افراد جن میں ایڈم بھی شامل ہے گرفتار کروا کے مختلف سزائیں دیتی ہے ایڈم کو شاہی کتب خانے میں کام کرنے کی سزا ملتی ہے۔

تالیہ کو اپنے باپ مراد کے خیالات جان کر دھچکا لگتا ہے۔ وہ ہر صورت چابی حاصل کر کے ملائیشیا واپس آنا چاہتی ہے۔ مگر راجہ مراد بے جا طاقت کا اور ظلم کا مظاہرہ کر کے تالیہ کو خوفزدہ کر دیتا ہے۔ راجہ کی خاص کنیز شریفہ اس کی جاسوسی کرتی ہے۔ مگر تالیہ اس کی کمزوری پتا چلا کر اس کی وفاداری خرید لیتی ہے۔

ملکہ یان سوفو چینی بادشاہ کی بیٹی اور بادشاہ مرسل کی بیوی ہے مگر وہ ایک ظالم عورت ہے اور اس کے مقابل بندہ ہارا مراد ہے۔ جو بادشاہ کے فیصلوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔

وان فاتح کو ابوالخیر اپنے باورچی خانے میں کام پر رکھ لیتا ہے۔ وہ اسے اچھی غذائیں کھانے کو دیتا ہے تاکہ غلامی میں اس غلام کی اچھی قیمت ملے۔

تالیہ، فاتح سے ملاقات کا موقع نکال لیتی ہے۔ وہ جاننا چاہتی ہے کہ تاشہ کی بیٹی اس نے کیا کارنامے انجام دیئے تھے مگر فاتح نہیں بتاتا۔ ایڈم ”بنگاریا ملائیو“ کے رائٹر کا تھیلا چر لیتا ہے۔ جس نے ابھی کتاب لکھنی شروع نہیں کی۔ تالیہ وہ تھیلا لیتی ہے۔

ابوالخیر شاہی خزانچی بننا چاہتا ہے وہ بادشاہ کی دعوت کرتا ہے۔ جہاں ملکہ اور راجہ مراد بھی ہوتے ہیں۔ تالیہ بھی وہاں پہنچ جاتی ہے۔ بادشاہ اس سے متاثر ہوتا ہے۔ ملکہ یان سوفو ”وانگ لی“ کو شاہی خزانچی بنانا چاہتی ہے۔ مراد، ابوالخیر کو۔ وان فاتح، سن پاؤ کے وانگ لی سے متاثر ہے دعوت میں سن پاؤ وانگ لی بھی موجود ہوتا ہے۔ ابوالخیر اس سے خطرہ محسوس کر کے فاتح کے ہاتھوں اسے زہر دلواتا ہے مگر فاتح وانگ لی کو خبردار کر دیتا ہے۔

فاتح، وانگ لی سے بے حد متاثر ہے اور اسے خزانچی دیکھنا چاہتا ہے مگر تالیہ ابوالخیر کو خزانچی بنانے کی غارش کرتی ہے۔ فاتح کو یہ بات ناگوار گزرتی ہے، تالیہ، ایڈم کو شاہی مورخ تعینات کرتی ہے۔ فاتح تمام ناموں میں آزادی کا جذبہ جگاتا ہے اور اپنے ساتھ کا یقین دلاتا ہے۔ راجہ مراد تمام اہم عہدوں پر بادشاہ کو قائل کر کے اپنے آدمی تعینات کر دیتا ہے اور ہر ادارے کا کنٹرول اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے۔ تالیہ، شاہی مورخ سے اپنی جھوٹی تعریفیں لکھواتی ہے۔

تالیہ راجہ مراد کی غیر موجودگی میں اس کے خزانے کے کمرے کی تلاشی لیتی ہے تو اس پر انکشاف ہوتا ہے کہ راجہ خفیہ طور پر کمائی گئی دولت، کسی خفیہ جگہ پر چھپا کر رکھتا ہے۔ تالیہ، مسجد کے نام پر پیسہ حاصل کرنے کے لیے ابو الخیر سے ساز باز کر لیتی ہے۔ فاتح کو پتا چل جاتا ہے، وہ ناراض ہوتا ہے اور نیلامی میں وانگ لی کا غلام بننے کو ترجیح دیتا ہے۔ فاتح مستقبل کی باتیں بتا کر وانگ لی کو متاثر کرتا ہے۔

یان سوفو کے والد کو بادشاہ مرسل کی نظر لگ جاتی ہے، وہ اس کے توڑ کے۔ یہ بادشاہ کا مستعمل غسل کا پانی

مگر وہ اسے بیچنے سے انکار کر دیتا ہے۔ فاتح کو یاد آتا ہے کہ وہ عصرہ اور بچوں کے ساتھ پہاڑوں کی سیر کو جاتا ہے، جہاں آریانہ کو اس کی آیا دھوکے سے اغوا کر لیتی ہے۔ فاتح، آریانہ کے گرائے ہوئے باپ کارن کے ذریعے آریانہ کی لاش تک پہنچ جاتا ہے۔ آریانہ مزاحمت کے دوران پہاڑ سے گر کر ہلاک ہو جاتی ہے۔ اس کے اغوا کار بھی کھائی میں گر کر مر جاتے ہیں۔ فاتح آریانہ کی لاش شدہ لاش دفن دیتا ہے۔ اور اس کی موت کا کسی کو نہیں بتاتا، کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ آریانہ کو صوفیہ رحمن نے اغوا کر لیا تھا۔

ایڈم ملا کر پہنچ جاتا ہے۔ ایڈم کو یقین دلانے کے لیے تالیہ بریسلٹ اس کو دے دیتی ہے۔ ایڈم شک میں پڑ کر راستے میں فاتح کو پہنچ جاتا ہے۔

تالیہ فاتح کے گھر میں خزانے کا راستہ تلاش کر لیتی ہے۔ فاتح اور ایڈم بھی پہنچ جاتے ہیں۔ فاتح اسے پولیس کے حوالے کرنا چاہتا ہے، مگر تالیہ خزانہ دیکھنے پر بضد ہوتی ہے۔ بالآخر تینوں بحث کے بعد ایک دروازے سے گزرتے ہیں۔ جہاں سے وہ ایک جنگل میں پہنچ جاتے ہیں۔ دروازہ غائب ہو جاتا ہے۔

راستے میں وہ ہی حالات پیش آتے ہیں جو تالیہ خواب میں دیکھ چکی ہے۔ اسے داتن کی باتوں میں سچائی نظر آنے لگتی ہے کہ وہ پندرہویں صدی کی لڑکی ہے جو وقت سے آگے نکل آئی تھی۔ خزانے کے لالچ میں، اور سچ کی تلاش میں تالیہ فاتح اور ایڈم پرانے زمانے میں پہنچ جاتے ہیں۔

فاتح پر کھل جاتا ہے کہ تالیہ ہی حاکم ہے۔ اب اس کا رویہ بدل جاتا ہے۔ وہ حالات سے گھبرانے کے بجائے جنگل سے نکلنے کا سوچتا ہے۔ اور از خود ان دونوں کا لیڈر بن جاتا ہے۔

جنگل میں تالیہ کو آگہی ملتی ہے۔ کہ شہزادی تاشہ اس کے گاؤں کے لوگوں پر ظلم ڈھارہی ہے اور اس نے تالیہ کے باپ کو بھی قید کر لیا ہے۔ تالیہ کو شہزادی تاشہ سے نفرت محسوس ہوتی ہے۔ مگر ایڈم اور وان فاتح تاریخی کتابوں کے حوالے سے تاشہ کو جانتے ہیں۔ وہ دونوں تاشہ کی تعریف کرتے ہیں اور وان فاتح تاشہ کا فین ہے۔

وان فاتح کو اپنے ملک میں ہونے والے انتخابات کی بھی فکر ہے اس کا خیال ہے کہ مراد دوبارہ چابی بنادے گا تو وہ واپس اپنے ملک چلے جائیں گے اس مقصد کے لیے قدیم ملاکہ جانا ضروری ہے۔

یہ لوگ رین فاریسٹ میں سے راستہ تلاش کر کے جنگل میں جاتے ہیں۔ جہاں تالیہ ہرن کا شکار کر کے اسے آگ پر بھونتی ہے۔ کھانے کی یہ خوشبو قدیم ملاکہ کے لوگوں کو متوجہ کر لیتی ہے۔ اور تین قدیم باشندے وان فاتح، ایڈم اور تالیہ کو زبردستی پکڑ کر اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ ایسے میں تالیہ کو دوبارہ آگہی ملتی ہے جب وہ ملاکہ کے ایک یتیم خانے میں جانے کیسے پہنچ گئی تھی۔ وہاں کی انچارج مسز ماریہ نے اس کا بریسلٹ اتار لیا تھا اور ایک سنار کو بیچ دیا تھا مگر وہ سنار کے لیے بدبختی لایا تھا۔ وہ پکھل نہیں رہا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ دوسری مصیبتوں میں بھی مبتلا ہو گیا تھا۔ یتیم خانے کی میڈم ایکنیں تالیہ پر چوری کا غلط الزام لگاتی ہے۔ اور اسی ضد میں تالیہ چوری کرنا اور زبردستی اپنا حق چھیننا سیکھتی ہے۔

یتیم خانے میں مسز ذوالکفلی آتے ہیں جو تھوڑا وقت بچوں کے ساتھ گزارنا چاہتے ہیں تاکہ اپنا من پسند بچہ ایڈاپٹ کریں۔ ان کا زیادہ وقت تالیہ مراد کے ساتھ گزرتا ہے۔ جو ہمہ وقت کسی پہاڑی پر چل کا اٹیچ بناتی ہے۔ ذوالکفلی اسے پیلے گلاب اور سکے کا ایک شعبہ دکھا کر متاثر کرتے ہیں۔

ذوالکفلی ایک کون آرٹسٹ اور اسکامر ہے۔ وہ یتیم خانے میں بچہ ایڈاپٹ کرنے نہیں آتا تھا، بلکہ کسی جگہ نظر رکھنے آتا تھا اور موقع ملتے ہی وہاں سے ہیرا لے اڑا۔ پولیس تالیہ سے اس کا اٹیچ بنواتی ہے۔ تو وہ غلط اٹیچ بنا کر اسے بچا لیتی ہے۔

تالیہ کو بار بار یتیم خانے میں اپنے ساتھ ہونے والا براسلوک یاد آتا ہے۔ اسے لاہور کے ایک گھر میں لے جایا جاتا ہے، جہاں اس پر اس فیملی کے دادا جی کے قتل کا جھوٹا الزام لگایا جاتا ہے۔ وہ سچائی ثابت کرنے میں ناکام ہو جاتی ہے۔ وہ ملائیشیا کو یاد کرتی ہے۔ جہاں اس نے بالآخر ذوالکفلی کو ڈھونڈ نکالا تھا اور احسان مندی کے طور پر ذوالکفلی نے اسے اپنا سارا ہنر سکھادیا تھا۔

تالیہ، ایڈم اور فاتح کو ”ابوالخیر“ نامی آدمی کے کارندے ایک بنجر یے میں قید کر کے گھوڑا گاڑی کے ذریعے قدیم ملاکہ کے شہر لے جاتے ہیں۔ تالیہ خود کو اور ایڈم کو آزاد کر لیتی ہے۔ مگر فاتح کو آزاد کرانے سے پہلے اغوا کاروں کو خبر ہو

چاہتی ہے مگر شاہی طبیب آنا کافی کرتا ہے۔ تالیہ مداخلت کر کے طبیب کو ملکہ کا حکم ماننے پر مجبور کر دیتی ہے۔ ملکہ، تالیہ کی جاسوسی کروا دیتی ہے مگر تالیہ باتوں باتوں میں اس کا دل اپنی طرف سے صاف کر دیتی ہے۔ بادشاہ کے حوالے سے اس کے خدشات بھی دور کر کے واضح کرتی ہے کہ وہ اپنے محبوب کی خاطر ضرور واپس جائے گی۔

فاتح کے کہنے پر محمود مرنی، وانگ لی سے مدد چاہتا ہے مگر وہ انکار کر دیتا ہے۔ وانگ لی کے انکار سے اس کی شخصیت کابت فاتح کے سامنے ٹوٹ جاتا ہے۔

راجہ مرسل تالیہ کے فن اور تالیہ سے متاثر ہو کر اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ ایڈم کی زبانی یہ بات سن کر فاتح کا دماغ گھوم جاتا ہے۔ راجہ میرا کو شک ہو جاتا ہے کہ تالیہ اپنے ساتھ کسی مرد کو لائی ہے وہ اسے تلاش کر داتا ہے۔ تالیہ بھی یہ بات بھانپ لیتی ہے اور فاتح کو خبردار کرتی ہے۔ راجہ مرسل تالیہ کے باپ کو تالیہ کا رشتہ دیتا ہے۔ ملکہ یان سو فو کی کنیر یہ بات ملکہ کو بتاتی ہے۔

پندرہویں قسط

وقت کے اس پار

ٹوکری میں رکھی چیزیں دھندلی نظر آرہی ہیں۔۔۔

اور..... خواب ہوا میں تحلیل ہو جاتا ہے۔۔۔

☆☆☆

سرد ہوا کے زوردار جھونکے نے اس کے سر سے چنے کی ٹوپی گرا دی۔

تالیہ مراد چوکی کے اٹھی۔ وہ سوئی نہیں تھی۔ بس کتے کے کونے میں بیٹھے بیٹھے گھٹنوں پہ چہرہ ٹکا کے آنکھیں موندی ہی تھیں کہ یہ خواب دکھائی دیا۔ اب آنکھ کھلی تو دیکھا..... کتے پانی پہ تیرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی اور جزیرہ قریب آتا دکھائی دے رہا تھا۔

”کوئی برا خواب دیکھا ہے کیا؟“

ایڈم ہاتھوں پہ رسی لپیٹتے ہوئے قریب آیا تو اس نے گردن اٹھا کے اسے دیکھا۔ چنے میں ملبوس وہ رسی اٹھائے مصروف دکھائی دیتا تھا۔

”اچھے برے کا معلوم نہیں۔ مگر ہاں..... خواب ہی دیکھا ہے۔“ اس نے جھرجھری لی۔

”کیا دیکھا آپ نے؟“ وہ اس کے قریب آ رہا تھا۔ ساتھ ساتھ رسی بھی لپیٹ رہا تھا۔

”میں نے خود کو اپنے کے ایل والے گھر میں

اس نے خواب میں دیکھا..... گھنٹی کی تیز آواز سے اس کی آنکھ کھلتی ہے۔۔۔

وہ ہڑبڑا کے لحاف پھیلتی ہے، پھر بستر سے پیر نیچے اتارتی ہے۔۔۔

اور چپل پیروں میں ڈالے باہر کو پکتی ہے۔۔۔

اب وہ تیز تیز زینہ پھلانگ رہی ہے، دل زور زور سے دھڑک رہا ہے۔

وہ دروازہ کھول کے باہر ڈرائیو دے پہ آتی ہے۔

سامنے گیٹ کے پار کوئی کھڑا ہے۔۔۔ اس کے ہاتھ میں ایک ٹوکری ہے۔

اس کے قدم سست پڑ جاتے ہیں۔ وہ گیٹ تک آتی ہے، جنگلے کے اوپر سے ہاتھ بڑھاتی ہے۔

آدمی اس کو ٹوکری پکڑتا ہے وہ وہیں نیچے زمین پہ بیٹھتی چلی جاتی ہے۔ ٹوکری اس کے ہاتھ میں ہے اور چہرہ شکست خوردہ سا لگتا ہے۔

اب وہ ٹوکری میں موجود اشیاء پہ ہاتھ پھیر رہی ہے، ان کی خوشبو تھنوں سے ٹکرا رہی ہے، تیز مانوس خوشبو.....

اور اس کی آنکھیں بھیگتی جا رہی ہیں.....

دیکھا۔ گھنٹی بجتی ہے۔ ایسی گھنٹی جس کا مجھے انتظار تھا بسے۔ کوئی عادت ہو جیسے۔ میں بھاگ کے دروازہ کھولتی ہوں تو مجھے کوئی شخص ایک ٹوکری دیتا ہے جیسے تحفہ ہو..... مگر میں.....

وہ کہتے کہتے رک گئی جیسے خود میں ہی الجھ گئی ہو۔

”تحفہ ملنے پہ یوں غمگین کون ہوتا ہے ایڈم؟“

”جو خزانے ڈھونڈنے کے لیے جاتا ہے اور وقت کے اس پار کھو جاتا ہے..... شاید وہ۔“ اداسی سے مسکراتے ہوئے ایڈم نے رسی کا گچھا دور ایک سپاہی کی طرف اچھالا جس نے فوراً اسے تھام لیا۔ دوسرے سپاہی اور خادم بھی لنگر انداز ہونے کی تیاریوں میں لگے ہوئے تھے۔

”مگر اس ٹوکری میں کیا تھا؟“ اس نے آنکھیں بند کر کے یاد کرنا چاہا۔ ”میں اس چیز کی خوشبو پہچانتی ہوں۔ ایسے جیسے..... جیسے رسیلا چاکلیٹ

.....“ پھر اس نے گہری سانس لی اور کھڑی ہوئی۔

”خیر..... ایک بات تو طے ہے کہ ہم اس زمانے کی قید سے جلد نکل جائیں گے۔“

”ہم یا صرف آپ؟“

تالیہ نے گلہ آمیز نظروں سے اسے دیکھا۔ ”تمہیں لگتا ہے، میں تم دونوں کو چھوڑ کے جا سکتی ہوں۔“

”جی بالکل، مجھے ایسا لگتا ہے۔ کیونکہ..... آپ لوہیں فیصد خزانہ بھی مجھ سے بانٹنا برا لگ رہا ہوگا اندر ہی اندر۔“

”ہاں لگ تو رہا ہے۔ بیس فیصد جتنا کام تو تم نے کیا نہیں ہے۔ ہونہ۔“ بالوں کو بے نیازی سے پیچھے جھٹکا اور عرشے پہ آگے بڑھ گئی۔ جزیرہ جیسے قریب آ رہا تھا..... سورج اسی رفتار سے ڈھلنے کی تیاری میں تھا۔

ایڈم نے کینہ تو ز نظروں سے اسے دیکھتے

”گہری سانس بھری۔“

”کیا تمہیں اس آدمی کی باتوں پہ یقین ہے؟“

”جے تالیہ جل بھی جائیں تو ان کے بل نہیں جائیں گے۔“ یہ تو طے تھا۔

☆☆☆

بندھارا کے دربار میں کھڑا دان فاتح کہہ رہا تھا۔

”وہ ایک سمندری سفر پہ گئی تھی جس سے وہ لوٹ کے نہیں آئی تھی۔ اگر تم اس کو پہچانا چاہتے ہو تو اسے کسی سمندری سفر پہ نہ بھیجنا۔“

مراد راجہ کے دل پہ کسی نے پیر رکھ دیا۔

”بس یہی یا کچھ اور بھی جاننا چاہتے ہو تم راجہ؟“ بے تاثر سے انداز میں اس نے بات جاری رکھی۔

مراد کی گردن میں گھٹی سی ڈوب کے ابھرتی دکھائی دی۔ مگر چہرے کے تاثرات اس نے بہت ضبط سے ہموار رکھے۔

”مجھے تمہاری کسی بات پہ یقین نہیں ہے۔ جاؤ اور میرے قید خانے میں اپنی باقی ماندہ زندگی گزارو۔“ وہ قدرے غصے اور حقارت سے ہاتھ جھلا کے بولا تو فاتح ہلکا سا مسکرایا۔

”بہت جلد تم اتنے مجبور ہو جاؤ گے مراد راجہ کہ تم مجھے خود یہاں واپس بلاؤ گے اور اس کرسی (تخت کے ساتھ والی کرسی کی جانب اشارہ کیا) پہ بٹھا کے میرے ساتھ مذاکرات کرو گے۔“

مراد نے جواب نہیں دیا۔ ہاتھ دوبارہ جھلایا اور رخ موڑ لیا۔ سپاہی تیزی سے وارد ہوئے اور اسے بازوؤں سے پکڑا۔ اس نے مزاحمت نہیں کی۔ بس ایک نظر راجہ پہ ڈالی جو کمر پہ ہاتھ باندھے رخ موڑ گیا تھا اور پلٹ گیا۔

”عارف!“ اس کے جانے کے بعد مراد قدرے بے چینی سے عارف کی طرف گھوما جو فکر مند سا وہیں کھڑا تھا۔ پیشانی شکن آلود تھی اور آنکھوں میں پریشانی تھی۔

”کیا تمہیں اس آدمی کی باتوں پہ یقین ہے؟“

عارف نے ایک نظر بند دروازے پہ ڈالی جہاں سے فاتح ابھی گیا تھا۔

”اس کی پیشانی کشادہ اور آنکھیں روشن ہیں۔ جھوٹے لوگوں کے چہرے ایسے نہیں ہوتے۔“

”پھر تم ابھی اسی وقت جنوبی محل کی طرف روانہ ہو جاؤ اور شہزادی کو بحفاظت واپس لے آؤ۔ ابھی“ عارف! آخر میں اس کی مضطرب آواز بلند ہوئی تو عارف نے جھٹ سر جھکا دیا۔

”جو حکم راجہ!“ اور پھر تیزی سے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

مراد اب مارے اضطراب کے دربار میں دائیں بائیں چکر کاٹ رہا تھا۔ وہ اندر تک مل کے رہ گیا تھا۔

☆☆☆

شام ڈھل گئی تو بندہ ہار محل کے در دیوار نے سرگوشیوں میں ایک دوسرے کو تہ خانے کا احوال سنایا۔ کھڑکیاں احتیاجاً ڈرا کھڑکیں اور دروازوں نے اپنے پٹ جھلائے مگر اونچے ستون بے حسی سے قید خانے کا منظر نامہ سنتے رہے۔

وہ جیل نیچے تہ خانے میں بنی تھی۔ تاریک کال کوٹھڑیوں کی قطار جن کے دروازے آہنی اور سلاخ دار تھے۔ ایسی ہی ایک کوٹھڑی کے اندر زمین پہ فاتح بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ کھلے تھے مگر دائیں پیر سے بندھی زنجیر کے سرے پہ بڑا سالو ہے کا وزن بندھا تھا جس کے باعث وہ چند قدم سے زیادہ نہیں چل سکتا تھا مگر اس نے کھڑے ہونے کی کوشش بھی نہیں کی۔ بس کونے میں اکڑوں بیٹھا دیوار کو دیکھتا رہا۔

دیوار پہ لگے گارے اور اینٹوں پر وہ ناخن سے لکیریں کھینچ کے حساب کتاب کر رہا تھا۔

”کیا سوچ رہے ہیں آپ؟“ آریانہ دوسرے کونے میں چپکے سے آن بیٹھی تھی۔ فاتح نے نظریں اس کی طرف اٹھائیں۔

وہ سفید ہیر بینڈ میں بال جکڑے آلتی پالتی مار

کے بیٹھی اس کو غور سے دیکھ رہی تھی۔

”کتنے گھٹنے بیت چکے یہ حساب کر رہا ہوں۔“

تمہارے باپ کے پاس ہمیشہ پلان ہوتا ہے اور میرے حساب کے مطابق وہ ٹھیک جا رہا ہے۔“ دوبارہ ناخن سے لکیر کھینچنے لگا۔

”آپ کو ڈر نہیں لگ رہا؟“ ”مجھے ڈرنا نہیں، محض انتظار کرنا ہے۔ وقت کے اس پار جانے کا انتظار۔“

”اور اس کے بعد؟ واپس جا کے آپ تالیہ کے ساتھ کیا کریں گے؟“

”وہی جس کا میں نے اس سے وعدہ کیا ہے میں اس کو آزاد کر دوں گا۔ وہ اپنی زندگی گزارے خوش رہے میں اپنی زندگی گزاروں گا۔“

اس نے ہلکے سے کندھے اچکائے اور ایک لکیر کھینچی۔ ناخن کی سوکھے گارے سے رگڑے جانے کا آواز سنائی دی۔

”اور اگر کسی موقع پہ آپ کو ”دایسی“ یا ”تالیہ“ مراد میں سے کسی ایک کو چننا پڑا تو کیا کریں گے؟“ وہ چونکا۔ ”تمہیں یہ خیال کیسے آیا؟“

حیرت سے اس نے کونے میں بیٹھی آریانہ کو دیکھا جواب میں وہ استہزاء سے مسکرائی۔

”مجھے؟ مگر میں تو کوئی نہیں ہوں، ڈیڈ۔ میں آپ کا لاشعور ہوں جو آپ سے پوچھ رہا ہے کہ آریانہ کا موقع آیا تو کیا کریں گے آپ؟“

اس نے جواب نہیں دیا۔ بس گردن موڑ کر دیوار پہ بنی لکیروں کو دیکھنے لگا۔ ماتھے پہ بل پڑے تھے اور آنکھوں میں بے چینی در آئی تھی۔ ذہن میں ایک دم آوازوں کا جھوم اٹھا ہو گیا تھا۔

(ایک وقت آئے گا جب آپ مجھ سے کہیں گے کہ آپ کو میری ضرورت ہے وان فاتح! کہ میں آپ کے ساتھ رہوں۔) تالیہ ہنسی تھی۔

(یہ ایک بے وفا آدمی ہے جس کو وعدہ نبھانے نہیں آتے۔) ملکہ کی آواز میں سنجیدگی تھی۔

(”میں وان فاتح ہوں اور مجھے کبھی کسی کی ضرورت نہیں ہوتی۔“) اس نے ایک زمانے میں بھی یہ کہا تھا۔

(وان فاتح کو صرف وان فاتح سے محبت ہے!) عصرہ بے رحم ہوئی تھی۔

آوازیں.... یادیں.... سب دیوار پہ بنی لکیروں سے ٹکرائی تھیں۔ وہ سر جھٹک کے اپنی توجہ منصوبے پہ مرکوز کرنے لگا۔

☆☆☆

تین چاند والے جزیرے پہ سورج ڈوب رہا تھا۔ کتنی ساحل پہ لنگر انداز ہو چکی تھی اور سپاہیوں کا گروہ ریت پہ اتر اٹھا تھا۔ دائرے کی صورت وہ تالیہ اور ایڈم کے گرد کھڑے تھے۔ مورخ خاموش تھا جبکہ چغہ پوش شہزادی ان کو ہدایات دے رہی تھی۔

”سب ٹولیوں کی صورت جزیرے میں پھیل جاؤ، مگر ساحل کی پٹی کے ساتھ ساتھ۔ اندر کی طرف جنگل شروع ہو جاتا ہے۔ ہمیں رات میں جنگل کے اندر نہیں جانا۔ صرف ساحل کی پٹی کے ساتھ جزیرے کا محاصرہ کرنا ہے۔ کوئی بھی غیر معمولی چیز نظر آئے تو ایسی صورت میں.....“ اس نے ایک ترکش سامنے کیا جو تیروں سے بھرا تھا۔ ”یہ آتش باریق ہیں اور تم سب کے پاس یہ موجود ہیں۔ اس کو سلگا کے ہوا میں چھوڑ دو گے تو یہ فضا میں پھٹ جائے گا اور روشنی دیکھ کے باقی سب تمہاری طرف بھاگے آئیں گے۔“

”جو حکم شہزادی!“ سپاہی سر ہلارہے تھے۔ ”آپ میرے ساتھ رہیے گا۔“ وہ سب بکھر گئے تو ایڈم نے مریبانہ انداز میں کہا۔

”اوہ! اتنے بڑے ہو گئے ہو اور اندھیرے سے ڈرتے ہو؟“ تالیہ نے سادگی سے پلکیں ہچکائیں۔

ایڈم کی پیشانی پہ بل پڑے۔ ”میں آپ کے لیے کہہ رہا تھا۔“

”میرے لیے؟“ وہ ہنسی۔ ”میں تاشہ پونا

ہوں میں کسی سے نہیں ڈرتی۔“ پھر بالوں کو جھٹکا چنے کی ٹوپی برابر کی اور ایک طرف کو مڑی تو ایڈم بولا۔

”ابھی تک نہ میں نے بنگارا یا ملا پول میں آپ کو ”ساحرہ“ کا لقب دیا ہے نہ ہی ملاکہ میں کوئی آپ کو اس نام سے پکارتا ہے۔“

”شاید وہ وقت ابھی آتا ہے جب میں پونا بنوں گی۔ تم جلنا چھوڑو۔ اور خزانے کو تلاش کرو۔“ گھمنڈی شہزادی اس کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے ایک طرف کوچل دی۔ ایڈم ضبط کے گھونٹ بھرتا رہ گیا۔

سورج ڈوب گیا اور جزیرے پہ اندھیرا چھا گیا۔ ایسے میں پورا چاند آسمان پہ چمکنے لگا۔ جزیرہ بالکل خاموش تھا۔ کسی فوج، کسی مخلوق کی چاپ تک نہ سنائی دیتی تھی۔ کیا واقعی خزانہ اسی جزیرے پہ تھا؟ یا ان کے سارے حساب کتاب غلط تھے؟

وہ ٹھنڈی ریت پہ قدم پہ قدم چل رہی تھی۔ چوکنی نظریں چاروں طرف لگی تھیں۔ جزیرہ بالکل خاموش اور ساکن تھا۔ سوائے ساحل کی لہروں کے شور کے کوئی آواز....

پھر ایک دم آواز سنائی دی۔ غراتی ہوئی آواز۔ وہ سنائے میں رہ گئی۔

پس ثابت ہوا کہ جزیرہ زندہ تھا۔ ملاکہ کے اس قدیم جنگل کی طرح جس میں وہ چار دن تک پھنسے رہے تھے۔

تالیہ محتاط انداز میں آواز کی سمت چلنے لگی۔ آواز کسی جانور کے ڈکرانے کی معلوم ہوتی تھی۔

جو تے میں کوئی سوراخ ہو گیا تھا جو ریت پیروں میں گھس رہی تھی۔ یوں لگتا تھا وہ ٹھنڈی ریت پہ ننگے پیر چل رہی ہے۔

نہیں نہی چیزیں پیروں میں چھ رہی تھیں مگر وہ جھپٹ سے بے پرواہ قدم اٹھاتی رہی۔ چنے کی ٹوپی نے اس کے سر کو ڈھانپ رکھا تھا مگر ہوا کے باعث وہ

بیوٹی بکس کا تیار کردہ

سوہنی ہیرائل

SOHNI HAIR OIL

- گرے ہوئے بالوں کو روکتا ہے
- نئے بال اگاتا ہے
- بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے
- مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے
- یکساں مفید
- ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے



قیمت = 150/- روپے

سوہنی ہیرائل 12 جزی بیوٹیوں کا مرکب ہے اور اس کی تیاری کے مراحل بہت مشکل ہیں لہذا یہ تھوڑی مقدار میں تیار ہوتا ہے، یہ بازار میں یا کسی دوسرے شہر میں دستیاب نہیں، کراچی میں دستی خرید جاسکتا ہے، ایک بوتل کی قیمت صرف = 150/- روپے ہے، دوسرے شہروں کے لئے آڈر بھیج کر جزی پارسل سے منگوائیں، رجسٹری سے منگوانے والے منی آڈر اس حساب سے بھجوائیں۔

- 2 بوتلوں کے لئے ----- 350/- روپے
- 3 بوتلوں کے لئے ----- 500/- روپے
- 6 بوتلوں کے لئے ----- 1000/- روپے

نوٹ: اس میں ڈاک خرچ اور پیکنگ چارجز شامل ہیں۔

منی آڈر بھیجنے کے لئے ہمارا پتہ:

بیوٹی بکس، 53- اورنگزیب مارکیٹ، سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی
دستی خریدنے والے حضرات سوہنی ہیرائل ان جگہوں سے حاصل کریں

بیوٹی بکس، 53- اورنگزیب مارکیٹ، سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی
مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی

فون نمبر: 32735021

”کموڈو ڈریگن ہے یہ تو۔“ تالیہ چونکی۔ ”تو راجہ نے اپنے خزانے کی حفاظت کے لیے کموڈو ڈریگن پال رکھا ہے اور اس کا خیال یہ شکار باز رکھتا ہے یعنی....“

”یعنی اس آدمی کا کوئی ساتھی ادھر تعینات نہیں ہے۔ یہ ایک ڈریگن کافی ہے۔“

ڈریگن (اژدھا) زمین پر ریگتا آہستہ آہستہ اس آدمی کے سامنے آرکا۔ اس کا بھاری پیٹ نیچے رگڑتا ریت پر نشان بناتا جا رہا تھا۔ سامنے آکے اس نے منہ کھولا اور غریبا۔ ایڈم اور تالیہ نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

”اب کیا کریں؟“ وہ ذرا فکر مند ہوئی۔ ڈریگن ایک ہی نوالے میں سالم بندہ نگلنے کی صلاحیت رکھتا تھا اور یہ آج کے ملایشیاء کے ڈریگن سے دگنا تھا، یہ تو ایک ہی سانس میں ان دونوں کو ہضم کر جاتا۔

”ایسا کرو تم اس آدمی پر تیر چلاؤ اور میں ڈریگن کا نشانہ باندھتی ہوں۔ ان دونوں کو مار کے ہی ہم اس پہاڑی تک جا سکتے ہیں۔ یہ اگر اس پہاڑی کی حفاظت کر رہے ہیں تو خزانہ ادھر ہی ہے۔“

”مگر ہم کموڈو ڈریگن کو نہیں مارتے۔“ ایڈم ایک دم بولا۔

”اف ایڈم....“ اس نے دانت پیسے۔ ”یہ ہمیں کھا جائے گا۔“

مگر ایڈم نے کمان نیچے کر دی۔ ”ہم سانپ کو بھی نہیں مارتے۔ ان کو ان کے علاقوں میں چھوڑ دیتے ہیں۔ میں نے والٹڈ لائف پارک میں ایک بچی کی جان بچائی تھی کموڈو ڈریگن سے.... لیکن میں نے اس کو بھی نہیں مارا تھا۔ نہیں چے تالیہ.... ہم جانوروں کو مارنے والے لوگ نہیں ہیں۔“ اس کے اندر کا اورنگ اصلی جاگ گیا تھا۔ تالیہ چند لمحے اسے دیکھتی رہی۔

”تو تم کموڈو ڈریگن سے پہلے مقابلہ کر چکے ہو؟“ اس نے اپنا تیر کمان نیچے کر لیا۔

کے ہاتھ پہ لگا تو تلوار چھوٹ گئی۔ وہ کراہ کے نیچے گئے تالیہ نے جھٹ اپنا تیر کمان اس پہ تان لیا۔

”آپ اپنی حفاظت خود کرنا جانتی ہیں شہزادی؟“ طنز سے کہتا ایڈم قریب آیا۔ تالیہ نے بر تھوک لگلا۔ نظریں اس آدمی پہ جمائے رہیں۔

اس کی تلوار دور جا گری تھی۔ تلوار اٹھانے کے بجائے وہ لڑکھڑاتا ہوا اٹھا اور پیچھے ہٹنے لگا۔ ہاتھ سے بھل بھل خون بہہ رہا تھا۔

”رک جاؤ ورنہ اگلا تیر تمہاری گردن کے آریا ہوگا۔“ وہ تیر سے اس کا نشانہ لے کر غریبا تو آدمی ٹھہ گیا۔ تالیہ نے اس کے آس پاس نظر دوڑائی۔

”تمہارے ساتھی کہاں ہیں؟ بولو! کہاں ہیں مراد راجہ کے دوسرے آدمی۔“ وہ خستہ حال حلیے والا جنگلی سا آدمی لگتا تھا جواب دینے کے بجائے دائیں طرف دیکھنے لگا ہونٹ بند رہے۔

”میں کچھ پوچھ رہی ہوں۔“ مگر وہ مسلسل دائیں طرف دیکھ رہا تھا جیسے کسی کا منتظر ہو۔

”کہیں اس کے ساتھی حملہ ہی نہ کر دیں۔ ہمیں سپاہیوں کی ضرورت ہے۔“

ایڈم نے فکر مندی سے کہتے ہوئے آتھ بھرے تیر کو سلگایا اور زور سے اوپر فضا میں چھوڑا۔ اوپر جا کے پھٹ گیا۔ ہر سو آتش بازی کی صورت میں روشنیاں بکھر گئیں اور پھر اندھیرا چھا گیا۔ مگر ذرا روشنی میں تالیہ کو اس آدمی کے دائیں طرف کو حرکت دکھائی دی تھی۔

کوئی ریگلتی ہوئی شے۔ جو اس طرف بڑھ رہی تھی۔

تیر کمان تانے تالیہ کی نظریں اس طرف اٹھیں۔ چاندنی میں اب واضح دکھائی دینے لگا تھا۔ زمین پہ کوئی چیز ریگ رہی تھی۔ چھپکلی کی شکل مگر مجھ۔ لیکن عام مگر مجھ سے دو گنا۔

پشت سے پھڑ پھڑا رہا تھا۔

دفعاً ایک مقام پہ وہ ٹھہری۔ سامنے آسمان پہ مکھن کی ٹکیا جیسا چاند چمک رہا تھا۔ اس نے نظریں دائیں طرف موڑیں۔ وہاں ایک چھوٹی سی پہاڑی تھی جس کی چوٹی خوب روشن تھی۔ جیسے شیشے کی بنی ہو....

اس چوٹی کے چمکتے شیشے میں ایک دوسرا چاند نظر آرہا تھا....

وہ ایک دم گھومی۔
ہوا سے چنے کی ٹوپی پیچھے کو ڈھلک گئی۔ مگر اس کی سیاہ آنکھیں سامنے جم گئیں....
وہاں سیاہ کا بیج جیسے سمندر کا پانی بہہ رہا تھا اور ایک چاند پانی کی سطح پہ چمک رہا تھا....
”جہاں ملتے ہیں تین چاند۔“
وہ چونک کے بڑبڑائی.... پھر اس کے ہونٹ مسکراہٹ میں ڈھلے....

”یہاں.... ہاں یہاں ملتے ہیں تین چاند۔“
پہاڑی کی چوٹی شیشے یا کاچ کی بنی لگتی تھی۔ چاند آسمان پہ چمک رہا تھا مگر اس کا عکس سمندر کے پانی اور چوٹی دونوں میں دکھائی دے رہا تھا۔
”تین چاند۔“ اس نے گہری سانس لی۔ ”تو یہ تھے تین چاند۔“ ان ہی کے آس پاس آواز آئی تھی۔
”چے تالیہ۔“ ایڈم نے قریب سے آواز دی تو وہ چونکی۔ وہ پیچھے سے تیز تیز آرہا تھا۔

تالیہ کے ماتھے پہ بل پڑے۔ ”سنو! تم باڈی مین ہو گے وان فاتح کے... میں اپنی حفاظت خود کر سکتی ہوں۔“

ایڈم نے جواب نہیں دیا۔ ایک دم ترکش سے تیر نکالا اور تالیہ کی طرف کمان تان کے تیر چلا دیا۔ وہ ہکا بکا رہ گئی۔ تیر زن سے اس کے پاس سے ہوا میں تیر تا پیچھے کو گیا۔ تالیہ گھومی۔

پہاڑی کے قدموں میں ایک آدمی کھڑا تھا اور وہ تالیہ کی طرف تلوار تانے بھاگا چلا آرہا تھا۔ تیر اس

”میں اس سے ایک بچی کی جان بچا چکا ہوں لیکن سرکاری اعزاز دیتے وقت مجھے بھلا دیا گیا تھا۔“

”مگر تم تو اس واقعہ کو نہیں بھولے نا۔ ہو سکتا ہے اس دنیا کے واقعات اس دنیا کی تیاری کے لیے ہوں۔ جاؤ اور ہمیں اس ڈرگین سے نجات دلاؤ۔“

شہزادی نے کمان بلند کر کے اس طرف اشارہ کیا جہاں ڈرگین تھا۔

شہزادی کے حکم پہ ایڈم نے بے اختیار تھوک لگلا۔ چند فٹ کے فاصلے پہ ڈرگین کھڑا غرار ہا تھا اور شکار باز اس کی اوٹ میں کھڑا اپنے زخم کو دوسرے ہاتھ سے دبائے ہوئے تھا۔ خون دھاروں کی صورت بہہ رہا تھا مگر اس کی بے تاثر آنکھیں ایڈم پہ جمی تھیں۔ عجیب پتھر یلا چہرہ تھا اس کا۔

”کیا نام ہے تمہارا؟“ ایڈم بھاری آواز میں استفسار کرتے ہوئے آگے بڑھا۔

”پچھے دوڑتے قدموں کی آواز آرہی تھی۔ ایک ایک کر کے سپاہی وہاں اکٹھے ہو رہے تھے۔ تالیہ نے ان کو خاموشی سے اپنے عقب میں کھڑے ہونے کا اشارہ کیا۔ انہوں نے اپنے کمان تانے دیں جگہ سنبھال لی۔

”احمد... کمال... علی... ایسا ہی کوئی نام ہوگا تمہارا۔“ ایڈم تبصرہ کرنے والے انداز میں ڈرگین کی سیدھ میں کئی فٹ کے فاصلے پہ ٹھہر گیا۔ سنجیدہ نظریں اس شکار باز پہ جمی تھیں۔

”مفید۔“ وہ دھیرے سے بولا۔ ”مفید نام ہے میرا اور تم نے اگر آگے بڑھنے کی کوشش کی تو میرا دوست تمہیں نکل جائے گا۔“

”یعنی تم نے اس کی اچھی تربیت کی ہے مفید!“ وہ اونچی آواز میں بولا۔ ”یہ جانور تمہارا پالتو ہے۔ تمہارے اشارے کی تعمیل کرنا جانتا ہے۔“

”یہ سب کچھ کرنا جانتا ہے۔“

”سب کچھ کرنا تو تم بھی جانتے ہو لیکن کیا یہ معلوم ہے کہ تم یہ سب کیوں کر رہے ہو؟“

چاندنی میں ڈوبا خاموش جزیرہ.... اور اس پہ

ایڈم کی آواز.... سب خاموشی سے اسے سن رہے تھے۔ تالیہ البتہ بے چینی سے بار بار ڈرگین کو دیکھتی تھی۔ کمان تانے وہ ڈوری کو پیچھے کھینچے ہوئے تھی۔ ادھر انگلی چھوڑی، ادھر تیر ڈرگین کی آنکھ میں جا لگے۔

”ہر انسان کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ جو وہ کر رہا ہے وہ اسے ”کیوں“ کر رہا ہے! تم بتاؤ۔ تم اس بیاباں جزیرے پہ ایک جانور کے ساتھ راجہ کے خزانے کی حفاظت کیوں کر رہے ہو۔“

”تم کچھ نہیں جانتے۔“ زخمی شکار باز غصے سے بولا۔ ”یہ چند مشکل دن ہم نے گزارنے ہیں پھر ہمارے پاس اتنا خزانہ اکٹھا ہو جائے گا کہ ہم ساری دنیا پہ حکومت کریں گے۔“ اس کے لمبے بال کندھوں پہ گر رہے تھے۔ میلا پھیلا چہرہ اب بھی ڈاڑھی... لبو پٹکانی آنکھیں... وہ ذہنی طور پہ صحت مند نہیں لگتا تھا۔

”تو یہ وعدہ کیا ہے راجہ نے تم سے؟“

”مراد راجہ ہمارا سردار ہے اور یہ خزانہ.... یہ صرف ہمارا ہے۔“

”میرے پیارے دوست!“ دونوں پہلوؤں پہ ہاتھ رکھے کھڑے ایڈم نے افسوس سے گہری سانس لی۔ ”تم غالباً مراد راجہ کے تخت سنبھالنے کے دن سے یہیں ہو۔ تم نہیں جانتے کہ ملاکہ میں کیا ہو رہا ہے۔ بے وقوف انسان! مراد راجہ اس وقت ملاکہ کا بے تاج سلطان بن چکا ہے۔“

”نہیں۔ ابھی سلطان مرسل زندہ ہے۔“ شکار باز فوراً غرایا۔ ”جب وہ مرے گا تو ہم حکومت کریں گے۔“

”تم کتنے بے وقوف ہو مفید۔ تم یہاں مراد راجہ کے خزانے کی حفاظت کر رہے ہو اس آس میں کہ مراد، سلطان کو قتل کر کے تخت سنبھال لے گا؟ نادان انسان.... وہ سلطان کو بھی قتل نہیں کرے گا۔ پوچھو کیوں؟“

”وہ سلطان کو قتل کر دے گا۔“ وہ ہٹ دھرمی سے چلایا۔ خون بہاتے ہاتھ کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔

”نہیں کرے گا۔ کیونکہ وہ اپنی بیٹی شہزادی تاشہ کی شادی مرسل شاہ سے کر رہا ہے۔ کیا اپنے داماد کو قتل کرے گا وہ؟“

”تم جھوٹ بول رہے ہو کیونکہ مراد راجہ کی کوئی بیٹی تاشہ نہیں ہے۔“

”میں ہوں۔ مراد راجہ کی بڑی بیٹی، اور اللہ شاہد ہے کہ میں سچ کہہ رہی ہوں۔“ تیر سے اس کا نشانہ باندھے، وہ بلند آواز میں بولی تو مفید بے اختیار اس کو دیکھنے لگا۔

”شاید تمہیں میرے باپا نے اپنے بارے میں ہر بات نہیں بتائی۔ میں شہزادی تاشہ بیت مراد ہوں اور مجھے میرے باپا نے یہ خزانہ لینے اور تمہیں مارنے بھیجا ہے.... لیکن میرا یہ جرنیل چاہتا ہے کہ تمہاری جان بخش دی جائے۔“

ایڈم نے گردن موڑ کے اسے گھورا۔ (اپنی کہانیاں گھڑنے والی عادتوں سے آپ باز نہ آئیے گا۔)

”اب بتاؤ مرنا چاہتے ہو یا قید ہونا چاہتے ہو۔“

”نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”تم لوگ جھوٹ بول رہے ہو؟“

”مجھے بات کرنے دیں۔“ ایڈم ہلکے سے بولا پھر مفید کی طرف چہرہ موڑا۔ ”مفید! تم راجہ مراد کے وفادار ہو مگر اپنے دل سے پوچھو۔ راجہ تمہیں بھول چکا ہے۔ وہ وہاں عیش سے حکمرانی کر رہا ہے اور تم ادھر تنہا ہو۔ تمہارا دل اب راجہ سے محبت نہیں کرتا۔“

مفید لب بھینچے اسے دیکھے گیا۔

”جانتے ہو تمہارا دل کس سے محبت کرتا ہے؟“

انگلی اٹھا کے اشارہ کیا۔ ”اس جان دار سے جس کے ساتھ تمہیں جنگل میں چھوڑ دیا گیا ہے۔ جب ایسے کوئی کسی کو کسی کے ساتھ جنگل میں چھوڑ دے تو پیچھے ساری دنیا اجبھی ہو جاتی ہے۔ صرف وہ اندھیروں کا دوست رہ جاتا ہے۔ یہ تمہارا دوست، تمہارا ساھی ہے۔ تمہیں اسی سے محبت ہے اور جن سے محبت کی جاتی ہے ان کو اپنی خواہشات کی رسی سے قید نہیں کیا

جاتا۔ انہیں آزاد چھوڑ دیا جاتا ہے۔ انہیں کھل کے جینے دیا جاتا ہے اور دنیا کے جنگلوں میں اپنی مرضی سے بھٹکنے دیا جاتا ہے۔ اگر وہ لوٹ کے آجائیں تو ہم محبت میں سچے تھے۔ اگر نہ آئیں تو ہم صرف بد قسمت تھے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ تم اس معصوم جانور کو آزاد کر دو۔“

مگر مفید نفی میں سر ہلاتا ان سب کے چہرے دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے جیسے تھک کے خون بہاتا ہاتھ پہلو میں گرا دیا۔

”تم لوگ جھوٹ بول رہے ہو۔“

”مراد راجہ وہاں عیش کر رہا ہے اور تم یہاں پاگل ہو رہے ہو۔ کب تک اس جانور کو اپنے ساتھ قید میں رکھو گے؟ کم از کم اس کو تو آزاد کر دو۔ اس سے کہو کہ واپس جنگل میں چلا جائے اور تم ہمارے ساتھ ملا کہ چلو۔ پھر اپنی آنکھوں سے دیکھو کہ مراد راجہ نے تمہیں کس کس طرح دھوکا دیا ہے.... اور اگر تم نے یہ نہ کیا تو ہم سب تیر مار مار کے اس ڈرگین کی آنکھیں اور شریان پھوڑ دیں گے۔“

مفید نے ایک نظر اس ڈرگین کو دیکھا جو بچوں کے بل کھڑا ان لوگوں پہ مسلسل غرار ہا تھا۔ پھر اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ اس نے سیٹی سی بجائی۔ انجان زبان میں چند آوازیں نکالیں۔ ڈرگین نے اس کی طرف گردن موڑی۔ مفید نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔

سپاہیوں کے تیر کمان ابھی تک ہاتھوں میں تھے۔ خود تالیہ کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ تیر تیار تھا۔ ادھر ڈرگین حملہ کرتا، ادھر وہ اس کے اندر تیر اتار دیتی۔

مگر ڈرگین نے چند لمحوں کے لیے مفید کی بات سنی، پھر واپس مڑا اور درختوں کی طرف جانے لگا۔ ایڈم نے گہرا سانس لیا۔ تالیہ کی بھی تیر کمان پہ گرفت ڈھیلی ہوئی۔

”تم نے اچھا فیصلہ کیا، مفید! اب ہمیں راستہ دکھاؤ۔ خزانہ کہاں ہے اور تم یقین رکھو واپس جا کے میں....“

”راجہ سے کہنا، مجھے معاف کر دے“ میں خزانے کی حفاظت نہیں کر سکا۔“ مفید نے آنسوؤں بھری آنکھوں سے کہتے ہوئے اپنے ہاتھ میں لگا تیر ایک دم چیخ نکالا اور پھر... اگلے ہی لمحے... اسے اپنے سینے میں پیوست کر لیا۔ زور سے اس کی چیخ نکلی اور وہ زمین پر گر کے تڑپنے لگا۔

مجھے بھر کو وہ سب ششدر رہ گئے۔ پھر ایڈم بے اختیار اس کی طرف بھاگا۔

اور صرف ایڈم نہیں تھا جو اس کی طرف بھاگا تھا۔ جنگل کی طرف جاتا کموڈو ڈریگن بھی اپنے مالک کی چیخ سن کے تیزی سے واپس لپکا تھا۔

اگلے ہی لمحے سپاہیوں کے تیر فضا میں بلند ہوئے اور ڈریگن کے جسم میں پیوست ہو گئے۔ تالیہ کا تیر اس کی آنکھ میں لگا۔ ڈریگن گھائل ہو کے زمین پہ لوٹنے لگا۔ اس کے حلق سے چیخیں نکل رہی تھیں۔

”اسے مت مارو....“ ایڈم منت بھرے انداز میں چلایا۔ ”خدا را اسے مت مارو۔“

تالیہ نے چیخ کی ڈوری گردن تلے سے کھینچی چغہ کندھوں سے ڈھلک کے زمین پہ جا گرا۔ پھر اس نے تیر کمان پرے پھینکا اور تلوار میان سے نکالی۔

درندہ التازمین پہ گرا تڑپ رہا تھا۔ تیر زہر میں بجھے تھے اور اثر دکھارہے تھے۔ تالیہ تلوار لیے تیزی سے اس کے سر پہ آئی۔

”چے تالیہ.... اس کو مت ماریں.... یہ ایک معصوم جانور ہے۔“ ایڈم چلاتا ہوا اس کی طرف بڑھا۔ مگر تالیہ نے زور سے تلوار اس کی گردن پہ دے ماری۔

ڈریگن کے سر میں بڑا سا کٹ بڑ گیا۔ اس کی تڑپ دم توڑ گئی۔ آنکھوں سے زندگی کی روشنی نکل گئی۔

ایڈم ساکت کھڑا رہ گیا۔

تالیہ اسی طرح آگے بڑھی اور زمین پہ گرے مفید کو گردن سے دو بچ کے اٹھایا۔ پھر اس کے سینے سے زور سے تیر باہر چیخ نکالا۔ خون بھل بھل گرنے

لگا۔

”جنگل میں رہتے ہو اتنے سے زخم سے مر نہیں جاؤ گے۔“ اس کا چہرہ اپنے سامنے کیے وہ غرائی۔ وہ مسلسل کراہ رہا تھا۔

”ٹائٹل بند کرو۔ راجہ کے چوری کے مال کی حفاظت نے تمہیں یہ دن دکھایا ہے۔ اب سیدھی طرح مجھے خزانے کا راستہ دکھاؤ تاکہ تمہاری جان بخش دوں۔ ورنہ خدا کی قسم تمہارے جسم میں اتنے گھاؤ لگاؤں گی کہ گھٹنوں تکلیف سے تڑپتے رہو گے۔“ اس کی گردن کو جھٹکا دیا تو تکلیف سے بے حال شکار باز فوراً ایک طرف اشارہ کرنے لگا۔

”ادھر.... غار میں.... ہے خزانہ۔“ سپاہی فوراً مشعلیں اٹھائے اس طرف لپکے۔

تالیہ اس کی گردن دبوچے آگے بڑھنے لگی پھر رک کے مڑی اور ایڈم کو سنجیدگی سے دیکھا۔

”سارے بھاؤ تاؤ جنگ سے پہلے ہوتے ہیں۔ لیکن جب ایک دفعہ لڑائی شروع ہو جائے تو دشمن پہ ترس کھانا کمزوری ہوتی ہے ایڈم! اور یہ اصول ہر زمانے کے لیے ہے۔“ اور اسے لیے آگے بڑھ گئی۔ ایڈم بس شل سا کھڑا رہ گیا تھا۔

سپاہی اب غار کی طرف بڑھ رہے تھے اور سر کٹا کموڈو ڈریگن خون کے تالاب میں بے حس و حرکت پڑا تھا۔

☆☆☆

سلطنت محل کی مخروطی چھتوں پہ اس رات بارش برس رہی تھی۔ اپنی خواب گاہ سے لمحہ بالکونی میں سلطان مرسل شاہ کھڑا تھا۔ کمر پہ ہاتھ باندھے شاہی قبا میں ملبوس وہ نیچے دور تک پھیلے تاریک سبزہ زار کو دیکھ رہا تھا۔ پانی چھت کے کناروں سے پھسلتا بالکونی کے ستونوں پہ لڑھک رہا تھا۔ موسم خاصا خوش گوار تھا۔

”آقا!“

ملکہ کی آمد کی منادی کے چند ثانیے بعد یان سوفو اس کے عقب میں آکھڑی ہوئی تو مرسل چونکا۔ پھر

اس کی طرف گھوما۔

”ملکہ! طبیعت کیسی ہے آپ کی؟ مجھے خبر ملی تھی کہ آج قدرے بیمار تھیں آپ۔“

”میرے بابا کی جان آپ نے بچائی ان کی نظر بد کا علاج ہو گیا اس سے زیادہ اور کیا چاہیے مجھے آقا؟“ اس نے مسکرا کے تعظیم پیش کی۔ پھر سیدھی ہوئی اور ان ہی مسکراتی آنکھوں سے سلطان کو دیکھا۔

”آپ کو مجھ سے بات کرنی تھی؟“

وہ دونوں بالکونی میں آمنے سامنے کھڑے تھے ارد گرد بارش برس رہی تھی مگر وہ محفوظ تھے۔

”جی ہاں۔“

”حکم کیجیے آقا!“ وہ اس کی آنکھوں پہ مسکراتی نظریں جمائے ہوئے تھی۔

”اب تک آپ کو اطلاع تو مل گئی ہوگی کہ میں شادی کرنے جا رہا ہوں۔ تیاری شروع ہو چکی ہے اور انتظامات کیے جا رہے ہیں۔“

یان سوفو کے چہرے پہ ایک دم ڈھیروں اداسی بکھر گئی۔ اس نے سر جھکا لیا۔ ”جی آقا! سنا تو تھا میں نے مگر یقین نہیں آیا تھا۔“

”آپ خفا ہوا گی؟ یقیناً۔“ مرسل شاہ پرسکون سا پوچھ رہا تھا۔

”یہ تو شہزادیوں کی قسمت ہوتی ہے آقا۔“ ملکہ نے تھکی تھکی سی پلکیں اٹھائیں۔ ”میرے بابا کے حرم میں تین بیویاں اور کئی خواتین تھیں۔ میں نے اپنی والدہ کی تکلیف دیکھی ہے۔ یہ نہیں کہوں گی کہ مجھے فرق نہیں پڑتا۔ فرق تو پڑتا ہے۔ دل دکھتا ہے لیکن....“ وہ زخمی سا مسکرائی۔

”اگر آقا کی خوشی اسی میں ہے تو میں اعتراض نہیں کروں گی۔ میں اس تقریب میں شامل بھی ہوں گی اور کھلے دل سے آپ کی نئی منکوحہ کو خوش آمدید کہوں گی۔“

مرسل شاہ کا چہرہ کھل اٹھا۔ وہ پورے دل سے مسکرایا۔ ”مجھے آپ سے یہی امید تھی ملکہ! جو ہونا ہے وہ ہونا ہی ہے۔ لیکن میں آپ کو اتنا یقین دلا سکتا ہوں

کہ آپ ملاکہ سلطنت کی ملکہ ہیں اور رہیں گی۔“

”سارے سلاطین دوسری شادی سے پہلے یہی کہتے ہیں آقا۔“ وہ بجھے دل سے مسکرائی۔ پھر سر جھٹکا۔ ”خیر.... کیا کسی خاتون کا انتخاب کیا ہے آپ نے یا یہ کام بھی مجھے کرنا ہوگا؟“ (شاہی دستور کے مطابق بعض دفعہ ملکہ خود سلطان کی نئی منکوحہ یا خاتون چنتی تھی۔)

”کیا آپ کو نہیں معلوم۔“ سلطان حیران ہوا۔

”میں نے شہزادی تاشہ کا انتخاب کیا ہے۔ مگر آپ کو کیسے معلوم ہوگا۔ یہ نام میرے اور مراد راجہ کے درمیان ہی تھا اب تک۔“

”شہزادی تاشہ؟“ ملکہ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

بالکونی کے باہر زور کی بجلی کڑکی۔ پل بھر کو سارا محل روشن ہو گیا۔ جگہ جگہ زمین پہ پانی کھڑا نظر آتا تھا۔ اگلے ہی پل اندھیرا چھا گیا۔

”جی۔ مراد راجہ کی دختر۔“

”مگر....“ ملکہ بے اختیار الجھن سے بولی۔

”شاہی دستور کے مطابق.... آپ کے نکاح میں آنے والی خاتون کا چند شرائط پہ اترنا ضروری ہے آقا!“

”تو شہزادی تاشہ کسی لحاظ سے کم نہیں ہیں۔ وہ ہمارے خاندان سے تعلق رکھتی ہیں ان کی رگوں میں ہمارا ہی خون ہے۔ پھر وہ خوبصورت ہیں اور شاہی آداب جانتی ہیں۔“ مرسل شاہ نے سینہ اکڑاتے ہوئے فخر سے کہا تھا۔

ملکہ چند لمحے سادگی سے اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔

”تو پھر.... طلاق دلوائیں گے اسے یا اس کے شوہر کی گردن ماری جائے گی؟“

بادلوں کے گرجنے کی زوردار آواز سنائی دی۔ ایسی دہشت ایسی گرج کہ محل کے ہر ذی نفس کی روح تک کانپ گئی۔

مرسل شاہ بھونچکا کھڑا رہ گیا۔

”کیا کہہ رہی ہیں آپ ملکہ؟“ اس کی رنگت سرخ پڑنے لگی۔ ”دماغ درست ہے آپ کا؟“

”میرا دماغ تو درست ہے آقا لیکن آپ کی معلومات درست نہیں۔ شہزادی تاشہ نے خود مجھے اعتماد میں لیتے ہوئے بتایا تھا کہ چین سے جو آدمی اس کے ساتھ آیا ہے وہ اس سے شادی کر چکی ہیں۔ کیا آپ کو مراد راجہ نے نہیں بتایا؟ حیرت ہے۔ وہ اپنی شادی شدہ بیٹی کو کنواری لڑکی کے طور پر کیسے پیش کر سکتا ہے۔ چچ چچ۔ یہ تو سنگین جرم ہے۔ گناہ کبیرہ ہے۔“ وہ خود حیران تھی۔

”آپ کو....“ مرسل کی آواز بلند اور آنکھیں سرخ ہوئیں۔ ”غلط فہمی ہوئی ہوگی۔ شہزادی تاشہ غیر شادی شدہ ہیں۔“ اس کا تنفس تیز ہو گیا تھا۔

”آپ خود شہزادی سے اللہ تعالیٰ کی پاک کتاب پہ ہاتھ رکھو کے پوچھ لیں۔ اگر اس نے اس شادی سے انکار کیا تو میری گردن مار دیجیے گا مگر آقا.... وہ لڑکی شادی شدہ ہے اور اس کے شوہر کو مراد راجہ نے اپنے محل میں پناہ دے رکھی ہے۔ آپ کو جس سے شادی کرنی ہے کیجیے آقا لیکن بزرگوں کے رسم و رواج کو ٹھوکر مار کے نہیں۔ یہ آپ کی خاندانی غیرت اور حمیت کا سوال ہے۔“ وہ اس کی آنکھوں سے نظریں ہٹائے بغیر کہہ رہی تھی۔ مرسل کے چہرے پہ ایک رنگ آ رہا تھا ایک جا رہا تھا۔

”یہ جھوٹ ہے۔ میں نہیں مانتا۔“ وہ ایک دم ملکہ کے قریب سے گزرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ ملکہ یان سو فو نے آرام سے اسے جاتے ہوئے دیکھا اور زیر لب بڑبڑائی۔ ”چچ چچ“ پھر افسوس سے سر جھٹکا۔

بالکونی کی مخروطی چھت کے کنارے ٹپکے جا رہے تھے۔ بارش میں تیزی آگئی تھی۔

☆☆☆

جس غار کی حفاظت کموڈو ڈریگن کر رہا تھا اس کا راستہ تنگ اور تاریک تھا لیکن زخمی مفید کراہتا ہوا تالیہ کی راہنمائی کرتا، انہیں اندر لے آیا۔

غار کے اندر پتھروں کا ڈھیر لگا تھا۔ سپاہیوں

نے فوراً پتھر ہٹائے تو وہاں زمین میں ایک ڈھکن بنا تھا۔ ایک سپاہی نے ڈھکن اٹھایا دوسرے نے اندر روشنی کی۔ وہاں سیڑھیاں نیچے جاتی تھیں۔ محض پندرہ بیس سیڑھیاں جن کو اتر کے ایک بڑا سا کمرہ آ جاتا تھا۔

اس نے مفید کی گردن چھوڑ دی۔ دوسپاہی اس کی پٹی وغیرہ کرنے اسے باہر لے گئے۔ دیگر سپاہی نیچے اترے اور کمرے کی دیواروں پہ لگی مشعلیں روشن کیں۔ پل بھر میں وہ کمرہ خوب روشن ہو گیا۔

تالیہ مراد کے کندھے پہ تیروں سے بھرا ترکش تھا اور ہاتھ میں پکڑی تلوار سے ڈریگن کا خون ٹپک رہا تھا۔ وہ مٹی کی سیڑھیاں قدم قدم نیچے اترنے لگی۔ لبوں پہ مسکراہٹ تھی۔ اداسی سے بھری مسکراہٹ۔

ایک زینہ.... دوسرا زینہ.... جیسے جیسے وہ اترتی گئی کمرہ سامنے آنے لگا۔ اس میں قطار در قطار لکڑی کے صندوق رکھے تھے۔ سپاہیوں نے فوراً صندوقوں کے منہ کھول دیے تھے۔ اندر سونے کے موٹے موٹے سکے چمکتے دکھائی دے رہے تھے۔

اس نے ایک عرصہ یہ منظر دیکھنے کی خواہش کی تھی۔

کوئی رازوں سے بھرا کمرہ جس کا دروازہ وہ کھولے گی تو اندر سونے کے ڈھیر لگے ہوں گے۔

آج وہ پندرہویں صدی کے قدیم ملاکہ کے اس جزیرے کے زینے اتر رہی تھی اور سامنے موجود کمرہ ڈھیروں خزانے سے بھرا۔ دکھائی دیتا تھا۔

بالآخر اسے خزانہ مل گیا تھا۔

ایڈم اس کے عقب میں زینے اتر رہا تھا۔ وہ خاموش تھا مگر سبھل چکا تھا۔

تالیہ پہلے صندوق تک آئی اور اندر ہاتھ ڈالا۔ سکوں کی کھنک.... سونے کی چمک.... اس کے جذبات مچنے لگے۔

وہ دوسرے صندوق تک آئی.... ہاتھ اس کے سکوں کے اوپر سے گزارا۔ سونے کا لمس.... وہ ٹھنڈک.... وہ چمک جو آنکھوں کو خیرہ کر دیتی تھی۔

”تم لوگ اوپر جاؤ۔“ ایڈم نے سپاہیوں کو اشارہ کیا تو وہ سر تسلیم خم کرتے اوپر کی طرف چلے گئے۔

دیواروں پہ لگی مشعلوں کے شعلے جل رہے تھے اور زرد روشنی میں وہ دونوں اس دولت سے بھرے کمرے میں تنہا کھڑے نظر آ رہے تھے۔

”یا اللہ.... اتنا سونا.... اتنی دولت۔“ وہ ایک صندوق پہ جھکی۔ جس میں طرح طرح کے زیورات کا ڈھیر لگا تھا۔ اس نے ہاتھ سے چند زیورات اٹھائے اور ان کو واپس اندر گرا دیا جیسے ان سے کھیل رہی ہو۔

”یہ آپ کے نہیں ہیں جے تالیہ۔“ ایڈم کھنکھارتا ہوا آگے آیا اور صندوق کا ڈھکن بند کیا۔ وہ بنے بغیر اگلے صندوق تک آئی اور اس میں رکھی سونے کی ننھی اینٹ اٹھائی۔

”خالص سونا۔ اس کی چمک دیکھو۔ اس کو محسوس تو کرو ایڈم۔“ اس کے چہرے پہ بچوں جیسی خوشی تھی۔

”یہ ملاکہ کے غریب لوگوں کی امانت ہے جے تالیہ۔“ ایڈم نے جلدی سے اینٹ اٹھا کے واپس اندر ڈالی اور دھڑام سے اس صندوق کا بھی ڈھکن گرایا۔ وہ بدقت ضبط کر رہا تھا۔

مگر وہ مست مگن سی ایک کے بعد ایک صندوق کی طرف جارہی تھی۔ سونے میں ہاتھ ڈالتی اور کچھ نہ کچھ نکال لیتی۔ ایڈم بار بار اس کے پیچھے لپکتا اور ہر چیز اس سے واپس لے کر اندر ڈالتا۔

”یہ امانت ہے جے تالیہ۔ ہم اس کو نہیں چھو سکتے۔“

”سوچو.... اگر یہ ہمارا ہو جائے تو....“

”جے تالیہ!“ وہ ناراض ہوا تو اس نے گہری سانس لی اور زروٹھے پن سے اسے دیکھا۔

”جانتی ہوں، جانتی ہوں۔ مگر تھوڑی دیر کے لیے خوش تو ہو لینے دو۔“

”آپ نے خوشی خوشی میں اس خزانے میں نقب لگانا شروع کر دینا ہے۔“

”جے فکر ہو۔ اب میں اپنی اصلاح کر چکی ہوں۔ اب میں چوری نہیں کرتی۔“ وہ مڑ کے جانے لگی۔

”جی، اسی لیے آپ نے ہر صندوق سے چند اشرفیاں اور اس والے سے تھوڑا سا زیور کھسکا کے اپنی جیب میں ڈالا ہے۔“ وہ اس کے سامنے آکھڑا ہوا اور کڑے تیوروں سے اسے دیکھتے پھیل پھیلائی۔ تالیہ نے خفگی سے پلکیں اٹھائیں اور اسے دیکھا۔

”اتنے.... سارے خزانے میں سے دو تین چیزیں نکال لینے سے کس کا نقصان ہوگا؟“

”ہمارے ایمان کا نقصان ہوگا۔ اور وہ سب سے بڑا نقصان ہوتا ہے۔ اب واپس کریں سب۔“

تالیہ نے (ہونہہ) کر کے سر جھٹکا اور جیبیں الٹ دیں۔ زیور انگوٹھی سکے نکال کے اس کی پھیلی رکھے۔

”اور وہ جو آپ نے کان کے پیچھے بال اڑستے ہوئے سکے اپنے جوڑے میں چھپایا تھا وہ بھی دیں۔“

تالیہ نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے بالوں میں ہاتھ ڈالا اور سکے اس کی پھیلی پہ پٹخا۔ ایڈم کے لبوں پہ فاتحانہ مسکراہٹ بکھر گئی۔

”میدان جنگ میں نہ دشمن پہ ترس کھاتے ہیں نہ دوست کی طرف سے آنکھیں بند کرتے ہیں۔“ سمجھ داری سے اسے بتایا۔

تالیہ اسے نظر انداز کر کے آگے بڑھ گئی۔

کمرے کے کونے میں ایک ڈیوڑھی سی بنی تھی جس میں مختلف خانے تھے۔ ان میں عجیب و غریب چیزیں رکھی تھیں۔ کڑے، انگوٹھیاں۔ تالیہ ایک سونے کی گڑیا۔ اور سب سے اوپر ایک بوتل تھی۔ وہ اس بوتل کو پہچانتی تھی۔

اس نے بوتل اٹھائی اور اسے اوپر کر کے غور سے دیکھا۔

کانچ کی بنی بوتل خالی تھی۔ صرف پینڈے میں چند قطرے جتنا باقی ماندہ مائع موجود تھا۔

”ایسی ہی بوتل میں ایک مشروب کے اندر

چابی رکھی ہوتی تھی۔“ وہ بڑبڑائی۔

”مگر اب یہ خالی ہے۔“

”خالی ہے نہیں۔ اس کو خالی کیا گیا ہے۔“ اس نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے واپس رکھی۔ ”باپا کے ملازم یقیناً چابی کو کہیں اور لے گئے ہیں۔ شاید واپس باپا کے پاس۔“ وہ اس کی طرف گھومی تو قدرے فکر مند لگتی تھی۔

”اب ہم چابی کیسے ڈھونڈیں گے؟“

تالیہ نے ایک نظر اطراف میں دوڑائی۔ ”ابھی چابی کی فکر نہیں کرنی۔ وان فاح کا کہنا تھا کہ ہمیں پلان کے مطابق چلنا ہے۔ اس لیے بہتر ہے کہ ہم پلان کے مطابق چلیں۔“

”ٹھیک ہے۔“ ایڈم نے گہری سانس لی اور ایک عزم سے بولا۔ ”میں ان صندوقوں کو باہر نکلواتا ہوں۔ پھر میں واپس چلا جاؤں گا اور....“

”نہیں ایڈم!“ وہ بولی تو آنکھیں ایڈم کی آنکھوں پہ جمی تھیں۔ ”یہ خزانہ تم نے ڈھونڈا ہے۔ یہ جزیرہ تم نے ڈھونڈا ہے۔ تمہارے الفاظ نے ڈریگن کے مالک کو مجبور کیا کہ وہ پسپائی اختیار کرے۔ اس خزانے کا راز تمہارا ہے۔ اس راز کو افشا کرنا بھی تمہارا حق ہے۔“

”مگر....“ ایڈم لمحے بھر کو گنگ ہو گیا۔ ”پلان کے مطابق مجھے واپس جانا تھا اور آپ کو بعد میں یہ خزانہ لے کر واپس ملا کہ آنا تھا۔ آپ شہزادی ہیں اور میں تو بس.... (نگاہیں جھک گئیں)۔ ایک ادنیٰ غلام ہوں۔“

”اور ساتھ میں ایک بھگوڑے فوجی بھی ہو۔ مگر خیر....“ شہزادی نے بڑی نخوت سے گال پہ آئی لٹ پیچھے کی۔ ”تم بھی کیا یاد کرو گے۔ کیا اعزاز بخشے جا رہی ہوں تمہیں۔“

”کیا واقعی؟“ اس نے حیران سی نظریں اٹھائیں۔ ”آپ مجھے اس خزانے کا امین بنا رہی ہیں؟“

”میں جانتی ہوں۔ پلان کے مطابق مجھے یہیں

رہ کے اگلے مرحلے کا انتظار کرنا تھا مگر میں نے واپس جانے کا فیصلہ کیا ہے۔ مجھے ملکہ کی طرف سے خطرہ ہے۔ وہ فاح کو مشکل میں نہ ڈال دیں۔“

”مگر وان فاح کو تو کبھی کسی کی ضرورت نہیں رہی۔“

”یہ ان کا خیال ہے اور ضروری نہیں کہ ان کا ہر خیال درست ہو۔“ پھر تالیہ نے گردن گھمائی اور خزانے سے بھرے کمرے کو دیکھا۔

”تمہاری ماں نے کہا تھا کہ ایک دن آئے گا جب ایڈم بن محمد کو اللہ تعالیٰ زمین میں مدفن خزانوں کے راز سمجھا دے گا اور اس دن ایڈم دنیا کے بڑے بڑے حکمرانوں اور بادشاہوں سے بھی زیادہ طاقت ور ہوگا اور میں نے کہا تھا۔ آمین۔ شاید یہ وہی دن ہے ایڈم! تم اس خزانے کے مالک ہو۔ اب یہ تمہارا امتحان ہے کہ تم حق کے لیے کھڑے ہوتے ہو یا نہیں۔ رہی میں تو میرا خزانہ سن باؤ کے گھر چھپا ہے اور میرا مراد مقصود صرف وہ چابی ہے۔ اس لیے مجھے جانا ہوگا۔“

تالیہ مراد کی آواز میں تحکم کی ہلکی سی رمت موجود تھی۔ ایڈم بن محمد نے سر کو تسلیم خم کر دیا۔

شہزادی حکم سنا کے اب سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ اس کے کندھے کی پشت پہ بندھے ترکش میں اب بھی کافی تیر باقی تھے۔ پے تالیہ کے منصوبوں کی طرح۔

وہ خزانے سے بھرے کمرے میں تنہا کھڑا سوچ رہا تھا۔

”اگر یہ وہ دن ہے.... جب مجھے زمین کے خزانوں کا راز معلوم ہو جانا تھا.... تو مجھے دنیا کے سارے بادشاہوں سے زیادہ طاقت ور ہونا تھا۔ پھر اتنا طاقت ور کیوں نہیں محسوس کر رہا میں خود کو؟“

وہ سوچ رہا تھا۔ حیران۔ پریشان۔ سپاہی اب نیچے اتر رہے تھے۔ کچھ کو تالیہ کے ساتھ واپس جانا تھا۔ کچھ کو ایڈم کے ساتھ یہیں رہ کے اگلے مرحلے کا انتظار کرنا تھا۔

☆☆☆

مدھم مدھم بتیاں مراد راجہ کی خواب گاہ کو نیم روشن کیے ہوئے تھیں۔ وہ کمرے کے ایک کونے میں بیٹھا تھا۔ چوڑی مار رکھی تھی۔ اور ارد گرد تیرہ موم بتیاں قطار میں جلا رکھی تھیں۔ سامنے ایک بھری ہوئی بوتل رکھی تھی جس کے پینڈے میں سنہری سکھ اور زنجیر تیر رہی تھی۔ وہ آنکھیں بند کیے دونوں ہاتھ بوتل سے چند انچ اوپر پھیلائے زیر لب کچھ پڑھ رہا تھا جب دروازے پہ دستک ہوئی۔

مراد نے توجہ نہ دی۔ وہ اسی طرح آنکھیں موندے منتر پڑھنے میں مصروف رہا۔

دفعتاً دوبارہ دستک ہوئی۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔ وہ سرخ پڑ رہی تھیں۔

دستک تو اتر سے ہونے لگی۔

مراد نے برہمی سے دروازے کو دیکھا۔ پھر پھونک مار کے ساری موم بتیاں بجھا دیں۔ کمرے میں اندھیرا چھا گیا۔ وہ اندھیرے میں اٹھا۔ کھڑکی تک گیا۔ پیالے سے پانی لے کر چہرے پہ ڈالا پھر دیاسلائی سلگائی اور قدیل روشن کی۔

اندھیرا چھٹا اور اب کی دفعہ کمرہ عام روشنی سے روشن ہوا۔ وہ موم بتیوں کی نحوست بھری روشنی عنقا ہو چکی تھی۔

اس کے گیلے چہرے کے تاثرات نارمل ہو چکے تھے اور آنکھوں کی سرخی کم تھی۔ سادہ سفید کرتے پا جاے میں ملبوس مراد نے سرخ پٹی ماتھے پہ باندھی اور دروازے کی طرف بڑھا جو مسلسل بج رہا تھا۔

”کون سا عذاب آگیا تھا جو مجھے اس وقت تنگ کیا ہے؟“ پٹ کھولتے ہی وہ دھاڑا۔ ”کیا جانتے نہیں ہو، یہ بندہ ہارا کی عبادت کا وقت ہوتا ہے۔“

”راجہ!“ سپاہی نے دونوں ہاتھ باندھے عرض کی۔ ”سلطان کا پیغام آیا ہے۔ آپ کو فوری طور پہ بلا بھیجا ہے۔“

”اس وقت؟“ مراد کے ماتھے پہ بل پڑے۔

”سلطان نے.... کہا ہے کہ....“ سپاہی نے تھوک نگلا۔ ”اگر مراد اپنے پیروں پہ چل کے نہ آئے تو بیڑیوں میں لے آؤ۔“

ملا کہ سلطنت کے عظیم بندہ ہارا مراد راجہ کے ماتھے کی ساری شکنیں غائب ہو گئیں۔

”ہوا کیا ہے؟“ اسے پریشانی ہوئی۔

”معلوم نہیں راجہ۔ مگر آقا سخت برہم لگ رہے ہیں۔“

”چلو۔“ وہ فوراً مڑا اپنی قبا اٹھا کے کندھوں پہ ڈالی پیروں میں جوتی کھینچی، تلوار اٹھانے لگا پھر واپس رکھ دی۔ اس کے کسی انداز سے جارحیت کی بو نہیں آتی جا ہے۔

باہر نکلنے سے قبل وہ بوتل کو خاص جگہ پہ چھپانا نہیں بھولا تھا۔

☆☆☆

تین چاند والے جزیرے کی وہ چھوٹی پہاڑی چاندنی میں دمک رہی تھی۔ اس کی چوٹی پہ بڑا سا شیشہ تراش کے لگایا گیا تھا یا شاید وہ نمک تھا جو اتنا شفاف تھا کہ چاند کا عکس اس میں جھللاتا تھا۔

دوسرا چاند سمندر پہ تیر رہا تھا اور تیسرا چاند آسمان پہ بادلوں کے اوپر ٹیک لگائے نیم دراز نیچے جزیرے کے ساحل کو دیکھ رہا تھا۔

دور افق پہ مدھم سی روشنی دکھائی دیتی تھی۔ سیاہ آسمان جامنی ہو رہا تھا اور ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ صبح ہونے میں کم وقت رہ گیا تھا۔ ایسے میں ساحل پہ کھڑی کشتی کو سپاہی سفر کے لیے تیار کر رہے تھے۔

چند سپاہی پہاڑی کے دامن میں غار کی طرف آتے جاتے دکھائی دیتے تھے۔

تالیہ اور ایڈم کشتی کے ساتھ کھڑے تھے۔

آمنے سامنے۔ تالیہ نے اپنا چغہ پہن رکھا تھا تیز ہوا سے اس کے بال بار بار چہرے پہ آتے جن کو وہ کانوں کے پیچھے اڑتی۔ ایڈم اداس مسکراہٹ سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”احتیاط سے جائیے گا۔ سمندری سفر خطرے

سے خالی نہیں ہوتا۔“

”ہمیشہ مایوسی کی باتیں کرتے ہو ایڈم۔“ وہ بے فکری سے مسکرائی۔ ”ہم پلان یہ چل رہے ہیں تو ڈر کیسا؟ بس کل تک میں واپس ملا کر پہنچ جاؤں گی۔ تم تب آنا جب دوسرا مرحلہ پورا ہو جائے۔“ اس نے ذومعنی انداز میں یاد دلایا۔

ایڈم نے سر اثبات میں ہلایا۔ پھر آنکھوں کی پتلیاں سکڑ کے غور سے اسے دیکھا۔

”کیا واقعی آپ یہاں سے کچھ چرا کے نہیں لے جا رہے؟ آپ چوری سے جاسکتی ہیں۔ ہیرا پھیری سے نہیں۔“

”ارے وہ سب تو میں نے مذاق میں اٹھایا تھا۔“ وہ کھلکھلائی۔ ”ابھی اتنی ٹرس نہیں سکھائیں تمہیں کہ میرے ہاتھ کی صفائی پکڑ سکو۔“

”میری نظر بہت اچھی ہے جے تالیہ! یاد کریں، مسز عصرہ کی گیلری میں پہچان گیا تھا کہ آپ تنگو کامل کی ملازمہ ہیں۔“

اور وہ دونوں ہنس پڑے۔ پھر تالیہ نے گردن گھمائی۔ وہ دونوں ساحل پہ کھڑے تھے اور سامنے چاندنی سے چمکتے پانی کا سمندر بہہ رہا تھا۔ خاموش ساکن سمندر۔ پندرہویں صدی کا سمندر۔

”وقت کے اس پار کیا ہو رہا ہوگا ایڈم؟“ نیلے پانی کو دیکھتے ہوئے اس کی آواز میں اداسی گھل گئی۔

”میں تو صرف یہ سوچ رہا ہوں کہ پانی کے اس پار کیا ہو رہا ہوگا۔ اگر وان فاح کا راز کھل گیا اور راجہ نے ان کو گرفتار کر لیا یا ان کی جان لینے کی کوشش کی تو کیا ہوگا۔“

”نہیں۔ باپا ان کو یوں ایک دم مار نہیں دیں گے۔“

”یہی تو میں سوچ رہا ہوں کہ اگر راجہ نے ان کو مارا نہیں بلکہ چٹاؤ کا اختیار دے دیا تو وہ کس کو چنیں گے۔“

تالیہ چونکی۔ سمندر کی لہریں پل بھر کو ختم گئیں۔ سارا جزیرہ دم سادھے سننے لگا۔

”کیا مطلب؟“

”یاد رکھیے گا۔ اگر ان کو چٹاؤ کا موقع ملا تو وہ آپ کو یا مجھے کبھی نہیں چنیں گے۔“

تالیہ کی رنگت گلابی پڑنے لگی۔ ماتھے پہ بل در آئے۔ ”تم میں اور مجھ میں فرق ہے ایڈم۔“

”صرف اتنا کہ آپ سے انہوں نے نکاح کیا ہے مگر یاد رکھیے گا۔ وہ ہمیشہ ہمارے ہیرو ہیں گے اور ہم ان کے فینز۔ ادنیٰ کارکن۔ بس!“

”تمہیں کیوں لگتا ہے باپا ان کو چٹاؤ کا اختیار دیں گے اور کس قسم کے چٹاؤ کی بات کر رہے ہو تم؟“ وہ ابھی ہوئی تھی۔ اسے یہ باتیں ناگوار گزر رہی تھیں۔

”یہ مجھے نہیں معلوم۔ مگر اتنے مہینے ایک محل میں رہا ہوں میں جے تالیہ۔ اتنا تو بتا سکتا ہوں کہ یہ حکمران بڑے فیصلوں میں ہم ادنیٰ کارکنوں کو شریک نہیں کرتے۔ اس لیے..... اگر آپ کو چٹاؤ کا موقع ملے تو میرے جزیرے سے آنے کا انتظار مت کیجیے گا۔ خود اس دروازے کو پار کر لیجیے گا۔“

”نہیں ایڈم!“ وہ بولی تو آنکھوں میں قدرے غصہ تھا۔ ”ہم ایک ساتھ آئے تھے اور ایک ساتھ ہی جائیں گے۔ اگر ہم میں سے کوئی مر گیا تو اس کی لاش ساتھ جائے گی۔ تم فی الحال اس خزانے کو سنبھالو۔ میں ملاکہ میں تمہاری منتظر رہوں گی۔“

اس کا انداز قطعی اور حتمی تھا۔ ایڈم نے پھر سے سر کو خم دیا۔

”الوداع شہزادی!“

تالیہ نے چغے کی ٹوپی سر پہ برابر کی اور کشتی کی طرف بڑھ گئی۔ اس پہ بیٹھتے ہی اس نے پیچھے مڑ کے دیکھا۔

ساحل کنارے چغہ پوش آدم بن محمد کھڑا اسے جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ چند سپاہی اس کے آس پاس کام کرتے دکھائی دے رہے تھے۔ ملاح سپاہی نے بادبان کھول دیا اور کشتی کو پانی میں دھکیل دیا۔ پھر چوچلانے لگا۔

وہ عرشے پہ ایک لکڑی کی چوکی پہ بیٹھ گئی اور رخ پانی کی طرف موڑ دیا۔ کن آنکھوں سے وہ ساحل کنارے کھڑے ایڈم کو دیکھ سکتی تھی۔

جب کشتی سمندر میں دور نکل آئی اور آسمان سے فجر طلوع ہونے لگی تو تالیہ نے چغے کے اندر ہاتھ ڈال کے نکالا تو اس میں ایک چمکتی ہوئی شے تھی۔

یہ وہ چیز تھی جو اس نے غار میں رکھی عجیب و غریب چیزوں میں سے اٹھائی تھی۔ یہ سونے کی ہیرا پن تھی جس کو جوڑے میں لگایا جاتا تھا۔ اس کے دہانے پہ ہرن کا چہرہ بنا تھا آنکھوں میں ہیرے لگے تھے۔ اور پیچھے جا کے وہ لمبی نوکیلی ہو جاتی تھی۔ تالیہ نے اسے اٹھا کے روشنی میں دیکھا اور مسکرائی۔

”ایڈم بن محمد..... یہ ملاکہ کے لوگوں کی نہیں میرے باپا کی شے ہے۔ جانے یہ کس لیے استعمال ہوئی ہے مگر نئے دور میں جا کے یہ اچھی خاصی قیمت پہ بک جائے گی۔ اس میں قیمتی ہیرے اور خالص سونا استعمال کیا گیا ہے۔ اس کو میں اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔“ وہ خوش اور مطمئن نظر آ رہی تھی۔ اس کی کشتی سمندر پہ تیرتی جزیرے سے دور ہوئی جا رہی تھی۔

☆☆☆

مراد راجہ جب سلطنت محل پہنچا تو صبح ہونے میں کافی وقت تھا۔ سپاہی اسے فوراً اندر لے گئے۔

مراد نے چہرہ بے تاثر رکھا مگر حقیقتاً وہ پریشان تھا۔ اسے ایک ملاقاتی کمرے میں بٹھا کے سپاہی چلے گئے۔ وہ کافی دیر انتظار کرتا رہا۔ بے چینی سے ٹپکتا رہا۔ ایک دو بار دربانوں کو آواز دی تو انہوں نے بتایا کہ آقا غسل فرما رہے ہیں۔ مراد ضبط کے گھونٹ پی کے رہ گیا۔

اسے مرسل نے پہلی دفعہ اتنا انتظار کروایا تھا۔ صبح کی پہلی کرن باہر آسمان پہ دکھائی دی تو مرسل شاہ کمرے میں داخل ہوا۔ وہ کہیں سے بھی حالت نیند میں نہیں لگتا تھا نہ بال گیلے تھے۔ شاید وہ اتنی دیر کچھ سوچنے میں مصروف رہا تھا۔ پیشانی سلوٹ

زده تھی۔ مراد نے غور سے اسے اندر آتے اور مسہری پہ براجمان ہوتے دیکھا۔ ایک ہاتھ گھٹنے پہ جمائے وہ سیدھا بیٹھا درے خفی سے مراد کو دیکھ کے بولا۔ ”آگئے تم؟“ ساتھ ہی اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

مراد آہستہ سے سامنے بیٹھا۔ ”کافی دیر ہو چکی آقا۔ خیریت تھی؟ کہیں بغاوت کا اندیشہ تو نہیں ہوا؟ یاد منن کا حملہ؟“ وہ بظاہر فکر مندی سے بولا مگر آواز میں معمولی سا گلہ بھی تھا۔

”مراد راجہ!“ مرسل نے بھنویں اکٹھی کر کے سنجیدگی سے اسے دیکھا۔ ”دشمن کے حملے سے زیادہ تکلیف وہ بات میرے لیے یہ ہوگی کہ میرا بندہ ہارا مجھ سے جھوٹ بولے۔“

مراد کی گردن میں گھٹی سی ابھر کے معدوم ہوئی۔ تاثرات میں حیرانی گھل گئی۔

”میری جان لے لیجیے آقا“ مگر مجھے بتائیے تو سہی کہ ہوا کیا ہے۔“ پھر اسے خیال گزرا۔ ”کیا چین سے قرضہ لینے کے فیصلے پہ میری رائے.....“

”تم نے اپنی بیٹی کو کنواری کیوں کہا جب کہ مجھے اطلاع ملی ہے کہ وہ شادی شدہ ہے۔“ وہ اکھڑے اکھڑے مگر مضطرب لہجے میں بولا تو مراد نے تعجب سے دونوں ابرو اچکائے۔

”میری بیٹی..... شادی شدہ؟“ پھر وہ ہلکا سا ہنس دیا۔ ”ایسا مذاق کس نے کیا آپ سے آقا؟“ وہ حیران تھا مگر جیسے محظوظ بھی ہوا تھا۔

مرسل کے تاثرات قدرے بدلے۔ چہرے کے تناؤ میں کمی آئی۔ وہ ذرا آگے کو ہوا۔

”تو یہ بات غلط ہے کہ ملک چین میں تمہاری بیٹی کی پہلے شادی ہو چکی ہے اور اس بات کو چھپا کے تم مجھ سے جھوٹ بول رہے تھے۔“ وہ بے چین لگتا تھا۔

کھڑکی کے پار جامنی آسمان سفید پڑ رہا تھا۔ روشنی اندر آئی تو کمرہ منور ہونے لگا اور قندیلوں کی روشنی ماند پڑنے لگی۔

”میں سمجھ گیا آقا۔“ مراد نے گہری سانس لے

جزیرے سے واپس نہیں لوٹتے تھے۔

پھر ایک سپاہی نے جنگل میں جانے کی ہمت کی اور تھوڑی دیر بعد چند پرندے شکار کر کے لے آیا۔ ویسے تو ان کے پاس کھانے کا دوا فر سامان موجود تھا مگر پرندے مل جانا بھی غنیمت تھا۔ اب دو افراد ان پرندوں کو آگ پہ بھونٹے دکھائی دے رہے تھے۔

ایڈم ساحل کے پتھروں کے پاس بیٹھا تھا۔ وہ کاغذ گھنٹوں پہ رکھے سیاہی میں قلم ڈبو ڈبو کے الفاظ صفحے پہ اتار رہا تھا۔

”مورخ صاحب!“ پیچھے سے ایک سپاہی نے اسے مخاطب کیا تو اس نے گردن موڑی۔

”ہاں کیا ہوا۔“

”میں سوچ رہا ہوں، لکڑیاں کاٹ کے کشتی بنانے کا انتظام کروں۔ شہزادی تاشہ کے چلے جانے کی وجہ سے ہمارے پاس کوئی کشتی نہیں ہے۔ بالفرض دوسرا مرحلہ ناکام ہو جاتا ہے تو ہم کیا کریں گے؟“ وہ فکر مند لگتا تھا۔

ایڈم ہلکا سا مسکرایا۔ ”ہاں، تم اپنا انتظام پورا رکھو مگر مجھے یقین ہے کہ ہم دوسرے مرحلے تک ضرور پہنچ جائیں گے۔ جو لوگ سچ کا ساتھ دینا چاہتے ہیں ان کے لیے راستے اللہ تعالیٰ خود کھولتا ہے۔“

سپاہی نے گردن موڑ کے درختوں کے چھپر تلے رکھے صندوق کو دیکھا اور پھر اس مورخ کو جو واپس کاغذوں کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ (سچ کیسا؟ ہم تو شہزادی کی غلامی اور احسانات کی وجہ سے ان سے وفا کر رہے ہیں۔ مگر خیر بڑے لوگوں کی بڑی باتیں۔)

پھر ایڈم کے قلم کاغذ کو دیکھا تو بولا۔ ”آپ لکھنے کا سامان ساتھ لائے تھے؟“ اسے حیرت ہوئی۔

”سراقہ کے کنگن والا واقعہ سنا ہے تم نے؟“ سادوئنگ؟“ وہ لکھتے ہوئے مسکرا کے بولا تو سپاہی سوچ میں پڑ گیا۔

”وہ صحابی جن کو عمر بن خطابؓ نے فتح ایران کے بعد کسریٰ کے کنگن بھجوائے تھے کیونکہ رسول اللہ

کے ساتھ جلتی قندیل کا شعلہ بے معنی سا لگتا تھا۔ اس نے لوہے کا ڈھکن اٹھایا تا کہ قندیل کے اوپر رکھ کے شعلہ بجھا دے۔

”اصل میں ملکہ نے بھی عجیب غلط سلط باتیں میرے ذہن میں ڈال دیں۔“ مرسل شاہ پیچھے بڑبڑا رہا تھا۔ ”وہ بولیں کہ تاشہ کی شادی اس مرد سے ہوگئی تھی جو اس کے ساتھ چین سے یہاں آیا ہے اور تو اور؟“ مراد راجہ نے اس کو اپنے محل میں پناہ دے رکھی ہے۔“ مراد نے زوردار آواز سے لوہے کا ڈھکن شعلے کے اوپر رکھا۔

ہوا کا رستہ رک گیا۔

شعلہ بجھ گیا۔

مگر اس کا ہاتھ ڈھکن پہ ساکت ہو گیا۔

مرسل کی طرف اس کی پشت تھی اس لیے مرسل اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکتا تھا جو ایک دم زلزلوں کی زد میں آ گیا تھا۔

سیاہ پڑتا ساکت چہرہ۔

اس نے ڈھکن سے ہاتھ ہٹایا تو وہ بہت وزنی محسوس ہوتا تھا۔ بدقت مراد راجہ نے قدم آگے بڑھائے اور باہر نکل گیا۔

راہداری میں تیز تیز قدم اٹھاتا بندہ ہارا اس چہرے کے ساتھ نہیں جا رہا تھا جس کے ساتھ وہ آیا تھا۔

☆☆☆

تین چاند والے جزیرے پہ بھی صبح طلوع ہو چکی تھی۔ سمندر کا پانی لہروں کی صورت بار بار ساحل سے ٹکراتا اور واپس پلٹ جاتا۔

پہاڑی کے دامن میں درختوں تلے صندوق قطار در قطار رکھے تھے اور ان کے اوپر لکڑیوں کے چھپر بنائے گئے تھے تاکہ وہ بارش سے محفوظ رہیں۔

سپاہی اب ایک طرف آگ جلا کے ناشتے کا انتظام کرنے میں مصروف تھے۔ جنگل کے اندر کوئی نہیں گیا تھا کیونکہ یقیناً وہاں بہت سے خونی کموڈو ڈرگین موجود تھے جو ہر سیاح کو کھا جاتے تھے اور لوگ اس

کر سر ہلایا۔ ”آپ کو ایسی بات کسی چین سے تعلق رکھنے والے نے کہی ہوگی۔ ظاہر ہے اس شادی پہ سب سے زیادہ تکلیف چینوں کو ہی ہوگی۔ کیا آپ نے سمجھ لیا تھا کہ یہ شادی آپ آرام سے کر لیں گے اور گستاخی معاف ملکہ کوئی رد عمل نہیں دیں گی؟ آپ تو برے سے برے حالات کے لیے بھی تیار تھے آقا! پھر اب ان فضول باتوں پہ کیوں دھیان دے رہے ہیں۔“ کمرہ مزید منور ہوا تو مرسل کے چہرے پہ آئے شک کے بادل بھی چھٹنے لگے۔

”یعنی..... شہزادی تاشہ کی کوئی شادی نہیں ہوئی اور وہ..... وہ میرے نکاح میں آسکتی ہیں۔“

مرسل کے چہرے پہ خوشی اور اندیشے ایک ساتھ موجود تھے۔ مراد راجہ سے مسکرایا اور آگے کو جھکا۔

”آقا! یہ صرف ایک سازش ہے مجھے آپ سے دور کرنے اور اس شادی کو روکنے کے لیے۔“

میری بیٹی غیر شادی شدہ ہے اور وہ آپ کی ہی ملکہ بنے گی۔ آپ اس کو بلوآ کے بھی پوچھ سکتے ہیں۔ میں خود قرآن پہ ہاتھ رکھ کے حلف لینے کو تیار ہوں۔ آپ ان واہموں سے نکل آئیں۔“

”اوہ۔“ مرسل شاہ نے گہری سانس لی۔ کھڑکی سے آتی روشنی نے کمرے کے سارے اندھیرے دور کر دیے تھے۔ فضا جیسے صاف ہو گئی تھی۔

”تو یہ صرف ایک سازش تھی؟ میں خواہ مخواہ اتنا پریشان رہا۔“ اس نے بے اختیار پیشانی مسلی جیسے بہت سے تناؤ کو خارج کیا۔

”یہ تو ابھی شروعات ہیں آقا! آگے بہت کچھ ہوگا۔ آپ کو خود کو مضبوط بنانا ہوگا۔ ہمیں مل کے ان سب سازشوں کا مقابلہ کرنا ہے۔“ پھر مراد نے کھڑکی سے باہر نگاہ دوڑائی۔ ”مجھے فوج کی مشقوں کی نگرانی کے لیے جانا ہے۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو.....“

”ہاں ہاں۔ تم جاؤ۔“ مرسل نے ہاتھ جھلایا۔ وہ مطمئن اور پرسکون نظر آنے لگا تھا۔ مراد ادب سے سر کو خم دے کے اٹھا اور اٹنے قدموں دروازے کی طرف بڑھا۔ کمرہ اتنا روشن ہو چکا تھا کہ دروازے

ہیں۔ میں اکثر مایوس ہوتا تھا کہ میں اس اعلیٰ مقام تک کبھی نہیں پہنچ سکتا جس کی مثالیں دی جاتی ہیں۔
وان فاح مجھے بڑی بڑی مثالیں دیا کرتے تھے۔ مگر مجھے ملا کہ نے یہ سکھایا ہے کہ انسان کو بڑے کام کرنے کے لیے پہلے چھوٹے چھوٹے کام کرنے پڑتے ہیں اور میں نے اس چھوٹے کام سے شروع کیا۔“ اس نے اپنا قلم اٹھا کے دکھایا۔
سادوئنگ خاموشی سے اسے دیکھے گیا۔ اس کی باتیں سننا اس کی مجبوری تھی۔

”قلم سے..... قلم نے اس واقعے میں کسی کی زندگی بچائی تھی۔ برسوں بعد بھی سراقہ بن مالک نے اس پروانے کو دکھا کے امن حاصل کیا تھا۔ تحریر میں جان بچانے کی طاقت ہوتی ہے سادوئنگ۔ جن لوگوں کو لکھنا آتا ہے ان کا نہ لکھنا گناہ ہوتا ہے اور مجھے لکھنا آتا ہے۔ جو سکون مجھے لکھنے سے ملتا ہے کسی چیز سے نہیں ملتا۔ اب لکھنا میری مجبوری ہے۔ میں اگر نہیں لکھوں گا تو ایک نعمت خداوندی کو ضائع کروں گا اور یہ گناہ ہے۔ تو میں یہ قلم کاغذ اس لیے ساتھ لایا تھا کیونکہ میں نے یہ بات اپنے نبی ﷺ کی زندگی سے سیکھی ہے۔ وہ دنیا کے سب سے عظیم انسان ہیں۔ میں یہ نہیں سوچتا کہ ہر وقت لکھنے کا سامان ساتھ رکھنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے مگر میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ اگر مجھے آپ ﷺ جیسا سچا اور دیانت دار انسان بننا ہے تو مجھے ان چھوٹی چھوٹی باتوں کو اپنانا ہوگا۔ تب ہی میں بڑے بڑے کام کر سکوں گا۔“
جرنیل سادوئنگ نے گہری سانس لی اور دونوں ابرو اٹھائے۔

”درست فرمایا۔ اب میں ذرا کشتی کا سامان بنانا شروع کر دوں۔“ اور ذرا سی جھر جھری لے کر وہ مڑ گیا۔ ایڈم نے مسکرا کے سر جھٹکا اور واپس کاغذ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

ابھی اسے بہت کچھ لکھنا تھا۔ اگر شہزادی تاشہ کی امیدیں سچی تھیں اور انہوں نے واقعی وقت کے اس پار چلے جانا تھا تو اسے یہ کتاب جلد از جلد مکمل

کرنا تھی۔

☆☆☆

ملا کہ سلطنت کا بندہ ہمارا مراد راجہ اپنے محل میں داخل ہوا تو اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ اس کی نظر سے دیکھو تو سارے منظر نامے یہ سرخ دھند چھائی ہوئی تھی۔ دھند لی سی راہداری تھی جس میں وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا جا رہا تھا۔ تیز تیز.... راہداری بڑھتی جا رہی تھی.... وہ چلتا جا رہا تھا.... سرخ دھند گہری ہوتی جا رہی تھی۔

درمیان میں کتنے لوگ آئے، پہرے دار دربان، سپاہی غلام۔ اس نے ہر ایک کو ہاتھ جھلا کے ہٹنے کا کہا۔ لوگ ہٹتے گئے۔ راستہ دیتے گئے۔ سرخ دھند دھوئیں میں بدلنے لگی۔ ایسا دھواں جس میں سانس لینا تک دشوار ہو رہا تھا۔

اس کا سینہ گھٹ رہا تھا۔ مٹھیاں بھنچی ہوئی اور ناخن ہتھیلی میں پیوست محسوس ہوتے تھے۔ آنکھیں دھکتے انگاروں جیسی ہو رہی تھیں۔ کسی بھوکے بھیڑیے کی مانند وہ جارحانہ انداز میں قدم اٹھا رہا تھا۔

(شہزادی نے اس شخص سے شادی کر رکھی ہے جو چین سے اس کے ساتھ آیا ہے اور مراد راجہ نے اس کو اپنے محل میں پناہ دے رکھی ہے۔) الفاظ اس کے کانوں میں پگھلا سیسہ اٹھیل رہے تھے۔

گول زینہ سامنے آیا تو وہ بھی سرخ دھوئیں کی لپیٹ میں تھا۔ ایسا دھواں جس میں انسانی گوشت کے جلنے کی بو شامل ہوتی ہے۔

مراد راجہ زینے اترنے لگا۔ ایک ایک زینہ چھوڑ کے پھلانگتا..... وہ گول سیڑھیاں چکر کی صورت عبور کرتا نیچے آیا۔

وہاں قید خانے بنے تھے۔ قطار در قطار۔ قیدی اسے دیکھ کے اٹھ کھڑے ہوئے۔ مگر وہ سرخ آنکھوں کے ساتھ آگے بڑھتا گیا۔ سرخ دھواں گہرے سے گہرا ہوتا گیا۔ شدید بو محسوس ہو رہی تھی۔

راہداری کے سرے پہ وہ کال کوٹھڑی تھی۔ اس آتے کے ساتھ ہی زور سے دروازے پہ ہاتھ مارا۔

ساتھ کھڑے پہرے دار نے جلدی سے تالا کھولا تو مراد پٹ دھکیلا اندر داخل ہوا۔

سرخ دھند میں اتنا نظر آیا کہ قیدی کو نے میں زمین پہ بیٹھا ہے۔ پیر سے زنجیر بندھی ہے اور زنجیر کے سرے پہ وزنی لوہے کی گیند ہے۔ اسے دیکھ کے قیدی نے سر اٹھایا اس کی چھوٹی آنکھوں میں چمک آئی اور وہ مسکرایا۔ سنہری رنگت اور چھوٹے بالوں والا خوش شکل قیدی جو بوسیدہ سفید کرتے پا جاے میں ملبوس اکڑوں بیٹھا تھا اس وقت کسی دوسری دنیا کا باشندہ لگ رہا تھا۔

راجہ مراد کو سرخ دھند میں اس کے کپڑے بھی سرخی مائل نظر آرہے تھے۔

اس نے قیدی کو گریبان سے پکڑ کے کھڑا کیا اور دیوار سے لگا کے غرایا۔

”تمہارا میری بیٹی سے کیا تعلق ہے؟“
فاح نے اپنے ہاتھ نہیں اٹھائے۔ سر کی پشت دیوار سے لگائے رکھی۔ اور ابرو اچکا کے مسکرایا۔

”تم یہ سوال مجھے کرسی پیش کر کے بھی پوچھ سکتے ہو۔“

”بتاؤ مجھے.... کون ہو تم؟ ورنہ میں تمہاری جان لے لوں گا۔“ مراد کی آنکھوں میں خون اتر ا ہوا تھا۔

چند لمحوں کے لیے قید خانے میں خاموشی چھا گئی۔ صرف مراد کے تیز بے ربط نفس کی آواز سنائی دیتی تھی۔

”ہماری دنیا میں ہمیں گیم تھیوری پڑھائی جاتی تھی۔ گیم تھیوری۔ حکمت چال۔ یہ ایک ایسی حکمت ہے جو کھیل، سیاست، جنگ حتیٰ کہ تمام بڑے فیصلے لیتے وقت استعمال کی جاتی ہے۔ کیا تم نے بھی حکمت چال کے بارے میں سنا ہے؟“

وہ محل سے بولا تو مراد راجہ نے جھٹکے سے اس کا گریبان چھوڑا اور دو قدم پیچھے ہٹا۔ اس کی سمجھ میں جیسے کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس آدمی کے ساتھ کیا کرے۔ بس دانت کچکا تا وہ اسے دیکھ رہا تھا جو اپنی ہی رو میں کہہ رہا تھا۔

”کھلاڑی دو طرح کے ہوتے ہیں۔ متناہی اور لا متناہی۔ متناہی کھلاڑی محدود ہوتے ہیں۔ تمہارے جیسے۔ وہ جب کھیلتے ہیں تو اصولوں کے اندر رہتے ہوئے ایک مقرر کردہ ہدف کو حاصل کرنے کے لیے کھیلتے ہیں۔ وہ صرف جیتنے کے لیے کھیلتے ہیں۔ محدود کھلاڑی ہارتے بھی ہیں اور جیتنے بھی ہیں کیونکہ ان کا مقصد صرف طاقت کا حصول ہوتا ہے۔“

”میں آخری بار انسانوں کی زبان میں پوچھ رہا ہوں کہ تم کون ہو؟“ وہ غرایا تھا۔ اس کا چہرہ غیظ و غضب سے سیاہ پڑ رہا تھا۔

”مگر لا متناہی کھلاڑی میرے جیسے ہوتے ہیں۔ لامحدود۔ وہ بغیر اصولوں کے بغیر کسی ہدف کے کھیلتے ہیں۔ ان کا مقصد جیتنا یا کوئی مقصد حاصل کرنا یا طاقت پالینا نہیں ہوتا۔ وہ اپنے ارادے کی مضبوطی سے کھیلتے ہیں۔ وہ اپنی مرضی سے اصول بدل لیتے ہیں حدود کو آگے پیچھے کر لیتے ہیں کیونکہ وہ اپنی بقا کی جنگ لڑ رہے ہوتے ہیں۔ وہ صرف کھیل کو بڑھاتے رہنے کی غرض سے کھیلتے جاتے ہیں۔ وہ جیتنے کے لیے نہیں کھیلتے۔ اس لیے غیر لا متناہی کھلاڑی کبھی نہیں ہارتے۔ ان کو کوئی ہراہی نہیں سکتا۔“

”تمہارا..... میری بیٹی سے..... کیا تعلق ہے؟“ راجہ نے چپا چپا کے الفاظ ادا کیے تو غصیلی نظریں اس پہ جمی گئیں۔ کال کوٹھڑی کے اندر وہ دونوں آمنے سامنے کھڑے تھے اور باہر راہداری میں سپاہی ہاتھ باندھے سر جھکائے کھڑے تھے۔

”ہماری دنیا کی حکمت چال کے مطابق.... تم ایک لا متناہی کھلاڑی کو نہیں ہرا سکتے۔ بقا کی جنگ لڑنے والے زماں و مکاں کی قید سے نکل کے کھیلتے ہیں۔“ پھر اس نے افسوس سے سر ہلایا۔ ”ہمیں تمہارے ساتھ تب تک کھیل کھیلنا ہے جب تک کھیل جاری رہ سکے اور تم تھک کے ہمیں یہاں سے جانے دو۔ میں جب چاہتا ہوں اپنی مرضی سے اصول بدل لیتا ہوں کیونکہ تالیہ اور میرے کوئی اصول کوئی حدود نہیں ہیں۔ ہمیں طاقت اور اہداف نہیں چاہئیں۔“

ہمیں صرف اپنی دنیا میں واپس جانا ہے اور جب تم مجھے اپنے سامنے کرسی پر بٹھانے کے لیے تیار ہو جاؤ گے تو میں تمہیں بتا دوں گا..... کہ میرا تالیہ کا کیا تعلق ہے۔“

مراد راجہ نچلا لب دانتوں سے دبائے نفی میں سر ہلاتا لٹے قدموں پیچھے ہٹا گیا۔

”خدا کی قسم! اگر ملکہ کی بات درست ہے تو میں تمہارا کھیل تم پہ الٹ دوں گا۔“ وہ الٹے قدموں پیچھے جا رہا تھا۔ سرخ دھواں آہستہ آہستہ چھٹ رہا تھا۔ نیم تاریک کمرہ صاف دکھائی دینے لگا۔

”میں تم سے نہیں ڈرتا راجہ! تم مجھے کبھی نہیں مارو گے میں جانتا ہوں اور اب تو بالکل بھی نہیں۔“ وہ دیوار سے لگا کھڑا تھا اور ہاتھ سینے پہ لپیٹ لیے تھے۔ آنکھوں میں راجہ کے لیے صرف ترحم تھا۔

”میں تمہیں..... ابھی..... ابھی اسی وقت مار سکتا ہوں۔“ وہ بلند آواز میں گرجا۔ غم دغصے سے اس کا چہرہ سرخ پڑ رہا تھا۔

سینے پہ بازو لپیٹے کھڑے فاتح نے ابرو اچکائے۔ ”اگر تم نے مجھے مار دیا تو تمہاری بیٹی اور تمہارے رشتے کا کیا بنے گا؟ وہ تمہیں کبھی معاف نہیں کرے گی۔ یہی سوچ رہے ہوتا تم اس وقت۔ میں تمہارا ذہن پڑھ سکتا ہوں بندہ ہارا! وہ سرد سا مسکرایا۔ ”اس لیے بہتر ہے کہ مجھے مارنے کے بجائے تم اپنی فکر کرو کیونکہ تمہیں بہت جلد اس سے بڑے جھٹکے ملنے والے ہیں۔ کیونکہ میں کھیل جاری رکھنے کے لیے کھیل رہا ہوں۔“

”میں تمہیں دیکھ لوں گا۔“ وہ اس پہ غراتا ہوا آگے بڑھا۔ ساتھ ہی بلند آواز میں حکم صادر کیا۔ ”اس کا کھانا پانی بند کر دو اور..... اور.....“ بے بسی سے جیسے وہ بس یہی حکم جاری کر پایا تھا۔ ”اور اس کو اتنا مارو کہ یہ خود بھی خود کو نہ پہچان سکے۔“

سپاہی فوراً فاتح کی کوٹھڑی کی طرف لپکے۔ دوسری کوٹھڑیوں کے قیدی بھی کھڑے ہونے لگے۔ مراد راجہ ماتھے پہ بل ڈالے بازو پیچھے باندھے

لبے ڈگ بھرتا زینے کی طرف بڑھ گیا۔ سرخ دھند کی جگہ اب سیاہ دھوئیں نے لے لی تھی۔

اس کے اندر کا سارا گوشت جیسے جل گیا تھا اور اب صرف راکھ رہ گئی تھی۔

☆☆☆
بندہ ہارا کے محل کے داخلی دروازے کے سامنے چوروش بنی تھی اس پہ پھولوں کی پیتیاں گری ہوئی تھیں۔ آج صبح شہزادی تاشہ واپس آئی تھی تو ابھی سے اترتے ہی اس کا استقبال کینروں اور خادموں نے بہت محبت سے کیا تھا۔

اس کا کمرہ ویسا ہی تھا جیسا وہ چھوڑ کے گئی تھی، البتہ مختلف جگہوں پہ کھونیاں لگا کے زرتار کام دار ملبوسات لٹکائے گئے تھے۔ یہ اس کی شادی کے لیے بنوائے گئے تھے۔ وہ چغہ اتار کے مسہری پہ چھینکتی کینہ تو زلفروں سے ان کپڑوں کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے جوڑے میں بندھے بال خشک ہو رہے تھے۔ دودن پرانا سیاہ کرتا پا جامہ پہنے وہ قدرے بے رونق سی لگ رہی تھی۔ چہرے پہ سفر کی تکان تھی اور آنکھوں میں بے زاری۔

ایک زمانے میں اس کی کتنی خواہش تھی کہ..... کہ وہ کوئی شہزادی ہوتی..... جس کی شادی کسی بادشاہ سے ہوتی..... اور سونے چاندی کے ڈھیر کے ساتھ زرتار عروسی ملبوسات میں اس کو رخصت کیا جاتا۔

اور آج اس نے جانا تھا کہ کچھ خواب پورے ہونے کے لیے نہیں، صرف دل کو خوش کرنے کے لیے ہوتے ہیں۔ فینٹسی۔ ذہن میں بنی کہانیاں۔ ان کو پورا نہیں ہونا چاہیے۔ ورنہ وہ ٹریجڈی بن جاتی ہیں۔

شریفہ ایک دم آندھی طوفان کی طرح اندر بھاگتی ہوئی داخل ہوئی تو تالیہ نے بے زاری سے اسے دیکھا۔ ”ابھی تو ہم سفر سے آئے ہیں..... دو گھڑی سانس تو لے لو شریفہ!“

”شہزادی..... شہزادی.....“ پھولے تنفس سے اس نے جوبات بتائی وہ تالیہ مراد کو پتھر کا بت بنا گئی تھی۔

☆☆☆
قید خانے میں وہ صلیب کی صورت میں بندھا تھا اور سپاہی اس کی کمر پہ زور زور سے کوڑے مار رہا تھا۔ فاتح نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ اس کے کندھوں اور کمر سے خون بہہ رہا تھا۔ ہر ضرب کے ساتھ دماغ کی چولیس ہل جاتیں اور خون کے ہر قطرے کے ساتھ وہ مناظر یاد آنے لگتے۔ آریانہ سفید لباس میں پہاڑی پہ گری ہوئی تھی۔

اس کا لباس خون آلود تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ اس کا سر گود میں رکھے رو رہا تھا۔ وہ اپنے ہاتھوں سے زمین کھود رہا تھا۔ سپاہی اس کی کمر پہ زور زور سے کوڑے برسا رہا تھا اور وہ..... وہ آریانہ کی پتھروں سے ڈھکی قبر کے سامنے گم صم بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پہ آنسوؤں کے نشانات تھے۔

اس کی کمر پہ خون کی دھاریں تھیں۔ جب تالیہ اس گول زینے کو اتر رہی تھی تو اس کے سامنے کوئی سرخ دھند نہ تھی۔ صرف خوف تھا اور امید تھی۔ دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ چہرہ غم دغصے سے دھک رہا تھا۔

وہ بھاگتی ہوئی نیچے آئی تھی۔ سیاہ کرتے پا جامے میں ملبوس وہ ننگے پیر دیوانہ وار اس آخری کوٹھڑی کی طرف لپکی۔ چوکھٹ پہ پہنچ کے وہ دھک سے رہ گئی۔ کوٹھڑی کا دروازہ کھلا تھا۔ چند سپاہی اندر کھڑے تھے۔ ایک دیوار سے لگا کھڑا فاتح صلیب کی صورت بندھا تھا۔ اس کی گردن بائیں کندھے پہ ڈھکی ہوئی تھی اور لباس پھٹا ہوا خون آلود تھا۔ پیشانی اور سر کے مختلف حصوں سے خون بہہ بہہ کے جسم پہ گر رہا تھا۔ کندھے، کمر، بازو..... ہر جگہ زخموں کے نشان

نظر آتے تھے۔ اس کی آنکھیں بند تھیں جیسے بے ہوش ہو یا کرب سے میچ رکھی ہوں۔

”ہٹو۔ چھوڑو اس کو۔ میں کہہ رہی ہوں، چھوڑو اس کو۔“ شہزادی تاشہ غراتی ہوئی آگے آئی اور جو سپاہی فاتح کے سر پہ کھڑا ہنر فضا میں بلند کیے اسے مارنے ہی لگا تھا اسے پرے دھکیلا۔ سپاہی چونکا پھر گرتے گرتے سنبھلا اور اس کی طرف دیکھا۔

سامنے وہ بھوکی شیرنی کی طرح کھڑی اسے گھور رہی تھی۔

”تمہاری ہمت کیسے ہوئی کہ تم اس کو ہاتھ بھی لگاؤ۔“ وہ جب اس کو سرخ آنکھوں سے دیکھتی غراتی تو اس کی آواز میں نسوانی پن نہ تھا۔ وہ کسی وحشی درندے کی غراہٹ لگتی تھی۔ وان فاتح نے اس عجیب آواز پہ آنکھیں ذرا سی کھولیں۔ وہ دونوں پہلوؤں پہ ہاتھ رکھے کھڑی سپاہی پہ چلا رہی تھی۔

”شہزادی..... یہ راجہ کا حکم ہے اس لیے خدا را آپ یہاں سے جائیے اور ہمیں ہمارا کام کرنے دیں۔“ ہنر والا ہاتھ اس نے پیچھے کر کے بصد احترام بتایا تو شعلہ بار نظریں اس پہ جمائے چند قدم آگے آئی۔ سپاہی نے گردن جھکا دی۔

”میں ملاکہ سلطنت کے بندہ ہارا مراد راجہ کی بیٹی تاشہ ہوں۔ میں..... سلطان مرسل شاہ کی ہونے والی بیوی ہوں۔ میں ملاکہ سلطنت کی ہونے والی ملکہ ہوں۔ جب سلطان مرے گا تو میں اس ملک کی حکمران ہوں گی اور میرے بیٹے تخت سنبھالیں گے۔ مراد راجہ ماضی ہو گیا ہے۔ ملکہ بنتے ہی سب سے پہلے میں اس کی گردن قلم کرواؤں گی۔ اب تم بتاؤ جرنیل تمہیں کس کا حکم ماننا ہے؟ ہونے والی ملکہ کا؟ یا ہونے والے مقتول کا؟“ وہ آنکھوں میں خون لیے اسی غراہٹ کے ساتھ کہہ رہی تھی۔ فاتح کی طرف اس کا نیم رخ تھا۔ اس نے بدقت دھندلی بصارت سے منظر دیکھنا چاہا۔

سپاہی نے مزید سر جھکا دیا اور ہنر زمین پہ پھینک دیا۔ دوسرے سپاہی بھی پیچھے ہٹ گئے۔

”میں تمہارے راجہ سے مل کے آتی ہوں۔ تب تک اس قیدی کو کھانا کھلاؤ پانی پلاؤ اور نیا لباس دو۔ پھر اس کی مرہم پٹی کرو۔“

اب غراہٹ نہیں تھی مگر آواز ہنوز بھاری تھی۔ اس میں شہزادیوں والا ناز و انداز نہیں، ملکہ والا قہر تھا۔ پھر وہ فاح کی طرف گھومی جو بے حال سا بندھا کھڑا تھا اور ایک اچھتی نظر اس پہ ڈالی۔

”جب میں واپس آؤں تو مجھے یہ تندرست نظر آنا چاہیے۔ اپنی ملکہ کی بات ماننا سیکھو جرنیل!“

وان فاح نے اسے دیکھتے ہوئے زخمی چہرے کے ساتھ اُبرو اچکائے۔ (سیریسلی؟) لب بے آواز ہلے۔

تالیہ نے جواب نہیں دیا۔ بس اسے بھی ایک خشمگین نظر سے نواز اور تیز تیز باہر نکل گئی۔

مراد راجہ باغیچے میں تنہا اُبل رہا تھا۔ سر پہ قیمتی جواہر سے مزین ٹوٹی ٹوٹی اور کندھوں پہ سنہری قبا۔ بازو کمر پہ باندھے وہ کچھ سوچ رہا تھا۔

”راجہ... مراد راجہ!“ آواز پہ وہ تیزی سے گھوما۔

سامنے سے دوڑتی ہوئی تالیہ آ رہی تھی۔ وہ ملجے لباس میں تھی اور چہرے پہ سخت طیش چھایا تھا۔

مراد اس کو دیکھ کے یک گخت سُن ہو گیا تھا۔ پھر جیسے ہی وہ قریب آئی اس نے اسے کندھوں سے تھاما۔ ”تالیہ... تم آگئیں۔“

اس نے سختی سے مراد کے ہاتھ جھٹکے۔

”آپ کو لگتا تھا، میں نہیں آؤں گی؟“

”وان فاح نے کہا تھا کہ تمہارا انجام یہ ہوگا کہ.... (اس کی آواز ٹوٹی) تم سمندری سفر سے نہیں لوٹو گی۔“

”تو کیا آپ وان فاح سے ہر ایک کا انجام پوچھ رہے تھے؟“ اس کی آواز میں ترشی در آئی۔

”میرے جاتے ہی آپ نے اسے کھوج نکالا اور پھر قید کر کے یوں تشدد کیا جیسے مجھے کبھی واپس ہی نہیں آنا تھا؟ یہی چاہتے تھے آپ؟“

مراد کے چہرے پہ افسوس ابھرا۔ ”میں کبھی بھی ایسا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے تمہارے پیچھے سپاہی بھیجے تاکہ وہ تمہیں واپس لائیں۔ وہ کل رات کو لوٹ آئے۔ ان کے مطابق تم جنوبی محل نہیں گئی تھیں۔ میں نہیں پوچھوں گا کہ تم کہاں گئیں کیونکہ تم اب واپس آگئی ہو یہی بہت ہے۔“

پھر اس کی آنکھوں میں تکلیف ابھری۔ ”تم میری بیٹی ہو تالیہ۔ تم نے اتنے سال میرے ساتھ سارے کام مل کے کیے ہیں۔ تم جنگل میں میرے ساتھ جاتی تھیں، جب میں عبادت میں مشغول ہوتا تھا تو تم میرے لیے کھانا بناتی تھیں۔“ وہ تاسف سے اسے دیکھتا کہہ رہا تھا۔ ”ہاں تم ایک دم سے..... بڑی ہو گئی ہو اور میں تمہارے اس..... (اس کی طرف اشارہ کیا) نئے روپ سے سمجھتا نہیں کر سکا کیونکہ میرے لیے میری بیٹی وہی چھوٹی سی تھی۔ لیکن وقت تمہیں جتنا بھی بدل دے وہ میرے دل سے تالیہ کی جگہ کو نہیں بدل سکتا۔“

سامنے کھڑی تالیہ کی پیشانی شکن آلود ہوتی گئی۔ ”اب ان باتوں کا وقت گزر گیا ہے راجہ! یہ باتیں اب مجھ پہ اثر نہیں کرتیں۔ مجھے صرف اتنا بتائیے کہ وان فاح پہ اتنا ظلم کیوں کیا آپ نے؟“

”کیونکہ اسے کرسی پہ بٹھانے کا وقت نہیں آیا۔“ مراد کے تاثرات تن گئے۔ چہرے پہ برہمی عود آئی۔ ”تم اس کی فکر کرنا چھوڑ دو۔“

”وہ کرسی کا حق دار ہے راجہ! وہ کرسی پہ ہی بیٹھے گا۔ وہ محلوں میں رہنے والا ہے اور محل ہی اس کا مقدر ہیں۔ اس کے سر کے اوپر سے حکمرانی کا ہما گزرا ہے۔ آپ اس کو نقصان نہیں پہنچا سکتے۔“

”تمہارا کیا تعلق ہے اس سے؟“ وہ زیر لب آہستہ سے بولا۔ تیز شکاری نظریں تالیہ کے چہرے پہ جمی تھیں۔

”جب اس کو کرسی پیش کریں گے تو وہ بتا دے گا لیکن ابھی کے لیے آپ اس کو جانے دیں ورنہ میں سپاہیوں سے کہوں گی اور وہ اسے جانے دیں

گے۔“

”میری پیاری شہزادی!“ وہ طنز سے مسکرایا۔

”سپاہی میرے ہیں اور میرا حکم مانتے ہیں۔ کل میں نے ان سپاہیوں کو حکم دیا تھا کہ اسے تب تک مارو جب تک تاشہ نہ آجائے اور اگر وہ کہے کہ مت مارو تو ہاتھ روک دینا لیکن اگر وہ کہے کہ اسے چھوڑ دو تو اپنی تلواریں شہزادی تاشہ کے اوپر تان لینا۔ وہ خود ہی پیچھے ہٹ جائے گی۔“

کاٹ دار لہجے میں بولتا وہ بالکل اجنبی ہو گیا تھا۔

تالیہ کے اکڑے کندھے ڈھیلے پڑنے لگے۔

”بابا....“ اس کے لب پھڑپھڑائے۔

”بابا کہنے کا وقت بھی گزر چکا ہے۔ مجھ پہ اب یہ الفاظ اثر نہیں کرتے۔ چند ٹائپ پہلے تک میں شک میں تھا کہ ملکہ کی بات غلط ہوگی لیکن تمہارا انداز سب عیاں کر چکا ہے۔“ وہ افسوس سے کہہ رہا تھا۔ ”تم مجھے اپنا دشمن سمجھتی ہو باب نہیں۔ تم نے مجھ سے جھوٹ بولا کہ تم اکیلی آئی ہو۔ تم نے اپنی شادی کو چھپایا۔ تم نے سلطان کے سامنے مجھے مجرم بنا دیا۔ وان فاح درست کہتا تھا۔ تم اپنی دنیا میں ایمان دار نہیں تھیں۔ مجھے تم سے ایمان داری کی توقع نہیں کرنا چاہیے تھی۔“

وہ جب کھڑی اسے دیکھتی رہی۔

”میں تمہیں ملا کہ کی سلطنت دینے جا رہا تھا اور تم نے اپنی اس دنیا کو ترجیح دی جہاں تم اپنی محنت سے دو آنے تک نہیں کما سکتی تھیں۔ کیا ہو تم اس دنیا میں؟ یہ جو یہاں تمہاری آواز میں غراہٹ در آئی ہے نا، یہ اس دنیا میں نہیں ہوگی کیونکہ یہاں تمہارے پاس طاقت ہے اور طاقت جیسا اور کچھ بھی نہیں ہوتا۔ تم اپنی دنیا میں واپس چلی گئیں تو دیوانی ہو جاؤ گی پاگل ہو جاؤ گی کیونکہ وہاں تم شہزادی نہیں ہوگی۔ اس لیے قدر کرو اس سلطنت کی جو تمہاری ہونے والی ہے۔ ابھی بھی وقت ہے تالیہ، ملکہ کے الزامات کو رد کرو اور کہہ دو کہ تم نے اس..... (دانت پیسے) اس غلام سے نکاح نہیں کر رکھا۔ خدا کی قسم میں تمہیں بچا لوں گا۔“

تالیہ بس سپاٹ نظروں سے اسے دیکھ گئی۔

”سوچ لو تالیہ! میں آخری بار کہہ رہا ہوں۔“

”اس کو کرسی پیش کریں راجہ۔ اس سے پوچھیں کہ وہ کیا چاہتا ہے تو وہ بتا دے گا اور یہ آپ کی بھول ہے کہ آپ اسے قید میں زیادہ دیر رکھ سکتے ہیں۔ اگر میں اسے نہیں آزاد کروا سکتی تو کوئی ہے جس کے پاس مجھ سے زیادہ طاقت ہے اور جس دن اس کو اپنی طاقت کا علم ہوا وہ اسے آزاد کروا لے گا۔“

مراد راجہ کے ابرو بھنج گئے۔ ”کون؟“

”آپ جلد جان جائیں گے۔“ وہ تنفر سے کہتی ایک آخری نظر اس پہ ڈالتی پلٹ گئی۔ یقیناً اسے قیدی کے پاس جانے کی جلدی تھی۔

مراد نے ایک خشکیں نگاہ اس پہ ڈالی اور پلٹ گیا۔ اس کا رخ اپنی تیار سواری کی طرف تھا۔ اسے بھی کسی سے ملنے کی جلدی تھی۔

دھند کا جالا بنتی سرخ مکڑی، اس نے ذہن سے نکال کے دور پھینک دی تھی۔

☆☆☆

قید خانے کا ماحول اب قدرے مختلف تھا۔ فضا سے تناؤ، خوف اور وحشت چھٹ چکی تھی۔ اب وہاں صرف خاموشی تھی۔

وان فاح کی کونٹری کا دروازہ بدستور کھلا ہوا تھا۔ اس کے پیر میں بندھی زنجیر ویسی ہی تھی، مگر لباس بدل چکا تھا۔ خاکی رنگ کا صاف پاجامہ اور اوپر بنا آستین کی جیکٹ نمائش پہن رکھی تھی۔ کمر پہ پٹیاں بندھی تھیں اور سامنے کھلے سینے پہ بھی کئی جگہ مرہم لگا ہوا تھا۔ وہ اکڑوں بیٹھا تھا اور دیوار سے ٹیک لگا رکھی تھی۔ چہرہ اب صاف تھا، مگر خون آلود کٹ دکھائی دیتے تھے۔

ایک خادم اس کے برہنہ باز، کمر پہ زخم کو دیکھ رہا تھا، دوسرا دو کا تھال لیے سر پہ کمر پہ ”تم لوگ جاؤ“ میں د

ساتھ نسوانی جوتی کی قرۃ

فاح نے آنکھیں کھولیں

میں وہ نظر آئی تھی۔ اس نے پلکیں جھپکیں۔ دھندلا منظر ذرا واضح ہوا۔

وہ بھورے باجو کرنگ میں ملبوس سر پہ دوپٹا لپیٹے سادہ مگر خوبصورت کینر لگ رہی تھی۔ سیاٹ چہرے کے ساتھ قریب آئی اور روئی خادم کے ہاتھ سے لی۔ پھر فاح کے پاس دوڑا نوہو کے بیٹھی۔

”یہ تھال یہیں رکھ دو اور جاؤ۔ مجھے دوسری دفعہ نہ کہنا پڑے۔“ انداز جستی تھا۔

خادم تعظیم بجالائے اور باہر نکل گئے۔ دروازہ کھلا رہ گیا۔

تالیہ نے روئی تھال میں پڑے پیالے میں ڈبوئی، اس پہ پانی جیسا مالچ لگ گیا اور پھر اس کے بازو کے اوپری حصے تک لائی۔ وہ جوادھ کھلی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا، کندھا پیچھے کیا۔ تالیہ نے محض سیاہ آنکھیں اٹھا کے اسے دیکھا۔

”مجھے زخم کو دیکھنے دیں۔“ انگریزی میں زیر لب بولی۔ گویا منت کی۔

”تمہیں زخموں کا کیا پتا؟“

”سنگاپور کی ایک امیر بیوہ کو لوٹا تھا میں نے۔ اس کی نرس بن کے گئی تھی۔ وہ ایکسڈنٹ میں زخمی ہوئی تھی۔“ اس نے فاح کے بازو کو دیکھتے اب بھیگی روئی زخم پہ رکھی تو اس نے (س) کر کے آنکھیں موندیں۔

”کیا چرایا تھا اس کا؟“

”زیور اور کچھ نقدی۔ مگر جتنی خدمت اس کی میں نے کی وہ میرا حق بنتا تھا۔ اس لیے تھوڑا بہت یہ کام آتا ہے مجھے۔“

”وقت کے اس پار زخموں کی دیکھ بھال کے طریقے مختلف ہوتے ہیں، عالم!“

وہ جو روئی سے آہستہ آہستہ زخم صاف کر رہی تھی، بے اختیار ہاتھ روک کے اسے دیکھنے لگی۔

”اتنے دن بعد میرا یہ نام کیسے یاد آیا آپ کو؟“

”جیسے تمہیں اتنے دن بعد اپنا پرانا کام یاد

آیا۔“ وہ ماتھے پہ شکنیں لیے آنکھیں میچے ہوئے تھا۔ بازو پہ سرخ لکیروں کی صورت لمبے لمبے کٹ پڑے تھے۔ تالیہ آہستہ آہستہ بھیگی روئی سے ان کو صاف کرنے لگی۔

”آپ تو کہتے تھے آپ کسی سے نہیں ڈرتے، راجہ کے سامنے کھڑے ہونے کے لیے تیار ہیں۔“

اب ان زخموں سے تکلیف کیوں ہو رہی ہے؟“ فاح نے آنکھیں کھول کے مصنوعی حلقی سے اسے دیکھا۔

”تکلیف تو سب کو ہوتی ہے۔“

”ڈر بھی سب کو لگتا ہے اور کسی کا ساتھ بھی سب کو ہی چاہیے ہوتا ہے۔ آپ جتنے بھی بہادر اور مضبوط بن جائیں فاح صاحب، فطری جذبات سے نہیں بھاگ سکتے آپ!“ وہ پلکیں زخم پہ جھکائے کہہ رہی تھی۔ وہ چند لمحے اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔

”تم جلدی آگئیں۔ حالانکہ تمہیں ادھر رہنا تھا اور ایڈم کو واپس آنا تھا۔“

”آپ کو میری ضرورت تھی۔ اسی لیے آگئی۔“ فاح نے ہلکا سا سر جھٹکا پھر بات بدل دی۔

”جزیرہ مل گیا تھا؟“

”اور سونا بھی۔ ایڈم وہ سب ساتھ لے کر ہی آئے گا۔“ وہ اب دھیمی آواز میں تفصیلات بتا رہی تھی۔

”گڈ۔ ہر چیز پلان کے مطابق جا رہی ہے۔“

”سوائے آپ کی گرفتاری اور اس قید کے۔“

اس نے روئی رکھی اور مرہم سے بھرا پیالہ اٹھایا۔ پھر انگلی اس میں ڈبوئی اور کندھے پہ دوا لگانا شروع کی۔

ٹھنڈے مرہم کے زخم پہ لگتے ہی وہ (س) کر اہا مگر ضبط کر گیا۔

”تو تم آگئی ہونا۔ مجھے چھڑا لوگی۔“

”نہیں۔ راجہ کو ملکہ نے ہمارے نکاح کا بتا دیا ہے، وہ اب آپ سے کسی قسم کی رعایت نہیں برتے گا۔ سپاہی میرا حکم نہیں مانیں گے۔“

”پھر؟“ اس نے تشویش سے ابرو اٹھائے۔

”آخری مرحلے کے لیے میرا آزاد ہونا ضروری تھا۔“ تالیہ کے پاس ہمیشہ پلان ہوتا ہے۔ پلان اے نا کام ہو جائے تو پلان سی ہے نا۔“

”اور پلان بی کا کیا؟“

”تالیہ کے پلانز ہیں۔ تالیہ کی مرضی!“ وہ توجہ سے دھیرے دھیرے دوا لپ رہی تھی۔

کوٹھڑی میں خاموشی چھا گئی۔ باہر جانے کون سا پہر ہوا تھا، اندر ہمیشہ اندھیرا ہوتا تھا۔ ایسے میں دیوار پہ نصب مشعلوں کے شعلے مدھم روشنی بکھیرے ہوئے تھے۔

اس کے ہاتھ پہ بھی ضرب لگی تھی اور ہتھیلی کے اندر کی طرف بڑا سا گٹ لگا تھا۔ تالیہ نے اس کی ہتھیلی اپنے ایک ہاتھ پہ پھیلائی اور پھر بھیگی روئی سے ہتھیلی پہ لگی خون کی لکیر صاف کی۔

”تم واپس جا کے کیا کرو گی؟“ وہ اس کی جھکی پلکیں دیکھ کے پوچھنے لگا تو انداز نرم تھا۔

تالیہ نے چہرہ نہیں اٹھایا۔ بس گمن انداز میں اس کی ہتھیلی سے خون کے دھبے صاف کرتے ہوئے بولی۔ ”میں اپنی وہ دولت جس کو میں نے محنت سے نہیں کمایا۔“

”یعنی ساری دولت....“

”اس کو میں اپنے پاس نہیں رکھوں گی۔ فارغ وقت میں پینٹنگز بناؤں گی۔ جائز کمائی کروں گی اور خوش رہوں گی۔ شاید کسی دوسرے ملک چلی جاؤں۔“

آپ تو ظاہر ہے، جانے کے ساتھ ہی مجھے چھوڑ دیں گے۔“

”ہاں ظاہر ہے۔“ اس نے عام سے انداز میں کہا۔ تالیہ کے ہاتھ لمحے بھر کو بھی نہیں ٹھہرے۔ وہ زخم صاف کرتی رہی۔

بس اس وقت اس کو کمزور نہیں پڑنا تھا۔ اس تعلق پہ رونے کے لیے عمر بڑی تھی۔

”آپ کیا کریں گے؟“

”میں واپس جا کے ایک دنیا کو وضاحت دیتا رہوں گا کہ یہ چار ماہ میں نے کہاں گزارے۔“ اس نے جھرجھری لی۔

”چار ماہ!“ تالیہ نے گہری سانس لی۔ ”چار ماہ بیت گئے۔ لیکن....“ وہ چونکی۔ ”اگر وقت رک گیا ہو تو؟“

”اور اگر نہ رکا ہو تو؟ ہمیں ہر بات کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ سس۔“ وہ ہاتھ پہ دوا لگا رہی تھی، اس لیے اس کے لبوں سے سسکاری نکلی۔ آنکھیں بھی تکلیف سے میچیں۔ تالیہ نے رک کے اسے دیکھا۔

”ایک بات پوچھوں۔“ اس کا دھیان بٹانے کی غرض سے بولی۔ ”آپ کا والٹ کہاں گیا؟“

”موبائل، والٹ، جوتے، ہر چیز جنگل میں کھو گئی تھی جب ہمیں گرفتار کیا گیا تھا۔“

”آپ کا والٹ میرے پاس ہے۔ گر گیا تھا تو میں نے اٹھا لیا۔ دینا بھول گئی تھی۔“

وہ چونکا، پھر اسے دیکھ کے تاسف سے نفی میں سر ہلایا۔

”اور تمہیں تو بھول کے چیزیں اٹھانے کی بہت عادت ہے۔“

اس نے مسکراہٹ دبا کے شانے اچکائے۔ پھر دوا کا پیالہ رکھ دیا اور پٹی اٹھالی۔

”اس کے اندر ایک زپ لاک بیگ میں مکی کے چند دانے تھے۔ ٹوٹے پھوٹے پرانے پاپ کارن۔ آپ نے انہیں کیوں رکھا ہوا ہے سنیچال کے؟“ وہ اب پٹی اس کے ہاتھ پہ باندھ رہی تھی۔

جواب نہیں آیا تو سر جھکائے کام کرتے ہوئے بولی۔

”ٹھیک ہے، نہ بتائیں۔ ویسے بھی میں ہوں تو آپ کی بس ایک ادنیٰ سی کارکن۔ تالیہ دی فین گرل۔ اس لیے.....“

”وہ آریانہ کے تھے۔“ تالیہ نے چونک کے سر اٹھایا۔ پٹی کا بل دیتے ہاتھ وہیں ٹھہم گئے۔

وہ اسی کو دیکھ رہا تھا مگر اس کی آنکھوں میں کچھ تھا جو اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ آواز بھی دھیمی ہو گئی تھی۔

”جس دن آریانہ کھوئی تھی، وہ انہیں کھا رہی تھی۔ جب میں اس کی تلاش میں پہاڑیوں کی طرف

دوڑا تو مجھے وہ نظر آئے۔ وہ اغوا کاروں کی نشان دہی کے لیے پاپ کارن گرائی گئی تھی تاکہ ہم ان کی مدد سے اسے تلاش کر لیں۔ اسے فیری ٹیلر پسند تھیں۔“ وہ اداسی سے مسکرائی۔ پھر چونکی۔ ”لیکن آپ نے تو پولیس میں کہا تھا کہ آریانہ کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ سب کو ہی معلوم ہے کہ اسے صوفیہ رحمن نے اغوا کر دیا کے غائب کر دیا تھا۔ مسز عصرہ تو فی دی پہ بر ملا کہتی ہیں کہ ان کی بیٹی کسی اچھے گھرانے کو ہی ملی ہوگی کیونکہ ان کو واپس نہیں ملی مگر....“ اس کی آنکھیں وان فاح کی زخمی آنکھوں پہ ٹھہر گئیں۔ ”مگر.... کیا آپ کو پاپ کارن ملے تھے؟“

وہ خاموش رہا۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ وہ ہلکے تک نہیں جھپک رہی تھی۔ ”تو انکو... آپ کو... وہ مل گئی تھی؟“ اس کو اپنی آواز بھی سنائی نہ دیتی تھی۔ بے یقینی سی بے یقینی تھی۔ فاح نے ہلکا سا سر کو خم دیا۔ ”وہ جہاں مجھے ملی تھی اس کے پاس سے مجھے یہ پاپ کارن ملے تھے۔ کچھ کو میں نے سنبھال لیا۔ کچھ مجھ سے کھو گئے۔“

”اور آریانہ؟“ اس کا سانس اٹکا ہوا تھا۔ ”آپ کی بیٹی؟“ ”وہ مر چکی تھی تالیہ! میں نے اسے وہیں دفن دیا اور میں واپس چلا آیا۔“ وہ گہری سانس لے کر بولا اور وہ اگلا سانس نہیں لے سکی۔ ”مسز عصرہ کو معلوم ہے؟“ بہت دیر بعد وہ بول پائی۔

”میں نہیں بتا سکا اسے۔“ ”مگر کیوں؟“ وہ دنگ رہ گئی۔ ”مجھے جو سچ لگا میں نے وہ کیا۔ اس وقت میں اپنی بیٹی کی موت کو سیاسی ایشو نہیں بنا سکتا تھا۔ ہم خاندان کو سیاست سے الگ رکھنے والے لوگ ہیں۔ بہت سے لوگ خود ہی سمجھ گئے کہ وہ زندہ نہیں ہوگی۔“ وہ ٹھہر ٹھہر کے بول رہا تھا۔ اسے تکلیف ہو رہی تھی۔ ”نہیں۔ مسز عصرہ کو نہیں معلوم تو کسی کو نہیں

معلوم۔ آپ ان کو بتا سکتے تھے۔“ ”کیسے بتاتا؟ اور اگر بتاتا تو وہ لاش دیکھنے کی ضد کرتی۔ میں اپنی آریانہ کی وہ حالت کسی کو نہیں دکھا سکتا تھا۔“ اس کی آواز تیز ہوئی۔ ”اور عصرہ بالکل ٹوٹ جاتی۔ اس لیے میں نے اس کو ایک امید تھما دی۔ کم از کم وہ اسٹیل تو رہے گی۔ اسے سکون تو رہے گا۔“

”ایک ماں کو سکون کیسے آ سکتا ہے بھلا؟ آپ کو انہیں بتانا چاہیے تھا۔ مر جانے والے کا صبر کھو جانے والے سے جلدی آ جاتا ہے۔“ وہ شکوہ کرنے لگی۔ پٹی لپیٹتے ہاتھ وہیں اس کے ہاتھ کے اوپر ٹھہرے ہوئے تھے۔

”عصرہ کو نہ آتا۔ وہ ایک مثبت عورت نہیں ہے۔ وہ ہمیشہ منفی رہتی ہے۔ میں اس کو مزید منفی پن سے بچانا چاہتا تھا۔“ ”یا شاید آپ کو یہ ڈر تھا کہ وہ آپ کو الزام دیں گی۔ کیونکہ آپ کی سیاست نے یہ دن دکھایا تھا۔ اسی لیے اس روز پارٹی پہ وہ مجھ سے کہہ رہی تھیں کہ (اس نے یاد کرنے کی کوشش کی۔ چار ماہ پہلے کی شام بدقت یاد آئی۔) کہ آریانہ کے بعد انہوں نے سیاست میں حصہ لینا چھوڑ دیا۔ لیکن اگر آپ نے پہلے نہیں بتایا تو اب بتا دیں۔“

”بھی بھی نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”آنکھوں سے وہ چیز چلی گئی اور پہلے جیسی سنجیدگی واپس چھا گئی۔“ ہماری شادی پہلے ہی بہت پیچیدہ ہو چکی ہے میں اس میں مزید پیچیدگی نہیں بھر سکتا۔“ ”آپ کی شادی پیچیدہ ہے؟“ وہ چونکی۔ ”کیا آپ دونوں کے درمیان مسئلے چل رہے ہیں؟“ ”اس بات کو جانے دو۔ اور ہاں....“ اس نے بات بدلی۔ ”میں نے تمہارے باپا کو بتایا تھا کہ تم اس دنیا میں چور تھیں۔ اور مجھے وہ سب کہتے ہوئے اچھا نہیں لگا۔“

”مگر وہ پلان کا حصہ تھا۔ میں نے خود ہی آپ سے کہا تھا کہ ان کو بتا دیجیے گا تاکہ وہ آپ پہ بھروسہ

لریں۔“ ”لیکن تم.... اپنے باپ سے اپنا معاملہ درست کر لو تو اچھا ہوگا۔“

”اس کا وقت گزر چکا۔“ وہ بات کاٹ کے بولی۔ ”ویسے بھی ان کو کوئی فرق نہیں پڑتا اگر میں کسی سندری سفر پہ جا کے کبھی واپس نہ آؤں۔“ پھر وہ ہلکا سا ہنسی۔ ”یہ جھوٹ کیوں بولا آپ نے میرے انجام کے بارے میں؟“ وہ پٹی لپیٹ کے گرہ دیتے ہوئے بولی۔ ”ایسی بے کار بات کہنے کی کیا ضرورت تھی؟“ وہ خاموشی سے اس کی جھکی نظریں دیکھے گیا، پھر نگاہیں پھیر لیں۔ گردن میں گٹھی سی ابھر کے معدوم ہوئی۔

”تم مجھے یہاں سے نکالنے کی فکر کرو۔ باقی باتیں چھوڑو۔“ موضوع بدل دیا تو اس نے مسکرا کے پٹی کی گرہ لگائی اور تھال سے رومال اٹھا کے ہاتھ پونچھے۔

”جیسا کہ میں نے کہا.... تالیہ کے پاس ہمیشہ پلان ہوتا ہے۔“

اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ مدہم روشنی میں بھی اس کی چمکتی آنکھیں واضح دکھائی دیتی تھیں۔ فاح نے بس مسکرا کے اسے دیکھا۔ زخمی قیدی کے جسم پہ جا بجا پٹیاں بندھی تھیں اور رنگت زرد ہو رہی تھی لیکن پھر بھی وہ مسکرا رہا تھا۔

☆☆☆

ابوالخیر کی حویلی کے احاطے میں غلام معمول کے مطابق کام کرتے دکھائی دے رہے تھے۔ سامان کندھوں پہ اٹھائے سوکھے سڑے نقاہت زدہ اجسام کے مالک غلام ادھر ادھر آ جا رہے تھے۔ پھر سے کوئی تعمیراتی کام شروع تھا اور وہ جانوروں کی مانند مشقت میں لگے تھے۔

حویلی کے اندر دیوان خانے میں بڑی بڑی کھڑکیاں تھیں جن کے پردے ہٹے تھے اور خوب ساری روشنی اندر آرہی تھی۔ سامنے خوب صورت مسہریاں رکھی تھیں جن میں سے ایک پہ ابوالخیر بیٹھا

غور سے سامنے براجمان مراد راجہ کو دیکھ رہا تھا۔ مراد بظاہر پرسکون نظر آتا تھا۔ ٹانگ پہ ٹانگ جمائے روشن کھڑکیوں کو دیکھتے ہوئے مسلسل ناخن سے ٹھوڑی کو رگڑتا ہوا.... مگر جب سے وہ آیا تھا، فضا میں ایسا تناؤ گھل گیا تھا کہ ابوالخیر کو بھی اب تجسس ہونے لگا تھا۔

”راجہ.... سب ٹھیک تو ہے نا؟“ ”بندہ اپارا تمہارے مہمان خانے پہ آیا ہے تو ظاہر ہے سب ٹھیک نہیں ہے۔“ مراد نے ابرو چنچ لیے اور ناخوشی کے عالم میں کہنے لگا۔

”عجیب مشکلات آن پڑی ہیں۔“ ابوالخیر آگے کو ہوا۔ چہرے پہ تشویش ابھری۔ ”راجہ.... آپ ہر مشکل میں مجھے اپنے ساتھ پائیں گے۔ بتائیے، کیا بات ہے۔“

”میں نے تمہیں جب وزیر خزانہ بنوایا تھا اور ملاکہ میں امان دی تھی حالانکہ تم پچھلے سلطان کے حامی تھے تو میں نے ایک عہد لیا تھا تم سے۔“

”مجھے یاد ہے راجہ۔ آپ نے کہا تھا کہ اگر میں سلطان سے زیادہ آپ کا وفادار ہو جاؤں تو وقت آنے پہ آپ سلطان سے زیادہ مجھ سے وفابھائییں گے۔“

”اور وہ وقت آ گیا ہے ابوالخیر۔“ مراد بھی آگے کو جھکا اور آواز دھیمی کی۔ ”ہمیں مرسل شاہ کا تختہ الٹنا ہے۔“

کمرے میں ایک دم گھبرناٹا چھا گیا۔ ابوالخیر نے بے یقینی سے ابرو اٹھایا۔ ”لیکن مرسل شاہ تو ہماری مرضی کے مطابق کام کر رہا ہے۔“

باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ

اسی کی دہائی اور اگست کے گرم دن کا سورج سوا
نیزے سے ڈھل چکا تھا۔ صبح سے ہی گہما گہما اور اب
مغرب کے بعد ہی ڈھول باجے بج رہے تھے۔ لڑکیاں
بج رہی تھیں۔ دن تو ڈھل گیا لیکن دلہن والوں کے گھر
رات رنگ، نور اور خوشبو کی بارش میں نہا گئی۔ کرن سے
سجے زرتار ریشمی آنچل صحن میں بکھر گئے۔ مہندی کی خوشبو
میں بے، چوڑیاں کھٹکھٹاتے ہاتھ جب پھسلتے دوپٹوں کو
سر پہ سیدھا کرتے تو اندر باہر آتے جاتے مردوں کے
دلوں میں بجتا جلتا رنگ چوڑیوں کے ساز کا ہم نوا ہو جاتا
اور نئی کہی ان کہی دھنیں بکھر کر ہوا میں تحلیل بھی ہو جاتیں
اور منزل تک بھی پہنچ جاتیں۔
بلے بلے فی ماں دیے موم بتی اے

افراح سکندر خان

ریشم کھاتی

ان بہت سی ہم آہنگ آوازوں میں ایک آواز اس
کی بھی تھی جو ماں کی موم بتی تو تھی ہی لیکن ”شمع محفل“
بن جانا بھی خوب جانتی تھی۔ جس کی گردن میں سر پانٹ
تھا۔ کیوں نہ ہوتا چار بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔
ناز واداد تو اس پہ ختم تھا جیسے..... حسن ہو تو نزاکت
آہی جاتی ہے لیکن اس کو ”چار چاند“ پیسہ لگاتا ہے۔ تو
اس کے ناز و انداز کی پنک دمک ہی نرالی تھی۔
ہنستے ہوئے جب تان لگا کر وہ ڈھولک پیتی تو
نوجوان اسے پلٹ کر دیکھتے۔ ان کی دھڑکنیں سرک
کر پھسل سی جاتی تھیں ”ریشم“ کی ہر ادھر۔

☆☆☆

مہندی کی رونق عروج پہ تھی کہ کھانا کھول دیا
ایا۔ مہرتوں کے کھانے کا انتظام چھت پہ اور مردوں

کی ایک تھیں۔ یہی شکر تھا کہ وہ شادی میں شرکت کر
رہی تھیں۔ تائی سے تو کبھی بنی ہی نہیں تھی، لیکن زیادہ
قصورتائی کا اس لیے بھی نکلتا تھا کہ تایا کی حیثیت کم
تھی ورنہ ریشم اور ابا کا کتنا دل تھا کہ ثروت باجی کی
شادی منجھلے بھائی سے ہو جاتی۔
برے برے منہ بناتی وہ ان ہی سوچوں میں
ابھی تیزی سے سیڑھیاں اتر رہی تھی کہ اس کا ریشمی
آنچل سیڑھیوں کے ساتھ لگی لوہے کی گرل سے الجھ گیا،
بے دھیانی میں وہ تین چار سیڑھیاں اتر گئی تو آنچل
تار تار ہونے کو ہی تھا۔

عین اسی وقت خاقان اپنی والدہ کو بلانے
سیڑھیاں چڑھتے تیزی سے اوپر آیا۔ ریشم جو پلٹ کر
اپنے دوپٹے کو کھینچنے ہی والی تھی تو اس نے یہ موقع

غنیمت جانا اور تیزی سے اس کے پاس سے گزر کر ریشم کے الجھاؤ کو سلجھا دیا۔ وہ اس سے تین سیڑھی اوپر پلو تھامے جھکا تھا اور ریشم کا خفا خفا سارخ روشن کرل سے لگے برقی ققموں سے جگمگ کر رہا تھا۔ پس منظر میں خالی صحن تھا جہاں مہندی اور پھولوں کے تھال اور ڈھولک تھے تو اوپر آسمان پہ تیرہویں کا چاند۔ سیدزادہ قید کیوں کر نہ ہوتا۔

ریشم نے جب اسے پلو پکڑے تکتے دیکھا تو اپنے مہندی لگے انگوٹھیوں سے سجے ہاتھ سے خود ہی اپنے آپچل کو کھینچنا چاہا لیکن پلو تو سیدزادے کے ہاتھ پہ لپکتا ہی چلا گیا۔

یہ وہی لمحہ تھا جب ان کی آنکھیں چار ہوئیں اور دلوں کی دھڑکنوں نے ایک ہو کر ایسی دھن پر وئی جو ان کو باندھ گئی، جوان کے سوا کسی نے نہ سنی تھی۔

اس وقت تو ریشم دھڑکتے دل کے ساتھ پلٹ گئی۔ لیکن پھر بارات والے دن آنکھوں کی گستاخیاں عروج پہ رہیں۔ وہ چوری چوری خاقان کو دیکھتی رہی تو خاقان نے بھی اسے نظروں کے حصار میں رکھا۔

گھر کے اندر باہر سب کام خاقان ہی دیکھ رہا تھا۔ ریشم کے خیالوں میں تو شاید کب سے تھا لیکن خاقان کی نظروں میں وہ اب آئی تھی۔

ارد گرد کتنے ہی لوگ تھے جو اس کی ایک نگاہ کے منتظر تھے۔ وہ اپنی اہمیت اور حسن سے خوب واقف تھی۔ لیکن وہ کیا کرنی اپنے دل کا۔ جو خاقان کا نام سنتے ہی سر پٹ دوڑتا تھا۔ جب جب ثروت باجی یہ کہتی تھیں، خاقان بھائی سے سمو سے منگواتے ہیں۔ چلو تمثیلہ کے گھر چلیں، میں نے کروٹے کا ہک منگوایا تھا، خاقان بھائی تو کب کے لے بھی آئے۔

چھت پہ کھڑے ہو کر صحن میں لگے شہوت کے درخت سے شہوت توڑتے۔ کبھی مٹی کی دیوار سے ٹیک لگائے اجار یا سو جی کی ٹکڑیاں کھاتے وہ خاقان کو چوری چھپے دیکھتی تھی۔ تارا باجی، ثروت باجی کے لیے وہ بھائیوں جیسا ہی تھا کیونکہ ان کا سگا بھائی بہت

چھوٹا تھا۔ تائی تو خاقان اور تمثیلہ کو جیسے اپنے بچوں طرح ہی سمجھتی تھیں اور اللہ گواہ ہے ریشم سے زیادہ انہیں تمثیلہ عزیز تھی۔ ریشم تو کبھی ایک آنکھ نہیں بھاڑتی تھی۔ بس تاپا ابا اور ثروت باجی تھیں جن کی لاڈلی تھی ان ہی کی محبت اسے یہاں لانی یا بھئی خاقان کو دیکھنے کی خواہش ورنہ وہ اس گھر میں کبھی نہ آئی۔ شادی ختم ہوئی اور ریشم کا دل جیسے خالی ہو گیا ثروت باجی کی رخصتی کے ساتھ ہی سب بہانے رخصت ہو گئے۔

وہ کالج کے گیٹ سے باہر نکلی تو اسے لگا کہ اس دل بند ہو جائے گا۔ خاقان درخت کے سائے تلے کھڑا تھا۔ اسے لگا کہ وہ ہم ہے یا پھر وہ کسی کام سے یہاں آ رہا ہے۔ لیکن وہ اسے دیکھتے ہی اس کی طرف بڑھا۔ ”ثروت آئی ہوئی ہے کل سے۔ تم ملنے نہیں آئیں؟“

”مجھے پتا ہی نہیں تھا کہ وہ آئی ہیں۔ آپ انہوں نے بھیجا ہے؟“ اپنے دل کی دھڑکن کو قابو میں کرتی ریشم بے یقینی سی تھی۔

”آں نہیں..... میں.....“ خاقان نے سانس روک کر نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اور نظر بھر کر دیکھا۔ زبان نہ کہہ سکی، وہ فسانہ آنکھوں نے بیان کر دیا اور خوب کیا۔ ریشم نے جو اس کی نگاہوں میں محبت کی تڑپ دیکھی تو نظریں جھکا گئی۔

”میں شام میں آؤں گی۔“ جھکی نظروں اور لبوں پہ مسکان بکھیرتی وہ پلٹ گئی اور خاقان کی سائیں معطر ہو کر واپس لوٹ آئیں۔ اسے جواب مل گیا تھا۔

پھر بہت سے جواب پیام محبت کی صورت وہ ایک دوسرے کو بھیجتے رہے۔ بس سوال نہیں کرتے تھے کیونکہ سوال اندیشے لاتے ہیں۔ خاقان جب محبت کی نظمیں کہتا تو دھنک کے رنگ اس کے چہرے پہ بکھر جاتے اور خاقان کے دل کی دھڑکنیں موروں طرح رقص چار پارہ کرنے لگتیں۔ مشک محبت فضا میں پھیل جاتی۔ لیکن ہوا وہی جو ہوتا ہے۔ جو ساز صرف محبت

لے والوں کے کانوں میں رس گھولتے ہیں، جو دھنیں ریشم کی نرمی اور اس کے راز کی طرح پوشیدہ ہوتی ہیں، وہ نشوونما بن جاتی ہیں۔ ہر طرف بکھر جاتی ہیں۔ وہاں بھی پہنچ جاتی ہیں جہاں ان کو سزا نہ سمجھا جاتا ہے۔ ان کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ مہندی کی رات سے جو سلسلہ چلا تو سال بھر بعد اس آنکھ پجولی کا کھیل عروج پہ پہنچا تو وہ دونوں پکڑے گئے۔

”ریشم میں کیا کیا سوچتی رہی تیرے لیے اور تو نے اس ٹٹ پونچھے کو چٹنا اپنے لیے۔“ ریشم نے پانی بھری لال آنکھوں کو اٹھایا تو ان کے غضب نے اماں کو دہلا دیا۔

”اماں وہ میرے دل میں بست ہے، اس کی حیثیت کا اندازہ ٹھیک سے نہیں لگا پائیں آپ۔“ چٹاخ کی آواز بھائیوں نے کمرے کے باہر تک سنی۔ ریشم کے انگارہ ہوتے گالوں کا تصور ہی ان کے سینوں میں ٹھنڈک اتار گیا۔

باپ بھائی قصداً خاموش تھے۔ ان کا مان، ان کا غرور ٹوٹا تھا لیکن ریشم کی ہڈیاں توڑنا گوارا نہیں تھا انہیں۔

اس کا کالج جانا تو بند ہو ہی چکا تھا۔ اس پہ عذاب بھائیوں کی شکلیں دیکھنا تھا۔ کل تک بھائیوں کی ”سُر“ چڑھی۔ ریشم جو ان کے ”سروں“ پہ چڑھ کر ناچا کرتی تھی، آج وہ مزے لے کر اس کے کردار اور اماں کی تربیت کو ”روندی“ تھیں۔

بس پھر اماں بھی میدان میں آ گئیں۔ کیا ہوا ”بچی“ ہی تو تھی ان کی لاڈلی، اب بچے غلطی نہیں کریں گے تو اور کون کرے گا؟

پھر گھر میں روز طبل جنگ بجتا، روز تماشا لگتا اور بھائیوں یہ تماشا صحن میں لگاتیں تاکہ ”تماشا“ جمع ہو سکیں۔ اماں نے کبھی ہار نہیں مانی تھی، پھر ان بالشت بھر کی چھو کر یوں سے کیسے ہار مان لیتیں۔ لیکن پھر اماں ڈھسے گئیں ان بالشت بھر چھو کر یوں کے ”شوہروں“ کے سامنے۔ کیونکہ وہ

انہیں خود ”شیر جوان“ کہتی تھیں۔ جن کی غیرت و حمیت کے قصوں سے بہوؤں کو دایہ کے رکھا تھا، جن کے غصے کا چرچا وہ اٹھتے بیٹھتے کرتی تھیں۔ وہ اماں کے سامنے تن گئے تھے۔ انہیں ریشم اچھوت لگنے لگی تھی اور ان کی زبانیں بیویوں کی بولیاں بولنے لگی تھیں۔

ابا نے چپ سادھ لی تھی کیونکہ قصہ زبان زد عام ہونے کو تھا۔ بس پھر ایک ہی حل تھا جو ہر باپ کے پاس ہوتا ہے۔

بڑے کمرے میں ہنگامی میٹنگ بلائی گئی۔ ریشم تو ضد کی پکی تھی وہ تو پہلے بھی کمرے سے نہیں نکلتی تھی کیونکہ بقول اس کے وہ تو ”حق بجانب“ تھی۔ بھابھیاں جلے پیر کی ملی کی طرح سن گن لینے کے لیے بے تاب تھیں۔

”بس اس کا رشتہ ڈھونڈو۔ یہاں سے چلی جائے گی تو لوگوں کی زبانیں خود ہی بند ہو جائیں گی۔“ میٹنگ برخاست ہوئی۔ بھائیوں نے پھرتی دکھائی اور تین دن بعد رشتہ بھی ڈھونڈ لائے۔

ریشم اتنی بھی بے خبر نہیں تھی۔ بڑے بھتیجے کی دوڑیں لگی کی نکر یہ کھڑے خاقان سے شروع ہو کر ریشم پہ ختم ہوتی تھیں۔

بھائیوں کا لایا رشتہ پکا ہوتا، اس سے پہلے سید



دستِ مسکینا
نگاہِ مسکینا

قیمت - 400 روپے

منگوانے کا پتہ:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ: 37 - اردو بازار، کراچی۔ فون نمبر: 32735021

زادہ خاقان کی والدہ بیٹیوں کے ساتھ آ موجود ہوئیں۔ گودل پہ پھر رکھے ہی لیکن وہ ریشم کا رشتہ مانگ رہی تھیں۔

ابا تو اٹھ کر چلے گئے۔ لیکن اماں نے اپنے تئیں ان کے ساتھ جو کیا وہ ان کی سات نسلیں یاد رکھتیں۔ جب خاقان کی ماں دہلیز پار کر رہی تھیں تو ریشم کی اماں کی آواز ان کے کان پھاڑ رہی تھی۔

”کلرک کی ماں ہو کر میری شہزادی کا رشتہ لے آئیں ذرا شرم نہیں، پتا نہیں لوگ اپنی اوقات کیسے بھول جاتے ہیں۔ چلو اوقات تو بھول ہی گئے اپنے عقیدے کا ہی خیال رکھ لیتے۔“

لیکن پھر ریشم نے اماں سمیت سب گھر والوں کے ساتھ وہ کیا جو واقعی ان کی سات نسلوں پہ بھاری پڑنے والا تھا۔

☆☆☆

مجسٹریٹ کے دفتر سے نکل کر جب ریشم تیز تیز چلتے سید زادہ خاقان کے پیچھے چل رہی تھی تو اس کی چادر جنگل کی باڑ میں اٹک گئی۔ یہاں ریشم نے پھر لا پرواہی برتی اور دھیان نہ دیا بس وہ تیزی سے خاقان کے ہم قدم ہو جانا چاہتی تھی جو اپنے دوستوں کے ساتھ تیز تیز چل رہا تھا اس کا دھیان اس وقت قطعاً ریشم پہ نہیں تھا، جس کا پلو جنگل میں اٹک کر پھٹ گیا تھا۔

وہ دن سید گھرانے پہ تازیانہ بن کر اتر تھا۔ جب اکلوتا بیٹا اس حال میں گھر تک داخل ہو کہ اس کے ہاتھ میں کاغذات ہوں اور اس کے پیچھے کھڑی لڑکی (بہو) کی چادر تار تار ہو تو ماؤں کی دنیا ہی اندھیر ہو جاتی ہے۔

خاقان کے گھر کی بھی بنیادیں ہل گئیں۔ اس کی ماں پہ غشی طاری ہو گئی۔

”ابا..... ہم آپ کے پاس آئے ہیں، ہمارے سر پہ ہاتھ رکھ دیں یا ہمیں گھر سے نکال دیں۔“

خاقان کے ابا جو کرسی پہ گر سے گئے تھے۔ خاقان ان کے پاؤں پکڑ کر زمین پہ بیٹھا کہہ رہا تھا۔ اکلوتا بیٹا جوان کی امیدوں کا مرکز تھا جسے ان کا

بازو بننا تھا۔ اس نے ان کے دماغ کو مفلوج کر رکھا تھا۔ بیٹے کو گھر سے کیسے چلتا کرتے، جب کہ ”چلتا“ ہی اس کی کمائی پہ تھا۔

”خاقان! تجھے ذرا حیا نہ آئی تو بھی بہنوں کے لیے ہے۔“ خاقان سے سال بھر چھوٹی بہن تمثیلہ اس کا گریبان پکڑ لیا۔

”ہم میں سے کوئی ایسا کرتی تو تو ہمیں مانع غیرت کا شملہ اونچا کرتا۔ بتا اب تیرے ساتھ ہم کریں؟ ہمیں تو معاشرے نے یہ حق ہی نہیں دیا کہ ہم غیرت کے نام پہ قتل کر سکیں۔“

خاقان تو زندہ زمین میں ہی گر گیا۔ ریشم اب تک صحن کے بیچ و بیچ کھڑی تھی لرز گئی۔ یہ تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا اس کے بھائی اگر اس کے پیچھے گئے تو.....؟

ارد گرد کی چھتوں پہ سر ابھرنے لگے تو خاقان کے ابا نے بیٹے کو کمرے میں بھیج دیا۔ ریشم کی طرف کسی نے دیکھا ہی نہیں تھا۔ دو ماں کے ہاتھ پاؤں سہلار ہی تھیں تو ایک باپ کو پانی دے کر ٹھنڈا کر رہا تھا۔

خاقان ہی اس کا ہاتھ تھام کر اپنے کمرے میں لے گیا اور پھر دو دن وہ اسی کمرے میں بند رہی۔ اس نے اسے نہیں بلایا تو وہ کیوں خود کو ہلکا کرتی اور ان جیسوں (دبوس) کے آگے تو قطعاً نہیں۔

ریشم کے بھائی تو مرنے مارنے پہ اتر آئے تھے۔ لیکن خاقان کے ابا کو بیٹا عزیز تھا۔ وہ ریشم کے بتایا کے پاس گئے۔ گو کہ اس کے تایا کو بھی غصہ تھا لیکن بیٹی کی ضد اور کارنامے سے بھی واقف تھے۔

پنجائیں لگیں، کوسلر بلوائے گئے۔ گھر کی بات چور اہوں کی زینت بنی۔ وہ ناز و ادا کا پیکر ریشم بہت سوں کو پہنچ سے دور لگتی تھی۔ اب اس کا قصہ زباں زد عام تھا۔ لوگ خاقان کے گھر کی طرف دیکھتے اور باتوں کا چکا لیتے۔ عورتیں بہانے بہانے سے گھر میں آنے کی کوشش کرتیں۔ خاقان کی اماں بانو دروازہ کھولنا ہی بند کر دیا۔

خیر فیصلہ یہ ہوا کہ دونوں عاقل و بالغ تھے، والدین کو شروع میں ہی مان جانا چاہیے تھا۔ حل یہی ہے کہ ولیمہ کیا جائے اور دونوں گھرانے اس میں شرکت کریں۔ ایک دوسرے کی عزت کو مزید نہ اچھالیں۔ ولیمہ سے ایک دن پہلے خاقان سے چھوٹی تمثیلہ کے سسرال والے آکر انگٹھی واپس کر گئے۔ جس گھر کا لڑکا ایسا تھا وہاں کی لڑکیاں تو پھر الامان۔ شادیانے کیا بنتے اس گھر پہ تو نحوست نے ڈیرے ڈال لیے تھے۔

☆☆☆

”ہائے کتنا روپ آیا ہے۔۔۔“ ریشم خاقان کے کمرے میں ہی بیٹھی تھی۔ خاقان ہی اس کے لیے ایک سبز رنگ کا کام والا جوڑا لے آیا۔ ماں کے زیور پہ حق نہیں رہا تھا اور ساس اسے حق دار نہیں سمجھتی تھی۔ خاقان نے پھولوں کا زیور لا کر پہنا دیا آخر دلہن کو دلہن لگنا چاہیے۔ ویسے کی نا سبھی مہندی کی ہی سہی۔

ریشم نے اپنے مہندی سے عاری ہاتھوں کو دیکھا۔ کتنا شوق تھا اسے مہندی لگانے کا۔ بھائیوں کی شادیوں پہ کیسے بھر بھر مہندی لگائی تھی اور اپنی شادی؟ ایسا تو نہیں سوچا تھا کہ شادی ایسے ہوگی۔ اسے تو شہزادیوں کی طرح رخصت ہونا تھا۔ پہلی دفعہ احساس ہوا کہ بہت غلط ہو گیا ہے۔ اٹھارہ سالہ زندگی کی پہلی اور سنگین غلطی کا ادراک اب ہوا تھا۔

”ہائے روپ تو دیکھو، سادگی میں بھی غضب ڈھا رہی ہے۔“

”روپ کو ساری عمر چائنا تھوڑی ہوتا ہے یہ دیکھ کیسی سبز قدم ہے۔ جب سے آئی ہے گھر ماتم کدہ ہی بن گیا ہے۔“

”چڑھاوے کی چادر کتنی ہی عمدہ ریشم سے کیوں نہ تیار کی جائے، سونے کے تاروں سے سجائی جائے لیکن جگہ تو اس کی مرقد ہی ہے نا۔ بس یہ بھی وہی ریشم ہے۔ کیسی پاک بیبیوں کا گھرانہ تھا، اب تو ایسے ہے جیسے کوئی مزار۔“

کسی نے اسے کبھی اف بھی نہ کہا تھا اور اب جو عورت کمرے میں آئی، کچھ نہ کچھ بول کر ہی جاتی۔ بس ایک بار اماں ابا آجائیں ان کے پیروں میں گر جاؤں گی۔ وہ معاف کر دیں تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ لیکن انتظار انتظار ہی رہا۔ اس کے گھر سے کوئی نہ آیا۔

کھانا کھول دیا گیا تو سب خواتین صحن میں چلی گئیں۔ ان کی میزبانی کرنے والا بھی کوئی نہ تھا۔ گھر کی خواتین نے خود کو کچن تک محدود کر لیا تھا۔

وہ پھر سے تنہا ہو گئی۔ اب اسے رونا آ رہا تھا۔ دھندلی آنکھوں کو دروازے کے پار کسی اپنے کا گمان ہوا تو وہ دوڑ کر دروازے کے پاس گئی۔ ثروت باجی اندر داخل ہو رہی تھیں۔ وہ ان سے لپٹ گئی۔

”کتنی حسرت تھی میری ریشم کہ تو میری بہن ہوتی۔ لیکن ابھی شکرانے کے نفل پڑھ کر آ رہی ہوں، کتنی خوش قسمت ہوں کہ تو میری بہن نہیں ہے۔“ ریشم جوان کے گلے لگی تھی جھٹکے سے پیچھے ہوئی۔

”دنیا دکھاوے کو آئی ہوں کیونکہ اور کوئی تیار ہی نہیں تھا آنے کو۔ یہ لے چاچی نے بھجوائے ہیں۔“ ایک چھوٹا سا بیگ انہوں نے اسے تھما دیا جس میں زیورات اور کچھ کپڑے اور نقدی تھی۔

”اور چاچا جی نے ایک پیغام دیا ہے، کہتے تھے ریشم کو کہنا ہم نے اس پہ فاتحہ پڑھ لی ہے، جیسے وہ ہمیں دفن کر گئی ہے۔“

ریشم تو واقعی ریشم ہی نکلی، اوپر سے نرم، چمکیلی اور اندر سے قاتل۔ تھوک کی پیداوار۔ جیسے ریشم کو بٹتے بٹتے ریشم کا کیڑا امر جاتا ہے، تو نے بھی ویسے ہی چاچا چاچی کو مار دیا۔ ابا حج کہتے تھے حرام کمانا ایسا ہی ہے جیسے کوئی تھوک چاٹ لے۔

آج میں نے دیکھ بھی لیا کہ ابا کتنا صحیح کہتے تھے۔ یہ کہہ کر وہ باہر چلی گئیں۔

دو گھر چھوڑ کر تایا جی کا گھر تھا۔ لیکن ریشم کی سمجھ میں آ گیا کہ فاصلہ دو صدی جتنا ہے۔

☆☆☆

ماہنامہ حنا

بہنوں کا اپنا ماہنامہ

لاہور

جولائی 2018 کا شمارہ نمبر 197

یہ لائی 2018 کے شمارے کی ایک بھلیک

☆ ”ہتھیلی کا چاند“ سباس بھل کا ناول،

☆ ”عید کے رنگ“ فوزیہ سرور کا ناول،

☆ ”بندھن“ خورشید بھک کا ناول،

☆ ”میں دقلم“ بشری سیال کا ناول،

☆ ”شہر دل کا راستہ“ حسین اختر کا ناول،

☆ ”پھگلتا چاند“ نازک طارق کا ناول،

☆ ”دل گزیدہ“ ام مریم کاسلے دار ناول،

☆ ”پریت کے اس پار کھین“ نایاب جیلانی

کاسلے دار ناول،

☆ وجیہ بخاری، نادیہ جہانگیر، سورالک، فرحت انصاری،

فیض آصف اور شبانہ شوکت کے افسانے،



پیارے نبی ﷺ کی پیاری باتیں، انشاء نامہ،

تمام مستقل سلسلوں کے علاوہ وہ سب کچھ جو

آپ پڑھنا چاہتے ہیں

کا شمارہ آج ہی اپنے قریبی

یہ لائی 2018

کے اشعار سے طلب کریں

خاقان کا توجہ متلانے لگا۔ ابا نے بھی ایک دو لقموں کے بعد ہاتھ روک لیا۔

”میرے ہاتھ زخمی ہو گئے، جل بھی گئے اور آپ مجھے باتیں سنارہے ہیں۔“ ریشم کھانے کے بعد سے کمرے میں بند تھی۔

خاقان نے ان نرم ہاتھوں کو سہلانا شروع کر دیا۔ ”تم تمثیل سے کہہ دیتیں، وہ مدد کروادیتی۔ بلکہ میں اسے کہہ دیتا ہوں۔ تم فکر نہ کرو وہ اور سمیعہ تمہیں سب کچھ سکھادیں گی۔“

”نہیں، رہنے دیں، میں دیکھ لوں گی۔ ویسے میرے کرنے کی ضرورت تو نہیں، پہلے ہی وہ دونوں سب کچھ کرتی تھیں۔ چھوٹی بھی اسکول سے آکر ان کی مدد کروادیتی ہے۔“

”لیکن میرا دل تو یہ کرتا ہے نا کہ میرے سب کام تم کرو، میں آفس سے آکر تمہیں پکاروں، کھانا، چائے مانگوں۔“

”ہائے اللہ پھر نوکرانی لے آتے، میری کیا ضرورت تھی۔“

”یہ ضرورت نہیں، مان ہے مان۔“ خاقان نے اس دن تو اسے بہلا لیا۔ لیکن آئندہ آنے والے دن کسی کے لیے بھی خوش گوار نہیں تھے۔

☆☆☆

روٹھنا منانا، رونا دھونا، لڑنا جھگڑنا..... بس یہی سب تھا جو اس گھر کا معمول بن گیا تھا۔ صرف چھ مہینے میں ہی سب کی بس ہو گئی۔ خاقان اپنے گلے پڑا ڈھول بجانے پہ مجبور تھا، ورنہ ریشم اب دل سے اترتی جا رہی تھی، آخر وہ کب تک اس کے حسن کو خراج پیش کرتا۔

ریشم کا خمار بھی اتر گیا۔ اس دیوی کو بھی ایک بچاری چاہیے تھا جو اسے پوجتا رہتا۔ پرستش کرنا تو ایک طرف اس کا تو حسن ہی کملا کر رکھ دیا تھا خاقان کی ذمہ داریوں نے۔ ماں بہنوں نے ریشم سے نوک جھونک کا بدلا کچھ یوں لیا کہ خاقان کے ہر کام سے ہاتھ اٹھالیا۔

جو اس نے صفائی کی تھی اس پہ اس کی ساس بڑبڑاہیں کل سے جاری تھیں۔ اس وقت اسے شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ کاش خاقان کی ایک بہن سے ہی دوستی کر لیتی تو وہ ہی مدد کو آ جاتی۔

”لو اماں دیکھو تمہاری بہو پیاز کاٹ رہی ہے۔“ تمثیلہ نے مشین سے کپڑے نکالتے ہوئے کہا۔

”ہاں دیکھ رہی ہوں، کاٹ نہیں رہی ضائع کر رہی ہے رزق۔“ ریشم کا چہرہ پانی سے تر تھا۔ ناک بہہ رہی تھی اور ہاتھ پہ ایک دوکٹ بھی آچکے تھے۔

”تو آ کر خود کاٹ لو۔“ اس نے بھی غصے سے چھری پٹنی۔

”اللہ معاف کرے، ماں نے دو ہی کام سکھائے یا تو زبان چلا لویا معاشرہ..... اور کچھ نہیں سکھایا کیا؟“ انہوں نے طنزیہ کہا تو ریشم نے غصے کو دبا لیا۔ خاقان نے اب تک یہی تو سمجھایا تھا کہ یہی اماں ابا سے بدتمیزی نہ کرنا، اسی لیے وہ ان کا لحاظ کر گئی۔

”جا تمثیلہ تو بنا لے ورنہ آج کھانا نہیں ملے گا۔“ بڑی بی بی نے جب سے بیٹیوں کو گھر داری سکھائی تھی خود یوں ہی کبھی سخن میں کبھی برآمدے میں تخت پہ بیٹھی کاموں کی نگرانی کرتی تھیں۔

”شرم کرو، مجھ سے تین سال چھوٹی ہو، نند نہ سمجھو لیکن بڑے ہونے کا لحاظ تو کرو۔“ تمثیلہ برآمدے میں بچن کے دروازے پہ آکر بولی۔

”ہنہ.....“ ریشم نے بھی استہزاء سے چہرہ جھٹکا۔

”لو اماں! پھر آج ابا اور خاقان کو دیکھ لینے دو اس کی کارکردگی۔“ تمثیلہ ثروت کی بچی دوست تھی۔ اسے بچپن سے ہی اتراتی، ناک چڑھانی ریشم زہر لگا کرتی تھی۔ وہ جو مدد کے خیال سے آئی تھی، غصے میں دوبارہ پلٹ گئی۔

ریشم کو غلطی کا احساس ہوا لیکن ڈٹی رہی۔ ایک آلو مٹر کا سالن ہی تو تھا، بنالے گی جیسے تیسے کر کے۔ لیکن یہی آلو مٹر اس کے کس بل نکال گئے۔ دوپہر کے کھانے میں عجیب و غریب ملعوبہ دیکھ کر

کتنا ناز تھا اسے اپنے حسن پہ، اپنے پیسے پہ۔ جسے کبھی گرم ہوانے بھی نہ چھوا تھا۔ اس پہ زمانے نے اس کی حقیقت واضح کر دی۔ اس کے گھر والوں نے اسے تھوک دیا اور سسرال والے چائے پہ تیار نہ تھے۔ ایک دو مہینے تو یوں ہی گزر گئے، نہ وہ کسی کو بلاتی نہ ہی کوئی اس کو بلاتا۔ خاقان بھی خیرے اٹھا اٹھا کر تھکنے لگا تھا۔ کبھی ریشم کو سمجھاتا کبھی اماں اور بہنوں کو۔ لیکن دونوں طرف کوئی انا کی دیوار گرانے کو تیار نہ تھا۔

پھر اس کے ابا نے گھر کا سربراہ ہونے کا حق ادا کیا اور تینوں بیٹیوں اور بہو کے درمیان کاموں کی تقسیم کر دی۔ بہو گھر کے کاموں میں رچ بس جانی۔ کسی نہ کسی بہانے اسے گھر کی لڑکیوں سے بات چیت کا موقع ملتا تو ماحول بہتر ہو سکتا تھا۔ لیکن ریشم کے لیے تو یہ حکم سسرال کے مظالم کی کہانی میں پہلا باب ثابت ہوا۔

☆☆☆

ریشم کے کیڑے کی کہانی بھی عجب ہے۔ تار تار کر کے وہ لعاب اپنے گرد لپیٹتا جاتا ہے یہاں تک کہ خود کو ان ریشمی تاروں کے گویا میں قید کر لیتا ہے۔ بس اس کی اتنی ہی سکت، اتنا ہی اختیار ہوتا ہے۔ اس کے آگے کی کہانی اس بات پہ منحصر ہے کہ وہ گویا کس کے ہاتھ لگتا ہے، اگر ہاتھ ہنرمند ہوں تو وہ اس کو بے گو گرم پانی کی گرماہٹ سے نرم چمکیلے چمکیلے ریشم میں بدل دیں۔ لیکن اگر ہاتھ اناڑی ہوں تو وہ اس خول کی چمک دمک کو ہی عزیز جان لیں، یہاں تک کہ کیڑا خود ہی گویا توڑ کر باہر آجائے، پھر نہ ہی ریشم بچتا ہے نہ ہی کیڑا ہاتھ آتا ہے۔

ریشم کی ماں نے بھی اسے زمانے کی گرم ہواؤں سے بچا کر رکھا تھا۔ اسے اپنی بیٹی کی ظاہری چمک دمک ہی عزیز تھی، تب ہی تو نہ وہ نرم اور چمکیلی بن سکی نہ ہی گھر کی چار دیواری میں قید رہ سکی۔

گھر کے کام..... ایک عذاب تھا جو اس پہ مسلط کیا گیا تھا۔ آج کھانا بنانے کی باری اس کی تھی۔ پچھلے دن

خاقان کی آمدنی محدود تھی جو ساری گھر پہ خرچ ہو جاتی۔ ریشم کے لیے کچھ بچتا ہی نہیں تھا۔ چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لیے دل مارنا کسے کہتے ہیں یہ سمجھ میں اب آیا تھا۔

باہر والوں کی نظریں تو اسی گھر پہ ٹکی رہتی تھیں۔ روز نیا معرکہ ہوتا اور چٹ پٹی خبریں محلے میں ونڈی کی چیز کی طرح گردش کرتیں۔ سن گن لینے والی عورتوں کا تانتا بندھا رہتا اور نہیں تو ساتھ والے گھر کی چھت پہ محفل جمی رہتی کہ صحن میں کچھ ہو تو وہ سب براہ راست ملاحظہ کریں۔ خاقان کے ابا نے زندگی میں اتنی بدنامی کا سامنا نہیں کیا تھا، جس گھر سے بیٹی کی ہنسی کی آواز بھی باہر نہ جانی ہو۔ اب اس گھر کی خبریں سات محلوں تک سنی جاتی تھیں۔

”خاقان تُو نے میرے سر میں خاک ڈلوادی۔ مجھے بتا تو میرے کس گناہ کی سزا ہے۔ تمثیلہ کا رشتہ دیکھنے والے یہ کہہ کر چلے گئے تھے کہ انہیں عزت دار گھرانے میں رشتہ کرنا ہے۔

یا اللہ تُو تو رحم کرنے والا ہے، مجھ پہ رحم کر، میرا پردہ ڈھک لے۔ اب اور ہمت نہیں ہے مجھ میں۔ تو رحم کر دے مولا تو رحم کر دے۔“ ڈرائنگ روم میں ہی موت کی دعا کرتے کرتے ابا نیچے گر پڑے۔ ان پہ فالج کا حملہ ہوا تھا۔

ابا کی آہ و بکا دو دن ریشم کے کانوں میں گونجتی رہی۔ خاقان کے ابا کا درد اسے پہلی بار محسوس ہوا۔ کیا وہ اور خاقان اتنے برے تھے کہ وہ شرفاء کے زمرے میں ہی نہیں آتے تھے۔

اس کا دل پسچ گیا۔ ہسپتال سے آنے کے بعد اس نے ابا کو بخنی پلانا چاہی تو تمثیلہ اور سمیعہ اس کے بال پکڑ کر اس کے کمرے میں گھسیٹ کر لے گئیں۔

”اب کیا ابا کی جان لوگی تم۔ تمہارا دل نہیں بھرتا یا ابھی ہمارا اور خون پینا ہے۔ ایسا کرو ایک ہی دفعہ ہم سب کے گلوں پہ چھریاں چلا دو شاید تمہاری پیاس بجھ جائے۔“

ریشم نے پہلی بار سب چپ چاپ سن لیا۔ اس

کی ذہنی روائے اپنے ماں باپ کے گھر جا بھٹکی۔ کیا اس کے ابا بھی اسی حال میں ہوں گے؟ ان پہ کیا بیت رہی ہوگی؟ وہ شادی سے اب تک ان سے خفا رہی تھی۔ اب اس کا دل اس خیال سے پھٹنے لگا کہ خدا نخواستہ اس کے اماں ابا کو کچھ ہونہ گیا ہو۔ وہ اسی عالم میں گھر سے نکل بھاگی۔

اب وہ تیسرے گھر کا دروازہ پیٹ رہی تھی۔ راہ گیر اسے رک کر دیکھنے لگے، کھڑکیاں کھل گئیں۔ جس گھڑی کا انتظار سب محلے والوں کو تھا کہ آخر کب ریشم کو اس گھر سے دھکے مار کر نکالا جائے گا، وہ شاید آگئی تھی۔ تاپا کا چھوٹا لڑکا جو دروازے کے پار کھڑا تھا کہ ماں کا حکم تھا کہ دروازہ نہیں کھولنا اس نے ایک بار پھر ماں کی طرف دیکھا۔

ریشم دروازہ پیٹ رہی تھی اور ایسے پیٹ رہی تھی کہ یا تو دروازہ توڑ دے گی یا پھر یہیں مر جائے گی۔ تائی غضب ناک ہوتی آئیں۔ دروازہ کھول کر ریشم کو اندر گھسیٹا۔ دھاڑ سے دروازہ بند کیا اور ایک زوردار پھٹرا سے دے مارا۔ ریشم نیچے جا گری۔

”وہاں سے بھاگ کر آ رہی ہے یا انہوں نے نکال دیا۔“ اس وقت ریشم کا بھی دل کیا، سر کی طرح آہ و بکا کرے اور رحم مانگ لے۔

”بتا اب کیا گل کھلا دیا تو نے جو انہوں نے نکال دیا۔“

”مجھے کسی نے نہیں نکالا، بس یہ بتادیں کہ اماں ابا کیسے ہیں؟ میری بات کرادیں اماں سے۔“ زمیں پہ بیٹھی، ہاتھ جوڑ کر منت کرتی ریشم وہ ریشم نہیں تھی جسے وہ جانتی تھیں۔

”اماں.....“ تائی کے بیٹے سے ریشم باجی کا حال دیکھا نہ گیا۔ دل تو تائی کا بھی پسچ گیا۔ شرور کے دو مہینوں کے بعد سے تو خاقان کے ساتھ بھی آتے جاتے نہیں دیکھا تھا اسے کسی نے۔ سننے میں یہی آیا تھا کہ ساس نے منع کیا ہے اسے باہر آ جانے سے۔ چھ سات مہینوں میں ہی ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گئی تھی۔ حسن کو جیسے گرہن لگ گیا تھا۔ انہوں نے

اسے بازو سے پکڑا اور اندر لے گئیں۔

”تائی! بس اماں ابا سے بات کروادیں۔ میں واپس چلی جاؤں گی۔ مجھے دسو سے آرہے ہیں۔ اللہ کا واسطہ اماں کی بس آواز سنوادیں۔ میں بات بھی نہیں کروں گی۔ بس آواز سن لوں گی۔“

تائی کے دل میں بڑی کدورت تھی ریشم کے لیے اس کی ماں کے لیے۔ لیکن اس لمحے ان کا دل بدل گیا۔ وہ تائی سے ماں بن گئیں۔ انہوں نے اسے زور سے خود میں بھینچ لیا۔

”بس کر جا ریشم! بس کر جا، بھول جا نہیں۔“ دروازہ پھر دھڑ دھڑایا جانے لگا۔ دروازہ کھلنے پہ خاقان جن تیوروں سے اندر داخل ہوا تائی بہت کچھ سمجھ گئیں۔

”ریشم گھر جا اور زبان مت چلانا خاقان سے۔ خبردار جو آگے سے ایک لفظ بھی کہا۔ میں کل ملنے آؤں گی تجھ سے۔“

ان کی بات بھی پوری نہیں ہوئی تھی کہ خاقان اسے بازو سے پکڑ کر لے گیا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی اس نے دروازہ بند کیا اور ریشم کو زوردار پھٹرا دے مارا۔

”میری اجازت کے بغیر آئندہ تم اس گھر سے قدم بھی باہر نہیں نکالو گی۔“

ریشم گال پہ ہاتھ رکھے اپنے محبوب کو دیکھ رہی تھی، ایک یہی تو آسرا تھا کہ خاقان میرا ہے، میرے ساتھ ہے۔ اب وہ تنکا سا آسرا بھی پاس نہ رہا تو وہ ڈوبنے لگی۔ اس کا دل بند ہونے لگا۔ ناک میں جیسے ڈھیر سارا پانی چلا گیا۔ چہرہ جو تر ہوتا تھا آنسوؤں سے۔ تائی نے کہا تھا زبان نہ چلانا۔ وہ تو کسی قابل رہی ہی نہیں تھی۔ ڈیوڑھی میں کھڑی ریشم کو دیکھ کر برآمدے میں کھڑی تمثیلہ کے دل میں سکون اُتر گیا۔ کیونکہ سزا اس نے بھی بھگتی تھی خاقان کی بہن ہونے کی۔ خاقان کمرے میں بند ہو چکا تھا۔

☆☆☆

گرم کھولتا ہوا پانی تھا جو اس پہ ڈالا جا رہا تھا۔

لیکن اس کا بدن نہیں دل جل رہا تھا۔ تپش سے وہ کھلنے لگی۔ آگ کہیں نہیں تھی، بس پانی تھا، جس کا کنارہ کہیں نہیں تھا۔ ایک گرم آبشار اسے موم کی طرح پکھلا رہی تھی۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ بس پانی گرنے کی آواز تھی۔ قطرہ قطرہ، وہ پانی کا حصہ بننے لگی کہ کسی نے اس کے لیے بالوں کی چٹیا پکڑ لی۔ دہشت سے وہ چیخنے ہی والی تھی کہ مانوس آواز اس کی سماعت کا حصہ بنی۔

”بس ریشم! یہ ضروری ہے۔ بس تھوڑی دیر اور برداشت کر لے۔ گھبرانہ میری بچی، میں ہوں تیرے ساتھ۔“

اس نے جھٹکے سے آنکھیں کھول دیں۔ خاقان کروٹ بدلے سو رہا تھا۔ کل سے وہ خفا تھا، حالانکہ خفا ہونے کا حق تو ریشم کو تھا لیکن اب سب بدل گیا تھا۔ وہ بھی شاید بدل رہی تھی۔

وہ سمجھ نہ پائی کہ وہ کس کی آواز تھی۔ لیکن دوپہر کو سب سمجھ میں آ گیا۔ جب وہ خاقان کے کپڑے دھو رہی تھی تو وہی آواز ساس سر کے کمرے سے آ رہی تھی۔

”بانو بہن میں شرمندگی میں نہ آسکی ورنہ تیرا میرا بہنا پا تو کسی سے ڈھکا چھپا نہیں تھا۔“ تائی ہاتھ جوڑے اس کی ساس سے معافی مانگ رہی تھیں۔ ریشم کا دل بھر آیا۔ کتنے لوگوں کا سر نیچا کر دیا تھا ان دونوں کی شادی نے۔ بڑے جو سر پہ شفقت سے ہاتھ رکھا کرتے تھے، اب ہاتھ جوڑتے تھے۔

”فضیلہ بھابھی! بس آپ مجھے شرمندہ کر رہی ہیں آپ کی کیا غلطی؟ بس غلطی تو کسی کی بھی نہیں تھی شاید ایسا ہی ہونا لکھا تھا۔ جنہیں شرمندہ ہونا چاہیے وہ تو بیاں گ دہل پھر رہے ہیں۔“ تائی کے ہاتھ پکڑ کر وہ رو پڑیں۔

”بس اللہ کا کرم ہے کہ اس نے مجھے بیوگی سے بچالیا۔ ورنہ شادی کے بعد سے ایک دن چین سے نہیں سوئے تھے شاہ صاحب۔ ہمارا بھی بیٹیوں والا گھر ہے۔ ساری عمر دعا کرتے رہے کہ اللہ عزت کی

حفاظت فرمائے۔ تہجد میں اٹھ کر دعا کرتے تھے بیٹیوں کے نیک نصیب، نیک چلن کی۔ لیکن عزت کو نہ لگا بھی تو کہاں سے، بیٹے نے کہیں کا نہ چھوڑا۔ کسی میری حیا والی بیٹیاں اور اب لوگ کہتے ہیں عزت داروں میں رشتہ کریں گے۔“ تائی فضیلہ کے گلے لگ کر اس کی ساس کے بین، اس تک بخوبی پہنچ رہے تھے۔ کوئی گھٹنے بعد تائی فضیلہ کمرے سے باہر نکلیں۔ وہ برآمدے پہ تخت کے کنارے بیٹھی جیسے ان ہی کی منتظر تھی۔

”کل سے میرے دل کو پتنگے لگے ہوئے تھے خاقان جس طرح غصے میں آیا تھا، زیادہ گرمائی تو نہیں ہوئی؟“ ریشم کے چہرے پہ انگلیوں کے نشان سب کہانی سنار ہے تھے ریشم ان کے گلے لگ کر رو پڑی۔ ”بس صبر کر میری بیٹی! میں نے بانو سے اجازت لے لی ہے۔ کل سے آ جایا کرنا میرے گھر۔“

اور پھر زندگی کے نئے باب کا آغاز ہو گیا۔

☆☆☆

ہمیشہ سنا تھا تائی فضیلہ بڑی سخت ہیں۔ سارا بچپن ان سے ڈر کر گزارا تھا۔ جب وہ تایا کے گھر آ کر اچار کے مرتبانوں میں ہاتھ ڈالتی۔ چٹنیاں مرتبہ چھت پہ چھپ چھپ کھاتی تھی تو تائی کی دھاڑ سے پورا گھر دہل جاتا تھا۔ لیکن وہ بھی باز نہیں آتی تھی۔ اب اس کے گھر میں یہ مزے کی چیزیں تھوڑی بنتی تھیں۔

اب سمجھ میں آیا تھا کہ ثروت باجی، تارا باجی پہ سختی کیوں کرتی تھیں۔ کیوں ہر وقت کاموں میں لگائے رکھتی تھیں۔

کتنی خوش تھیں تارا باجی اپنے گھر میں۔ ثروت باجی بھی سنا تھا دعائی جانے والی ہیں۔

”چل ریشم سالن بھون۔ پیچ چلاتی جا۔ سالانچ نہیں لگنا چاہیے۔“ ریشم نے تابعداری سے سر ہلایا۔ ”چن ساتھ ساتھ ہی سمیٹ لینا اور ہانڈی بھی جاتے ہوئے آدھی ساتھ لے جانا۔“ ریشم نے جلدی سے مسالا بھونا اور پھر پیاز کے چھلکے شاپر میں ڈالنے لگی۔

شروع شروع میں تایا جی اسے دیکھ کر منہ پھیر لیتے تھے۔ لیکن خون میں بڑا اثر ہوتا ہے، وقت گزرا تو وہ بھی نرم پڑ گئے۔

”جائے بنا دے ریشم! میں سمو سے لایا ہوں تیرے لیے۔“ وہ سالن بنا کر فارغ ہوئی تو تایا جی نے چن میں آ کر شاپر اس کے حوالے کیا۔ اس نے بھی جلدی سے پکڑا اور چائے بنانے لگی۔ اگر اس کی اماں اسے دیکھ لیتیں تو کہتیں۔ ”میری بیٹی کو نوکرانی سمجھ لیا ہے“ لیکن ریشم کو میکے کا مان مل گیا تھا۔ جب سے تائی نے اس کے سر پہ ہاتھ رکھا تھا، چیزیں بدل رہی تھیں۔ تائی اسے کھانا بنانا، گھر سنبھالنا، شوہر کے دل پہ راج کرنا سکھا رہی تھیں اور اسے لگ رہا تھا کہ خاقان پھر سے اس سے محبت کرنے لگا ہے۔

”چھوٹی! یہ دیکھو میں گلاب جامن لائی ہوں۔“ گھر آ کر اس نے چپکے سے چھوٹی کو گلاب جامن دیں۔ سمعیہ اور چھوٹی سے اس کی دوستی ہو گئی تھی، گو کہ ساس کی اور تمثیلہ کی کوشش یہی ہوتی تھی کہ دونوں اس کی صحبت سے دور رہیں جیسے وہ اچھوت تھی۔ لیکن ایک ہی گھر تھا۔ آخر کتنا بردہ ممکن تھا۔ چھوٹی نے گلاب جامن کھائی اور اس کے گلے سے لگ گئی۔ ”میں سمعیہ باجی کو بھی دیتی ہوں۔“ وہ بھاگ کر کمرے میں چلی گئی۔

اماں ایا کی یاد کک بن کر رہ گئی تھی، لیکن زندگی بھی رکی نہیں تھی۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ زندگی وہ جام ہے جو پل پل ذائقہ بدلتا ہے۔ نہ تو بھی ایک سارہا ہے نہ ہی رہے گا۔ بھی کڑوا تو بھی شہد۔

وہ لمحہ بھی شہد گھونٹ ہی تھا جب اسے نئی زندگی کے پنپنے کی خبر ملی تھی۔ تائی نے کتنی دعائیں دی تھیں کہ جلدی سے اس کی گود میں ایک بیٹا آ جائے تو اس کے قدم جم جائیں گے۔

خاقان مٹھائی کا ڈبا لا کر اماں ابا کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ کتنا روشن چہرہ لگ رہا تھا خاقان کا۔ انہوں نے دروازے کی اوٹ میں کھڑی تمثیلہ کا تاریک چہرہ دیکھا۔ جس کی منکنی ٹوٹ گئی تھی۔ جس

کے نصیب پہ جیسے تالا ہی لگ گیا تھا۔ ابا جواب اٹھ کر بیٹھ جاتے تھے، تھوڑا چل پھر بھی لیتے تھے۔ انہوں نے مٹھائی اٹھالی۔ اماں نے بھی دل توڑنا مناسب نہیں سمجھا اور منہ مٹھا کر کے دعا دی۔

”خاقان مجھے نہیں دے گا۔“ تمثیلہ اس کے پیچھے آ کھڑی ہوئی۔

”تیرے لیے تو اسپیشل کھوئے والی برنی ڈلوائی ہے۔“ اس نے ڈبا آگے کیا۔

اس نے بھی ایک پھر دو ٹکڑیاں کھائیں۔

”اللہ کرے خاقان! تیرے گھر بیٹی پیدا ہو بالکل تیری بیوی کے جیسی۔“ اپنا منہ مٹھا کر کے وہ خاقان کا منہ کڑوا اور دماغ زہریلا کر گئی۔ ریشم سے محبت اپنی جگہ لیکن پھر وہ اٹھتے بیٹھتے دعائیں کرنے لگا کہ بیٹی نہ ہو۔

☆☆☆

تمثیلہ کی دعا پوری ہو گئی تھی۔ اور کیا خوب پوری ہوئی تھی۔ اللہ نے ایک کے بعد ایک بیٹی بھیجی تھی۔

سسرال میں قدم جمانا تو دور کی بات، خاقان کا رویہ ہی بعض اوقات سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

تائی کے صحن میں بیٹھی وہ میٹھیوں کو دیکھ رہی تھی جہاں اس کی تین اور چار سالہ بیٹیاں گڑیاں پکڑے کھیل رہی تھیں۔ ننھی بچیوں کے سر پہ کپڑوں کے ہم رنگ تلو نے اس کا رخ بندھے تھے۔

”یہ لے تمہیں“ کھا۔ تیرے دل سے غم کو اتار دے گا۔“

ریشم کے ابا کی وفات کو مہینہ ہو چکا تھا۔

”چل پکڑ، کھالے چھوٹی بچی کا ساتھ ہے اپنے پہ اور اس پہ ظلم نہ کر۔“ ان کا اشارہ اس کی گود میں چھ مہینے کی تانیہ کی طرف تھا۔

”تیرے بھائیوں کی مت تو ہمیشہ بیٹھی ہی رہے گی۔ بات بات یہ مرنے مارنے پہ آ جاتے ہیں۔ تو دل برا نہ کر۔“ ریشم کی آنکھوں میں وہ منظر گھوم گیا جب اس کے بھائیوں نے اسے باپ کا چہرہ بھی نہیں دیکھنے دیا تھا۔

”تیری ماں منوالے گی اپنی۔ آخر کو بیٹی ہے تو اور اس کا دل کتنا ترپا ہے یہ میں جانتی ہوں۔“

ہاں منوا تو لی تھی اس کی ماں نے، تب ہی تو اسے گھر میں داخل ہونے کی اجازت ملی تھی اور وہ گھر تو اس کے ابا کا تھا بھی نہیں۔ بھائیوں نے نئے گھر بنوائے تھے، چار بالکل ساتھ ساتھ۔ اب اس کا دھیان ان گھروں کی طرف چلا گیا۔ نئی نئی کالونی بنی تھی، کتنے عالی شان گھر تھے۔ اس کی چار سالہ یا کیزہ جو تایا تائی کو ہی نانائانی سمجھتی تھی، کتنی حیران ہوئی تھی اتنے بڑے گھر دیکھ کر۔

”کھا بھی لے، اب ٹھنڈا ہو جائے گا۔“

”بس اپنی بیویوں کے پیچھے لگے ہیں، تیرے تایا سے کہا ہے وہ سمجھا میں گے انہیں۔ چھوٹی سی تو تھی تو۔ غلطی ہو گئی اور سزا بھی کتنی بھگتی تو نے۔ خون کے رشتوں میں جینا مرنا بھی کبھی ختم ہوا ہے۔“ یہ کہہ کر انہوں نے اون سلائی اٹھالی۔

”تمثیلہ کا سنا وہ خوش ہے اپنے گھر میں۔“

سمعیہ تو جب سے جھلا ہوا ہے آئی ہی نہیں۔“

ریشم نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ”اگلے ہفتے آئیں شاید دونوں، ابا جی (سسر) کی برسی ہے نا۔“

”یہ دیکھ سال کے بچے کا بنا رہی ہوں میں۔“

گلابی رنگ کا فراک انہوں نے ریشم کے آگے کیا۔

”ثروت کی بیٹی کا اور تانیہ کا ایک جیسا بناؤں گی۔ اس سال سردیوں میں آئے شاید وہ۔ دونوں بہنیں پہنیں گی تو جڑواں لگیں گی۔“ ریشم کی نم آنکھوں نے فراک کو دیکھا تو بچیوں کا تصور کر کے مسکرا دی۔

تائی نے بے ہوئے گھر ادھیڑنا شروع کر دیے۔ ”ہائے کتنی ہی بھول گئی۔“ پھر دوبارہ بنا شروع کر دیے۔

کوئی دس منٹ بعد انہیں اندازہ ہوا کہ پچھلی

قطار میں انہوں نے دو گھر ہی چھوڑ دیے تھے۔ وہ پھر ادھیڑنے لگیں۔ ”نظر ہی ساتھ نہیں دیتی میرا۔ ورنہ اپنے بچوں کے لیے شاپر بھر سو میٹر بناؤں میں۔“

”چھوڑیں تائی! کیوں اتنی محنت کر رہی ہیں۔“

مجھے بتائیں میں ثروت باجی، تارا باجی کے بچوں کے لیے سویر خریداؤں گی۔“

”ریشم محنت ہی تو ہے۔ ایک یہی تو ہے جو انسان کے بس میں ہے۔“

”ماما! یہ کیا ہے۔“ پاکیزہ اور مثال دوڑتی ہوئی اس کے پاس آئیں۔ ”یہ دیکھیں، نانی کے درخت سے۔ گرا ہے۔“

ریشم نے اتنی عجیب بات سنی تو ہاتھ آگے بڑھایا۔

واقعی چھوٹا سا انڈا تھا۔ نانی نے بھی غور سے دیکھا۔

”انڈا نہیں ہے یہ کیا ہے۔“

”یہ کیا ہوتا ہے نانی؟“

”اس سے ریشم بنتا ہے اس کے اندر کیڑا ہے۔“

”او.....“ دونوں بچیاں جھرجھری لے کر پیچھے ہٹیں۔ ریشم نے بھی فوراً اسے زمین پر گرا دیا۔

”لو۔ ساری کی ساری جھلیاں ہی ہیں۔ اپنے نہیں باہر آتا یہ۔“ نانی ہنسنے لگیں۔

”ہائے.....“ کچھ سوچ کر انہوں نے ریشم کی طرف دیکھا۔

”تجھے پتا ہے ریشم کے کیڑے اور مکڑی میں فرق ”نیت“ کا ہوتا ہے۔ مکڑی جان لینے کے لیے، شکار کرنے کے لیے جالا بنتی ہے اور سب سے ناپائیدار گھر بنتی ہے۔ ریشم کا کیڑا اپنی ارتقاء اپنی افزائش کے لیے جال بنتا ہے اور کیسا شاندار گھر بنتا ہے۔ جان لڑا دیتا ہے اپنی لیکن دنیا کو کیسا ملائم، کیسا نایاب تحفہ دے کر جاتا ہے۔

اپنی نیت صاف کر لے۔ بس اپنی بچیوں پہ محنت کر، دیکھنا یہ کیسے تیری آنکھوں کی ٹھنڈک بنیں گی۔“

وہ پھر سے سلاپیاں پکڑ کر ادھڑکرنے لگیں۔ گھر بننے لگ گئیں۔ ریشم نے انہیں دیکھا، بہت غور سے دیکھا اور پھر اس نے بھی جان لڑا دی اور زندگی کی ڈگر کی

سلاپیاں پکڑ لیں، خانے بننے شروع کر دیے۔ جہاں گنتی بھول جاتی تو ادھڑک کر پھر شروع ہو جاتی۔ بڑی کڑی نظر رکھی بھی بیٹیوں پہ۔ لیکن اگر نظر چوک جاتی تو ادھڑک کر رکھ دیتی، بیٹیوں کو بھی اور خانوں بھی۔ کس بیٹی کو کتنا کتنا ہے اس نے نانی سے سیکھا تھا۔ اون کو اور بیٹیوں کی شخصیت کو ایک خاص زاویے ایک خاص تناؤ سے بنا تھا انہوں نے۔ نہ تو ان کے سویروں میں جھول تھے نہ ہی بیٹیوں میں۔

☆☆☆

ریشم نے پاکیزہ کو دیکھا جو چائے کی ٹرے اٹھا کر باہر جا رہی تھی۔ ریشم نے نخر سے اپنی بیٹی کو دیکھا۔ پاکیزہ نے چائے رکھی۔ آج تو اس کے پاؤں بھی زمین پہ نہیں ٹک رہے تھے۔ صبح سے ہی مہار کھا دینے والوں کا تانتا بندھا تھا۔ ابھی بھی پھپھیاں آتی ہوئی تھیں۔

”پھپھو یہ کروٹیں لیں، میں نے بتائے ہیں۔“ پاکیزہ نے پلیٹ چھوٹی پھپھو کے آگے کی۔

”دادو آپ کی چائے میں چینی نہیں ہے۔“

پھر کپ دادی کے ہاتھ میں دیا۔

آج تو نصیبوں والا دن چڑھا تھا۔ دادی نے پہلی بار پوری دلی آمادگی سے پوتی کو گلے لگایا تھا۔ اسے پیار کیا تھا۔

ریشم نے دل میں اپنے رب کا شکر ادا کیا پھر اس کی نظریں خاقان کی نظروں سے ٹکرائیں۔ ان آنکھوں میں بھی خوشی اور نخر نمایاں تھا۔

جب صبح وہ گزٹ چیک کرنے جا رہا تھا تو کتنا سنجیدہ سا تھا۔ گو کہ پتا تھا کہ بیٹی لائق ہے لیکن اتنی لائق ہے یہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔

علاقے کے دو گورنمنٹ اسکولوں اور تین پرائیوٹ اسکولوں میں سب سے زیادہ نمبر اس کی بیٹی نے لیے تھے۔ اسکول میں تو ٹاپ کیا ہی تھا۔ بورڈ میں بھی دسویں پوزیشن لی تھی۔

محفلے والوں نے تو اسی وقت مٹھائی کا مطالبہ کر دیا۔

بس تبھی سے مہمانوں سے گھر بھرا ہوا تھا۔

پاکیزہ بہت خوش تھی کیونکہ آج باپ کی آنکھوں میں غصہ نہیں تھا بلکہ وہ سب کو نخر سے بتا رہا تھا کہ اس کی بیٹی اس کا مان، اس کا نخر ہے۔

اسی وقت ریشم کے مٹھلے بھائی، بھابھی بھی آگئے۔ ایک کی بھی جو پوری ہو گئی۔

پاکیزہ کی مٹھی ایک بار پھر سے گرم ہو چکی تھی۔ اس نے وہ پیسے بھی ماں کو جا کر دے دیے۔ اس کی ممانی کی نظروں نے اس کا پیچھا کیا تھا۔

”خاقان بھائی! یہ مٹھائی میں پاکیزہ کی کامیابی کی خوشی میں نہیں لائی۔“ خاقان اور ریشم کے ساتھ سب ہی متوجہ ہو گئے۔

”میں تو اپنی بیٹی مانگنے آئی ہوں اور اسی مٹھائی سے منہ میٹھا کر کے جاؤں گی۔ بھرے مجمعے میں بڑے مان سے کہہ رہی ہوں۔“

سب ایک دوسرے کی شکلیں دیکھنے لگے۔ کسی کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ ریشم نے خاقان کو دیکھا۔ کیسے دونوں میاں بیوی کی سانسیں اٹکی رہتی تھیں بیٹیوں کی شادی کا سوچ کر۔ کتنی مشکل سے اس گھر کی بیٹیاں بیاہی گئی تھیں۔ کیسے کیسے طعنے سنے تھے انہوں نے۔

جیسے بھی خاقان کے اہمیت میں دعائیں مانگتے تھے۔ ریشم گواہ تھی، خاقان کی بھی دعا مانگتے ہوئے بچی بندھ جاتی تھی۔ ریشم کی دعائیں بھی ایسی ہی ہوتی تھیں جو بویا تھا اسے کاٹنے کی ہمت اب نہیں تھی۔ بلکہ وہ تو کاٹ ہی رہے تھے۔ پچھلے سترہ سالوں سے۔

ریشم کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ خاقان کی آنکھوں میں بھی اقرار کا عندیہ پا کر وہ تو خوشی سے ہی جھوم اٹھی۔

”اماں اجازت ہے؟“ خاقان نے ماں کی طرف دیکھا۔

”گھر کا بچہ ہے۔ کیسا لائق پڑھا لکھا۔ اللہ آسانیاں پیدا کرے۔“

اماں کا یہ کہنا تھا کہ ریشم کی بھابھی نے خود ہی ڈبا کھولا اور سب کا منہ میٹھا کر دیا۔

خوشیوں بھری وہ شام اس گھر میں ٹھہری گئی تھی۔

اور پھر کتنے ہی پہر کتنے ہی دن کتنے ہی مہینے وہ گھڑی ٹھہری ہی رہی۔ تب تک جب تک پاکیزہ رخصت نہیں ہو گئی۔

☆☆☆

اللہ نے اسے ایک پری عطا کی تھی۔ جسے اس نے پاؤں پاؤں چلنا سکھایا۔ جس کی توتلی زبان کو اس نے فصاحت سکھائی۔ جس کے سفید پروں کو اس نے سلیقے، قابلیت اور ہنرمندی کے رنگوں سے سجایا۔ پھر محبت کا تاج اس کے سر پہ رکھ کر اس کی پیشانی چومی۔ لیکن پھر وہ ڈر گئی کہ کہیں وہ پری اڑ نہ جائے۔ اور اس کا ڈر اس کی پری کو کھا گیا۔ اس نے پری کے پر باندھ دیے۔ اسے اڑنے کے ہنر سے نا آشنا کر دیا۔

بس اس کا خوف اس کی پری کا زنداں بن گیا۔

”ماما! میں کیا کروں، میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ میرا ہنر میرا ہر کمال ان سب کی نظروں میں بے کمال ہے۔ میرا ہر عمل قابل اعتراض ہے۔ ان کی بات ہی یہاں سے شروع ہوتی ہے کہ ”جیسی ماں ویسی بیٹی“ وہ..... اب فون پہ پاکیزہ کی ہچکیاں گونج رہی تھیں۔ ریشم کو پتا تھا وہ کون سا جملہ ہے جو اس کی بیٹی ادا کرنے سے جھجک رہی ہے۔

گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی کی بیٹی تھی وہ۔ اسے زمانہ کیسے بخش سکتا تھا۔

ہم سمجھتے ہیں کہ وقت بڑا مرہم ہے۔ ٹھیک ہے بالکل ٹھیک ہے۔ ہم سمجھتے ہیں وقت کے ساتھ ساتھ دنیا والے بھول جاتے ہیں۔ نہیں یہ غلط ہے بالکل غلط۔ دنیا والوں کی یادداشت اس دھونے سانپ جیسی ہے جو کندلی مارے بیٹھا ہوتا ہے جیسے ہی موقع ملے ڈس لیتا ہے۔

پاکیزہ کی ہچکیاں فون پہ گونج رہی تھیں اور ریشم کے بین اس کے دل میں ہی دم توڑ رہے تھے۔ اگر وہ خود اپنی پری کو اڑنا سکھاتی تو کیوں کر ممکن تھا کہ وہ بہک جاتی۔ قدم اٹھانا بھی تو سکھایا تھا

قدم تو نہیں بھٹکتے تھے۔

☆☆☆

ہر دوسرے تیسرے دن اسے ایسے ہی فون موصول ہوتے تھے۔ ارحم بھابھی کا اکلوتا بیٹا تھا۔ انہیں ایک گھڑ محبت کرنے والی دبوڑکی بطور بہو چاہیے تھی۔ سولہ سالہ پاکیزہ ان کے معیار پہ پوری اترتی تھی۔ تب ہی تو انہوں نے ایک دو سال کا وقت بھی نہیں دیا تھا۔ جھٹ پٹ شادی کی تھی۔

”ماما! ارحم کو ذرا سی بات پہ غصہ آ جاتا ہے۔ میں کیا کروں۔ پہلے تو سب کو میرے ہاتھ کا کھانا بہت پسند تھا اب کسی کو اچھا نہیں لگتا۔“
بکھی کہتی ”میری طبیعت بھی ٹھیک نہیں رہتی۔ اتنا بڑا گھر ہے ممائی نے کام والی بھی نکال دی۔ اماں کسی کو مجھ سے ترس کیوں نہیں آتا۔“
ریشم کے دل پہ برچھیاں چلتی تھیں۔

خاقان کو کہ ایک سخت باپ تھا لیکن بیٹیوں میں اس کی جان تھی۔ وہ بھی سب جانتا تھا لیکن خاموش تھا۔ اب تہجد پڑھنے پڑھتا تو فجر تک سجدے میں ہی گرا رہتا۔ یہ کیسی خاردار فصل تھی جسے بونے میں تو لمحے لگے تھے لیکن کاٹنے پہ آئے تو کتنی ہی نہیں تھی۔ برس ہا برس گزر گئے، ایک حصہ کاٹتے تھے تو دوسرا سر کو آتا تھا۔ دونوں کو یقین ہو گیا تھا کہ جب تک سائیں ہیں تب تک ان کے مقدر میں کاٹنے ہی لکھے ہیں۔

ریشم خاقان کو امید سے دیکھتی۔ لیکن جب وہ بولا تو بس اتنا کہا کہ.....

”اسے کہو۔ وہیں گزارا کرے۔ یہاں واپس آنے کے بارے میں مت سوچے۔ میرے کندھوں میں اور جھکنے کی سکت نہیں ہے۔ میں بس اس کے لیے دعا ہی کر سکتا ہوں۔“

اور پھر وہ وقت آ گیا جب ریشم نے اپنی پری کو جادو کی چھڑی دینے کا فیصلہ کیا۔ ”صبر“ کی چھڑی۔ جو مفاہمت اور امن کے ستاروں سے سجی تھی۔

اب وہ فون پہ روتی دھوتی نہیں تھی۔ اس نے پاکیزہ کے بھی سبھی آنسو پونچھ دیے تھے۔ اب وہ

اسے مشورے دیتی تھی۔ اسے وہ گرسکھا رہی تھی جو کبھی تائی، تارا باجی اور ثروت باجی کو سکھایا کرتی تھیں۔

اس نے اپنی پری کے کچلے پروں کو محبت سے اکٹھا کیا۔ اور فیصلہ کیا کہ وہ ان ریشمی پنکھوں کو اڑانا بھی سکھائے گی۔ اپنی بیٹیوں کے حق کے لیے آواز اٹھانا بھی سکھائے گی اور معاشرے میں سر اٹھا کر چلنے، اپنے حق کے لیے لڑنے کی آزادی بھی دے گی۔

اس نے مثال اور تانیہ کے پروں کو محبت سے سجایا پھر ان ریشمی پروں میں سلیقے، فریے اور ہنر کے رنگ بھرے۔ محبت کا تاج ان کے سروں پہ رکھ کر ماتھے پہ بوسہ دیا اور پھر ان ریشمی زرتار آچل جیسے پروں کو تھول دیا۔ انہیں پھڑ پھڑانے دیا۔ ان کے رنگوں کو ہوا کے دوش پہ پکا ہونے دیا۔ ان کے نگیںوں سے سبے سروں کو شان سے اٹھنا سکھایا۔

خود اعتمادی کی چھڑی ان کے ہاتھوں میں پکڑا کر اللہ کا نام لے کر اس کی اماں میں دے کر دنیا کے سپرد کر دیا اور پھر دنیا نے دیکھا، ریشم کی پروں کی اڑان کو۔ وہ پریاں جن پہ دنیا رشک کرتی ہے، جن کی مثالیں دی جاتی ہیں۔ جو بھی بھی تندہی بادمخالف کے آگے گر بھی جائیں تو نازک پروں میں اڑان بھر کر پھر سے اڑنے لگتی ہیں۔

اس نشیب و فراز کی وادی..... جسے دنیا کہتے ہیں۔ وہ اس میں گرتی ہیں، چوٹ کھاتی ہیں، سنبھلتی ہیں لیکن ہار نہیں مانتی ہیں کیونکہ انہوں نے ماں باپ کا سر جھکنے نہیں دینا۔ ان کے والدین کے رعبہ زدہ زخمی ہاتھوں نے خاردار فصل بالآخر کاٹ ہی لی ہے۔ اب اس زمین پہ ریشمی آنچلوں جیسی فصل لہلہاتی ہے۔ خاقان بڑی محبت سے اپنی ریشم کو دیکھتا ہے جس کے آنچل نے اسے قید کر لیا تھا اور ریشم سجدہ شکر بجالاتی ہے کہ دیر سے ہی سہی لیکن اس نے سچ رنگوں کا انتخاب کیا تھا۔



طاہرہ فردوس عید اللہ

ہمارے بچے

ہوتا ہی ہے۔ نو سے پانچ والی نوکری تو ہے نہیں۔ تم یہاں آیا کرو تو چلی جایا کرو بازار۔“ بھابھی نے نادیدہ کا مسئلہ حل کر کے ہی رہنا تھا۔

”ارے بھابھی! بچے کہاں جانے دیں گے مجھے۔ وہ طوفان مچائیں گے۔ آپ لوگ پریشان ہو جائیں گی خواہ مخواہ۔“ گویا میکے آکر بازار نہ جانا نادیدہ کا وہ احسان تھا جس پر مجھے اور بھابھی کو شکر ادا کرنا چاہیے۔ میں مسکرا کر رہ گئی۔

”ہاں واقعی یہ تو ہے۔ بچے بڑا ستاتے ہیں۔ ذرا چین سے نہیں بیٹھتے۔ میں خود جب امی کے ہاں جاتی ہوں، صرف تب ہی بازار جاتی ہوں۔ وہ بھی اس لیے کہ سیدہ اور سدرہ ہوتی ہیں تو بچوں کو سنبھال لیتی ہیں۔“ شاید کہنے کا مقصد یہ تھا کہ میں

”بھابھی! آپ کا سوٹ تو بہت اچھا لگ رہا ہے۔“ نادیدہ نے نوشین بھابھی کے سوٹ کی تعریف کی تو میں نے بھی ستائشی انداز میں گردن ہلا دی۔

”ہاں یہ پرنٹ تو مجھے خود بھی بہت پسند آیا تھا۔ سامہ میں بڑے اچھے پرنٹ آتے ہیں لان کے سوٹوں میں۔ میں تو ہمیشہ وہیں سے لیتی ہوں۔ کافی ورائٹی ہوتی ہے پھر قیمتیں بھی مناسب ہوتی ہیں۔“ بھابھی کے پاس تفصیلی جواب موجود تھا۔ حالانکہ نادیدہ نے کہاں سے لیا؟، کتنے کا لیا؟ جیسا کوئی سوال بھی نہیں کیا تھا۔

”اچھا آپ سامہ سے لیتی ہیں۔ میرا تو جانا ہی نہیں ہوتا مارکیٹ۔ شہزاد اتنے مصروف رہتے ہیں۔ ساری گرمیاں یوں ہی نکل جاتی ہیں۔“ نادیدہ نے بھی یوں ہی بات برائے بات کی۔

اس ساری گفتگو میں میری حیثیت ایک خاموش تماشا کی سی تھی، جو میں نے خوش دلی سے خود منتخب کی تھی۔

”ہاں اپنے کاروبار میں تو انسان مصروف



اس قابل بھی نہیں کہ ذرا سا ان کے بچوں کو دیکھ لوں۔ میں ایک دفعہ پھر مسکرا دی۔

”بھابھی! آپ تو سامہ جاتی ہی ہیں نا۔ ایک دوسوٹ میرے لیے بھی لاد دیجیے گا۔ پرنٹ تو ویسے بھی آپ اتنے اچھے پسند کرتی ہیں۔“ نادیا کا تو گویا مسئلہ ہی حل ہو گیا تھا۔

”ہاں چلو۔ اب کی بار جاؤں گی تو لادوں گی۔“ بھابھی نے بھی تند کی محبت میں ہائی بھر لی۔ پھر یہ ہوا کہ وہ سوٹ لے آئیں۔ پرنٹ واقعی شان دار تھا۔ نادیا کو بے حد پسند آیا۔ بھابھی خوش کہ نند نے شرف قبولیت بخش دیا۔ بھائی، بھابھی سے خوش کہ ان کی بیوی ان کی بہن کا اتنا خیال رکھتی ہے اور ساس صاحبہ بیٹے سے خوش کہ وہ بہنوں کا کتنا خیال کرتا ہے۔ اب اتنے خوش گوار ماحول میں بھابھی، نادیا سے بھلا پیسوں کی بات کیسے کرتیں۔

”تم بھی نادیا کا ایک آدھ جوڑا بنا دیا کرو۔“ پروفیسر صاحب نے اپنی بیوی ہونے کے ناتے مجھے بھی متیقن کی۔

”ہاں دینا تو چاہیے۔ آپ لے آئیے گا، میں دے دوں گی۔“ میں نے ہلکے پھلکے انداز میں جواب دیا۔ یہ بلا میں اپنے سر کیوں لیتی جبکہ اس کے نتائج کا مجھے اچھی طرح اندازہ تھا۔

☆☆☆

اگلے ہفتے نادیا نے فون کر کے بھابھی سے کہا۔ ”بھابھی یقین کریں۔ شہزاد کو بہت پسند آیا سوٹ۔ کہہ رہے تھے دو سوٹ اور منگوا لو۔ میرے لائے ہوئے پرنٹ تو تمہیں پسند ہی نہیں آتے۔ میں نے کہا، ہاں بھابھی سے کہہ دوں گی۔ وہ تو جاتی ہی ہیں، لادیں گی۔

بس میں نے اسی لیے فون کیا تھا کہ آپ سے کہہ دوں۔ باقی سب خیریت ہے۔ عروہ کی طبیعت کیسی ہے؟ امی بتا رہی تھیں، بخار ہو گیا

تھا۔۔۔۔۔“ پھر چند ادھر ادھر کی باتیں کر کے نادیا نے فون رکھ دیا گیا۔

بھابھی بے چاری بری طرح پھنس گئیں۔ میاں سے پیسے کیسے مانگیں۔ وہ تو ساری تنخواہ ان کے ہاتھ پہ رکھتے تھے۔ ٹال بھی نہیں سکتی تھیں کہ نادیا کی ہر دوسرے دن اپنی امی سے فون پر بات ہوتی تھی اور وہ یہ بات بھابھی کو یاد دلانا نہیں بھولتی تھیں۔ صاف منع کیسے کرتیں؟ تحض ہفتہ بھر پہلے اپنے لیے سسرال میں پیدا کردہ خوش گوار ماحول مہینہ بھر تو باقی رہنا چاہیے تھا۔

بھابھی کی امی کا گھر سامہ کے سامنے والے فلیٹوں میں تھا۔ جمعہ کو بچوں کا اسکول کا باف ڈے ہوتا تھا اور بھائی جمعہ کی نماز کے بعد ہی آفس جاتے تھے۔ اس لیے تقریباً ہر جمعہ کو بھائی، بھابھی کو میکے چھوڑ دیتے۔ ہفتے کی دوپہر تک وہ واپس آ جاتیں۔ شادی کے فوراً بعد سے یہی معمول تھا۔

اس جمعہ کو بھابھی نہیں گئیں۔ ”خواہ مخواہ میں جاؤں گی اور کپڑے نہیں

آئیں گے تو امی کا موڈ خراب ہو جائے گا۔ اگلے جمعہ کو جاؤں گی پھر آ کر کہہ دوں گی کہ پرنٹ اچھے نہیں تھے۔“ سبزی بناتے ہوئے بھابھی نے بڑبڑانے والے انداز میں مجھے اپنا منصوبہ بتایا۔ میں خاموش رہی۔ میری خاموشی سے انہوں نے نہ جانے کیا اخذ کیا کہ فوراً وضاحت دے لگیں۔

”میں جھوٹ کب بولتی ہوں مگر تمہیں تو پتا ہے آج کل ہاتھ کتنا تنگ ہے۔ پچھلے ہفتے ہی نادیا کو ایک ہزار کا سوٹ دیا ہے۔ اب اگلے مہینے بچوں کے یونی فام بنانے ہیں۔ نادیا تو پتا نہیں کب پیسے لوٹائے؟“ آخری جملہ سوال نہیں، خدشہ تھا۔ اس لیے اس بار بھی میں خاموش رہی اور چونکہ سبزی بن گئی تھی تو ٹرے لے کر سیدھی کچن میں چلی آئی۔

☆☆☆

”شہزاد تو کہہ رہے تھے کہ بری بات ہے۔ بلا وجہ اپنی بھابھی کو تنگ مت کرو۔ آج کے دور میں اپنے ہی کاموں سے فرصت نہیں ملتی۔ دوسروں کے کام بھلا کون کرے لیکن میں نے ان سے کہا کہ جی نہیں۔ بھابھی ایسی نہیں ہیں۔ اگر انہیں اپنا کام نہ بھی ہوا تو صرف میرا کام کرنے ہی مارکیٹ چلی جائیں گی۔ ویسے بھی ان کا میکہ سامہ کے بالکل سامنے ہے۔“ رات کے کھانے پر سب کی موجودگی میں نادیا کو شہزاد کی بات اچانک یاد آئی۔

”چار دن پہلے تو شہزاد کہہ رہا تھا کہ اپنی بھابھی سے سوٹ منگوا لو۔ نادیا، پہلے سوچ لو کہ شہزاد نے وہ بات نہیں کہی تھی یا یہ بات نہیں کہی ہے۔“ میں یہ بات صرف سوچ سکتی تھی۔ اس لیے سوچ کر رہ گئی۔

پھر بھابھی میکے گئیں تو حسب منصوبہ یہی کہا کہ پرنٹ اچھے نہیں تھے۔ پسند نہیں آئے۔ امی کے ذریعے نادیا کو دو گھنٹے کے اندر اندر معلوم ہو گیا۔

”ارے بھابھی! اب آپ اتنی تنقیدی نظر سے کپڑے پسند کریں گی تو کہاں سے کوئی سوٹ پسند آئے گا۔ اتنی گرمی ہے۔ اپنے کپڑے تو مجھ سے بالکل نہیں پہنے جا رہے۔ شہزاد کو تو بالکل پہچان نہیں ہے۔ کس لان اٹھا لاتے ہیں۔ اس میں رسمی کپڑوں سے زیادہ گرمی لگتی ہے۔ اب آپ جائیں تو لے آئیے گا۔ جیسے بھی ملیں۔ بس گزارا ہی تو کرنا ہے۔

اور آپ سنا میں امی کی طرف سب خیریت ہے۔ سدیہ کا کہیں رشتہ ہوا؟“ بھابھی نے غائب دماغی سے ہوں ہاں کر کے فون رکھ دیا۔ مجھے بتایا۔ میں بھلا کیا تبصرہ کرنی۔

اگلے جمعہ کو بھابھی پھر میکے نہیں گئیں۔ ساس کے استفسار پر کہہ دیا کہ امی کو پڑوس کی شادی میں جانا ہے تو میرے جانے کا فائدہ نہیں۔ ساس صاحبہ خاموش ہو گئیں۔

لیکن وقت ٹالنے سے مشکل تو نہیں ملتی۔ اگلے جمعہ کو جانے سے پہلے جی کڑا کر کے ساس سے کہہ دیا۔

”امی! وہ نادیا کے کپڑے لانے ہیں نا تو پیسے دے دیں۔“

”میرے پاس کہاں ہیں پیسے۔ علیم سے لے لو۔ جہاں اتنے خرچے ہوتے ہیں، وہاں بہن کے لیے ہزار دو ہزار نکالنے میں کیا ہو جائے گا۔“ آخری بات سنانے کے لیے تھی۔

علیم بھائی کے پاس پیسے کہاں سے ہوتے۔ الٹا بھابھی کے مانگنے پر بھائی نے پتا نہیں کیا کہا کہ اچھا خاصا جھگڑا ہو گیا۔ بھائی گھر سے نکل گئے۔ بھابھی منہ لپیٹ کر پڑ گئیں۔ ساس صاحبہ الگ اکھڑی اکھڑی۔ مہینے کے شروع میں نند کو دیے جانے والے جوڑے کا اثر مہینہ بھر بھی نہیں رہا تھا۔

چار گھنٹے بعد فون کر کے نادیا نے بھی اپنا حصہ ڈالا۔

”توبہ بھابھی! کیا میں پیسے نہیں دیتی؟ ایسی بھی کیا بے اعتباری۔ رشتوں سے زیادہ پیسے اہم ہوتے ہیں کیا؟“ بھابھی بے چاری پُچ۔ نا نہیں تو مشکل۔ ہاں کہیں تو مشکل۔

ہفتہ بھر بھائی کا موڈ خراب رہا۔ بھابھی بے چاری ابھی ابھی۔ بچے الگ نظر انداز ہوتے رہے۔ مہینے بھر کی کشمکش کا انجام مجھے مہینہ بھر پہلے ہی پتا تھا۔ مگر ایک تو میری شادی کو ہی چھ مہینے ہوئے تھے۔ پھر وہ شاعر نے بھی تو شاید جوائنٹ فیملی سسٹم ہی کے لیے کہا ہے

فغاں کہ مجھ غریب کو حیات کا یہ حکم ہے سمجھ ہر ایک راز کو مگر فریب کھائے جا

☆☆☆

سوٹ کا قصہ تمام ہوئے مہینہ بھر ہوا تھا کہ بڑی نند کینیڈا سے آ گئیں۔ خوش گفتار، خوش لباس۔

پیسے اور رتبے، دونوں لحاظ سے بڑی تھیں، لہذا ویسا ہی دبدبہ اور رعب ادب۔ خیر سے امید سے تھیں اور اسی سلسلے میں پاکستان آئی تھیں۔

میں نے تو انہیں دیکھا ہی پہلی دفعہ تھا۔ ہماری شادی پر وہ چند وجوہات کی بنا پر نہیں آسکیں۔ کم از کم بھابی نے مجھے یہی بتایا تھا۔ چند وجوہات کا مطلب انہیں بھی معلوم نہیں ہوگا۔

مجھ سے تو پہلی ملاقات تھی۔ ظاہر ہے میں ان کو بہت اچھی لگی اور وہ مجھے بہت اچھی لگیں۔

بھابی سے دو چار سال ہی بڑی تھیں۔ بھابی بھی مجھے نادیہ کے مقابلے۔ انجم باجی سے زیادہ بے تکلف لگیں۔ دس پندرہ دن تو ملنے ملانے اور دعوتوں میں گزر گئے۔

”نوشین! تمہاری اسکن کتنی رف ہو رہی ہے۔ فیشن ویٹل کرانا چھوڑ دیا کیا؟“ اس دن اچانک انجم باجی کو بھابی کے چہرے کی بے رونقی نظر آگئی۔

”بس باجی! آپ کو تو پتا ہے۔ جیسے جیسے بچے بڑے ہو رہے ہیں، لگتا ہے مسائل بھی بڑے ہو رہے ہیں۔ ایک جھنجھٹ سے نکلو، دوسرا مسئلہ سر پر کھڑا ہوتا ہے۔ اسے سلجھاؤ تو تیسری پریشانی سامنے ہوتی ہے۔ اخراجات بڑھ رہے ہیں۔

مہنگائی بڑھ رہی ہے۔ آمدنی وہیں رکی ہوئی ہے۔ میں نے نوکری کرنے کا سوچا مگر پھر بچے نظر انداز ہوتے ہیں۔ اتنی فکروں اور الجھنوں میں چہرہ کہاں سے اچھا ہوگا۔“ مہنگائی پر بولنے کے لیے تو بھابی کو موقع چاہیے تھا۔

”ہاں سچ کہہ رہی ہو۔ بچوں کے مسائل تو لگتا ہے بچوں کے ساتھ ساتھ بڑے ہو رہے ہیں۔ مہنگائی تو ہر جگہ ہی بڑھ رہی ہے۔ ان کے کاروبار میں بھی مسئلے چل رہے تھے پچھلے دنوں۔ میں نے کہا زیور بیچ کر پیسہ کاروبار میں لگا دیں۔ کاروبار ہوگا تو زیور اور بن جائے گا۔ پہلے تو نہیں مانے لیکن پھر

یہی کیا۔ سونے کا کیا ہے اور آجائے گا۔“

”ہاں یہ تو ہے۔“ بھابی نے بھی اتفاق کیا۔ میں نے بھی۔ مگر میں فی الحال کسی کنتی میں نہیں تھی۔

”نوشین! میری مانو تو تم بھی اپنا زیور بیچ کر کسی کاروبار میں لگا دو۔ آمدنی بڑھے گی تو زیور اور بن جائے گا۔“ انجم باجی کی اگلی بات پر بھابی تو بھابی، میں بھی ہلک رہ گئی۔ بھابی کے پاس سونا تھا ہی کتنا کہ وہ اسے بیچ کر کسی کاروبار میں لگائیں۔ کہاں انجم باجی کے شوہر کا کئی شہروں میں پھیلا ہوا کاروبار اور ان کا بے تحاشا زیور اور کہاں بھابی کا دس تو لے سونا۔

پھر پیسہ کسی چھوٹے موٹے کاروبار میں لگ بھی جاتا تو اس کی قلیل آمدنی سے زیور کہاں سے بنتا جبکہ سونے کی قیمت میں عمومی مہنگائی کی نسبت کئی گنا اضافہ ہو رہا تھا۔ علیم بھائی کی تین بچیاں تھیں اور بچیاں بڑے ہوتے کتنی دیر لگتی ہے۔

انجم باجی کا مشورہ برسرِ سہمی، اس کی نامعقولیت اتنی زیادہ تھی کہ میں تو رہتی ہی چپ تھی، بھابی بھی چپکی رہ گئیں۔

یوں فی الوقت بات آئی گئی ہوگی۔

☆☆☆

”نوشین، اپنا زیور الماری سے نکالو تو میری چوڑیاں بھی نکال لینا۔ اچھا ہے ساری چیزیں ساتھ ہی بک جائیں گی۔“ ساس کا حکم شاہی اگلی صبح ناشتے پر ہی جاری ہو گیا۔

”جی!“ بھابی بے چاری نا سمجھی کے عالم میں بولیں۔

جب بھابی کی ”جی“ کے باوجود ناشتہ کرتے کسی کے اطمینان میں کوئی فرق نہیں آیا تو بھابی نے چیخ کر کہا۔

”امی مگر زیور کس لیے بیچنا ہے؟“

”ارے نوشین! کل ہی تو تم سے بات ہوئی

ہے۔“ انجم باجی کے لہجے میں معصومیت بھری حیرانی تھی۔ اتنا کھرا لہجہ تھا کہ مجھے لگا شاید واقعی بات ہوئی تھی۔

”باجی! میری تو آپ سے ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔“ بھابی کا لہجہ از خود تیز ہو گیا۔

”کیا مطلب ہے؟ میں جھوٹ کہہ رہی ہوں۔ کل ہی تو بات ہوئی ہے تم سے۔ فرح! تم بتاؤ۔ تمہارے سامنے ہی تو بات ہوئی تھی۔“ تو گویا کنتی میں آنے کے بجائے میں سیدھا نشانے پر آگئی تھی۔

بانی کا گلاس لبوں سے لگاتے ہوئے میں نے چند لمحوں میں فیصلہ کر لیا۔

”نہیں باجی! ایسی تو کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔“ میں نے اطمینان بھرے لہجے میں باجی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

اس جواب کی امید بھابی کو تو شاید ہو، باجی کو قطعاً نہیں تھی۔ انجم باجی پہلے تو گڑبڑائیں، پھر رونا شروع ہو گئیں۔

”میں جھوٹ کیوں بولوں گی۔ مجھے کیا ملے گا جھوٹ بول کر۔ تم لوگوں کے فائدے کے لیے سوچا اور صلہ یہ ملا کہ مجھے ہی جھوٹا کہہ رہی ہو۔“

”ظاہر ہے جب ایسی کوئی بات ہوئی ہی نہیں تو میں کیسے مان لوں۔ ویسے بھی وہ زیور میرا ذاتی ہے۔

میری مرضی میں اسے بیچوں یا نہ بیچوں۔“ بھابی ایک دم تیز تیز بولتے ہوئے کمرے میں چلی گئیں۔ جب انسان چھوٹی چھوٹی پریشانیاں برداشت کرتا رہتا ہے تو ایک وقت آتا ہے کہ ضرورت سے زیادہ رد عمل ظاہر کر دیتا ہے اور پھر اس کا نقصان بھی سب سے زیادہ اس کی اپنی ذات کو ہوتا ہے۔

ہمارے میاں بھی کچھ بول رہے تھے۔ علیم بھائی تو تھے ہی غصے کے تیز۔ ساس صاحبہ بیٹی کو خاموش کروا رہی تھیں۔ بھابی کمرے کا دروازہ بند کیے یقیناً رو رہی تھیں۔ بچے سرا سیمہ کھڑے تھے۔

اس ساری صورت حال میں میں نے نہ میاں کو خاموش کرانے کی کوشش کی، نہ بھائی کو، نہ ساس کو، نہ نند کو، نہ بھادج کو، نہ ہی بچوں کو ہٹانے کی کوشش کی۔

چپ چاپ ناشتے کے برتن سمیٹ کر اطمینان سے انہیں دھویا۔ دوپہر کے کھانے میں مسور کی دال چڑھائی۔ ساتھ پودینے کی چٹنی بنائی کہ صرف مجھے پسند تھی۔ ہری مرچیں تلیں۔ روٹیاں ڈالیں۔ کھانا لگایا۔ ساس صاحبہ، انجم باجی اور بھابی کو خود بلانے لگی۔ حسبِ توقع کوئی نہیں آیا۔ سکون سے کھانا کھایا۔ جائے پی۔ پھر اپنے کمرے میں لیٹ کر پرانے ڈائجسٹوں میں سے ڈھونڈھ کر اپنی پسندیدہ مصنفہ کی رومانوی سی کہانی پڑھی اور سو گئی۔

☆☆☆

عصر کے بعد انجم باجی اور میری ساس کسی عزیز کے ہاں تعزیت کرنے گئیں تو بھابی میرے پاس آ گئیں۔

”فرح! تم بتاؤ۔ میرا کیا قصور تھا۔ انجم باجی کو پتا نہیں کیا ہو گیا تھا۔ ایسی تو کوئی بات ہی نہیں ہوئی تھی۔“

بھابی اب تک صبح والی بات کا غم منارہی تھیں۔ ”چھوڑیں بھابی، کوئی اور بات کرتے ہیں۔“ یہ کہنے کے بجائے مجھے لگا، مجھے بھابی سے بات کر ہی لینا چاہیے۔

”دیکھیں بھابی! برا مت مانیے گا۔ لیکن قصور آپ کا اپنا ہے۔ میں نے بہت دفعہ سوچا آپ سے بات کروں مگر پھر کچھ سوچ کر خاموش ہو گئی۔

بھابی مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں جب لڑکی سرال جانی ہے تو سمجھتی ہے کہ خدمت اور آگے پیچھے پھرنے سے وہ سب کا دل جیت لے گی۔

سب کو خوش رکھے گی۔ سب اس کے نام کی مالا جپیں گے۔ لیکن نہ تو وہ ہر کسی کو خوش رکھ پاتی ہے، نہ کسی کا دل جیت پاتی ہے۔ تو وہ ایسے ہی افسردہ اور پریشان رہتی ہے جیسے آپ۔“



WITH
COLOR LOCK
TECHNOLOGY™

BLACK ROSE Color Supreme

PERMANENT
HAIR COLOR
DEEP NOURISHING EFFECTS

AVAILABLE IN 10 DIFFERENT SHADES



COLOR EXPERTS!

www.blackrosecosmetics.com

www.bookspk.site

پھر میرے سامنے کیوں تقریر کر رہی ہو؟“
مجھے پتا تھا بھابھی یہ سوال ضرور پوچھیں گی۔
اس سوال کے پردے میں جو سوال انہوں نے
کیا تھا، میں وہ بھی سمجھ گئی تھی۔

”دیکھیں بھئی، صبح تو میں نے اس لیے آپ کا
ساتھ دیا تھا کہ آج میں آپ کی بات کو جھٹلا کر نند کو
خوش کریتی۔ کل اپنی بات کو جھٹلا کر اپنی ذات کی بھی نفی
کرنا پڑتی۔ زندگی میں رشتوں کو ان کی صحیح جگہ پر رکھنا
بہت ضروری ہوتا ہے۔ یہ جو کہتے ہیں نا کہ رشتے
نبھانے آنے چاہئیں، اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ہم
ہر وقت دوسروں کو خوش کرنے میں لگے رہیں۔ اس کا
مطلب ہوتا ہے رشتوں کی پرکھ اور حساب سے ان کو
لے کر چلنا۔“ پہلی دفعہ تو بات کرنے کا موقع ملا تھا،
میں کیوں ہاتھ سے جانے دیتی۔

”لیکن ہمارا دین تو صلہ رحمی کا حکم دیتا ہے۔“
بھابھی معترض ہوئیں۔

”بھابھی! برا مت مانیے گا۔ لیکن ہم صلہ رحمی کی
نیت سے نہیں، اچھا کہلانے کی نیت سے سسرال میں
یہ ساری نیکیاں کر رہے ہوتے ہیں۔ اسی لیے انجام یہ
ہوتا ہے کہ سامنے نیکی کر کے گھنٹوں، پہروں اور دنوں
الجھتے اور کڑھتے رہتے ہیں۔“

”ٹھیک کہہ رہی ہو۔“ بھابھی شرمندہ لہجے
میں خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ بولیں۔ ”تم اتنی
چھوٹی ہو، پھر بھی اتنی سمجھ ہے۔“

”میں اپنی بڑی بہن کو بھی یہی سمجھاتی ہوں تو
وہ کہتی ہے کہ فرح، تم نے تو لگتا ہے سسرالیاں میں پی
اچ ڈی کیا ہوا ہے۔“ میں نے ہنستے ہوئے خوش دلی
سے کہا۔ بھابھی بھی سادہ سے انداز میں ہنس دیں۔



”لیکن فرح! میں نے نادیہ اور انجم باجی کو
ہمیشہ اپنی بہنوں کی طرح.....“
میں نے بھابھی کی بات کاٹ دی۔

”ہمارے ہاں لڑکی یہ سب دعوے لے کر
سسرال آتی ہے کہ نند کو بہن سمجھے گی، ساس کو ماں کا
مقام دے گی۔ دیور کو بھائیوں کی طرح رکھے گی۔
لیکن بھابھی! نند، نند ہوتی ہے۔ ساس، ساس اور
دیور، دیور۔ نادیہ کو آپ نے اس کی فرمائش پر سوٹ
لا دیا۔ اس کی جگہ آپ کی سگی بہن ہوتی تو آپ منہ
کھڑن کر اس سے پیسے مانگ لیتیں۔ پھر اس نے
آپ سے مزید دو جوڑوں کی فرمائش کر دی۔

آپ مہینہ بھر ادھیڑ بن میں رہیں مگر اس کو منع
نہیں کر سکیں۔ آپ کی سگی بہن ہوتی تو کیا تب بھی
آپ اسے منع نہ کر پاتیں؟ انجم باجی کے سامنے بھی
آپ ہر وقت اپنے دکھڑے روئی رہتی تھیں۔ انہوں
نے جو کیا، وہ آپ کو بھی معلوم ہے، مجھے بھی۔ آپ کی
سگی بہن ہوتی تو کیا وہ کرتی؟ پھر آپ کی ساس کی جگہ
آپ کی امی ہوتیں تو کیا ان کا رویہ یہی ہوتا؟

اگر یہ حقیقت شادی کے فوراً بعد قبول کر لی
جائے تو زندگی آسان ہو جاتی ہے۔ نادیہ نے آپ
کے سوٹ کی تعریف کی، آپ مسکرا کر چپ ہو جاتیں۔
انجم باجی کو اگر آپ ہنس کر ٹال دیتیں تو نہ ان باتوں کا
اتنا بنگلہ بنتا نہ ہی گھر کا ماحول خراب ہوتا۔ سب سے
بڑی بات آپ خود پرسکون رہتیں۔“

”تم تو اچھی خاصی مقررہ ہو بھی۔“ بھابھی
نے مسکراتے ہوئے حیرانی ظاہر کی۔

”ارے مجھے آپ میرے میکے میں دیکھتیں۔ صبح
و شام تقریریں کرتی تھی۔ لیکن مجھے معلوم ہے یہاں
تقریریں کرنے سے بات تو کون مانے گا، الٹا باتیں بننا
شروع ہو جائیں گی۔ بڑبولی اور منہ پھٹ کے القابات
مل جائیں گے۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

”صح کہہ رہی ہو۔“ بھابھی فوراً بولیں۔ ”لیکن

www.bookspk.site



صرف ریجان گیلانی میں اور تم

سبز نظر آنے والی وادی اب اجلی سفید چادر تلے چھپتی چلی جا رہی تھی۔ یوں جیسے زندگی پر موت چھا جائے اور کیسے عجیب تھے یہ لوگ جو اتنا سفر کر کے صرف یہ ایک نظارہ کرنے یہاں تک آئے تھے۔

ایک لخت وہ اس سارے ماحول سے بے زار ہوا تھا۔ باہر گرتی برف، اندر بھری رونق سب ایک دم سے ناقابل برداشت ہونے لگا تو وہ اٹھ آیا۔ کمرے میں آتے ہی کوٹ اتار کر پرے پھینکا، ٹائی یوں ڈھیلی کی گویا وہ اس کا دم گھونٹ رہی ہو۔ لپک کر کھڑکی بھی کھول لی، بریلی ہوا جیسے اسی انتظار میں تھی دھڑلے سے اندر کھس آئی۔ دلبر اس کے پیچھے ہی آیا تھا، وہ کھلے پٹ کے ساتھ سرٹکائے کھڑا تھا۔

”صاحب! آپ کے لیے کھانا لے آؤں۔“ وہ پوچھ رہا تھا، اس نے مڑ کر دیکھا۔

”ہاں۔ کھانا لے آؤ، لیکن مجھے بھوک نہیں ہے۔ وہ کھانا تم اپنے لیے لے جانا۔“ اور اسے کیا چاہیے تھا بھلا، گھر میں تو آج پھر وہی دال سبزی بنی ہوگی۔ صاحب کی آفر نے اس کے مرجھائے چہرے کو ایک دم کھلا کھلا کر دیا۔

”ٹھیک ہے، جیسا آپ کا مرضی اور موسم کا پہلا برف باری ہے۔ یہ ہوا فوراً بیمار کر دیتا ہے، کھڑکی بند کر لو صاحب! دیکھو تو کمر ایک دم کیسے ٹھنڈا ہو گیا اور آپ نے کوٹ بھی اتار دیا۔ اللہ کا واسطہ ایسا بے احتیاطی مت کرو، آپ نہیں جانتا اس

وادی کا حسن آج پورے جوہن پر تھا۔ سرما کی پہلی برف باری شروع ہو چکی تھی اور چونکہ اس برف باری کی اطلاع محکمہ موسمیات کے طفیل پہلے ہی مل چکی تھی، سو بے شمار منچلے کشاں کشاں کھینچے چلے آئے تھے۔ ان کے ریٹ پاؤس کے تمام کمروں کی بکنگ چار دن پہلے ہی ہو چکی تھی۔

ریٹ پاؤس کا ڈائنگ ہال اس وقت کھیا کھچ بھرا ہوا تھا۔ بھانت بھانت کی بولیاں، رنگ رنگ کے لوگ، برتنوں کی کھڑکھڑاہٹ، قہقہے اور کھلکھلاہٹ، بے فکر، خوش باش لوگ۔ صبح تک سر

مکمل ناول



سردی کو، بڑا ظالم ہوتا ہے۔ ایک بار آپ کو پکڑ لے گا تو سارا سیزن کھوں کھوں کرتے گزرے گا۔“ دلبر تھا تو پندرہ سال کا مگر باتیں بوڑھوں والی کرتا تھا۔ اس کی فکر مندی ہونٹوں پر مجروح سی مسکراہٹ لے آئی تھی اور جسے دیکھتے ہی وہ جھٹ برا مان گیا۔

”آپ اماری بات کو مذاق سمجھتا ہے، ام پر یقین نہیں تو بھلے اس علاقے کے کسی بھی آدمی سے پوچھ لو۔ آپ کا یہ شہر والا سردی نہیں ہے صاحب! یہ پہاڑوں والا سردی ہے اور جیسا ادھر کا پہاڑ سخت ہوتا ویسا ہی ادھر کا موسم بھی سخت ہوتا۔ ایک بار جان کو لگ جائے تو جلدی پیچھا نہیں چھوڑتا۔ امارا مورے (ماں) کو بھی کچھ سال پہلے ٹھنڈ لگ گیا تھا، اب وہ ہر سردی میں بیمار ہو جاتا ہے اور امارا نیا (دادی) اس کو باتیں سناتا کہ وہ کام سے بچنے کے واسطے ایسا کرتا۔ اللہ ناکرے آپ کو اگر سردی لگ گیا تو ادھر تو کوئی ڈاکٹر بھی اچھا نہیں ہے، بہت مسئلہ ہو جائے گا۔“

”اچھا ٹھیک ہے، اب تم جاؤ اپنا کام کرو۔“ وہ پہلے ہی بے زار تھا، اس پر دلبر خان کی باتیں، اس نے چڑ کر کہا اور اس نے جیسے سنا ہی نہیں تھا وہ آتش دان میں لکڑیاں رکھنے لگا۔

پھر آیا تھا اور صاحب کو جوں کا توں وہیں کھڑے دیکھ کر پہلے سے زیادہ کپکپا گیا۔

”آپ کھانا نہیں کھا رہے صاحب تو یہ کافی ضرور لی لیں۔ میں نے خود بنایا ہے آپ کے لیے۔“ اور اس نے سر ہلادیا۔ واپس پلٹتا دلبر سوچ رہا تھا کہ صاحب سے اس دوا کا نام لازمی پوچھنا ہے جس کو کھا کر انہیں سردی نہیں لگتا۔ پھر وہ اپنی مورے کو بھی وہ دوا دے گا۔ وہ نیا کی جلی کئی باتوں سے ہمیشہ کے لیے بچ جائے گی۔ وہ کھڑکی سے ہٹ کر ایزی چیئر پر آ بیٹھا تھا۔ کافی کا مگ اٹھایا، کافی سے دھوئیں کے مرغولے اٹھ رہے تھے اور اس گرم مگ کو ہاتھ میں لیتے ہی جیسے کوئی دروا ہو گیا۔ جس سے مختلف آوازیں آرہی تھیں، کوئی چیخ رہا تھا، کوئی بول رہا تھا۔

”اللہ..... اللہ..... میں یہ منظر دیکھنے سے پہلے مر کیوں نہیں گیا۔ بے حیا، بے غیرت..... تنگ خاندان..... تو تو سانپ سے بھی بدتر نکلا۔ اپنوں کو ہی ڈس لیا، ارے چور بھی چوری کرنے نکلتا ہے تو اپنا محلہ چھوڑ دیتا اور ایک ٹو..... مار دیا تو نے مجھے..... ہم سب کو مار دیا۔“ تڑاخ تڑاخ لاٹھی برس رہی تھی، ان بوڑھے ہاتھوں میں ایسا زور آ گیا تھا کہ جوان ہاتھ انہیں روکنے کی سکت ہی کھو بیٹھے یا شاید انہیں سکتہ ہو گیا تھا یا پھر وہ ٹوٹ گئے تھے۔

وہ لمحے ہی ایسے کرب ناک تھے کہ ہر چیز اپنے محور سے ہٹ گئی تھی۔ جسم کی موت اچھی ہوتی ہے، سب واقف تو ہوتے ہیں اور گلنے سڑنے سے پہلے جا کر دفن آتے ہیں لیکن یہ روح کی موت کیسی بری ہوتی ہے نا..... نہ کوئی اسے مرتے دیکھ سکتا ہے اور نہ اس سے اٹھتے قفسن کو محسوس کر سکتا ہے۔ اسے تو بس وہی برداشت کرے جس کے اندر لاش پڑی ہو۔

یہ کیسا عذاب تھا جس نے اسے گھیر رکھا تھا۔ وہ خود ہی شدید متنفر تھا۔ بے بسی سی بے بسی تھی، لگتا تھا لاٹھی اب بھی کوڑے کی طرح برس رہی ہے۔ تڑپ کر کافی کا مگ ہی کھینچ مارا، اک چھنا کے کے ساتھ

کھڑکی کا شیشہ چکنا چور ہوا تھا اور چند قدم دور گئے دلبر کے کانوں نے صاف سنا تھا۔ وہ ٹھٹھک کر وہیں رک گیا، یہ شیشہ کتنی پارٹوٹا تھا۔ اسے کتنی کی ساتھ ساتھ اب یہ فکر لاحق تھی کہ برف باری نے تمام راستے بند کر دیے تو کاریگر کو کیسے بلوایا جائے گا اور شیشہ نہیں ہوگا تو کمرے کا ٹمپر پچر.....

”اوو وہو وہو.....“ پہلے کم سردی تھی کہ اسے اور کپکپی چھوٹنے لگی۔

☆☆☆

ابھی سیڑھی کے پہلے قدم پر پاؤں رکھا ہی تھا کہ نیچے سے آتی قہقہوں کی بے ہنگم آوازیوں نے اسے وہیں جامد کر دیا۔ ناگواری کی اک لہر تھی جس نے پورے دماغ میں ایک چکر کاٹا، ماتھا شکن آلود ہوا تھا، یعنی آج پھر اس کی بے تنگی سہیلیوں کا ٹولہ گھر میں گھس آیا تھا اور اپنی فطرت سے مجبور اب وہ ذرا ذرا سی بات پر اونچے اونچے قہقہے لگا رہی تھیں۔ چلو وہ تو مہمان تھیں لیکن اس لڑکی کی عقل کو کیا ہوا ہے؟

”دیکھو! اگر تم اپنی ازلی بے وقوفی کی وجہ سے سہیلیاں ڈھنگ کی نہیں بنا سکیں تو ان بے ڈھنگی لڑکیوں کو کم از کم ڈھنگ سے ہنسنا ہی سکھا دو۔ جب وہ ہنستی ہیں نا تو ایمان سے ایسا لگتا ہے کئی چڑیلیں مل کر بین ڈال رہی ہوں۔ اُف..... مارے وحشت کے روٹنے کھڑے ہو جاتے ہیں، ایویں آس پڑوس میں کسی کمزور اعصاب کے مالک کو ہارٹ اٹیک ہو گیا تو؟ کسی معصوم جان کا گناہ سر لوگی ایسے؟“

اور تب وہ ازل کی بے وقوف پلٹیں پٹپٹاتی اسے دیکھے گئی تھی اور وہ حسب سابق اسی خوش نہمی میں رہ گیا تھا کہ بات سمجھ میں آگئی ہے، لیکن کسی بھی بات کو ایک بار سمجھانے پر وہ پہلے اپنی انیس سالہ زندگی میں بھی سمجھی تھی جواب سمجھ جاتی۔ اس کے ”چول پن“ کا اپنا ہی ریکارڈ ٹوٹ جاتا۔

”اُف..... مطلب پچھلی بار کی تادیب کا کوئی اثر نہیں لیا اس لڑکی نے۔ کچھ زیادہ ہی من مانیاں

نہیں کرنے لگی۔ اب یہ ان چڑیلوں کو کس کی اجازت سے بلایا ہے اس نے، حد ہوگئی بدتمیزی کی۔ علاج کرنا ہی پڑے گا اب تو، چند دن ڈھیل کیا دے دی یہ سر پر ہی چڑھ گئی ہے۔“

غصے میں پیچ و تاب کھاتا دھڑ دھڑ کرتا وہ جس انداز سے سیڑھیاں اُترا، وہ سب ہنسنا چھوڑ کر ادھر دیکھنے لگیں۔ اس نے بھی دیکھا اور لال بھھوکا چہرے پر نظر جاتے ہی شٹی گم ہوئی (ایں..... یہ گھر پر ہی تھے..... اوہ میرے اللہ) پہلے ہونٹ یک لخت سمٹے۔

گزشتہ کلاس وہ بھولی نہیں تھی بلکہ وہ تو بچپن سے لے کر اب تک کی کوئی بھی ”کلاس“ نہیں بھولی تھی اور نہ ہی آخری سانس تک بھول سکتی تھی۔ اتنا سخت میچر تو اسکول سے لے کر کالج تک بھی کوئی نہ ملا تھا جتنا کہ اللہ نے اس کے لیے گھر کے اندر ہی انتظام کر رکھا تھا۔

وہ چاہے لاکھ احتیاط کا دامن تھایے رکھنے کی کوشش کرتی، لیکن قسمت ہی ایسی دغا باز تھی کہ وہ ہر بار عین موقع پر دھری جاتی۔ جیسا کہ اب۔ اس کا اندازہ تو یہ تھا کہ وہ گھر پر نہیں ہے، آج کل وہ انسٹیٹیوٹ جا رہا تھا جہاں سے شام ڈھلے واپسی ہوتی، تو کیا آج وہ نہیں گیا تھا؟

”اُف..... مارے گئے، اس طرف تو دھیان ہی نہیں گیا۔ یہ نینا کی بچی کے اٹنے سیدھے مشورے ایک دن ضرور مروا میں گے، یا اللہ بس آج بچالے۔“

اس کا بھی کبوتر کا سا حال تھا اس وقت، جو سمجھتا ہے آنکھیں بند کر لینے سے مصیبت دور ہو جائے گی اور مصیبت نے اسے بری طرح گھورا تھا۔ اگر بس چلتا تو آنکھوں سے ہی بھسم کر ڈالتا، اس نے تو اتنی ضرورت بھی نہیں سمجھی تھی کہ اس کی سہیلیوں کی خدمت میں سلام ہی عرض کر دیتا لیکن اس کی سہیلیاں ایسی بے ادب تھوڑا ہی تھیں، سب نے

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

کتاب کا نام	مصنف	قیمت
شمول کے دروازے	شازیہ چوہدری	500/-
نکھلتا شام	شازیہ چوہدری	250/-
ہم سہ	فرحت اشتیاق	400/-
ہنر و آئینہ	فرحت اشتیاق	250/-
حاجران ہوتی	فرحت اشتیاق	500/-
دل وادیں	شمرہ بخاری	350/-
ہستی کا آئینہ	شمرہ بخاری	300/-
وہ بھی وہاں ہی	آبیہ سلیم قریشی	400/-
آرزو گھر آئی	آبیہ سلیم قریشی	400/-
ایمان مامیہ اور محبت	عمیرہ امجد	200/-
لامائل	عمیرہ امجد	180/-
اسر تیل	عمیرہ امجد	450/-
اک دیا ہلائے رکنا	ماہک	300/-
جو چلے وہاں سے گزر گئے	ماہک	120/-
میرے خواب ریہ ریہ	ماہک	300/-
سوم تھا ہے قرار	فریہ اشتیاق	300/-
دل سے ڈھونڈ لایا ہے	آبیہ رزاقی	300/-
زندگی اک روشنی	رخسانہ رحمان	500/-
میرے سانس کے چکر	زہرہ ممتاز	180/-
پھلاں دے رنگ کالے	فاخرہ انصار	180/-
میری جنت	نور بانو مجیب	250/-
بنور	شوکت رائے اللہ	150/-
اے وقت گواہی دے	راحت جمیں	350/-
شام آرزو	ایم سلطانہ	300/-
رنگ، خوشبو، ہوا، بارش	افشاں آفریدی	400/-
آئینوں کا شہر	فاخرہ انصار	400/-
بڑا آدمی	حیمہ قریشی	300/-
میرے خواب لوٹاؤ	محبت مہداد	400/-

ناول نگار کے لیے کتاب ڈاک خرچہ 30/- روپے
مکتبہ عمران ڈائجسٹ - 37 اردو بازار، کراچی
فون نمبر: 32216361

ہے کہ جلد ہی ایسا کچھ ہو جائے گا۔“
چاکلیٹ کیک پیس برآمد ہو ہی گیا تھا، وہ
پلیٹ اور دیگر لوازمات لیے میز پر آ بیٹھی۔
”حالات کیا چل رہے ہیں ذرا ان پر بھی
روشنی ڈالیں گی آپ؟“ چپس چبانی نینا کی طرف
سے سوال آیا۔

”ہک باہ..... حالات کا تو پوچھو ہی مت،
بہت برے رخ تک پہنچ چکے ہیں۔ جیسے ضرورت
سے زیادہ پانی برتن کے بھر جانے پر پھلک کر گر جاتا
ہے، بالکل ایسے ہی ضرورت سے زیادہ محبت بھی دل
بھر کر بننے لگتی ہے۔“

”ایں..... یہ کیا خلیل جبران کا قول ہے؟“ نینا
نے نین پھیلائے۔
”نہیں، یہ قول یقیناً فیثا غوث کا ہوگا۔“ پانی
گرم ہو چکا تھا، پتی جھونکتے رمشانے اپنی رائے پیش
کی۔

”بوتھ آر روٹنگ..... یہ قول نہ خلیل جبران کا
ہے اور نہ ہی فیثا غوث کا بلکہ یہ تو تانیہ امیر کا وہ قیمتی
قول ہے جو انہوں نے ابھی ارشاد فرمایا ہے اور یہ
ضرور اک دن سنہری روشنائی سے لکھا جائے گا۔ بہتر
ہوگا کہ تم لوگ جلدی سے کاپی پین پکڑ کر اسے نوٹ
کر لو۔“ تانیہ کا لہجہ اتر اہٹ سے لبریز تھا۔
”کریں گے نوٹ، پہلے تم حالات بتاؤ۔“ نینا
نے اپنے آگے پڑی خالی پلیٹ پرے کرتے اس
کے کیک کی طرف ہاتھ بڑھایا، جو مزید آگے کھسک
گیا، وہ برا سا منہ بنا کر رہ گئی۔

”جیسا کہ تم لوگ بھی جانتی ہو کہ ہمارے
فائل ایگزام سر پر چڑھتے چلے آ رہے ہیں اور جو
ہماری گزشتہ کارگزاریاں رہ چکی ہیں ان کی رو سے
اب ہمیں کافی سے زیادہ محنت کی ضرورت ہے، سو
ان سب عوامل کو دیکھتے ہوئے بابا کی طرف سے حکم
نامہ آیا ہے کہ ہر طرح کی فضول ایکٹیویٹیز ترک کر دی
جائیں۔ جس میں سیل فون سرفہرست ہے، جو کچھ
ہی روز میں بندی سے لے لیا جائے گا تو میں نے

اس کا، بات بات پر تو آنسو نکل آتے ہیں اور مجھ
سے اس کا رونا برداشت نہیں ہوتا پھر کچھ ہی دن ہیں
آجائے گی زینب تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم
ریلیکس رہو، جاؤ اللہ کی امان۔“

وہ منہ سے کچھ نہیں بولا تھا مگر وہ سب سمجھ گئے،
پیار سے شانہ تھپکا۔ اس نے سارا غصہ بائیک کو کک
لگاتے اتارا اور زن سے لے اڑا۔ اباجی زیر لب
دعائیں پڑھتے آرہے تھے، انہیں دیکھ کر سب، بی بی
بچیاں، بنی اٹھ کھڑی ہوئیں، کورس میں سلام کیا گیا۔
”جیتی رہو، شام ہو رہی ہے بچیو! اس وقت
درختوں تلے نہیں بیٹھتے۔ چلو سب اندر جاؤ اور عزیزہ
بیٹا! سویرا سے کہو، میری چائے لے آئے۔“

”سویرا کے ہاتھ کی چائے تو آپ روز ہی پیتے
ہیں اباجی! آج ہم بتائیں آپ کے لیے چائے؟“
نینا بڑی سلیقہ شعار بن رہی تھی، انہوں نے مسکرا کر
اس کا سر تھپکا۔

”ہاں کیوں نہیں، ضرور پیوں گا۔ آج یہ تجربہ
بھی سہی۔“
”تجربہ..... ہائے اللہ، کتنے ناٹی ہیں اباجی
آپ۔“ رمشانے ٹھٹھا لگایا کہ باقی بھی اک بار پھر
زور سے ہنس پڑیں اور انہوں نے دہلتے ہوئے
اعتراف کیا کہ وہ ٹھیک ہی چڑتا ہے ان لڑکیوں کی
ہنسی سے، یہ تو سچ کچ کسی کا بھی ترہ نکال سکتی ہیں۔

☆☆☆

”میرے سیاں جی سے آج میں نے بریک
اپ کر لیا۔“ فریح کا جائزہ لیتی تانیہ خوب لہک لہک
کر گنگنا رہی تھی۔

”اسے کہتے ہیں، جدید زمانے کے جدید
تقاضے یعنی بریک اپ کی اطلاع بھی اب گا کر دی
جاتی ہے۔ بائے داوے کب ہوایہ خوش گویا سانچہ؟“
دودھ کا برتن چولہے پر رکھتی رمشا پوچھ رہی تھی۔

”آپ کی معلومات میں اضافہ کے لیے
بتا دوں کہ فی الحال تو یہ سانچہ وقوع پذیر نہیں ہوا، مگر جو
حالات چل رہے ہیں ان کی روشنی میں امید واثق

اسے ہیلو کہنے میں اک دو بجے سے سبقت لے جانے
کی بے اختیار کوشش کی تھی اور وہ ایسا بے مروت کہ
کسی کی طرف بھی نظر کیے بنا پاس سے گزر گیا۔

”ہائے ہائے..... کیا ہوا ہے، ایسی بھی کیا
جلدی پڑی ہے۔ کدھر کی تیاری ہے، گھر سے نکلتے
وقت زادراہ لے کر جاتے ہیں، اگر ہمارے سلام کا
جواب دے دیتے تو دس نیکیاں تو مل ہی جاتیں۔“
نینا بولے بنا نہ رہ سکی جبکہ اس نے بازو پکڑ کر جھنجھوڑا
بھی۔

”سلام کا جواب نہ دینا انتہائی بدتہذیبی ہے۔
توبہ توبہ..... بہت روڈ ہے تمہارا کزن۔“ تانیہ نے
دروازے کی طرف منہ کر کے تبصرہ کیا، یعنی کہنا بیٹی کو
اور سنانا بہو کو۔

”خدا جب حسن دیتا ہے، نزاکت آ ہی جاتی
ہے۔“ رمشانے اپنے لیزر کٹ بالوں کو اک جھٹکا
دیا۔ وہ منہ کھولے دیکھتی رہ گئی، کہتی بھی تو کیا ہو
سب ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھیں۔ اس کے ایسے رویے
نے کتنا شرمندہ کروایا تھا۔ گھر آئے مہمانوں سے
کوئی ایسا سلوک کرتا ہے کیا؟ وہ تو بھلا ہونینا کا جس
نے اس کا خوب اچھا تعارف کروا رکھا تھا۔ رمشا اور
تانیہ کو بھی علم تھا وہ کیسا بد مزاج ہے اور وہ سب سنتا اور
کھولتا بائیک کو تیزی سے گیٹ سے نکال کر لے گیا
تھا۔

”خیر تو ہے میاں صاحب زادے؟ کہاں
جارے ہو، بہت جلدی میں لگ رہے ہو۔“ اباجی
لاٹھی ٹپکتے سامنے سے چلے آ رہے تھے اور ابھی سلام
اس کی نوک زباں پر ہی تھا کہ اندر سے آتے اک اور
بے ہنگم قہقہے نے اسے ہونٹ بھینچنے پر مجبور کر دیا۔
چہرے پر چھائی برہمی مزید بڑھی تھی، اباجی نے پہلے
گیٹ کی جانب دیکھا، پھر اسے۔

”کوئی بات نہیں یار! مت گھبرایا کرو، بچی
ہے۔ اداس ہو جاتی ہے تو سہیلیاں اکٹھی کر کے ہنس
بول لیتی ہے۔ اب ماں تو اس کی نہیں ہے یہاں،
میں بھی نہیں تو کتا۔ کہیں دل نہ برا کرے، پتا تو ہے

سوچا کہ کسی بے چارے محبت کے مارے کو تڑپا کر گناہ کمانے سے بہتر ہے کہ اسے اس چنگل سے آزاد کر دوں۔ ویسے بھی جواب اس غریب کی حالت ہو چکی ہے اور جو وہ عشقیہ ڈائلاگ جھاڑ جھاڑ کر میری کرنا چاہ رہا تھا، وہ سب ناقابل برداشت ہوتا جا رہا ہے میرے لیے۔ مجھے تو اپنی فکر بڑھ گئی ہے اگر چند دن اور اس کی محبت بھری باتیں سنتی رہی تو مجھے ڈر ہے میں بھی اس آفت ناگہانی میں مبتلا نہ ہو جاؤں۔“

جیسا اطمینان اس کے لہجے میں تھا، اس سے کہیں بڑھ کر چہرے پر چھایا تھا۔ جبکہ عنیزہ نے منہ اٹھا کر بغور اسے دیکھا۔

”واہ کیا کہنے، کتنی سمجھ دار ہو گئی ہے یہ بچی۔“

نینا نے بے اختیار سراہا۔

”ویسے یار بڑا اچھا ”شغل“ لگا ہوا تھا، میری مانو تو ابھی یہ چیئر کلوز مت کرو، سچی میں بہت ہی مزے کی باتیں کرتا ہے وہ تمہارا عاشق۔ تم جتنے دن آف لائن رہو گی، اتنے دن کے لیے اسے مشورہ دو کہ وہ کچھ لکھنا شروع کر دے سچ میں نہایت بہترین رومانی ناول لکھ سکتا ہے وہ۔“ رمشا نے چٹخار لیتے ہوئے رائے پیش کی۔

”ہاں واقعی لکھ تو سکتا ہے اور ناول بھی ایسے جو تہلکہ مچا دیں۔ آف تو بہ..... اور ایسے ایسے مکالمے جو کانوں سے دھواں نکال دیں۔ میں تو باز آئی ایسی عاشقی سے، لاجول پڑھنے کو دل کرتا ہے اب، ویسے تمہیں اگر اس کی باتیں اتنی ہی پسند ہیں تو بھی اب تم لگالیا کرو اس سے گپ شپ۔“ تانیہ نے اسے کھلی آفر دی۔

”ارے نہیں بھی، تم تو اب فیڈ اپ ہوئی ہو، میں کب کی ہو چکی۔ یہ پردے کے پیچھے والے عاشق کچھ زیادہ ہی سچے اور پکے ہوتے ہیں۔“ سب کہہ دو، ان کا من پسند فقرہ ہے، ذرا دید لحاظ نہیں ہوتا ان میں۔ بس محبت کے ڈوگرے برسائے چلے جاتے ہیں، مجھے تو معاف رکھو۔“

پاپیوں میں چائے چھانتی وہ بے زاری سے کہہ رہی تھی۔ نینا اور تانیہ ہاتھ پر ہاتھ مارتی ہنس دیں اور چپ چاپ ان کی گفتگو سنتی عنیزہ کی کان کی لوٹیں تک سرخ ہو چکی تھیں۔ اس کا چہرہ دیکھ کر نینا بول پڑی۔

”بہت ہی بے شرم لڑکیاں ہوتی ہیں، یہ کس قسم کی گفت و شنید کر رہی ہو؟ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ اگر تم لوگوں کا کہا کوئی ایک بھی لفظ ”ہٹلر کے بچے“ کے کان میں پڑ گیا تو سمجھو قیامت آجائے گی۔“

”ہٹلر کا بچہ.....؟“ تانیہ اور رمشا ایک آواز میں متحیر سی بولیں، جبکہ عنیزہ نے اسے گھورا تھا۔

”ہاں ہٹلر کا بچہ..... تم لوگ اس ہستی کے غصے سے ابھی واقف نہیں ہو۔ نہ تم لوگوں نے اسے گرتے برستے دیکھا ہے، اس لیے اتنے مزے سے فضول گوسپ میں مشغول ہو۔ اگر اس نے کچھ سن لیا تو یقین کرو، اٹھا کر گھر سے باہر پھینک دی جاؤ گی۔“

نینا نہایت رازدارانہ لہجے میں انہیں مطلع کر رہی تھی۔

”اوہ..... پر یہ موصوف ہیں کون؟“ وہ جاننے کو بے چین تھیں۔

”کیوں عنیزہ! بتا دوں انہیں؟“ وہ شرارت سے مسکراتی اس سے پوچھ رہی تھی، جو ان سنی کرتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میں اباجی کو چائے دے آؤں، ٹھنڈی ہو رہی ہے۔“

”ہاں اب بتاؤ۔“ اس کے جاتے ہی وہ دونوں قریب کھسک آئیں۔

”بہت ہی ناقص یادداشت ہے تم دونوں کی، ابھی باہر ہی تو ملی ہو ان حضرت سے۔“ نینا نے ان پر ”در فتنے منہ“ والی نظر ڈالی۔

”ہیں کیا اباجی؟“ دونوں نے اک دو جے کو دیکھا اور نینا نے بھنا کر انہیں۔

”اباجی کی بچیوں..... اباجی سے پہلے کس سے ملے تھے ہم لوگ؟“

”ہیں..... وہ ڈشنگ؟“ ان کا ”ہیں“ چیخ سے مشابہ تھا۔

”ہاں وہ ڈشنگ، جس کا بس نہیں چلتا عنیزہ بے چاری کو ڈھٹوں ڈھٹوں کر دے، اتنی معصوم سی ہماری میہلی۔ قسم سے حوصلہ ہے اس کا جو ایسے بدل لحاظ کزن کو برداشت کرتی ہے، ابھی دیکھا تھا نا تم لوگوں نے بھی۔ ذرا میسر نہیں ہیں اسے، کیسے منہ پھلا کر گزرا ہمارے پاس ہے۔ مت پوچھو جو یہاں پر میں دیکھ رہی ہوں، میں تو سمجھتی تھی عنیزہ کی فطرت ہی ایسی دبو سی ہے لیکن یہ تو اب پتا چلا کہ اس بے چاری کو سانس بھی کھل کر نہیں لینے دیا جاتا۔ ہزار طرح کی تو پابندیاں ہیں اس پر، زیادہ دوستیاں نہیں بنائی۔ کسی سہیلی کے گھر نہیں جانا، کسی کو گھر نہیں بلانا، یہ تو اتفاق ہوا کہ پھپھو، انکل کے ایکسٹنٹ کاسٹے ہی دینی چلی گئیں اور مجھے ممانے اس کی پریشانی کے خیال سے یہاں بھیج دیا۔ سیل فون تک تو اس کے پاس نہیں، حالانکہ اس کے بابا نے بھیجا تھا اس کے لیے لیکن اس ہٹلر کے بچے نے اٹھا کر اپنے کسی دوست کو گفٹ کر دیا۔ یہ کہہ کر کہ گھر میں فون ہے تو اسے علیحدہ فون کی کیا ضرورت..... اف..... میرے ساتھ کوئی ایسا کرے نا تو میں اس کی گردن ہی دبا دوں اور ایک یہ ہماری عنیزہ صاحبہ ہیں، الٹا اس سے ڈر کر رہتی ہے۔ وہ اتنا رعب جھاتا ہے اس پر کہ حد نہیں اور یہ ایسی بے وقوف کہ اس کے سامنے چوں نہیں کرتی۔ اس کی حالت دیکھ کر تو میں نے بھی ارادہ کر لیا ہے۔ اب تب تک یہاں سے نہیں جاؤں گی جب تک اسے سدھار نہ لوں۔“ نینا کی آنکھوں میں اک عزم نظر آ رہا تھا۔

”بالکل..... اگر ایسی صورت حال ہے تو ہمیں ضرور عنیزہ کو سمجھانا چاہیے۔ وہ کیوں اتنا ڈرتی ہے اس سے اور اپنا سیل فون بھی دے دیا، وہ تو اس کے بابا نے دینی سے بھیجا تھا۔ کتنا زبردست ہوگا نایا! بالکل پاگل ہے یہ عنیزہ تو۔“ اتنی دھکی تو یقیناً عنیزہ بھی نہیں ہوئی ہوگی جتنا اس وقت وہ دونوں ہو رہی

تھیں۔

”باگل سی پاگل..... مگر میں نے بھی اب اس کا علاج کر کے ہی دم لینا ہے، یہ ہٹلر کا بچہ سمجھتا کیا ہے اپنے آپ کو۔ اگر عنیزہ اس کی کزن ہے تو میں بھی عنیزہ کی کزن ہوں۔ اس نے بگاڑ کر رکھ دیا ہے اس کی شخصیت کو، اب دیکھنا میں کیسا سدھارنی ہوں۔“ نینا دانت کچکا رہی تھی، یوں جیسے وہ منہ میں رکھا ہو، تانیہ اور رمشا نے اس کے شانے تھپکے۔

☆☆☆

لاؤنج میں آتے ہی پہلے قدم پر لگا کہ جیسے وہ لق و دق صحرا میں آگئی ہو۔ اسے ایسا کیوں لگا تھا؟ جب اس امر پر غور کیا تو اس کے حلق سے نکلنے والا ”امی.....“ چیخ جیسا ہی تھا۔

”خیر تو ہے؟ یہ کیا طریقہ ہے، نا سلام نہ دعا آتے ہی شور..... سامنے ہی تو بیٹھی ہوں میں۔ اتنا زور سے چلانے کی کیا ضرورت تھی۔“ یاسمین کو اس کا انداز ذرا نہ بھایا، فوراً لٹے لیے۔

”یہ..... یہ کیا کیا آپ نے؟“ وہ چاروں اور دیکھتی بدحواس سی پوچھ رہی تھی۔

”کیا مطلب؟ کیا کر دیا ہے میں نے؟“ انہوں نے بھی ادھر ادھر دیکھا، پر کچھ سمجھ نہ آیا۔

”یہ..... یہ پورے لاؤنج کی کیا حالت کر ڈالی ہے، کیوں اتارے یہ سب پردے اور کور وغیرہ؟ ابھی لاسٹ سنڈے ہی تو سب دھویا تھا میں نے، اب پھر کیا ضرورت آن پڑی اور کیسے دھویا ہے ان کو؟“

”لو یہ کیا سوال ہے بھی، جیسے سب کپڑے دھلتے ہیں ویسے ہی دھویا ہے اور یہ لاسٹ سنڈے کی بھی خوب کہی۔ پورا ہفتہ ہونے کو آ گیا اب تو، دوبار تو آندھی آچکی، ہر طرف گرد و غبار بھرا ہوا تھا۔ پردے بھی بڑے ہی میلے لگ رہے تھے مجھے، میں نے نازیہ سے اترا دئے اور مشین میں دھلوا دیے۔ غیاث بھائی اور بھابھی کتنے سالوں بعد وطن لوٹے ہیں، کل رات کے کھانے پر بلارہی ہوں انہیں۔“

بے اختیار جی چاہا کہ وہ اپنے بال نوچ لے۔

کوئی تین ماہ پہلے عید پر پورے گھر کے پردے وغیرہ بنائے گئے تھے۔ ہر بار شاپنگ امی ہی کیا کرتی تھیں اس بار بابا کے ساتھ وہ ضد کر کے گئی تھی اور جی بھر کے عمدہ اور پسندیدہ شاپنگ کی، بابا نے بھی نہ ٹوکا، وہ ان ہی کی تو ہم مزاج تھی، بلکہ ان کے ہی مشورے سے لاؤنج کے سب سے بہترین اور ہنگے اسٹف کے پردے لیے گئے۔ جن کے لیے شاپ کپرنے اسے خاص ہدایات دی تھیں کہ ان کی عمر بڑھانے کے لیے ضروری ہے کہ آپ انہیں ہمیشہ مشین کے بجائے ہاتھ سے دھوئیں اور دھوپ میں تو ہرگز خشک نہ کریں، لاسٹ سنڈے بھی اس کی صفائی پسند ماں نے شور مچا رکھا تھا تو اس نے جی کڑا کرتے ہوئے پہلی بار بڑے پیار سے ان پردوں کو دھویا تھا کہ آج پھر ان کی شامت بلا دی گئی۔ اگر وہ ان پردوں کی اصل قیمت انہیں بتا دیتی تو شاید وہ انہیں عمر بھر دھونے کی غلطی نہ کرتیں اور اتنی بے دردی سے تو ہرگز نہیں۔

دھڑ دھڑ کرتی وہ اوپر پہنچی تھی، ستم زدہ پردوں کو تاروں سے اتار کر کرویوں بانہوں میں سمیٹا جیسے برسوں بعد بچھڑے محبوب ملتے ہیں۔ انہیں ٹٹول ٹٹول کر دیکھا، کہ کہیں ظالم زمانے نے کوئی زخم تو نہیں دے دیے، لیکن صد شکر کہ بچت ہی رہی تھی، آوازوں نے توجہ پھینچ لی۔ اب یہاں تک آگئی تھی تو لگے ہاتھوں یہ کام بھی کر لیا جائے۔ یہ ہی سوچ کر پردے احتیاط سے اک طرف رکھے اور اسٹول پر چڑھ کر دیوار پر ہتھیلیاں جماتی اگلی چھت پر کود گئی۔ اسے دیکھتے ہی اک شور مچ گیا تھا، بھوک سے بے قرار پرندے قفس کی جالیوں پر چوچیں مارنے لگے۔ ”ہیلو ڈیر برڈز..... کیسے ہو تم سب؟ کیا گزرا آج کا دن۔ سوری میں صبح نہیں آسکی، ناز یہ کو بھیج دیا تھا۔ وہ کھانا دے گئی تھی نا اور لگتا ہے سب کو اس وقت بھی خوب بھوک لگی ہے۔ ملتا ہے ابھی سب کو کھانا ملتا ہے بھئی..... آرام سے کھانا، ٹھیک ہے۔ چلو میں ابھی لے کر آئی تم سب کی من پسند ڈش۔“

نے مٹھیاں بھر بھر کر باجرہ ڈالا، رنگ برنگے طوطے اور چڑیاں لپک کر چگنے لگے۔ وہ کچھ لمحے بڑے پیار سے ان سب کو دیکھتی رہی، پھر خالی پیالے میں پانی بھر کر اٹھی تو عجیب سا احساس ہونے پر پیچھے دیکھا اور پتھر کی ہوگئی۔ نیچے جاتی سیڑھیوں کے پاس سینے پر بازو باندھے کھڑا بیٹنی طور پر وہ منصب زمان مروت ہی تھا۔ اس کا بھوت نہیں (کیونکہ بھوت کی مسکراہٹ ایسی دلکش نہیں ہوتی) اس کا سانس گم ہوا تھا، دل دھڑکنا ہی بھول گیا، حسب سابق۔

”آپ کو دیکھ کر جس طرح ان سب نے ری ایکٹ کیا، اس سے لگتا ہے آپ ان کا کافی سے زیادہ خیال رکھتی رہی ہیں۔ نیا جان خواہ خواہ پریشان ہوتی رہیں وہاں، ان کو تو فکر میں نیند ہی نہیں آتی تھی۔ صبح اٹھتے ہی پہلا خیال ان سب کا ہوتا تھا، پتا نہیں ان کے چڑیاں، تو توں نے ابھی تک کچھ کھایا یا بھی ہے یا بھوکے ہوں گے۔ جبکہ گل میناروز ان کو تسلی دیتی تھی کہ جس کے ذمے آپ ان سب کو چھوڑ کر آئی ہیں وہ اپنی جان سے بڑھ کر ان کی کیئر کر رہی ہوگی، یعنی گل مینا بالکل ٹھیک کہہ رہی تھی۔ بہت شکریہ آپ ان کو باقاعدہ وقت دیتی رہیں۔“

وہ ممنون ہو رہا تھا اور وہ خائف کہ وہ اسے چھپ کر ان سے کہیں لگاتے دیکھ رہا تھا، یہ کوئی طریقہ ہوتا ہے؟ ”تراہ“ ہی نکال دیا تھا ایک پل کے لیے۔

”آپ کب آئے، ابھی کل ہی تو میری بات ہوئی ہے مینو سے، اس نے تو بتایا ہی نہیں۔“ اسے گل مینا پر بھی غصہ آیا۔ کیا تھا اگر بتا دیتی وہ اس وقت کی شرمندگی سے تونج جانی (اور اس ننھے منے ہارٹ ایک سے بھی)۔

”صرف میں ہی نہیں نیا جان بھی واپس آ چکی ہیں، ان کا تو دل ہی نہیں لگ رہا تھا وہاں، انہیں تو بس اپنے ان بچوں کی فکر تھی۔“

”کمال ہے، کیا نیا جان کو مجھ پر یقین نہیں تھا۔“ اسے خاصا صدمہ ہوا اس اطلاع سے، منصب

نے شانے اچکا دیے۔

”جا کر پوچھ لیں ان سے، میں کیا کہہ سکتا ہوں۔“ اور وہ سیڑھیاں اتر آئی تھی۔

”ارے آؤ..... آؤ سویرا بیٹی! کیسی ہو؟“ نیا جان نے خوش دلی سے خیر مقدم کیا، اس کا منہ پھولا ہوا تھا۔

”میں ٹھیک ہوں اور آپ کے سب پرندے بھی بالکل ٹھیک ہیں۔ جیسے آپ تاکید کر کے گئی تھیں، ویسے ہی ان کا دھیان رکھتی رہی ہوں۔ آپ چاہیں تو ابھی چل کر ان سب کو دیکھ لیں، کل کلاں کو کوئی گلہ نہ کیجیے گا مجھ سے۔ سب ویسے ہی سٹے کئے اور مونے تازے ہیں، کاش کہ وہ سب بول سکتے تو میں ان سے کہتی کہ آپ کو بتا دیں جو رویہ میں نے ان کے ساتھ رکھا تھا۔“ نیا جان نے حیران ہو کر اسے تڑتڑ بولتے دیکھا اور مسکرا دیں۔

”مڑے وہ کیسے بولے گا وہ تو بے زبان جانور ہیں اور مجھے تم پر بھروسہ تھا تب ہی تو حوالے کر کے گئی تھی۔ خان صاحب کا خبر ہے، ہم کو وہ ہر آدھے گھنٹے بعد خود تو اٹھ کر کچھ کھا سکتے ہیں لیکن کسی اور کو جا کر کھانا مصیبت ہوگا ان کے لیے اور ادھر آؤ۔ دیکھو ہم کیا لایا تمہارے لیے، زر مینا اور گل مینا نے بھی چیزیں بھیجی ہیں تمہارے واسطے۔“

اور جب انہوں نے دونوں میناؤں کا دیا ہوا مینا بازار اس کے سامنے لگایا تو وہ سب غصہ بھول بھال گئی۔ کشمیری کڑھائی کا بہترین سوٹ، ہاتھ سے کشیدہ کاری کر کے بنایا گیا بیگ، بادام کا حلوہ، خشک میوے اور بہت کچھ۔ وہ دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔

”اور تم نے جو ذمہ داری نبھائی یہ تحفہ میری طرف سے اس بات پر۔“ انہوں نے سب سے آخر میں شیشوں کے کام سے مزین بھاری چادر اس کی گود میں رکھی، اس کی تو آنکھیں ہی کھل گئیں دیکھ کر، شیشوں سے منعکس ہوتی روشنی نے پورا کمرہ ہی جگمگا ڈالا تھا۔

”اوہ..... اس بیوٹی فل..... یہ اتنی زبردست

چادر میرے لیے۔ اُف..... نیا جان آپ کا تحفہ تو سب سے بڑھ کر ہے، بہت شکریہ۔“

”شکریہ کس بات کا، مائیں بچوں کے لیے چیزیں لایا ہی کرتی ہیں اور تم تو میری بہت پیاری بیٹی ہو۔“ انہوں نے اسے ساتھ لگا کر ماتھا چوم لیا، ان کی اتنی محبت پر وہ نہال ہوگئی۔

”نیا جان میں بھی آپ کا بچہ ہوں، کچھ میرے کھانے پینے کی فکر بھی کر لیں۔ اتنی لمبی ڈرائیو کی ہے، اب تو شدید تھکن کے ساتھ بھوک بھی لگ رہی ہے۔“ مسکراہٹ دبائے یہ نظارہ دیکھتا منصب زمان دروازے میں کھڑا تھا، نیا جان جلدی سے اٹھیں۔

”ہاں..... ہاں بچے! تمہاری فکر کیوں نہیں ہوگی، بس تم ہاتھ دھولو۔ دو منٹ لگتا ہے کھانا گرم ہونے میں۔“

”اتنا سفر کر کے آئی ہیں نیا جان! آپ بھی تھک گئی ہوں گی، آپ بیٹھ جائیں، کھانا میں گرم کر لیتی ہوں۔“ سب چیزیں ایک طرف کرتی وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اوہ بچے، اللہ خوش رکھے، جیتی رہو۔“ نیا جان خود بے حد تھکی ہوئی تھیں، اتنا طویل سفر کر کے آئی تھیں، جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ ان میں اب ہلنے کی بھی ہمت نہ تھی، انہوں نے اطمینان سے اسے جاتے دیکھا۔ جانتی تھیں وہ ابھی لپک جھپک میز لگا دے گی، منصب بھی اسے جاتے دیکھتا اندر آ گیا۔ وہ مسکرا دیں اور ان کی یہ مسکراہٹ بے وجہ نہیں تھی۔

”بابا جان کا فون آیا تھا، میں نے ان کو بتا دیا ہے کہ ہم گھر پہنچ چکے ہیں۔“ وہ ان کے پاس آ بیٹھا۔

”بہنوں کو بھی فون کر دو، انہیں بھی فکر ہوگی بلکہ زر مینے کا نمبر ملا کر دو مجھے، میں بات کروں اس سے۔“

”آرام سے کال کر لیجے گا، پہلے کھانا

کھالیں۔“ وہ صوفے کی بیک سے سرٹکا تا نیم دراز سا ہو گیا۔

”بہت تھک گیا ہے میرا بچہ!“

نیا جان نے پیار سے اس کے بالوں میں انگلیاں چلائیں اور اس میں کچھ شک نہ تھا، وہ سچ میں بے حد تھکا ہوا تھا لیکن وہ کچھ دیر پہلے کی بات تھی۔ اب تو وہ تازہ دم تھا، ساری تھکن تو اس کی صورت دیکھتے ہی اتر گئی تھی۔ پورے دس دن اس کی دید کے بنا گزارے تھے اور کیسے گزارے تھے یہ دن؟ یہ تو کوئی اس کے دل سے پوچھتا، ایک ایک بل صدیوں پر محیط تھا گویا تو اب بھی چاہ رہے تھے وہ کچھ دن اور ان کے ساتھ گزاریں۔

گل مینا کے پہلا بیٹا ہوا تھا، نیا جان تو اس کی طبیعت خراب ہونے کا سن کر زرخست سفر باندھ بیٹھی تھیں۔ پھر منے کا دھوم دھام سے عقیقہ کیا گیا، وہ تو اب بھی نہیں آنا چاہ رہی تھیں مگر وہی ان کو وہم میں ڈال رہا تھا کہ سویرا یونی جانی ہے، وہ کہاں ان کے پرندوں کا خیال رکھتی ہوگی۔ اس سے پہلے کہ ان معصوموں کے بھوکے پیاسے مرنے کی خبر آئے، انہیں واپسی کا رستہ ناپ لینا چاہیے۔

”لالہ! ویسے یہ کوئی اچھی بات نہیں آپ جب بھی نیا جان کے پاس بیٹھتے ہیں، میری سہیلی کی برائیاں کرتے ہیں۔“ گل مینا نے سختی سے نوٹس لیا تھا۔

”میں نے کب کوئی برائی کی؟ میں نے تو صرف اتنا کہا کہ وہ اپنی پڑھائی میں مصروف ہوتی ہے، اب اس میں کچھ جھوٹ ہے تو بتاؤ؟“

وہ جھٹ معصوم بن گیا، وہ مسکرا دی۔ اس کی سہیلی کی برائیاں کرتے ہوئے لالہ کی آنکھیں کیسے چمکتی ہیں، خوب جانتی تھی وہ۔

”نہیں مڑے ویسے! یہ کہتا تو ٹھیک ہے۔“ نیا جان انتہائی سادہ مزاج، اس کی باتوں میں آ جاتیں۔ وہ مسکرا ہٹ دباتا اٹھ جاتا، گل مینا دور تک گھورتی۔

وہ دونوں بہنیں سب سمجھ رہی تھیں اور ایک دن انہوں نے نیا جان کو بھی سمجھا دیا تھا۔ انہیں اور کیا چاہیے تھا اگر یہ اس کی خوشی تھی تو وہ بھلا کیا اعتراض کریں۔

”اب یہ نہ ہو کہ آپ وہاں پہنچتے ہی پوتے کا رشتہ لے جائیں، کچھ دن صبر کر لیجیے گا۔ ہم سب پوری تیاری کے ساتھ آئیں گے۔ ایک ہی توالالہ ہے ہمارا، سو سوارمان ہیں دل میں اور ہاں سویرا سے تو بھول کر بھی بات نہ کیجیے گا۔ سر پرانز دیں گے اسے، خوب مزا آئے گا۔“

گل مینا تصور کی آنکھ سے نظارہ کرتی لطف لے رہی تھی، اگر وہ لالہ کی آنکھوں کے رنگ پہچان گئی تھی تو سہیلی کے دل کی پہیلی بھی پوچھ گئی تھی۔

”اب یہ سر پرانز کیا بلا ہوتی ہے۔“ نیا جان سب کا منہ تک رہی تھیں۔

”سب اچانک جا کر بتائیں گے نیا جان۔“

زمینا نے آسان لفظوں میں سمجھایا۔

”تو اگر میں بتا دوں گی تو کیا حرج ہو جائے گی۔“ نیا جان کو ان کی بات کچھ خاص پسند نہیں آئی تھی، وہ کیسے اتنا صبر کریں گی۔ سویرا تو ہر دوسرے دن ان کے پاس آتی تھی۔ گل مینا نے اس سے وعدہ لیا ہوا تھا کہ وہ نیا جان اور داجی کا خیال رکھے گی اور وہ پورے خلوص سے اس سے کیا عہد نبھائے گی۔

”سویرا سے کہتی ہوں۔ کھانا گرم کر لیا ہے تو چائے کا پانی رکھ دے۔“ نیا جان کہتی باہر کوچل دیں، وہ آنکھیں موندے من چاہے رنگ دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

دروازے پر ہوتی دستک پر انہوں نے کتاب سے نظر اٹھائی وہ ٹرے اٹھائے اندر آ رہا تھا۔

”ارے بھی آؤ جوان، آج کیا لے کر آئے ہو بوڑھے دادا کے لیے ہوں۔“ خوشبو تو بہت اچھی آرہی ہے۔ لگتا ہے کچھ خاص ہے۔“ کتاب سائنڈ ٹیبل پر رکھتے انہوں نے ایک لمبا سانس کھینچتے کہا۔

”بوڑھے دادا ہوں گے میرے دشمنوں کے“ آپ تو میرے بیک اینڈ گریس فل سے اباجی ہیں اور آپ بالکل ٹھیک ہو جھے۔ بہت خاص ڈشز لایا ہوں آپ کے لیے، آج امی نے آپ کے فیورٹ مٹن کو فتنے بنائے ہیں اور میری فرمائش پر چائیز دیجی ٹیبل رائس۔ سویرا نے بیگن کا رائس اور فروٹ سیلڈ بنایا تھا، جب اتنے مزے کا کھانا دیکھا تو دل نہ مانا کہ اکیلے کھالوں، آپ نے ابھی کھانا تو نہیں کھایا نا۔“

”نہیں، تمہارے آنے سے پہلے تک کھانے کا موڈ نہیں تھا لیکن اب لگتا ہے موڈ بن گیا ہے۔“ وہ ٹانگوں پر پڑا کبل ہٹاتے اٹھے۔

”اور یہ میرے آنے سے پہلے موڈ کیوں نہیں تھا؟“

”آج دوپہر میں خان صاحب کی طرف چلا گیا تھا اور تمہیں تو پتا ہے ان کا، وہ کھانے کے معاملے میں ذرا احتیاط نہیں برتتے، پھر کچھ باداموں کا حلوہ بھابھی نے اتنا اچھا بنایا تھا کہ میں ضرورت سے زیادہ ہی کھا گیا۔ اب طبیعت بھاری محسوس ہو رہی تھی، سوچا تھوڑا پرہیز کر لوں۔“ عزیزہ بھی آئی تھی کھانے کا پوچھنے۔ میں نے منع کر دیا۔

”اوہ۔۔۔۔۔ تو یہ کوئی اچھی بات نہیں، آپ سے کتنی بار کہا ہے اباجی! خان صاحب کی طرف جاتے ہیں تو خدارا کھانے پینے کے معاملے میں احتیاط برتا کریں۔ آئی تھنک اب مجھے پہلے آپ کی شوگر چیک کرنا ہوگی۔“ میٹم نے پریشانی سے کہتے ٹرے بیڈ پر رکھی اور سائنڈ ٹیبل کی دراز کھولی۔ اس کے ہاتھ میں گلو کو میٹر تھا جس سے ان کی جان جانی تھی۔

”اوہ نہیں۔۔۔۔۔ رکھو پرے اسے، نارمل ہے میری شوگر، کہہ تو رہا ہوں، کھائی ہے دوا بھی۔“

”اچھا اچھا“ اب کھانا کھاؤ، بھئی واہ کمال ہے بہت مزے کے کوفتے بنے ہیں۔“ انہوں نے مزید چچہ بھر کر ڈالا، میٹم نے ڈونگا اٹھا کر ان کی پہنچ سے دور کر دیا، اباجی نے اسے گھورا پھر دونوں دادا پوتا ہنس

دیے۔

”اور سناؤ، کیسی جارہی ہے تمہاری پڑھائی اور کوچنگ۔“

”اے دن، یہ سب آپ کی دعائیں۔۔۔۔۔“ ابھی بات اس کے منہ میں تھی کہ لاؤنج سے لی وی کا فل والیوم گونجنے لگا۔ کوئی انڈین سوپ تھا، وہی مشہور زمانہ ہولناک میوزک، ڈھانسیں ڈھانسیں ڈھشوں ڈھشوں۔۔۔۔۔ کان پھاڑتا، دل دہلاتا، اس نے کھانے سے ہاتھ روک کر سامنے والی دیوار کو یوں گھورا جیسے پار کا منظر سامنے ہو۔

”آف۔۔۔۔۔ اتنی آواز۔۔۔۔۔ کیا کان خراب ہو گئے ہیں جو اتنا والیوم کھول لیا ہے۔ ایسا پہلے تو کبھی نہیں ہوا اس گھر میں۔ اور یہ انڈین ڈراما دیکھ کون رہا ہے، حد ہے بد تمیزی کی۔“ وہ بری طرح تپ اٹھا۔

”کھانا کھاؤ یار! مت ہاپر ہوا کرو ایک دم، کوئی بات نہیں۔ بچیاں ہیں، کر لینے دو انجوائے۔ سارا دن میں ایک دو گھنٹے ہی تو ملتے ہیں انہیں بھی تفریح کے، پھر نینا بیٹی مہمان ہے اگر ہم بات بات پر ٹوکیں گے تو وہ کیا سوچے گی ہمارے بارے میں۔“ عزیزہ کا اس کے ساتھ دل لگا رہتا ہے ورنہ تو پتا ہے نا، کیسے بولائی بولائی سی پھرتی ہے وہ۔

”بولائی ہوئی تو پیدا کئی ہے آپ کی پوتی، یہ کوئی نیا قصہ نہیں اور میں بتا رہا ہوں میری برداشت سے باہر ہے یہ نینا نامی لڑکی۔ مجھے اس کا یہاں عزیزہ کے ساتھ رہنا بالکل اچھا نہیں لگ رہا۔ اب یہ آواز سن رہے ہیں نا آپ، یہ کوئی طریقہ ہے۔ عجیب مزاج کی ہے یہ لڑکی، ہر وقت فضول گوسپ، بے مقصد ہنسی ٹھٹھول۔۔۔۔۔ مجھے تو ڈر ہے اگر چار دن اور عزیزہ اس کے ساتھ رہی تو کہیں اسے بھی یہ جراثیم نہ لگ جائیں۔“ مارے طیش کے اس کا چہرہ لال ہو رہا تھا۔

”اونہوں۔۔۔۔۔ کسی کے لیے اتنے برے گمان نہیں رکھتے، اچھی بچی ہے وہ اور پھر اس عمر میں

بچوں کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔ ہنسی کھلکھلاتی خوش کن بہار جیسی۔ گھر کی رونق تو بیٹیوں کی چہکاروں سے ہی ہوتی ہے، ایک یہ میری پوتیاں ہیں۔ سچ پوچھو تو نینا بیٹی کو دیکھ کر مجھے احساس ہونے لگا ہے کہ میری دونوں پوتیاں دنیا سے زالی ہیں۔ ایک زمانے بھر کی پڑھا کو دوسری جی بھر کے سیدھی۔ اس بے چاری کو تو ہم سب نے ایسا پروں میں چھپا کر رکھا ہے کہ وہ تو سانس بھی پوچھ پوچھ کر لیتی ہے، اب اس کی سہیلیاں کیسی کھلکھلاتی پھرتی ہیں، ان سب کے درمیان اسے دیکھو تو لگتا نہیں کہ یہ ان ہی کی ہم عمر ہے۔ اپنے چہرے کی سنجیدگی کے باعث ان سب میں سمجھ دار لگتی ہے، میں تو کل اسے دیکھ کر پریشان ہی ہو گیا۔ میں نے تو کہہ دیا ہے نہ سب سے، وہ کوئی فکر نہ کرے۔ تین ماہ کا ویزا ہے اس کا، چاہے تو تین ماہ کا اور بڑھو الے، سہیل کو اس وقت ضرورت ہے اس کی، وہ رہے وہاں۔ خدمت کرے میاں کی، جب تک وہ بالکل صحت یاب نہیں ہو جاتا، وہ واپسی کا سوچے بھی مت۔ ارے بھئی اس عرصہ میں میری بچی بھی کچھ زندگی کے رنگ ڈھنگ سیکھ لے گی۔“

وہ مطمئن سے کہہ رہے تھے اور وہ متحیر سا نہیں تک رہا تھا یعنی جن پتوں پر تکیہ تھا وہی ہوا دینے لگے۔ اسے ان سے اس رویے کی امید نہیں تھی وہ چپ چاپ برتن سمیٹ کر اٹھ گیا۔

”عنیزہ سے سبز قہوہ کا کہتے جانا۔“ کمرے سے نکلے اس نے سنا تھا۔

لاؤنج میں جس طرح دم سادھے وہ میک اپ سے لتھڑے خزانہ چہرے والی اداکارہ کی ادائیں دیکھ رہی تھیں، اس نے اس کے اندر جلتی آج اور بڑھادی۔

”عنیزہ۔“ وہ پکارا نہیں بلکہ دھاڑا تھا۔

”جی۔“ وہ بے چاری صوفے سے یوں اچھلی گویا نیچے اسپرنگ نکل آئے ہوں رنگ فتن ہوا تھا۔ اس کے ماتھے کے بل ہمیشہ سے جان ہوا کر دیتے تھے اس کی۔

”ادھر آؤ۔“ حکم دیتا وہ کچن کی جانب جا چکا تھا، وہ فوراً اٹھی تھی، نینا نے ناگواری سے اسے جاتے دیکھا اور منہ ہی منہ میں کچھ بڑا کر رہ گئی۔

”جی۔“ وہ تابع دار ماتحت کی طرح سر جھکائے اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ میٹم نے سر تا پا دیکھا۔

”ابھی تمہاری اتنی عمر تو نہیں کہ آلہ سماعت کی ضرورت پڑنے لگے۔“

”جی ہاں۔“ وہ قطعاً نہیں سمجھی۔

”کیا جی..... جی کر رہی ہو، ادھر قریب ہی حکیم انبالوی کا مطب ہے، کل پہلی فرصت میں اپنی سہیلی کو ساتھ لے جا کر دونوں اپنے کانوں کی صفائی کرواؤ۔ غضب خدا کا، یہ آواز سن رہی ہوں، مجھے یقین ہے باقی محلہ بھی فیض یاب رہا ہوگا۔ کبھی اس سے پہلے اتنا شور ہوا ہے یہاں؟ کیا ہو گیا ہے تمہیں، ساری تمیز اور تہذیب بھولتی جا رہی ہو۔ ابا جی بیمار آدمی ہیں، کیا وہ ڈسٹرب نہیں ہو رہے ہوں گے، وہ مارے مروت کے کچھ نہ کہیں لیکن تمہیں اس بات کا احساس ہونا چاہیے۔“

”سوری..... میں ابھی جا کر والیوم کم کر دیتی ہوں۔“

”اور یہ چینل کون سا دیکھا جا رہا ہے، کیا دوسرے سارے چینل بلاک ہو چکے ہیں۔“ وہ پوچھ رہا تھا۔

”مم..... میں تو نہیں دیکھ رہی۔“ وہ صاف انکاری ہو گئی۔

”ہاں ابھی دیکھا تھا میں نے، تم تسبیح پڑھ رہی تھیں۔“ اس نے دانت کچکچائے، عنیزہ کی ٹھوڑی گردن میں جا بھسی۔

”وہ تمہاری مہمان ہے، اس گھر کے طور طریقے نہیں جانتی۔ اسے بتانا تمہارا فرض ہے۔ اسے اپنے انداز سے رکھو نہ کہ اس کے رنگ میں رنگ جاؤ۔ اگر چچی جان کی پریشانی کا خیال نہ ہوتا تو میں ضرور ان سے تمہاری شکایت لگاتا۔ انہیں بتاتا

کہ ان کی لاڈلی آج کل اپنی اسٹڈیز سے زیادہ فالتو۔ سرگرمیوں پر دھیان دے رہی ہے، میزبانیاں نبھانے میں لگی ہے۔ وہ تمہاری پڑھائی کی ذمہ داری مجھ پر ڈال کر گئی ہیں، آ کر مجھ سے ہی سوال کریں گی نا اور نیکسٹ ویک سے ٹیسٹ شروع ہیں تمہارے، کیسی تیاری ہے؟“ وہ پوچھ رہا تھا۔

”اچھی ہے۔“ وہ اپنے پیروں پر نظر جمائے ہوئے تھی۔

”ابا جی کے لیے اچھا سا سبز قہوہ بناؤ، وہ انتظار کر رہے ہیں۔“

وہ لمبا چوڑا ہدایت نامہ دے کر چلتا بنا، اس کے جانے کے بعد عنیزہ نے یوں سانس لیا تھا جیسے بند کمرے سے نکل کر کھلی فضا میں آئی ہو۔ اس کے ٹلنے سے جان میں جان آئی تھی، یہ کوئی آج کا قصہ نہیں تھا۔ وہ بچپن سے ہی یہی سب سہتی آرہی تھی۔ بہت چھوٹی سی تھی، اسے دھندلا سا یاد تھا، ماما اسے اسکول لے کر گئی تھیں اور وہ رورو کر ان کی ٹانگوں سے چپکی جا رہی تھی، قریب ہی کھڑا میٹم اسے بری طرح گھور رہا تھا کیونکہ کچھ فاصلے پر کھڑے اس کے کلاس فیلو اس تماشے سے محظوظ ہوتے خوب ہنس رہے تھے اور پھر اسے ایک دم غصہ آیا تھا۔

”آپ جائیں چچی جان! میں اسے اس کی کلاس میں چھوڑ آتا ہوں۔“ وہ اس کا بازو دبوچے ہوئے تھا۔

”ہاں، لے جاؤ، اس کی ٹیچر کے حوالے کرنا اور ہاں بریک میں بھی اس کی خبر لے لینا۔“ لہجہ کروا دینا اسے، چھٹی کے وقت بھی دھیان سے ساتھ لے کر اسکول سے نکلنا اور عنیزہ بیٹا! آپ بھی بھائی کا انتظار کرنا۔ اکیلے اسکول سے باہر مت آنا، سمجھیں۔“ چچی نے دونوں کو سمجھایا۔ ان کی سوچی گئی ذمہ داری اور اعتماد نے آٹھ سالہ میٹم کو ایک دم ہی ساٹھ سالہ کر دیا۔

”آپ بالکل فکر نہ کریں، میں ہوں نا۔ میں خیال رکھوں گا اس کا، چلو عنیزہ!“ اس کے رونے

چلانے کی پروا نہ کرتے ہوئے وہ کھینچتا اسکول کے اندر لے گیا، بریک میں بھی وہ اسٹیشنل خبر گیری کرتا۔

”سارا بچ ختم کرو، خبردار جو کسی اور بچے کو دیا۔ میں دیکھ رہا ہوں تمہیں، جب تک کھا نہیں لوگی میں جاؤں گا نہیں۔“ وہ سر پر مسلط رہتا، گھر آ کر بھی عنیزہ کا اس سے بچنا مشکل تھا۔ چچی نے اس کا ہوم ورک اسی کے ذمہ لگا دیا تھا، وہ گھر بھر کی لاڈلی تھی۔ کوئی ایسے پھول کی چھڑی سے بھی چھونے نہ دیتا، یہ ہی وجہ تھی وہ ان کے قابو میں نہ آئی، اک میٹم تھا جو پڑھنے بیٹھتا تو اس کا بیگ بھی اٹھالاتا۔

”آرام سے آ کر ہوم ورک کرو۔ نہیں تو میں کل ٹیچر سے کمپلین کروں گا تمہاری۔“ وہ اس کی کمزوری سے واقف تھا۔

ٹیچر کو مل صرف نام کی ہی کوئل تھی ورنہ بچوں کو کس طرح سدھارا جاتا ہے، یہ خوب اچھی طرح جانتی تھی وہ۔ عنیزہ کا بھی اس کے نام سے دم نکلتا تھا، وہ جھٹ سے آ کر بیٹھ جاتی۔

چچی کو میٹم پر پیار آتا جس نے انہیں بے فکر کر رکھا تھا اور پھر یہ سب لازم و ملزوم ہوتا گیا۔ کم عمری سے اس کے لیے بڑا بننے والا میٹم جیسے ہر معاملے میں اس کا بڑا بن بیٹھا۔ ہر ہر بات پر روک ٹوک، مین میکہ نکالنا تو جیسے فرض تھا اس پر۔ کیا کرنا ہے، کیا پڑھنا ہے، کہاں جانا ہے، ہر موقع پر اس کا مشورہ کیا بلکہ اسی کا کہا پورا ہونے لگا۔ کچھ اس کی تربیت ہی ایسی ہو گئی تھی کہ اس کے سامنے سب صلاحیتیں صفر بٹا صفر ہو جاتیں۔ وہ سارا اعتماد کھو بیٹھتی، وہ بھی کیا کرتی اس نے شروع سے رعب ہی ایسے جمار کھا تھا۔

اب بھی گم صم سی قہوہ بنا کر ابا جی کو دے آئی اور اس کی ہدایت کے مطابق لاؤنج میں بیٹھنے کے بجائے سیدھا کمرے کا رخ کیا، نینا اس کا انتظار کر کر کے ادھر آئی تو حیران رہ گئی۔

”تم یہاں ہو، میں اتنی دیر سے تمہارے انتظار میں سوکھ رہی ہوں میں کبھی تم ابھی تک ابا جی کے روم

میں ہو۔ بھی مجھ سے تو بزرگوں کے پاس زیادہ نہیں بیٹھا جاتا، عادت ہوئی ہے ان کی، یوں ہی سمجھتے کرنے لگتے ہیں۔ تمہارا ہی حوصلہ ہے جو اتنے سکون سے برداشت کر لیتی ہو۔ چلو دادا جان کی حد تک تو ٹھیک ہے لیکن یہ جو دادا گیر کے سامنے تمہاری بولتی بند ہوتی ہے نا، سچ میں بہت غصہ آتا ہے مجھے تم پر۔ یہ بھلا کوئی طریقہ ہے، اس وقت جس طرح تم اس کھڑوس کی ایک ہی آواز پر اٹھ کر گئیں نا تو پتا ہے مجھے کیا فیمل ہوا۔“ وہ بولتے بولتے رکی، وہ جو خود کو کتاب میں گم ظاہر کر رہی تھی، بے اختیار سر اٹھا کر دیکھنے لگی۔

”مجھے یوں لگا کہ جیسے وہ انتہائی سخت قسم کا شوہر ہے اور تم ایک مظلوم بیوی، ایمان سے یارا! بالکل ایسا ہی سین تھا۔“ نینا ہنس رہی تھی، عمیزہ نے سخت برا ماننے ہوئے ہاتھ میں پکڑی کتاب سے اس کے سر کا نشانہ لیا۔

”فالتو بگو اس بہت زیادہ آتی ہے تمہیں، بڑے بھائی ہیں وہ میرے۔“ اس کا چہرہ غصے سے دھک اٹھا تھا، نینا کی ہنسی مزید بڑھی، بہ مشکل کنٹرول کرتے ہوئے بولی۔

”ہاں ہاں، سارے کزنز پہلے بہن بھائی ہی ہوتے ہیں، وہ بھی تمہارے بھائی جان (جان پر خاص زور تھا) ہیں اور یہ ہی تو المیہ ہے ہمارے معاشرے کا، خاندان کے وہ بزرگ جو لڑکی کو بچپن سے تربیت دیتے ہیں کہ بڑا بھائی ہے، خبردار نام نہیں لینا، ادب کرو، بھائی جان اور جب لڑکی عادی ہو جاتی ہے تو وہ ہی لوگ اس ”جان“ کو پکڑ کر ”جانو“ بنا دیتے ہیں۔ تم بھی سچ کے رہنا، کہیں ایسا نہ ہو کہ.....“

اور اس کے رخساروں کی لانی گیر و برابر ہو گئی۔ غصے سے برا حال، اس سے پہلے کہ وہ کوئی اور انتقامی کارروائی کرتی کہ فون کی کھٹی نے دھیان بٹا دیا۔ دہی سے ماما کی کال تھی، جو ہمیشہ کی طرح اس کے لیے فکر مند ہو رہی تھیں اور ان کی تاکیدیں..... اف۔ تھیں نائیشم کی چچی، انہیں بھی بس اس کی پڑھائی

کی ٹینشن تھی، وہ جلد ہی بے زار ہو گئی۔

”بابا سے بات کرو امیں میری، اب ان کی طبیعت کیسی ہے؟“

اس نے اکتا کر کہا اس کے بابا دہی کی ایک آئل کمپنی میں کام کرتے تھے، وہ بہت چھوٹی تھی جب وہ اسے اور ماما کو بھی وہیں لے گئے تھے لیکن اسے وہاں کی فضا اس نہیں آئی تھی وہ اتنی بیمار پڑی کہ جان کے لالے پڑ گئے۔

”کہا بھی تھا مت لے کر جاؤ اسے، کھلے گھر میں رہنے کی عادی ہے بچی، یہاں سب کے ساتھ دل لگا ہوا ہے اس کا، وہاں کے بند کمروں میں لکھی رہتی ہے وہ، جہاں سارا دن ماں کے علاوہ اور کسی اپنے کی صورت نظر نہ آئے اسے۔“

وہ اپنی اماں جی کی لاڈورانی تھی وہ بھی اس کے بنا ادا اس ہو گئی تھیں۔ اس کی بیماری کی خبر سنی تو بیٹے کے خوب لتے لیے۔ اس کی حالت دیکھتے ہوئے انہوں نے بھی یہ ہی بہتر سمجھا کہ اسے واپس پاکستان بھیج دیں، اب سال میں ایک بار بابا یہاں کا چکر لگا لیتے اور ایک بار وہ اور ماما ان کے پاس چلی جاتیں۔

کچھ روز پہلے بابا کو اچانک انجانا کا ایک ہوا تھا، ماما تو اتنی بدحواس ہوئیں کہ اگلے ہی دن رخت سفر باندھ لیا، تب ماموں اس کی پریشانی کے خیال سے نینا کو یہاں چھوڑ گئے۔ ماما نے سنا تو وہ بھی مطمئن ہو گئیں۔ آج بہت دن بعد بابا کی آواز میں نقاہت نہیں تھی یہی وجہ ہے کہ وہ دیر تک ان سے بات کرتی رہی۔

☆☆☆

”ماشاء اللہ..... اتنا کیوٹ گڈا ہے مینو! سچی میرا دل کر رہا ہے میں ابھی اڑ کر اس کے پاس آ جاؤں اور ڈھیر ساری پاریاں کروں۔“ آج کل مینا نے اپنے بیٹے کی تصویریں واٹس ایپ کی تھیں، جنہیں دیکھتے ہی اس نے جھٹ کال ملائی، گل مینا اس کی دیوانگی پر ہنس رہی تھی۔

”مجھے اندازہ ہے، تم اس کے دیدار کے لیے لٹی بے چین ہو۔ بس تھوڑے دن کی بات ہے تم نوب پیار کرنا اسے، میں، زرمینا اور مورے آئیں گے کراچی۔“

”اچھا، گڈ..... میں پھر آج ہی سے تمہارا انتظار شروع کر دیتی ہوں۔“

”کرلو شروع، اجازت ہے اور سناؤ پڑھائی کیسی جارہی ہے تمہاری اور امتحان کب تک ہیں؟“ وہ پوچھ رہی تھی۔

”پڑھائی بہترین جارہی ہے اور بس اب انگریز میں کچھ ہی ٹائم رہ گیا ہے، تمہاری دعائیں چاہئیں۔“

”ہاں..... ہاں کیوں نہیں۔ بہت دعائیں تمہارے لیے۔ پوری توجہ سے اب اپنی پڑھائی کرو اور سنو زیادہ نیا جان کی طرف جانے کی ضرورت نہیں۔“

”کیوں؟“ اس نے گل مینا کی بات درمیان میں قطع کرتے ہوئے بے تانی سے پوچھا۔

”ارے میری جان! تمہیں پتا ہے ان کا، یوں ہی پکڑ کر کسی نہ کسی کام میں لگا دیتی ہیں۔ تمہارا یہ وقت بہت قیمتی ہے، تم بس اب سارا وقت اپنی اسٹڈیز کو دو۔“

وہ کہہ رہی تھی (جب کہ اسے دھڑکا کوئی اور تھا، نیا جان کی بے صبری طبیعت کا رتی بھر بھروسہ نہ تھا اسے۔ ان کے سر پر ان کی ایسی کی تیسری کہہ سکتی تھیں وہ، سو حفظ ماتقدم کے طور پر اسے ہدایات جاری کر رہی تھی) اور اس کا دل جیسے اس ہدایت پر غوطہ کھا گیا۔

”کیسی باتیں کر رہی ہو مینو! نیا جان کا کام کرنا تو مجھے اچھا لگتا ہے، اتنا پیار کرتی ہیں وہ مجھ سے، اسی بہانے میں انہیں دیکھ بھی لیتی ہوں اور پھر تم ہی نے وعدہ لیا تھا مجھ سے اور اب.....“

”ہاں نا اور اب میں ہی کہہ رہی ہوں، مجھے تمہاری پڑھائی کی بھی تو فکر ہے نا بھئی۔ امتحان ہو جائیں پھر چاہے ہمیشہ کے لیے ان کے پاس

جا کر انہیں دیکھتی رہنا۔ اچھا میرا جازل خان رو رہا ہے، پھر بات ہوگی۔“ گل مینا عجلت میں کہتی کال ڈراپ کر گئی۔

”تیرا بھلا ہو جائے مینو کی بچی، مشکل میں ہی ڈال دیا ہے مجھے۔ نیا جان کی طرف نہ جاؤں، ہائے اللہ.....“

فون بیڈ پر اچھال کر کھڑی ہوئی، سامنے ہی آئینے میں اپنے عکس سے نظر جاملی، جس کے چہرے پر صاف لکھا تھا کہ یہ امتحان تو اس امتحان سے بھی زیادہ مشکل ہوگا۔

☆☆☆

”انکل حامد کی کال آئی تھی، کہہ رہے تھے دین خراب ہو گئی ہے۔ اس لیے لینے نہیں آ سکوں گا۔“

”ہیں..... تو اب ہم جائیں گے کیسے؟“ وہ تو کب سے گیٹ کے پاس کھل رہی تھی، نینا کتابیں سنبھالتی اب اندر سے نکلی وہ بھی اس ہولناک خبر کے ساتھ۔

”کوئی مشکل نہیں، مین روڈ تک پیدل مارچ کرنا پڑے گا۔ آگے کوئی نہ کوئی بندوبست ہو جائے گا۔“ نینا بے فکر تھی۔

”ٹھہرو، میں اباجی سے کہتی ہوں وہ ہمارے ساتھ چلتے ہیں۔“ وہ سدا کی ڈرپوک، کبھی اکیلے باہر نکلی نہیں تھی، واپس اندر کی طرف کو مڑنے لگی کہ نینا نے بازو سے پکڑ کر روک لیا۔

”اوہ خدا کا واسطہ ہے عمیزہ سہیل! اب بڑی ہو جاؤ، یہ دو فرلانگ پر تو مین روڈ ہے، اس پر بھی تم اباجی کا سہارا لوگی۔ یعنی اتنی بڑی نینا مقصود نظر نہیں آرہی تمہیں اور اباجی جتنی دیر میں لاٹھی ٹککتے خراماں چلیں گے، تب تک تو آف ٹائم ہو جائے گا، چلو آگے چلو۔“ اس نے گیٹ کی جانب دھکیلا۔

”بڑوں کے لیے بولتے ہوئے بندہ تھوڑی سی احتیاط کر لیتا ہے، اباجی ہیں وہ میرے۔“ اسے برا لگا تھا۔

”اچھا جی۔ آئندہ دھیان رکھوں گی، ایک

آپ کے ابا جی ہیں اور ایک آپ کے بھائی جان..... ہے نا۔“ نینا کی آنکھوں میں شرارت ہلکورے لے رہی تھی، وہ گیٹ سے نکل آئی تھیں۔ عزیزہ بس اسے گھور کر رہ گئی، برابر کے گیٹ سے چمچائی کرولا باہر آ رہی تھی نینا نے اس کی کلائی دبوچی۔

”اُف..... یاز کیا ماسٹر پیس رہتا ہے تمہارے پڑوس میں۔ آؤ اس سے لفٹ لیتے ہیں۔“ اور وہ کچھ کہنے کی کوشش میں فقط پھڑپھڑا کر رہ گئی، اتنی نوبت ہی نہ آنے دی اس نے، چیختی ہوئی لے گئی۔

”پلیز پلیز..... اسٹاپ، آج ہماری دین نہیں آئی، ہمیں یونی تک ڈراپ کر دیں گے؟“ منصب نے بریک پر پاؤں رکھا، یونی اس کے سراسر مخالف روٹ پر تھی، وہ صفا چٹ انکار کر دیتا اس لڑکی کو اگر ساتھ میں عزیزہ نہ ہوتی۔ ایک تو وہ داجی کے پرانے دوست کی پونی تھی، دوسرے سویرا کی کزن، اس نے سر ہلا کر گاڑی کا پچھلا دروازہ ان لاک کر دیا۔

بہت تیز ہے ہیرو! نینا نے اس کے کان میں سرگوشی کی پھر منصب سے کہنے لگی۔

”عیزہ! تم آگے بیٹھ جاؤ، ہم دونوں پیچھے بیٹھیں گی تو لگے گایہ ہمارے شوفر ہیں۔“

اس کی بات پر منصب نے مسکراتے ہوئے اگلا دروازہ کھول دیا۔ اب وہ کیا کرتی، ویسے بھی کسی کے سامنے اس کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے۔ دل ہی دل میں اسے برا بھلا کہتے آگے سیٹ پر بیٹھنا پڑا۔

جب منصب ٹرن لے رہا تھا اس وقت میٹم بایک گیٹ سے نکال رہا تھا، سرسری نظر ڈالی تھی گاڑی پر، روز تو منصب اکیلا ہوتا ہے آج کوئی تھا اس کے ساتھ اور اگلے پل جھماکا سا ہوا، کوئی تھا نہیں بلکہ کوئی تھی اور وہ بھی عزیزہ.....

”ارے نہیں، مجھے یوں ہی مغالطہ ہوا ہے، وہ کیسے ہو سکتی ہے۔ وہ تو دین پر گئی ہوگی۔“ وہ سر جھٹک کر اپنی راہ ہولیا۔

یونی پہنچنے تک حسب روایات نینا کی زبان چلتی رہی تھی، منصب سے وہ ادھر ادھر کی ہانکتی رہی۔ منزل پر پہنچ کر زور و شور سے شکر یہ ادا کیا گیا، اس کے بعد سے عزیزہ کی شامت آگئی تھی، جواب وقت بے وقت منصب نامہ سننے پر مجبور تھی۔

☆☆☆

اس گھر کی پرانی روایت تھی کہ چھٹی کا دن سب ساتھ گزارتے تھے اور شروع ہی سے یہ روایت اوپری پورشن میں یعنی خلیل صاحب کی طرف لگا کر لی۔ اب سہیل تو نہیں تھے یہاں، بہت پہلے غم روزگار نہیں ان سب سے دور لے گیا تھا، ان کے پیچھے بھادج اور جیتی کا خیال رکھنا ان کی اخلاقی ذمہ داری بنتی تھی جس سے وہ بھی غافل نہ ہوئے تھے۔ عام دنوں میں سب کی اپنی اپنی مصروفیات ہوتی تھیں، اکثر ایک دوسرے کی خیریت پوچھنے کا وقت بھی نہ ہوتا، ابا جی بھی بار بار سیڑھیاں چڑھنے سے گریز کرتے، مگر اس دن صبح ناشتے سے لے کے رات کے کھانے تک کا وقت سب ادھر ہی ہوتے، یوں سب اک دو بے کے حال سے واقف بھی ہو جاتے اور دن بھی اچھا گزر جاتا۔

ابھی سب نے مل کر بہترین ناشتا کیا تھا، موسم کے تیور کچھ دنوں سے بہت تیزی کے ساتھ بدلے تھے۔ اچھی خاصی خشکی بھی فضا میں، ابا جی، خلیل صاحب اور یاسمین تو ہلکی نرم سی دھوپ میں ٹیرس پر جا بیٹھے، میٹم کے ایم بی اے کے فائنل سمسٹر بس چند دنوں میں شروع ہونے والے تھے۔ آج کل وہ کتابوں میں سر دیے پایا جاتا (اس لیے عزیزہ کی طرف راوی چین ہی چین لکھ رہا تھا) وہ اپنے کمرے کا رخ کر گیا تھا، ان لڑکیوں نے دسترخوان سمیٹا اور اب کچن میں کپیں لگا رہی تھیں، پلان ہو رہا تھا کہ چائے بنانے کے بعد کیرم کی بازی ہوگی، سویرا نے سب کے لیے چائے بنائی، عزیزہ نے کپ ترتیب سے رکھے۔

”یہ ٹرے ہوگئی ابا جی، ابو اور امی کی چائے کی۔“ کپ میٹم بھائی کا اور یہ ٹرے ہماری، اب یہ سروکون کرے گا۔“ سویرا بتانے کے بعد پوچھ رہی تھی۔

”لاؤ، یہ کپ میں دے آئی ہوں، باقی یہ تم دونوں پکڑ لو۔“ نینا نے ہاتھ بڑھایا۔

”ارے..... نہیں یہ کپ میں دے آتی ہوں، ابا جی، تانیا اور تانی جی کو تم چائے دے آؤ اور سویرا تم ہماری ٹرے لے کر لاؤج میں پہنچو۔ ہم بھی وہیں آ رہے ہیں۔“ عزیزہ نے نینا کا ہاتھ لگنے سے پہلے ہی کپ پکڑ لیا (وہ اچھی طرح جانتی تھی نینا تو جیسے چڑ ہے میٹم کی اگر وہ چائے دینے چلی جاتی تو شاید وہ سویرا کو تو کچھ نہ کہتا لیکن اس کی شامت ضرور لے آتا) نینا نے بھنویں اچکاتے ہوئے ٹرے تھام لی، تینوں آگے پیچھے کچن سے نکلیں۔

”لیس کم آن۔“ اس کی دستک کے جواب میں آواز آئی تھی، دروازہ ادھ کھلا ہی تھا جسے کچھ اور وا کرتی وہ دھیمے قدموں سے اندر چلی آئی۔ میٹم نے لیپ ٹاپ کی اسکرین سے نظریں ہٹا کر دیکھا، کھڑکی کے پردے برابر تھے۔ لائٹ بھی آف تھی صرف لیپ ٹاپ کی اسکرین روشن تھی جس کی وجہ سے کمرے میں ملجاسا اجالا پھیلا تھا۔ جس میں زرد اور سرخ رنگ کے لباس میں سہج چل کر آتی لڑکی نے یک دم اس ناکانی اچالے کو بڑھا کر دگنا کر دیا۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اور میٹم کی اک ہی زاویے پر ساکت۔ وقت کی نبضیں رک گئی تھیں، ہر شے جامد، بس اک عکس باقی تھا اور سب ہوا میں تحلیل۔

”چائے۔“ اس نے کپ ٹیبل پر رکھا، وہ گویا ہوش میں آیا، نظر اسکرین پر ٹکائی، وہ کپ رکھ کر پلٹ رہی تھی۔

”میں بڑی ہوں آج کل، میں نے نہیں پوچھا تو تم نے بھی بتانا ضروری نہیں سمجھا کہ اسٹڈیز کیسی جارہی ہیں تمہاری؟“ وہ خود کو سنبھال چکا تھا، وہ ان ہی قدموں پر ٹھہر گئی۔

”اچھی جارہی ہیں۔“

”میٹم کیسے ہوئے تھے؟“

”ٹھیک ہوئے تھے۔“

”میں مزید کچھ دن لے حد بڑی ہوں، تمہیں خود ہی اپنی اسٹڈیز پر توجہ دینا ہوگی لیکن یاد رہے جیسے ہی فراغت ملی۔ میں گزشتہ ساری رپورٹ لوں گام سے۔“ عزیزہ نے تالیخ داری سے سر ہلا دیا اور جانے لگی۔

”میں نے کہا جانے کو؟“ وہ بے قراری سے کہہ گیا، وہ وہیں بت بن گئی۔

”میرے بیڈ پر کتاب رکھی ہے، وہ لے کر آؤ۔“ اب روکنے کا کوئی توجہ جواز بنانا ہی تھا، اس نے فوری حکم کی تعمیل کی۔

”کمرے کی لائٹ آن کرو۔“ اگلا آؤر جاری ہوا، وہ بھی لپک کر پورا کیا۔

”چائے میں چینی کتنے چمچے ڈالی تھی؟“ روشن کمرہ، چمکتا چہرہ اور جگمگاتی نظر۔ اک الگ سوال اور شکر اس نے سویرا کو ڈالتے دیکھ لیا تھا، جھٹ بتایا۔

”ایک چمچ۔“

”زیادہ ہے، میرے لیے تازہ بنا کر لاؤ اور شوگر ہاف لی اسپون سے زیادہ نہ ڈالنا اور ہاں.....“ وہ جاتے جاتے رکی (یا اللہ اب کیا رہ گیا)۔

”کچن میں جانے سے پہلے کیا کام کرنا چاہیے؟“ اور وہ کچن میں جاتی تھی، کام بھی کرتی تھی لیکن اس پل ذہن بالکل خالی ہو گیا، پہلے کیا کرتے ہیں؟

”اُف.....“ وہ سوچ میں پڑی تھی۔

”کاش کہ دادی اماں زندہ ہوتیں، تو کچھ تو میرا بوجھ ہلکا ہوتا۔ ہر کام سے پہلے مجھے ان کی اس نالائق پونی کی دادی اماں بننا پڑتا ہے۔ بے وقوف لڑکی آئندہ یاد رکھنا، کچن میں جانے سے پہلے کھلے بال باندھ لیتے ہیں، آئی سمجھ۔ اب جاؤ فوراً، چائے لے کر آؤ۔ تمہاری یہ کم عقلی سر میں درد کر دیتی ہے میرے۔“ وہ جانے گیوں جھنجھلا سا گیا تھا، وہ اس

سے زیادہ تملاتی ہوئی کمرے سے نکلی۔
”پتا نہیں کیا مصیبت ہے، جتنی بھی کوشش کرلوں، ان کے عتاب سے نہیں بچ سکتی۔ اب اتنا کس کر تو دوپٹا لے رکھا ہے لیکن پھر بھی جان گئے کہ بال کھلے ہیں میرے، بالکل چیل کی نظر پائی ہے، تو بہ ہے۔“

”تمہاری چائے پڑے پڑے ٹھنڈی ہوگئی، ہم الگ انتظار میں سوکھ رہے ہیں اور تم چائے پلا کر آئی ہو جبکہ تمہیں صرف چائے دینے کے لیے بھیجا تھا۔“ نینا نے بغور اس کے سرخ پڑتے عارض دیکھتے تبصرہ کیا، وہ چپ چاپ گزرنے لگی۔

”ارے اب کچن میں کیوں جا رہی ہو، یہیں رکھ دو کپ، پھر سمیٹ لیں گے سارے برتن۔ آ جاؤ اب گیم شروع کرتے ہیں۔“ سویرا بولی۔

”اس کپ میں میٹھا زیادہ ہے، چائے بنانی ہے مجھے۔ تم لوگ کھیلو، میں آتی ہوں ابھی۔“

”ارے بھائی بھی حد کرتے ہیں، کب میٹھا زیادہ ہے، ایک چمچ تو ڈالا تھا میں نے۔“ سویرا جھنجھلائی۔ عزیزہ کچن میں جا چکی تھی۔ نینا نے گویا لفظ چبائے۔

”آج شوگر ہائی ہوگئی نا، اس لیے میٹھا زیادہ لگا ہوگا۔“

”شوگر ہائی..... اللہ رحم کرے، ایسا تو کوئی مسئلہ نہیں۔ بس بھائی بھی نا، اچھا چلو عزیزہ کے آنے تک ہم ایک گیم کھیل لیتے ہیں۔“ اب اس کے سامنے وہ بھائی کی شان میں کیا بیان دیتی، سر جھٹک کر گولیوں کو ترتیب دینے لگی۔ کچھ دیر میں عزیزہ بھی آ ملی۔ وہ دونوں محتاط ہی تھیں لیکن میٹم بھنایا ہوا باہر آیا تھا۔

”یہ کیا ہو رہا ہے، آرام سے نہیں کھیلا جاسکتا۔ عزیزہ! تمہیں معلوم ہے میں اندر کیا کر رہا ہوں، پھر بھی طوفان بدتمیزی مچا رکھا ہے۔ حد ہوتی ہے کسی بات کی، اگر آرام سے نہیں کھیل سکتے تم لوگ، تو نیچے چلے جاؤ، اب مجھے آواز نہ آئے کسی کی۔“

یعنی وہ واشگاف الفاظ میں انہیں وہاں سے نکل جانے کا اشارہ دے گیا تھا۔

نینا نے تو اتنا برا مانا کہ سب چھوڑ چھاڑ سیڑھیوں کی جانب لپکی۔ ”ارے ارے“ کرنی سویرا اس کے پیچھے..... اور دھواں تو اس کے اندر بھی بھر گیا تھا۔ مانا کہ ان کی آواز اونچی ہوگئی ہوگی، وہ ڈسٹرب ہوا ہوگا لیکن یہی بات وہ ان سے آرام سے بھی تو کہہ سکتا تھا۔ ضروری ہے کہ وہ اس لہجے میں ہی بولے۔ چلو ان کا نہیں تو کم از کم مہمان کا ہی خیال کر لیتا۔

نینا تو پہلے ہی سہیلیوں میں اسے ہٹلر کا بچہ مشہور کر چکی تھی اور اس واقعے کے بعد تو کچھ شک نہیں ہٹلر کا باپ ہی بنا دے۔ اس کا کچھ نہیں جانتا۔ سبکی تو اسے ہی اٹھانا پڑتی نا۔ اب تو عجیب عجیب مذاق کرنے لگی تھیں وہ سب، صرف اس کے رویے کی وجہ سے۔

گوٹیاں اک دو جے سے چھین جھپٹ کرتے کب دوپٹا سر سے گلے میں آ گیا، پتا ہی نہ چلا۔ وہ بے دھیان سی، سیڑھیوں کی طرف رخ کر گئی۔ میٹم ابھی کمرے کے دروازے میں ہی کھڑا تھا۔ اس کے لانے بال پشت پر بکھرے تھے، جسے دیکھ کر غصہ دوچند ہوا۔ وہ پھر کچھ کہنے آ رہا تھا کہ اسے ہتھیلی سے گال پونچھتے دیکھ کر وہیں ٹھہر گیا۔ ہاتھ میں کتاب تھی، جسے اپنے سر پر مار کر طیش اتارا گیا۔ اب وہ ڈھنگ سے کچھ نہیں پڑھ سکے گا یہ تو طے تھا۔

☆☆☆

پہلے لاؤنج کے منقش دروازے کو بند کیا گیا پھر پردے برابر کر دیے گئے۔ اس کے بعد بی وی کی آواز تیز کی اور دھپ سے اس کے پاس آ بیٹھی۔

”یہ تمہارا گھر ہے، تم یہاں جیسے مرضی چاہے رہو۔ کسی مانی کے لال کی ہمت نہیں ہونی چاہیے تمہیں کچھ کہے۔ اگر کسی کو تکلیف ہے تو وہ دروازہ پار کر کے دکھائے۔ یہ سب تمہاری اس دبو فطرت کا

تصور ہے اور اس سے بڑھ کر پھپھو کی تربیت اور سلوک کا، جو وہ تمہارے ساتھ روا رکھے ہوئی ہیں۔ شروع سے انہوں نے اس بھوتنے کو تمہارے سر پر کسی اود بلاؤ کی طرح مسلط کیے رکھا اور جتنا وہ اسے تم پر فوقیت دیتی ہیں، سچ پوچھو تو مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہ اس فتنہ مزاج آدمی کو ساری زندگی کے لیے تمہارے ساتھ تھی نہ کر دیں۔“

نینا اس کے زانو پر ہاتھ رکھے کہہ رہی تھی۔ وہ سر جھکائے سن رہی تھی کہ اس بات پر جھٹکے سے گردن اٹھائی۔ (دل دھک دھک کرنے لگا تھا۔ دھڑک تو پہلے بھی رہا تھا مگر بے آواز۔ اب کچھ بول رہا تھا مگر کیا؟ یہ وہ خود سمجھنے سے قاصر تھی۔)

”اور کچھ خبر ہے تمہیں، سویرا کا رشتہ آیا ہے۔ اس کے اٹلی والے ماموں کے بیٹے کا۔“

”ہیں کب؟ اور تمہیں کیسے پتا، کیا سویرا نے بتایا؟“ وہ ایک لمحہ قبل کی کیفیت بھول بھال سیدھی ہو بیٹھی۔ نینا نے ناک چڑھائی۔

”سویرا کیا بتائی بھلا مجھے، میں نے خود سنا ہے۔ صبح جب سب کے لیے چائے لے کر گئی تو تمہاری تائی امی، اباجی سے مشورہ مانگ رہی تھیں۔“ ”ہیں..... اور تم نے اسی وقت آ کر ہمیں کیوں نہیں بتایا۔ تم کیسے ہضم کر گئیں ایسی خوشی کی بات۔ یا ر اسی وقت بتائیں، ہم مل کر سویرا کو تنگ کرتے۔“

”ہونہہ..... تنگ کرتے، چھوڑو پرے۔“ نینا نے الٹا ہاتھ مارا۔

”اور کس بات کی خوشی؟ تم رہنا۔ سدا بے وقوف۔ تمہیں کیا ضرورت ہے لڑیاں ڈالنے کی، میں تو صبح سے اس فکر میں پڑی ہوں اگر تو سویرا بیاہ کر اٹلی چلی گئی تو پیچھے تمہارا کیا بنے گا؟“

”کیا مطلب؟“ عزیزہ نے الجھ کر اسے دیکھا، اس کی بات سر سے گزر گئی تھی۔

”مطلب یہ میری بھولی سہیلی کہ وہ تو ایک

اچھے ماحول، اچھے ملک، اچھے لڑکے سے بیاہ دی جائے گی۔ پیچھے رہ جائے گا تمہارے پاس یہ جذباتی خاندان اور سب سے بڑھ کر اباجی، جنہیں تم سے کچھ زیادہ ہی پیار ہے اور یقیناً اکلوتا پوتا بھی انہیں بے حد عزیز ہوگا۔ تو سوچو ایک پونی کے جانے کے بعد وہ ہر گز نہیں چاہیں گے کہ دوسری بھی ان سے دور چلی جائے۔ وہ ضرور اسے اپنے پاس ہی رکھیں گے، تم لکھ کر رکھ لو میری یہ بات۔ سویرا کا رشتہ طے ہوتے ہی تمہاری شامت بھی آنے والی ہے اور میرا مشورہ ہے کہ اس جنگجو سے شادی کرنے کی بجائے تو سو سائیڈ کر لو تو بہتر ہے ورنہ دوسری صورت میں بھی وہ کوہ قاف کا دیو تمہارے خون کا آخری قطرہ بھی نچوڑ کر پی جائے گا۔

مجھے تو کوئی سائنکی پرابلم لگتا ہے اس کے ساتھ، اس قدر بدتمیز اور بے حس انسان ہے وہ، ہمیشہ تمہاری عزت نفس پر حملہ کرتا ہے اور مجھے تو تم پر حیرت ہے، کیسے چپ چاپ سہہ جاتی ہو۔ تم سے میرا اگر کوئی ایسا کزن ہوتا اور مجھ سے ایسا سلوک کرتا تو میں تو اک منٹ سے پہلے اس کی گردن دبا دیتی۔ اب بھی وقت ہے، تھوڑی سی سمجھ دار ہو جاؤ، اگر زندہ رہنا چاہتی ہو تو.....“ نینا جوش جذبات میں میٹم کو بے شمار القابات سے نوازیں بولے چلی گئی۔

”پتا نہیں کیا ہو گیا ہے تمہیں، کیا انٹ شدٹ بک رہی ہو۔“ عزیزہ کے رخسار تپ اٹھے۔

”تم کو تو انٹ شدٹ بکنے کا موقع بھی نہیں ملے گا بیٹا جی! جب اس سائیکو کے پلے بندھ جاؤ گی، جو آج تمہاری عزت نہیں کرتا۔ بات بات پر جھاڑ کر رکھ دیتا ہے، سوچو اگر اس کے ساتھ شرعی رشتہ بن گیا تو کیا حال کرے گا تمہارا۔“

نینا نے اسے ڈرانے میں کوئی کسر نہ چھوڑنے کا تہیہ کر لیا تھا گویا وہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ بروقت بہانہ بھی سو جھ گیا۔

”میں دیکھوں ذرا، پتا نہیں اباجی نے دوالی

انہیں صورت حال سمجھائی لیکن وہ جو پہلے داجی کے ساتھ چپک رہے تھے اب بالکل چپ سے ہو گئے۔ یقیناً انہیں ان کا اس وقت گھر سے باہر جانا اچھا نہیں لگا تھا۔

”جب تک بارش رکتی ہے تب تک آپ نیا جان کے ساتھ گپ شپ لگائیں۔“ منصب کے کہتے ہی انہوں نے اندر کی جانب رخ کیا تھا، نیا جان انہیں دیکھ کر بے حد خوش ہوئیں۔ گلے لگا کر ماتھا چوما۔

”شکر ہے بچے! آج تم نے بھی شکل دکھایا، اپنے بابا کی بتاؤ اب کیسی صحت ہے۔ ماں کب آئے گا تمہارا، ارے اداس ہو جانی ہوگی، آجایا کرو بھی میرے پاس اور وہ سویرا کدھر مصروف ہوتا ہے بڑے دن ہوئے اس نے بھی چکر نہیں لگایا۔ صورت کو ترس گئی اس کے، میرے تو سارے پرندے بھی اداس ہو گئے اس کے بنا، جب کا ہم گلگت سے آیا ہے اس کے بعد اس نے چکر ہی نہیں لگایا۔“ نیا جان عادتاً ایک ہی سانس میں کہتی چلی گئیں۔

نینا نے اسے جتلاتی نگاہ سے دیکھا، جتنی دیر وہ وہاں بیٹھیں ان کی ہر بات میں سویرا کا ذکر ضرور تھا،

”اپنے داجی کا ہی ڈرائی فروٹ کا کاروبار سنبھالتے ہیں داجی تو بہت عرصے سے یہاں رہ رہے ہیں۔ منصب بھائی اور نیا جان کو کچھ ہی عرصہ ہوا ہے یہاں آئے، وہ بھی داجی بیمار رہنے لگے تھے، تب منصب بھائی کی تعلیم بھی مکمل ہو گئی تھی، تو گلگت سے یہاں آ گئے۔ سنا ہے وہاں بھی ان کا وسیع کاروبار ہے، جو وہاں ان کے بابا سنبھالتے ہیں۔“ عزیزہ کو جتنی معلومات تھیں، اس کے گوش گزار کیں نینا نے آنکھیں پھیلاتے سر ہلایا۔

”یعنی ٹکڑی آسامی ہے، موصوف صرف صورت کے ہی شہزادے نہیں، نصیب کے بھی شہزادے ہیں اور یہ کیا تم ہر کسی کو بھائی بھائی پکارنے لگتی ہو۔ اگر پچھو نے تمہارے لیے بھائی کا انتظام نہیں کیا تھا تو اب کیا تم سارے زمانے سے بدلہ لو گی۔“ نینا نے فوراً نوس لیا۔

”تم سے تو بات کرنا ہی فضول ہے۔“ عزیزہ تپ اٹھی۔

”لڑکی! اب بھی وقت ہے، عقل کرو تو تھوڑی سی، ورنہ پچھتانے کا موقع بھی نہیں ملے گا۔ ایسا ہیرو میرے پڑوس میں ہوتا تو کب کا ہتھیا چکی ہوتی اور تم اب تک ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی ہو۔ کمال ہے یار!“ نینا کہاں باز آنے والی تھی۔ اسے ہی کان لپیٹنے پڑے۔ شکر ہے منصب نے زیادہ وقت نہیں لگایا تھا، اب اس کی تو جان چھوٹ گئی لیکن وہ بے چارہ قابو میں آ گیا اس کی بے سرو پا باتوں کا بڑے محل سے سارے راستے جواب دیتا رہا۔ بارش اب تڑا تڑا برس رہی تھی، منصب گاڑی اپنے کھلے گیٹ سے اندر لے گیا۔ سامنے ہی کوریڈور کے شیڈ تلے داجی اور اباجی شطرنج کی بازی جمائے بیٹھے تھے، پاس ہی لوازمات سے بھری ٹرائی پڑی تھی۔

”ہائے اللہ اباجی.....“ عزیزہ کا تو انہیں دیکھتے ہی رنگ فق ہو گیا، کچھ ایسی ہی حالت ان کی بھی ہوئی ان دونوں کو گاڑی سے اترتا دیکھ کر۔ وہ تو نینا نے

موقع جانے دے آیا تو ہو نہیں سکتا تھا۔ وہ اسے فقط کڑے تیوروں سے گھور کر رہ گئی۔ اور وہ تو شاید اگلے کئی گھنٹے موسم انجوائے کر سکتی تھی مگر اس کی حالت دیکھتے ہوئے اٹھنا پڑا۔ کن من اب بھی ہو رہی تھی۔ وہ بچتی بچاتی ایک شیڈ تلے آ کھڑی ہوئیں کہ نینا کی نظر سامنے تیزی سے آتے منصب زمان پر پڑی۔

”ارے وہ دیکھو ہینڈسم پڑوسی! اسے کہتے ہیں غیبی امداد، تم خواہ مخواہ پریشان ہو رہی تھیں، چلو آؤ۔“ نینا نے اس کی کلائی پکڑی اور پھینکتی ہوئی اس طرف ہوئی۔

”ہیلو..... ہیلو!“ اس کی پکار پر وہ پلٹا اور ان دونوں کو دیکھ کر بے اختیار رک گیا۔

”ارے اتنی بارش میں آپ لوگ ادھر کیا کر رہی ہیں؟“ ”بس کچھ ضروری شاپنگ کے لیے نکلے تھے تب اندازہ نہیں تھا کہ موسم ایک دم سے اتنا خراب ہو جائے گا۔ اچھا ہوا آپ مل گئے، ورنہ تو ایسے وقت میں ٹیکسی والے چار چکروں کا کرایہ مانگ لیتے ہیں، سچ میں اب تو پرس میں اتنے پیسے بھی نہیں بچے تھے کہ ہم.....“

”یہ لیں چابی، آپ گاڑی میں بیٹھیں، میں بس دو چار منٹ میں آتا ہوں۔“ نینا کا ارادہ تو داستان امیر حمزہ سنانے کا تھا شاید، اس نے جھٹ سے چابی نکال کر ان کے حوالے کی اور اندر بڑھ گیا۔

”واہ بھئی، بڑا دیا لو آدمی ہے۔ کتنے آرام سے چابی پکڑادی، ہائے کاش مجھے ڈرائیونگ آتی تو میں اس کی شان دار گاڑی لے کر فرار ہو جاتی۔“ کار کا دروازہ کھولتے ہوئے وہ حسرت بھرے لہجے میں کہہ رہی تھی، عزیزہ نے پچھلا دروازہ کھولا۔

”ویسے کیا ہیں موصوف؟ ٹھٹھاٹ باٹ تو بڑے زبردست ہیں جناب کے۔“ نینا گاڑی کا اندر سے جائزہ لے رہی تھی۔

”ہے یا نہیں۔“ ”سمجھ داری کی اگر کوئی دوا ملے تو چٹکی بھر خود بھی پھانک لینا۔“ نینا نے پیچھے سے ہانک لگائی تھی، وہ ان سنی کر گئی۔

☆☆☆

”دھت تیرے کی، ارے کل تو تانیہ کی برتھ ڈے ہے۔ یاد ہے اس نے میری برتھ ڈے پر سر پر انز پاری دی تھی، آف..... اگر اب میں نے اسے کوئی تحفہ نہ دیا تو وہ خفا ہو جائے گی۔“ نینا کو بیٹھے بیٹھے اچانک یاد آیا تھا اور اس نے مارکیٹ جانے کی رٹ لگا دی تھی۔

اباجی گھر پر نہیں تھے اس نے بڑی رد و کد کی لیکن وہ نینا ہی کیا جو بات سے پھر جائے۔ وہ بھاگ کر تائی امی کو بتا کر ان سے اجازت بھی لے آئی۔ گھر سے نکلتے ہوئے اندازہ بھی نہیں تھا کہ ہلکے ہلکے بادل اگلے ایک گھنٹے میں سرمئی سے سیاہ ہو جائیں گے۔ جب تک وہ مطلوبہ خریداری کر کے مال سے باہر نکلیں، رجم جھم شروع ہو چکی تھی۔

”اودہ یہ کیا..... اب گھر کیسے جائیں گے۔“ عزیزہ کے حواس اڑنے کو تھے۔

”گھر کون سا اتنا دور ہے، چلے جائیں گے۔ تم موسم دیکھو کتنا زبردست ہو گیا ہے۔ آؤ آؤ کس کریم کھاتے ہیں تب تک بارش بھی رک جائے گی۔“ نینا پھر اندر مڑ گئی، چارونا چاراسے بھی پیچھے جانا پڑا لیکن پریشانی ایسی تھی کہ آؤ کس کریم بھی اچھی نہیں لگ رہی تھی۔

”ارے کچھ نہیں ہوتا، بہ حفاظت گھر واپس لے جاؤں گی تمہیں، گھر آؤ مت میری بے بی۔ تسلی رکھو۔ میں ہوں نا تمہارے ساتھ۔ ویسے اللہ بھلا کرے ان لوگوں کا جنہوں نے بالکل ہی ”کاک“ بنا کر رکھ دیا ہے تمہیں۔ اتنا بڑا قد جانے کیسے نکال لیا تم نے، اگر ان لوگوں کا بس چلتا تو تمہیں کسی ڈبے میں بیک کر کے رکھتے۔“ نینا اور اسے سنانے کا کوئی

حساب دل رہے دو



نیلہ عزیز

قیمت - 400 روپے

منگوانے کا پتہ

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

فون نمبر

32735021

وہ تو چڑ کر کہہ ہی گئی۔

”سویرا نے آپ کو بتایا نہیں اس کا رشتہ طے ہو گیا ہے اہلی والے ماموں کی طرف۔“ اور انہیں اگلی بات بھول گئی۔

”ہو سکتا ہے اب وہ اپنے جہیز کی تیاری میں مشغول ہو گئی ہو، اس لیے آپ کے پاس آنے کا ٹائم نہ ملتا ہو۔ ویسے آپ کا پیغام دیے دیں گے ہم اسے۔“ اس نے نیا جان کو تسلی دی تھی لیکن ان کے چہرے کا بدلا رنگ بھی ان سے مخفی نہ رہا تھا۔ بارش رک گئی تھی۔ اباجی کے ساتھ گھر آئیں تو یاسمین ہل رہی تھیں۔

”ارے کہاں رہ گئی تھیں لڑکیو! میرا تو مارے پریشانی کے دم نکل رہا تھا۔“

”بہو! آئندہ وقت اور موسم دیکھ کر بچیوں کو کہیں جانے کی اجازت دینا۔“

اباجی سنجیدگی سے کہتے ہوئے آگے بڑھ گئے اور ہکا بکا سی یاسمین یہ بھی نہ کہہ سکیں کہ ان سے اجازت لی کس نے تھی۔ انہیں تو بس بتایا گیا تھا۔ اسی وقت باہر سے آتے میثم نے انہیں وہاں بت بنے دیکھا تو وجہ پوچھی اور وہ مارے غصے کے سب کہہ گئیں مگر پھر کہہ کر پچھتائیں کیونکہ یہ مشکل تمام اسے قابو کیا ورنہ وہ تو اسی وقت ان دونوں کی طبیعت صاف کرنے کے موڈ میں تھا۔

☆☆☆

”کیا بات ہے آپ نے رات کھانا بھی ٹھیک سے نہیں کھایا، اب ناشتے کے لیے بھی نہیں آئیں؟“ منصب کف کے بن بند کرتا آ رہا تھا۔

”کچھ نہیں بس ویسے ہی طبیعت کچھ سست ہو رہی تھی، تم تیار ہو گئے خیر سے، ماشاء اللہ..... اللہ نظر بد سے بچائے۔“

وہ ان کے پاس ہی بیڈ کے کنارے پرٹک گیا، انہوں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر محبت سے چوم لیا۔

انہیں اپنا یہ بچہ سب بچوں سے زیادہ پیارا تھا اور اس کی خوشیوں کی تو وہ کب سے منتظر تھیں۔ خاندان کی کئی لڑکیاں ان کے دھیان میں تھیں لیکن جب گل اور زرینا نے سویرا کے لیے اس کی مرضی بتائی تو وہ اسی پر خوش ہو گئیں، اس کی اپنی ماں تو تھی نہیں، بہت چھوٹا سا تھا جب وہ آنکھیں موند گئی تھی۔ ان کے بیٹے کو تو پھر دوسری بیوی مل گئی اور اولاد بھی لیکن وہ اس کی نیا (دادی) بھی تھیں اور ماں بھی۔ وہ شروع سے ہی ان کے بے حد قریب رہا تھا۔ اس کی خوشی میں ہی ان کا سکون تھا لیکن رات نینا سے جو سنا ان کا سب سکون ختم ہو گیا تھا۔ انہیں اس لمحے سے خوف آ رہا تھا جب منصب کو یہ خبر ملے گی، کیا وہ دیکھ سکیں گی اس کی آنکھوں کی بچھتی جوت، اس کی دل فریب مسکراہٹ کی موت نہیں..... یہ سب سوچ کر ہی ان کے دل پر آ رہے چل رہے تھے۔

”نیا جان!“ وہ گم صم سی تھیں۔ منصب نے شانہ ہلایا۔

”کیا ہوا ہے، کیا سوچ رہی ہیں۔ اگر طبیعت زیادہ خراب ہے تو میں ابھی ڈاکٹر قریشی کو لے آتا ہوں۔“ وہ ان کی چپ سے فکر مند ہوا۔

”نہیں..... ڈاکٹر کی ضرورت نہیں، بس ویسے ہی طبیعت کچھ اداس ہے۔ تم ایسا کرو گل مینے سے میری بات کرواؤ، کتنے دن ہو گئے۔ اس کے شہزادے کی خیر خیریت نہیں پوچھی۔“ اور منصب نے فوراً نمبر ملایا۔

”اچھا پھر زرینا مینے سے بات کروادو۔“ اور دوسرا نمبر ملا کر سیل انہیں دے دیا۔

”تم جاؤ، ناشتہ کرو، میں ٹھہر کے کرلوں گی ناشتا۔ جب بھوک لگے گی، میری فکر نہ کر میرا بچہ! میں ٹھیک ہوں بالکل۔“ اور وہ سر ہلا کر باہر کوچل دیا، سمجھ گیا کہ وہ اس کے سامنے بات نہیں کرنا چاہ رہی اور ایسی کیا بات ہے، فطری تجسس تو تھا ہی جس نے باہر ہی قدم جکڑ لیے، وہ زرینا کے لتے لے رہی تھیں۔

”مجھے منع کیا کہ سویرا سے کوئی بات نہ کروں،

بہت شوق تھا تم لوگ کا۔ وہ دینا ہے سب..... سبرائی.....“ انہیں غصے میں لفظ بھول گیا، زرینا نے جھٹ مشکل آسان کی۔

”اوئے ہاں..... وہی وہی..... کم بخت جو بھی ہوتا ہے۔ کتنا اچھا ہوتا جو میں اس بچی کے کان میں بات ڈال دیتی یا اس کی ماں سے جا کر رشتہ مانگ لیتی، پر تم دونوں نے روکا مجھے۔ آگ لگے تم لوگ کے سر ہلاؤ، آؤ اب دو کرو۔ سویرا کا رشتہ بکا کر دیا اس کی ماں نے بھائی کے گھر۔“ ان کا لہجہ بھیگ گیا تھا۔ زرینا کو دھچکا لگا اور جو اس پر ہنسی.....؟ بس ایسا ہی لگا تھا کہ جیسے کسی سرسبز کھیت میں آگ لگی ہو، دھواں ہی دھواں بھر گیا تھا ہر طرف۔ وہ کھڑے کھڑے ریت کا بت بن گیا۔

☆☆☆

”آہا..... بڑے مزے مزے کی خوشبوئیں آ رہی ہیں، کیا بنایا ہے آج۔“ وہ دور سے ہی لمبا سانس پھینکتی، بچن میں آئی تھی۔

”تمہارا فیورٹ مچھلی پلاؤ بنایا ہے ودریشی کباب۔“ یاسمین سلاد کی ڈش کو آخری سچ دے رہی تھیں۔

”ارے واہ..... چہر تو مزا آ گیا، ویسے خیال کس طرح آ گیا آپ کو میری پسند کا۔ ہمیشہ اپنے بیٹے کی، میاں کی فرمائش پوری کرتی رہی ہیں آپ تو۔“ وہ جوش میں کہہ گئی تھی پھر انہیں ادھر ادھر کوئی چیز تلاش دیکھ کر ہاتھ اٹھا دیے۔

”اولاد ہوئی ہی ناشکری ہے، ماں اپنا کلیجہ بھی کھلا دے پھر بھی انہیں کمی ہی لگتی ہے۔ سب کی پسند کا خیال رکھتی ہوں اور تمہاری کوئی فرمائش کب ٹالی ہے میں نے؟ ابھی ایک دو دن پہلے تم نے تذکرہ کیا تھا اور آج میں نے بنالیا اور پھر بھی میری لاڈلہ شکوہ کر رہی ہے۔“ انہیں تو غصہ ہی آ گیا۔

”اوہ مائی سویٹ مام! لو یو سوچ۔“ اس نے ہنستے ہوئے ان کے گلے میں بازو جھانک لیے۔

”ارے پرے ہٹو، یہ ڈرامے بازیاں کسی اور

ماں کے ساتھ جا کے کرنا۔“

”ہائیں..... کسی اور کون سی ماں..... کیا آپ کے علاوہ بھی کوئی ہے؟ ابو نے بھی بتایا ہی نہیں۔“ اس کی حیرت دو چند تھی، اس بار یاسمین نے سچ میں سچ اٹھالیا۔

”تو بہ ہے تم لوگوں سے، بات ہی پکڑ لیتے ہو اور میثم کو دیکھو، آ گیا ہے، تو میں کھانا لگاؤں۔“

”آپ کرتی رہے گا بھائی کا انتظار، پہلے مجھے کھانا دے دیں، بہت بھوک لگی ہے پھر میں کچھ دیر ریٹ کروں گی۔ اس کے بعد کل کے ٹیسٹ کی تیاری کرنا ہے۔“ وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی تو انہیں اس کے لیے کھانا لگانا پڑا اور وہ بڑی رغبت سے کھا رہی تھی، جب انہیں یاد آیا تھا۔

”کھانا کھا لو تو پھر ذرا نیا جان کی خیر خبر تو لے کر آؤ۔ فیروزہ (کام والی) آئی تھی، وہ بتا رہی تھی ان کی طبیعت کچھ اچھی نہیں۔ کل سے منہ سر لیٹے پڑی ہیں، اب میثم اور تمہارے ابو کا کچھ پتا نہیں کس وقت آ جائیں۔ میں نہیں جاسکتی، تم چلی جاؤ اور مچھلی پلاؤ انہیں بھی بہت مرغوب ہے، ہو سکتا ہے یہی شوق سے کھالیں۔ ایک تو ہو اور پوتیاں ان کی اتنی دور ہیں، جلدی کوئی پاس۔ آ بھی نہیں سکتا، بھلا کام والیاں اس طرح کیئر کر سکتی ہیں۔ بوڑھی جان ہیں، مجھے تو فکر لگ گئی سن کر۔“ وہ پریشان ہو رہی تھیں۔

سویرا کے حلق میں نوالہ اٹک گیا۔ کتنے دن ہوئے جب گل مینا سے بات ہوئی، وہ ادھر جا ہی نہ سکی۔ اسے مینو پر غصہ آیا، کچھ بھی تھا وہ بھی نہ بھی وقت نکال کر ان سے مل آئی تھی، ان کا دل بھی بہلا رہتا تھا۔ مینو نے اسے بھی منع کر دیا، اپنا تو اس نے فون بھی بند کر رکھا تھا اور وہ خود اس سے بڑی بے وقوف جو اتنی دور بیٹھے ایسی تابعداری کر رہی تھی، وہ سخت بے چین ہو گئی، کہاں کی بھوک، اس نے ہاتھ کھینچ لیا۔

”آپ ان کے لیے کھانا نکالیں، میں ابھی دے آتی ہوں۔“ وہ نیپکن سے ہاتھ پونچھتے ہوئے

اللہ کی لکھی ہزار داستانیں



دلچسپ اور خوبصورت داستانیں جنہیں پڑھ کر
بچے ہیری پوٹر کو بھول جائیں گے، ایسی داستانیں
جنہیں بڑے بھی پڑھ کر لطف اندوز ہونگے

کتاب بذریعہ رجسٹری منگوائیں
300/- روپے کا ڈسکاؤنٹ حاصل کریں
فی کتاب 1200/- روپے
ڈسکاؤنٹ 300/- روپے
آج ہی 950/- روپے
مئی آڈر ارسال فرمائیں

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے
مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

ہیں یہ تمہارا۔ انہیں تو بس سارے حکم تم پر لاگو کرنا
آتے ہیں، ساری پابندیاں انہیں تمہارے وقت ہی
یاد آتی ہیں۔ بات بات پر انویسٹی گیشن کی جاتی ہے
تو تمہاری۔

ارے لڑکی ابھی بھی تمہاری آنکھیں نہ کھلیں تو
تف ہے تمہاری عقل پر۔ اب بھی تم ان ہی کی مانو تو
پھر میری یہ بات بھی مان لو کہ تمہارے دن نہیں
پھرنے کے، اسی قید خانے میں سڑو گی تمام عمر، نہیں
ملنے کی خلاصی تمہیں۔

اس دن بھری دوپہر میں دیکھا تھا نا اپنی
آنکھوں سے، کہاں سے آرہی تھی وہ تمہاری پڑھا کو
کزن، جس کی مثالیں دے دے کر جینا حرام کیا
جاتا ہے تمہارا اور جس کے لیے تمہاری اپنی اماں
جان کا فرمان عالی شان ہے کہ وہ نہایت سمجھ دار اور
شاہجہی ہوئی بچی ہے اور وہ سچی ہوئی بچی حب چاہے
دیواریں پھلانگ کر پڑوسیوں کے گھر میں گھس جاتی
ہے، اسے کوئی روکنے تو کئے، پوچھتا چھ کرنے والا
نہیں۔ وہ نیا جان کی غیر موجودگی میں ان کے
پرندے سنبھال سکتی ہے۔

ارے بھی اب کسی کو کیا پتا وہ ان کے پرندے
سنبھال رہی تھی یا ان کا جوان جہاں پوتا اور دیکھا تھا
تا، کیسے وہ بڑھیا بار بار نام لے رہی تھی اس کا۔ مجھے تو
لگتا ہے اس چلتے پوتے کے ساتھ ساتھ دادی کو
بھی خوب قابو کر رکھا ہے۔

ایک تم ہو..... جسے یہ تک خبر نہیں کہ برابر
والے گھر میں کتنے افراد خانہ رہتے ہیں، بس اسی
بھول پن میں ماری جاؤ گی کسی دن۔ یہ لوگ چستی بنا
کر کھا جائیں گے تمہاری اور ڈکار بھی نہیں لیں گے۔
تمہارے ابا وہاں کما کما کر درہموں کے ڈھیر تمہارے
لیے ہی لگا رہے ہیں نا، اب ایسی لکشمی کو کوئی اور کہیں
جانے دیتا ہے بھلا۔ مجھے ان سب کے رویے سمجھ
میں آگئے ہیں جبکہ چند دن ہی ہوئے ہیں مجھے یہاں
رہتے ہوئے اور تمہاری تو عمر بیت گئی ان سب کے
درمیان اور افسوس کسی کو نہ پہچان سکیں نہ تم اور نہ میری

”اوہ خدا..... منصب زمان مروت اور ایسا لہجہ
و انداز.....“ اسے تو کتنی ہی دیر نہ اپنے کانوں پر
یقین آیا نہ آنکھوں پر۔ وہ کڑے تیوروں سے گھورتا
واپس پلٹ گیا تھا۔ اس کے انداز نے کم دکھ دیا تھا
کہ اس پر انداز نظر نے رہی سہی کسر بھی نکال دی،
اس کی تو جیسے روح نکلنے کو تھی۔

ٹانگیں بے دم ہو رہی تھیں اور قبل اس کے کہ
بے جان ہی ہو جائیں۔ اس نے پلٹنے کو غنیمت جانا
تھا۔ لڑکھڑاتے قدموں اور پتیلیوں سے گال رگڑتی وہ
واپس آئی تھی۔ لان میں جھولے پر بیٹھی نینا نے بغور
دیکھا اور پھر چٹخارے لے لے کر عزیزہ کو بھی بتایا۔

☆☆☆

نینا کی کسی کزن کی منگنی تھی۔ اسے تیاری کرنا
تھی۔ کچھ شاپنگ، پارلر پھر اس کا ارادہ تھا وہاں
رہنے کا۔ وہ اسے بھی ساتھ چلنے کے لیے مجبور کر رہی
تھی۔ میٹم کو خبر ہوئی تو اس نے کھٹ سے چچی جان کو
کال کر کے صورت حال سمجھا دی۔

”تھوڑا نام تو رہ گیا تھا ان کے امتحانات میں۔
اب اگر پورا ایک ہفتہ وہ فالتو کے فنکشن میں نکال
دے گی تو اس کی پڑھائی کا ٹھیک ٹھاک حرج
ہو جائے گا۔“ یہ ہی وجہ تھی جب اس نے ابا جی سے
اجازت چاہی تو انہوں نے کھٹ سے انکار کر دیا۔
ان کے سامنے اصرار کرنے کی تو اس کی ہمت نہ تھی۔

نینا نے بڑے مان سے پھپھو کو کال ملائی،
پوری امید تھی، یہاں سے انکار نہیں ہوگا لیکن ادھر
سے جب پوری تفصیل دہرانے کے بعد صاف منع
کر دیا گیا تو وہ بھڑک ہی گئی۔

”دیکھا..... دیکھا تم نے..... تمہارے پل
پل کی رپورٹ ہوتی ہے وہاں، تمہارے ہر ہر کام پر
نظر رکھی جاتی ہے۔ یو آر سو کی یار! بہت بڑے خیر خواہ
ہیں بھی۔ تمہارے اس دنیا میں اور ایسے ویل و شر جو
دراصل تمہیں ان کتابوں میں ہی دفن کر مار دینا
چاہتے ہیں۔ نہ تم اپنی مرضی سے کہیں جاسکتی ہونہ
آسکتی ہو، نہ عام لڑکیوں کی طرح کسی خوشی پر حق سمجھتے

بولی۔

”تم کھانا تو کھاؤ ٹھیک سے۔“
”کھالیا میں نے، تھوڑی سی بھوک رکھ لی ہے،
نیا جان کے ساتھ کھالوں گی۔ اس طرح وہ خوش
ہو جائیں گی۔“ یاسمین نے سر ہلادیا۔

لان سے لے کر لاؤنج تک ویران پڑا تھا۔
داجی اس وقت اکثر گھر میں ہوتے تھے، لگتا تھا آج
وہ نہیں آئے، وہ محتاط سے قدم اٹھاتی ہوئی آگے
بڑھ آئی۔ ارادہ نیا جان کے بیڈروم میں جانے کا ہی
تھا کہ برابر والے کمرے کے کھلے دروازے سے
منصب باہر آیا تھا۔

سادہ شلوار قمیص میں رف ساحلیہ۔ بکھرے
بال، بڑھی شیو، دونوں کی نظر ملی تو ٹھٹھک کر اپنی اپنی
جگہ تھم گئے۔ الگ الگ تاثرات، اس نے کتنے دن
بعد دیکھا تھا، ترسی ہوئی نگاہ، بے تاب سی اس کے
چہرے پر ہی ٹھہر گئی اور وہ اس سے ہی نہیں سارے
زمانے سے خفا لگ رہا تھا۔ یوں دیکھا جیسے پہچانتا نہ
ہو، نکھرے نکھرے چہرے سے چہرے والی سوراخ خلیل کبھی
ایسی اجنبی نہیں لگی تھی جیسی آج..... وہ بھی گم سم دیکھ
رہا تھا، کچھ دیر بعد وہ سنبھلی۔

”السلام علیکم! کیسے ہیں آپ؟ امی نے نیا
جان کے لیے کھانا بھجوا دیا ہے، ان کی طبیعت کیسی
ہے؟“

”میں جیسا بھی ہوں آپ کو اس سے مطلب؟
نیا جان آرام کر رہی ہیں۔ یہ سب رکھ دو یہیں، آنٹی
سے شکریہ کہہ دینا۔“ ایک تو آج اس کی صورت کچھ
بدلی بدلی سی لگ رہی تھی، اس پر مزاج بھی سوانیزے
پر، سویرا کو فکر لگ گئی۔ اللہ جانے نیا جان کی طبیعت
کس قدر ناساز ہے۔ جھٹ میز پر پڑے رکھی۔

”اگر نیا جان سو نہیں رہیں تو میں ان سے مل
لوں؟“ اس نے تو انتہائی نرمی سے پوچھا تھا لیکن
ادھر سے گویا ٹھٹھک کر ماری گئی۔

”میں نے پہلے ہی کہا ہے وہ آرام کر رہی
ہیں، کیا سنا نہیں؟“

بھولی پھپھو جان۔ ارے اب بھی مہلت ہے تمہارے پاس، بچ سکتی ہو ان کے ہر جال سے جو وقت پر ان کی چال سمجھ جاؤ تو.....“ نینا کے اندر تو جیسے زہر بھرا تھا اور وہ اسے بھی نیل و نیل کر دینا چاہتی تھی۔ انتہائی بے دردی سے کہتی چلی گئی اور آج تو وہ بھی نہ اسے گھور سکی نہ ہی کسی لفظ پر ٹوکا۔

سچ ہی تو کہہ رہی تھی وہ، اس پر ہی سارے اصول لاگو ہوتے تھے۔ سویرا مزے سے کہیں بھی آجاسکتی تھی۔ اس کا بھی تو دل چاہتا تھا اپنی مرضی کرنے کا۔ کہیں جانے کا، کیا حرج تھا اگر وہ نینا کے ساتھ ایک آدھ دن کے لیے چلی جاتی۔ انجوائے کر لیتی مگر نہ جی، اس کا تو پی ایچ ڈی ادھورا نہ رہ جاتا۔ حد کرتی ہیں ماما بھی اور ان سے زیادہ وہ جو شاید اسے خوش دیکھنا ہی نہیں چاہتا۔

آج پہلی بار اس کے اندر بدگمانی کی لہر نے سر اٹھایا تھا۔ قطرہ قطرہ گرتا پانی پتھر میں شکاف ڈال سکتا ہے تو بوند بوند ٹپکتے کڑوے لفظ بھی تاثیر چھوڑ سکتے ہیں۔ شاید کہ نیناں اور بھی بہت کچھ کہتی کہ دروازے میں نمودار ہوتے لال بھوکا چہرے نے اس کا رنگ فق کر ڈالا۔ اس کی ساکت ہوئی نظر کے تعاقب میں ہی اس نے پلٹ کر دیکھا اور بالکل نہ گھبرائی۔ اگر وہ سب سن چکا تھا تو یہ تو اور بھی اچھی بات تھی، وہ لا پرواہی سے بیگ شانے پر ڈالتی، اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”چلو ٹھیک ہے پھر، ملتے ہیں آفٹر فیوڈیز، میں کال کرتی رہوں گی۔ ویسے میں کال نہ بھی کروں تو تمہیں کوئی فرق تو نہیں پڑے گا۔ یہاں ہیں بہت سے لوگ تمہارا خیال رکھنے والے اور تمہارے لیے تو وہی کافی ہیں، اوکے بائے۔“

وہ یوں ہی اٹھی گردن سے اس کے برابر سے نکلتی چلی گئی۔

میشم اسے کھا جانے والی نظر سے دیکھ رہا تھا، وہ کچھ بولا کیوں نہیں، یہ بھید تو اگلے ہی پل ہل گیا جب ابا جی ہو لے ہو لے چلتے، اس کے پیچھے سے آگے آئے۔

”اب وہیں کیوں رک گئے، یہ سب چیزیں یہیں رکھ دو بھئی، میں اپنی عزیزہ بیٹی کے لیے لے کر آیا ہوں۔ کہیں تم اپنی ماں کے پاس لے جاؤ۔“ وہ خوش گوار لہجے میں کہہ رہے تھے اور باہر سے تو وہ خوش گپیاں کرتے ہی آرہے تھے مگر اب اس نے جس طرح سے سب تھیلے صوفے پر اچھالے اور واپس پلٹا، وہ حیران ہی رہ گئے۔

”ہائیں..... اسے کیا ہوا، ارے ایسا بھی کیا کہہ دیا میں نے..... میثم ادھر آؤ..... میثم!“ وہ آزیں ہی دیتے رہ گئے۔ وہ تو یوں گیا جیسے بندوق سے گولی، عزیزہ بھی رخ پھیرے ان تھیلوں پر جھک گئی، مبادا وہ اس کا اڑارنگ دیکھ کر کچھ پوچھ لیں۔

☆☆☆

ایک نظر نہیں بھاتی تھی اسے وہ لڑکی، پہلے ہی وہ اپنی ناقابل برداشت حرکتوں کی وجہ سے اس کی نظر سے گر چکی تھی۔ کئی بار وہ خواہ مخواہ فری ہونے کی کوشش کر چکی تھی۔ اگر اس کا مزاج اور طرح کا ہوتا تو وہ ضرور اس کی پذیرائی کرتا، جتنے دن وہ یہاں تھی، کچھ وہ بھی اپنے وقت کو رنگین کر لیتا مگر نہیں، اسے سخت چڑھی اس قسم کی لڑکیوں سے جو اپنے وقار کا خیال نہیں رکھتیں۔ اپنی بے وقوفیوں سے خود اپنی ذات کو اڑا کر کرتی ہیں۔ اس کی ایسی کئی بدتمیزیوں کو وہ صرف اس لیے نظر انداز کر گیا تھا کہ وہ گھر میں مہمان تھی اور وہ بھی چچی جان کی۔ اگر وہ اس کے اپنے ننھیال سے ہوتی تو وہ اسے کب کا دوڑا چکا ہوتا لیکن مجبوری تھی۔ وہ ابا جی کو بھی اب کیا بتاتا، سوکڑا گھونٹ پی لیا تھا۔

ہاں وہ عزیزہ کے لیے پہلے سے زیادہ پوزیشن ہو گیا تھا، پہلے سے زیادہ دھیان رکھتا۔ اس لڑکی کے جو اطوار تھے وہ کسی صورت غفلت نہیں برت سکتا تھا لیکن کہیں نہ کہیں غفلت ہو گئی تھی۔ اسے جو ڈر تھا سامنے آ کر رہا تھا اس روز منصب کی گاڑی میں جو اسے عزیزہ کا دھوکا تھا وہ بھی دھوکا نہیں حقیقت تھی پھر وہ اس شام خراب موسم میں مارکیٹ جانا اور بھلا پہلے

کبھی کی تھی اس نے ایسی جرأت، وہ تو ہر وقت، ہر کام میں اسی کی طرف دیکھنے کی عادی تھی۔ جب بھی کوئی کام ہوتا وہ ہی تو ہوتا تھا جو اس کا سایہ بن جاتا اور اب..... یہ سب خرابیاں اس لڑکی کے آنے کے بعد سے ہو رہی تھیں۔ وہی تھی جو اس کے دماغ میں خناس بھر رہی تھی اور اس کی بکواس..... اف..... جیسے تپتی بھٹی میں دانے بجھتے ہیں، بالکل ایسے ہی اس کے اندر چیخ مچ ہو رہی تھی۔

اگر اس وقت ہاتھ خالی ہوتے تو کچھ شک نہیں کہ وہ اس بدتمیز لڑکی کا منہ نوچ لیتا یا پھر ابا جی اس کے پیچھے نہ آرہے ہوتے تو وہ ضرور اسی وقت حساب کتاب کرتا۔ ایسا ہی غصہ آیا تھا اسے، اس کی بکواس اتنی ہی ناقابل برداشت تھی۔ ایک ایک لفظ جلتی ہوئی چنگاری کی طرح دامن سے لپٹا تھا۔ پیش تھی کہ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

وہ کیسے کیسے الزام رکھ رہی تھی ان پر، کیا وہ چاچو کے کمائے درہموں کی وجہ سے عزیزہ سے پیار کرتا ہے۔ اُف لاجول ولا قوۃ..... اور وہ سویرا پر کیا بہتان باندھ رہی تھی، اوہ میرے اللہ..... اگر وہ اس قسم کی بکواس کہیں اور جا کر بھی کر دے تو وہ کیا بگاڑ لیں گے اس کا۔

”عزیزہ کیوں سن رہی تھی چپ چاپ، اس نے منع کیوں نہیں کیا اسے..... وہ کیوں سن رہی تھی۔ ایسے سر جھکا کر جیسے کہ وہ کوئی سچی کہانی سن رہی ہو..... اف.....“ وہ کمرے کے ایک کونے سے دوسرے تک یوں گھوم رہا تھا، جیسے کہ فرش پر جلتے انگارے بجھے ہوں، جب سویرا کھانے کے لیے بلانے آئی تو وہ اس پر چلا اٹھا۔

”نہیں ہے بھوک مجھے، دفع ہو جاؤ یہاں سے۔“ وہ بے چاری ہکا بکا بگٹٹ لٹے پیروں دوڑی۔ اس کا اترامندہ دیکھ کر یاسمین نے فقط اتنا ہی پوچھا۔

”کیا ہوا؟“

اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ ”بھائی ایسے

روڈ پہلے تو کبھی نہیں ہوئے تھے۔ ایسا غصہ، ایسے جھڑکنا۔ سب ان سے کہہ دیا۔

ان کا رخ اس کے کمرے کی طرف تھا اور وہ انہیں بھی کیا بتاتا کہ کیا ہوا ہے بس سر درد کا بہانہ کر کے کمرابند ہو گیا۔ وہ سب کچھ سہ گیا تھا، نینا کی بے ہودگیاں بھی، لیکن عزیزہ کی چپ..... یہ تو ہرگز قابل قبول نہیں تھی۔ وہ اس وقت سے کھول رہا تھا تھا۔ آخر کب تک سلگتا اور اسی لیے تو غصہ حرام قرار دیا گیا ہے کیونکہ جب غصے کا الاؤ ایک بار بھڑک جائے تو پھر وہ سب کچھ اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے، سارے حواس سلب کرتا اور تمام قرار چھین کر صرف اور صرف اضطراب کی راکھ دامن میں چھوڑ جاتا ہے۔ وہ جس پل مارے طیش کے سیڑھیاں اترتا نیچے آیا، ذہن کے کسی حصے میں نہ تھا کہ اگلے چند لمحوں میں کیسا آزار مقدر ہونے والا ہے۔

مارے پریشانی کے نیند اس کی آنکھوں سے بھی تو دور تھی۔ بستر میں تو گویا کانٹے اُگ آئے تھے۔ آنکھوں کی پتلیوں پر ایک ہی عکس ثبت ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ تیخ صفت نظر تو گویا سینے میں گڑ گئی تھی۔ وہ سب سن چکا ہے اور اب شامت ضرور آئے گی، اسے یقین تھا لیکن اتنی جلدی..... یہ تو گمان بھی نہ تھا، وہ اٹھ کر باہر آ گئی تھی۔

ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ یقیناً سب سو رہے تھے۔ وہ کچن میں چلی آئی اور وہ تو نہایت آرام سے بنا کھٹکا کیے اپنے لیے چائے بنا کر واپس کمرے کے دروازے تک آئی تھی کہ طوفان کی رفتار سے آتے میثم نے بنا کچھ کہے اس کی کلائی دبوچ لی۔

ڈری ہوئی تو وہ پہلے ہی تھی، اس افتاد پر بے اختیار حلق سے چیخ نکلی، میثم نے گھبرا کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھنا چاہا۔ کپ اس کی ہاتھ سے چھوٹا، گرم چائے ہاتھ اور پاؤں جلا گئی تھی، میثم کا غصہ پل میں کافور ہوا، اس کے ہاتھ میں گرم چائے کا کپ ہے غصہ میں وہ دیکھ ہی کہاں پایا تھا۔

بے چینی کے مارے اس کا ہاتھ پکڑنا چاہا لیکن

ایک تو تکلیف دوسرا اس کے متوقع روئے کا خوف، وہ چیختی چلی گئی۔ میثم نے بوکھلا کر ایک پتھر جڑ دیا اور اپنے کمرے سے اقات و خیزاں باہر آتے اباجی کے لیے یہ منظر گویا قیامت کا منظر تھا۔

آدھی رات کا وقت، عزیزہ کے کمرے کا دروازہ جس میں وہ چلائی اور میثم سے ہاتھ چھڑاتی ہوئی اور پھر میثم کا اس کو پتھر مارنا، وہ گالی پر ہاتھ رکھے اندر کو پلٹی تھی کہ اسے پکڑنے کی کوشش میں دوپٹا میثم کے ہاتھ میں جھولتا رہ گیا۔ بالکل ایسے ہی جیسے پھندے کی رسی اور جوان کے گلے کے گرد لپٹ گئی تھی۔ کئی بار جو آنکھیں دیکھ رہی ہوتی ہیں ان کا وہی مطلب نہیں ہوتا جو ذہن سمجھا رہا ہوتا ہے۔ کچھ منظروں کا بھید نگاہ فوراً نہیں جان پاتی، ان کا محرک جاننے میں تھوڑا وقت لگتا ہے اور کون جانتا ہے اس وقت تک۔ انسان تو پہلی سانس سے ہی بے صبرا ہے، تب ہی تو خسارے میں ہے، انہیں ابھی اس پل کی بے صبری لے دوئی۔ بے اختیار ان کے دل نے صدا بلند کی تھی۔

”ہائے! کاش اس منظر کو دیکھنے سے پہلے مر کیوں نہ گئے۔“ بس پھر ان کی آنکھوں کے سامنے عزیزہ کے سرخ رخسار رہ گئے تھے۔ میثم کا وجود اک پتلے میں ڈھل گیا جس پر ان کی لاشی تابڑ توڑ برس رہی تھی۔

☆☆☆

پے درپے کلباڑے کے دار موٹے تنے پر برس رہے تھے۔ ہر درکاری تھا۔ ہر باراک نیا نشان ثبت ہوتا۔ جو دونوں حصوں میں دراڑ بنتا جا رہا تھا۔ وہ اک جنون کے عالم میں ضرب پر ضرب لگا رہا تھا، جیسے انہیں جدا کر کے ہی دم لے گا، دور سے دلبر خان دوڑتا آ رہا تھا۔

”صاحب..... میٹا صاحب!“ اور صاحب نے ناچار ہاتھ روک کر اسے دیکھا بلکہ گھورا۔

”کیا آفت آئی ہے، جو ایسے چلاتے آرہے ہو۔“ پھولی سانس کے ساتھ کہتے ہوئے اس نے

کلباڑا ایک طرف پھینکا اور ماتھے سے بہتا پسینہ آستین سے پوچھا۔ اچھی خاصی ٹھنڈی تھی، لیکن کچھ مشقت اور کچھ ہیجان تھا جس نے اس سر دوپہر کو بھی گرما کی چلچلائی دوپہر میں بدل ڈالا تھا۔ بھی بھی تو اس کا بس نہ چلتا راہ میں آئی ہر چیز کو ٹھوکروں سے اڑا دے۔ سب کچھ ہنس نہیں کر دے، سب بکھیر کر رکھ دے جیسے وہ اندر سے ٹوٹ کر رہ گیا تھا۔

”کیوں..... آپ کیوں کر رہا تھا کام، یہ آپ کے کرنے کا نہیں صاحب! آپ کے ہاتھ میں چھالے پڑ جائے گا۔ آپ کو تکلیف ہوگا۔“ دلبر خان نے بے قراری سے اس کا ہاتھ پکڑ کر جائزہ لیا، کہیں سچ میں کوئی چھالا نہ بن گیا ہو اور وہ اس کی حرکت پر مسکرا دیا۔

اب اسے کیسے سمجھاتا کہ جو چھالے اس کے اندر پڑے ہیں، ان کے سامنے ان چھوٹے موٹے چھالوں کی کیا اوقات۔ اس کا تو پور پور زخمی تھا، بھلا ایسے معمولی زخم اس کا کیا بگاڑیں گے۔ ”تم مجھے خیر سے ڈھونڈ رہے تھے؟“ اس نے پوچھا۔

”اوہ..... ہاں، وہ میں آپ کے کمرے میں صفائی کرنے گیا تھا، وہاں یہ آپ کا فون بج رہا تھا۔ جتنا دیر کام کیا، اس فون نے اتنی دیر میں امارا کان پکا دیا۔ آپ دیکھو کس کا فون ہے، لگتا کسی کو ضروری بات کرنا ہے آپ سے۔“ دلبر نے جیب سے سیل نکال کر اس کی جانب بڑھایا، اس نے کال لاک چیک کیا، چھتیس کالز تھیں اور اتنا حوصلہ صرف ایک ہی ہستی کا تھا ہونٹوں پر مبہم سی مسکان لیے وہ اک طرف کوچل دیا۔

”جی فرمائیے، آج کیسے یاد کیا؟“ اور اس کی آواز سنتے ہی ادھر بہت دیر کا رکاز بانی سیلاب بہہ نکلا۔ اس نے سیل کان سے دور کر لیا، جب تک تندو تیز ریلے کا زور کم ہوتا وہ تب تک سر نہ ہواڑے پیروں تلے پتے روندتا اور پتھروں کو ٹھوکروں سے اڑائے چلتا جا رہا تھا۔

☆☆☆

ایک جگہ مل کر بیٹھے تو انہیں کئی دن گزر گئے تھے۔ اباجی اپنے کمرے میں بند رہتے یا چپکے سے کہیں نکل جاتے تو سارا دن واپسی کا راستہ یاد نہ آتا۔ حلیل صاحب کے آفس میں بے شمار کام بڑھ گیا تھا، وہ رات گئے لوٹتے اور پھر منہ اندھیرے تیار ہی۔ سویرا پہلے بھی اس طرح کتابوں میں گم نہیں رہتی تھی جیسا کہ اب، اور رہ گئی عزیزہ..... تو وہ پہلے کون سا چنگتی پھرتی تھی کہ اب اس کا گونگا پن کسی پر آشکار ہوتا۔

سب اسے قصور وار مان لیتے۔ چاہے ساری دنیا آ کر گواہی دیتی۔ لیکن ایک ماں کا دل تو جو ماننے پر آمادہ ہی نہ ہوتا تھا۔ وہ اور بہت سی خطائیں کر سکتا تھا۔ مگر کوئی ایسی خطا..... نہیں..... نہیں..... وہ ایسا بالکل نہیں کر سکتا۔ وہ ان کی اولاد تھا وہ اسے اچھی طرح جانتی تھیں۔ وہ اس دن سے ٹپ رہی تھیں وہ تو ایسا گیا کہ گھر کا راستہ ہی بھول گیا۔ وہ اسے ڈھونڈ ڈھونڈ کر ٹھک گئی تھیں۔ وہ تو ایسے چھپ گیا تھا۔ جیسے سچ میں گناہ گار ہو۔ اس نے تو ان کا بھی خیال نہیں کیا تھا۔ اس نے تو کسی کا بھی خیال نہیں کیا تھا۔ اس دکھ نے انہیں ادھ موا کر ڈالا تھا۔ سب بے حس ہو چکے تھے لیکن وہ کس طرح اپنے دل کو پتھر کرتیں۔ وہ تو کھلی ہوا میں سانس لینے کے لیے میسر پر آئی تھیں۔ کہ لان کے ایک کونے میں گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی عزیزہ پر نظر پڑتے ہی ان کا دل جلتے تو بے پر جا پڑا۔ سہیل اور زینب کی چند دنوں تک واپسی متوقع تھی۔ وہ تو اب اس کا سامنا نہیں کرتی تھیں۔ دیور اور دیورانی کو کیا منہ دکھائیں گی۔ بس اس سوچ نے ایسا دامن پکڑا کہ نڈھال ہو گئیں۔ سویرا انہیں کھانے کے لیے بلانے آئی تو اکھڑے اکھڑے سانس لیتے دیکھ کر گھبرا گئی۔

”امی..... امی..... کیا ہو آپ کو.....“ وہ بے تابی سے ان کے ہاتھ مسلنے لگی۔ یاسمین کو بولنے میں سخت دقت ہو رہی تھی۔ وہ پانی لینے دوڑی۔ واپس آئی تو انہیں بے ہوش پایا۔

”اوہ میرے اللہ..... امی..... امی..... پلیز آنکھیں کھولیں.....“

اس کے اپنے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ خلیل صاحب تو صبح ہی کہہ گئے تھے کہ وہ کسی ضروری کام سے شہر سے باہر جا رہے تھے۔ اباجی کو اس نے خود کچھ دیر پہلے جاتے دیکھا تھا۔ اب کیا ہو سکتا تھا علاوہ اس کے کہ وہ کسی اور سے مدد لیتی۔ وہ اٹھ کر سر پٹ بھاگی۔ نیا جان لٹھ لیے فیروزہ سے صفائی کروا ہی تھیں۔ جب وہ حواس باختہ سی ان تک پہنچی۔

”ارے سویرا بچے کیسا ہوتم۔ آج تو بہت دن بعد چکر لگایا۔ اور..... اور سب خیر ہے تا تم روتا کیوں ہے۔“ وہ تو خوش ہو کر اس کی طرف آئی تھیں کہ اس کے بھگے رخسار پریشان کر گئے۔ اس نے بمشکل آنسو روکتے سب خال کہہ سنایا۔

”فیروزہ! سب کام چھوڑ کر تم جلدی سے سویرا کے ساتھ جاؤ اور بچے تم بالکل پریشان مت ہونا۔ میں ابھی منصب کو فون کرتا ہے۔ وہ ڈاکٹر کو لے کر آئے گا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ گھبرانا مت شاباش۔“ انہوں نے اسے گلے لگا کر تسلی دی۔ فیروزہ اس کے ساتھ چلی آئی تھی۔ اور کچھ ہی دیر میں منصب کے ساتھ ڈاکٹر بھی آ گیا تھا۔ یاسمین کی طبیعت اب قدرے بہتر تھی۔ مسلسل ڈپریشن سے ان کا پی شوت کر گیا تھا۔ ڈاکٹر نے دواؤں اور احتیاط کی لمبی لسٹ بتائی تھی۔ جسے منصب نے پورے دھیان سے نوٹ کیا۔ اسے تو رونے سے فرصت نہ تھی۔ نیا جان نے اسے یوں گلے لگا رکھا تھا۔ جسے کسی چھوٹے سے بچے کو خود میں سمیٹ رکھا ہو۔ وہ مسلسل اسے حوصلہ دے رہی تھیں۔ ابھی تک وہ اس خوف زدہ کرتے لہجے کے حصار میں تھی۔ یاسمین نے تو آج جان ہی نکال دی تھی اس کی، اگر خدا نخواستہ انہیں کچھ ہو جاتا تو..... منصب ڈاکٹر کے ساتھ ہی چلا گیا تھا۔

”جاؤ۔ ماں کے لیے اچھا سا بنی بناؤ۔ میں اس کے پاس ہوں۔ اب اس کا فکر مت کرو۔“ نیا

جان نے اسے کچن میں بھیج دیا۔ مقصد اس کا دھیان بنانا تھا۔ اس کا دماغ مختلف سمتوں میں گردش کر رہا تھا۔ ماں اس حال کو کیوں پہنچی۔ جب اس سچ پر سوچ کی سوئی رکی تو شدت سے دل چاہا کہیں سے بھائی کو لا کر ان کے قدموں میں ڈال دے۔ اس روز قیامت کے بعد سے وہ سب عذاب کی بھی میں جل میں رہے تھے۔ آنسو تھے کہ رکتے ہی نہ تھے۔ اذیت سی اذیت تھی۔ منصب میڈیسن لے کر آیا تھا۔

”آپ یہ پرس کرپشن دیکھ لیجیے گا۔ دو اس وقت اور کتنی مقدار میں دینا ہے۔ اس پر تمام تفصیل درج ہے۔“ اس نے لفافہ ٹیبل پر رکھا تھا۔

”آپ نے کیوں زحمت کی میں نے اباجی کو کال کی ہے وہ بس آتے ہی ہوں گے۔“ اس کا چہرہ ہی نہیں آواز بھی بھگی ہوئی تھی۔ منصب نے شا کی نظر اٹھائی۔ ”اور اباجی کے آتے ہی آپ انہیں واپس مارکیٹ بھیج دیتیں۔ بہت خوب۔“ اس نے جیسے اس کی عقل کو داد دی تھی۔ وہ سر جھکا گئی۔

”آپ اگر اسی طرح روتی رہیں گی تو آنٹی کا خیال کیسے رکھیں گی۔ وہ اس وقت بیمار ہیں۔ پہلے ہی کافی پریشان ہیں۔ اس پر آپ کی یہ رونی صورت انہیں مزید دکھ دے گی۔ پلیز بی بریو۔“ وہ مدہم لہجے میں کہہ رہا تھا۔

”امی کی تو صرف ایک ہی پریشانی ہے اور وہ ہے میثم بھائی کی گمشدگی۔ ہم سب تو ان کے لیے فکر مند ہیں ہی۔ لیکن امی نے تو ان کی فکر میں خود کو بیمار کر لیا ہے۔ کتنے دن ہو گئے انہیں گھر سے گئے۔ پتا نہیں کہاں ہوں گے وہ۔ اور کس حال میں؟ آنسو رکتے تو کیا اس کی ہمدردی پا کر کچھ اور بہہ نکلے۔“

”آپ انہیں سمجھائیں کہ وہ میثم کے لیے بالکل مینشن نہ لیں۔ وہ جہاں بھی ہوگا۔ خیریت سے ہوگا۔ اور اللہ نے چاہا تو جلد گھر آ جائے گا۔ بلکہ میں خود کوشش کروں گا اسے واپس لانے کی۔ بس آپ آنٹی کو سنبھالیں۔ ان کا خیال رکھیں اور.....“

”آ..... آپ جانتے ہیں میثم بھائی کہاں

ہیں؟“ اس کی بات قطع کرتی وہ بے تابی سے بول اٹھی۔ منصب جو صرف یاسمین اور اس کی حالت دیکھ کر کسلی دے رہا تھا۔ اس کے سوال پر اک لمحے کو گڑ بڑا گیا۔ پھر جیسے کچھ سوچ کر بولا۔

”نہیں، مجھے علم نہیں ہے کہ وہ کہاں ہے لیکن میں اسے ڈھونڈنے کی کوشش.....“

”دیکھیں پلیز، میرے ساتھ غلط بیانی مت کیجیے گا۔ اگر آپ ذرا سا بھی جانتے ہیں۔ میثم بھائی کے متعلق تو بتادیں۔ ہم سب بہت مشکل میں ہیں اس وقت ان کا یوں چھپنا ان کے لیے ہی ٹھیک نہیں۔ ان کا سامنے آنا بہت ضروری ہے۔“

وہ پھر بے تابانہ بول پڑی تھی منصب نے ہونٹ بھیج کر اک گہرا سانس لیا۔ وہ بالکل چپ ہو گیا تھا یوں جیسے کسی سوچ میں ہو اور وہ اس کا تذبذب بھانپ گئی تھی۔ وہ بتانا چاہ رہا تھا اور بتا نہیں پارہا تھا۔ وہ سخت مضطرب بے اختیار کہہ گئی۔

”کہاں ہیں میثم بھائی۔ جو بھی سچ ہے بتادیں پلیز منصب! دیکھیں آپ کو میری قسم.....“

اور شاید زماں و مکان کی گردشیں تھم گئی تھیں۔ لمحہ موجود ہر منظر پر چھا گیا تھا، سماعتیں منجمد ہو گئیں بصارتیں ساکت، منصب تو بت بنا ہی وہ خود بھی موم کے پتلے میں ڈھل گئی۔ وہ انجانے میں کیا کہہ گئی تھی۔ وہ خود سمجھ نہیں پائی تھی اور جب شعور بیدار ہوا تو جھٹ نظریں چڑھیں۔ مارے خفت کے گال دہک اٹھے تھے۔ دل ایسے دھڑک رہا تھا کہ وہ شور اپنے کانوں سے سن رہی تھی۔ منصب نے اس کے رنگ بدلتے رخسار بڑے دھیان سے دیکھے تھے۔ اب تو کسی رد و کد کی گنجائش بھی ہی نہیں۔ وہ اس قسم کے بدلے سارے زمانے سے کیے وعدے توڑ سکتا تھا۔ چاہے پھر کتنے ہی کفارے کیوں نہ بھرنا پڑتے۔

☆☆☆

”چھوٹا سا ہے یہ بچہ اور مجھے سارا دن ایسے آگے لگائے رکھتا ہے کہ کبھی بھی شرمیز بھی اپنی ہی اولاد سے جیلس ہونے لگتے ہیں۔ قسم سے پوچھو

مت۔ کیا حال ہو گیا میرا۔ کئی کئی دن گزر جاتے ہیں نیا سے بات کیے۔ اکثر لالہ ہی کال کر کے حال احوال پوچھ لیتے ہیں آج بھی انہوں نے ہی فون کیا تو نیا نے آنٹی کا بتایا۔ اب کیسی ہے ان کی طبیعت؟“ گل مینا پوچھ رہی تھی۔

”ہمم..... اللہ کا شکر ہے، اب پہلے سے کافی بہتر ہیں۔“

”چلو شکر ہے اللہ کا..... اور یہ میثم لالہ کا کیا مسئلہ ہے۔ نیا جان بتا رہی تھیں کہ وہ کسی بات پر خفا ہو کر گھر سے چلے گئے ہیں۔ آنٹی نے ان کے جانے کا بھی صدمہ لیا ہے۔ سب خیر تو ہے نا۔“ اور اک گل مینا ہی تھی جسے وہ شریک حال کر سکتی تھی۔ بلا تردد سارا مسئلہ کہہ سنایا۔ وہ سن کر حق دق۔

”اللہ..... اللہ..... نہیں سویرا! ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ میثم لالہ ایسا نہیں کر سکتے۔ وہ تو عزیزہ کا اتنا خیال رکھتے ہیں۔“

”یہی تو دکھ ہے ہم سب کو۔ وہ تو اس کا اتنا خیال رکھتے رہے ہیں۔ ہمیشہ مجھ سے زیادہ انہوں نے اس کی کیمر کی ہے۔ میری تو ان سے لڑائی ہی یہی رہا کرتی تھی۔ کہ وہ اسے مجھ پر فوقیت دیتے ہیں۔ لیکن اس روز جو اباجی نے دیکھا..... اف..... ہم سب تو جیسے اس دکھ سے ہی مر جائیں گے مینو۔“ وہ رو دینے لگی۔

”نا..... نا..... ایسے نہیں کہتے۔ اللہ کرے گا سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم پریشان مت ہو۔ میثم لالہ ہیں کہاں۔ پھر کچھ پتا چلا ان کا؟“ وہ پوچھ رہی تھی۔

”ہاں، پتا چل گیا ہے۔ وہ وادی شوکران میں ہیں اور منصب پہلے دن سے جانتے تھے۔ بلکہ وہ انہیں خود چھوڑ کر آئے تھے وہاں۔ پہلے تو مجھے بے حد غصہ آیا ان پر۔ جب انہوں نے بتایا۔ جی چاہ رہا تھا۔ خوب لڑوں ان سے۔ کتنا اچھا ہوتا وہ ہمیں اس روز ہی بتا دیتے۔ امی اس حال کو تو نہ پہنچتیں۔ لیکن ان کا بھی کیا قصور۔ انہوں نے تو میثم بھائی سے وعدہ کا پاس رکھا۔ وہ تو شاید اب بھی نہ بتاتے۔ اس دن میں نے ہی مجبور کیا تو.....“ وہ بروقت یاد آ گیا کیسے مجبور کیا تھا تو

بے ساختہ زبان دانتوں میں داب لی۔ گل مینا نے اس کا یکدم چپ ہونا پوری طرح محسوس کیا تھا۔

”لالہ کو مجبور کیا تھا..... کیسے۔“ وہ پوچھ رہی تھی ”کچھ نہیں۔ میں تو بس ایسے ہی بات کر رہی تھی۔ تم سناؤ، کب آرہی ہو۔ میں نے تمہارے گڈے کو دیکھا ہے۔ سچ بہت دل چاہتا ہے اسے گود میں لے کر پیار کرنے کو۔“ گل مینا نے اک آہ بھری۔

”میں نے تو آنا تھا۔ مورے، زرمینا اور میں ہم تو خود پتا نہیں کیا کیا پلان کر رہے تھے۔ مگر سب پروگرام چوٹ ہو گیا۔ کیا کرنا ہے اب آکر۔“

”کیا مطلب..... کیا پروگرام۔“

”میرا تو اس دن کا ایسا دل ٹوٹا۔ مارے دکھ کے تمہیں فون بھی نہیں کیا۔ وہ تو تم نے کال کر لی تو میں بات کر رہی ہوں۔ ورنہ سچ پوچھو تو میں سخت ناراض ہوں تم سے۔ مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی۔ مجھے تو لگتا تھا تم کو لالہ کے دل کی سب خبر ہے لیکن افسوس..... سچ سویرا! تم نے بہت دل دکھایا ہے ہم سب کا۔ نیا جان نے تو بات دل پر ہی لے لی تھی بڑی مشکل سے سمجھایا انہیں۔ ورنہ تو وہ بھند تھیں کہ ایک بار ضرور آنٹی سے بات کریں گی۔ لالہ میں ان کی جان ہے۔ ان کی ہر خوشی پورا کرنا فرض سمجھتی ہیں خود پر۔ وہ تو اس وقت ہی ایسے بے تاب ہو گئی تھیں جب انہیں لالہ کی خواہش کا بتایا ان کا تو بس نہیں چل رہا تھا کہ اسی بل کر اپنی جائیں اور لالہ کے لیے تمہارا ہاتھ مانگیں۔ لیکن بس قسمت کا پھیر ہم نے ہی انہیں روک دیا۔ مجھے ہی شوق چڑھا تھا کہ اس خوشی کو خوب دھوم دھام سے منائیں گے۔ کیا خبر تھی اس کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔ اس سے پہلے ہی تمہارا رشتہ طے ہو جائے گا۔ تم تو اتنی بدتمیز ہو، تم نے مجھے بتانا بھی غیر ضروری سمجھا۔“

گل مینا تو بندوق کی طرح جو تڑ تڑ شروع ہوئی تو اسے کم ہوتے حواس قابو کر کے کہنا پڑا۔

”ایک منٹ..... ایک منٹ..... رکو تو سہی۔ یہ کیا بولتی چلی جا رہی ہو۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں

آ رہا۔ کس کا رشتہ..... کس کی بات؟“

”ہاں تم تو اب یہی کہو گی نا..... تم نے تو مجھ سے بھی اس بات کو چھپایا۔ کتنی بار بات ہوئی ہماری اور تم نے تذکرہ تک نہیں کیا۔ ٹھیک ہے وہ لوگ تمہارے خاندان کے ہیں۔ ماموں کا بیٹا ہے وہ تمہارا لیکن ایک بات یاد رکھنا، وہ چاہے اٹلی میں رہتا ہو یا فرانس میں، میرے لالہ جیسا ہرگز بھی نہیں ہو گا وہ۔“

اس کے لہجے میں خفگی بھری تھی۔ جبکہ اس کے اعصاب جھنجھٹا اٹھے۔ خاندان، ماموں کا بیٹا، اٹلی، فرانس، اور پھر لالہ..... اور جیسے کوئی ابھی کبھی ہاتھ آئی تھی۔

”تم شاید یہ سمجھ رہی ہو کہ میرا رشتہ ماموں کے بیٹے سے طے ہو گیا ہے۔ اوہ گاڈ مینو! یہ ہمارے گھر کی بات تم تک کیسے پہنچی۔ تم سب سے پہلے تو یہ بتاؤ مجھے۔“

”کیسے پہنچی تھی۔ تمہارے گھر کے لوگوں سے ہی خبر ملی۔ عزیزہ اور اس کی کزن آئی تھیں ایک دن نیا جان کے پاس۔ انہوں نے ہی بتایا تھا۔“

گل مینا کے اگلے لفظوں نے اس کتھی کا سرا بھی ہاتھ میں دے دیا۔ ان دونوں نے اس بات کو اپنی مرضی کا رنگ دے کر نیا جان کو کیوں بتایا اس پر تو بعد میں بھی حیران ہوا جاسکتا تھا۔ لیکن وہ کیوں اتنا تپ رہی ہے۔ یہ خیال ہی دل کو گدگدانے لگا۔ بے اختیار ہنسی چلی گئی۔ ادھر اس بے موقع ہنسی پر کافی برا مانا گیا۔

”تم ہنس رہی ہو اور ادھر میرا غصے سے برا حال ہے۔ آج تو فون کر لیا۔ مجھ سے میٹم لالہ اور پھر آنٹی کی طبیعت کا سن کر رہا نہیں گیا۔ اللہ تمہیں بہت خوشیاں دے۔ تم جہاں رہو خوش رہو۔ میں دعا ضرور کروں گی تمہارے لیے مگر.....“

”اوہ اللہ کی بندی سانس تو لے لو۔ اپنی ہی کہے جا رہی ہو تب سے۔ کچھ میری بھی سنو گی یا نہیں۔“ وہ ملکہ جذبات کہیں فون رکھ ہی نہ دے۔ اس لیے ہنسی پر قابو پانے کی سعی کی۔

”پھوٹو۔“ گل مینا نے بادل نا خواستہ اجازت مرحمت فرمائی۔

”قصہ یہ ہے غیاث ماموں کے بیٹے کا رشتہ آیا تھا میرے لیے۔ امی تو راضی ہی تھیں۔ ابو نے بھی کوئی خاص اعتراض نہیں اٹھایا تھا۔ لیکن اللہ بھلا کرے اباجی کا انہوں نے عجیب ہی شرط رکھ دی ماموں کے آگے۔ کہ اگر تو ان کا بیٹا پاکستان سیٹل ہو سکتا ہے تو وہ اس رشتے پر راضی ہیں۔ ورنہ وہ اپنی پوتی کو اتنی دور نہیں بھیج سکتے اور ماموں جنہوں نے اتنی محنت کے بعد بچوں کو وہاں سیٹ کیا۔ وہ صرف بھانجی کی خاطر بیٹے کا مستقبل داؤ پر نہیں لگا سکتے تھے۔ سو یہ کہانی تو اس روز ہی اپنے انجام کو پہنچ گئی تھی۔“

”ہیں سچ.....“ گل مینا ساری خفگی بھول بھال بے اندازہ خوش ہو گئی۔

”کمال ہے بھئی۔ تم تو خوب دکھری ٹائپ کی سہلی ہو۔ ادھر میرا رشتہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔ میں تو خواب میں اٹلی کی سیر بھی کر آئی تھی اور تم ہو کہ.....“

”بد تمیز.....“ مجھے کرائی ہوں میں اٹلی کی سیر.....“ گل مینا چیختی تھی۔ وہ ایک بار پھر ہنس دی۔

☆☆☆

”کیا ہوا ہے تمہیں۔ یہ شکل کیوں بیماروں والی بنا رکھی ہے۔ لگتا ہے دل نہیں لگا میرے بغیر۔ ارے بھئی۔ میں کچھ دنوں کے لیے گئی تھی۔ اب واپس آ گئی ہوں۔ خوش ہو جاؤ۔ اور تانیہ بتا رہی تھی تم یونی بھی نہیں جا رہی۔ سب ٹھیک تو ہے نا۔ تم جیسی پڑھا کو بچی اور ایسی لاپرواہی۔ کیا ہٹلر کے بچے نے خیر خبر لینا چھوڑ دی تمہاری یا میری باتوں نے اثر دکھایا۔ بہادر ہو گئی ہو اب“ نینا پوچھ رہی تھی۔ جبکہ اس کے ماتھے پر ایک لکیر ابھری۔ پہلے فرش کو گھور رہی تھی اب نظر کا زادیہ گھوم کر اس پر جا نکا۔

”اوہو! تم ایسی چپ کیوں ہو۔ کچھ بول کیوں نہیں رہیں۔ ہوا کیا ہے؟“

نینا کو اس کی حالت نے حیران کیا تو انداز نظر نے پریشان کر دیا اور پھر جس طرح وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور بنا کچھ کہے چل دی وہ پکن کی جانب گئی تھی اور چند ہی لمحوں میں واپس آئی۔

”مجھے کچھ کام ہے۔ تم کو لڈرنگ پی کر جانا۔“

اس کے ہاتھ میں چھوٹی ٹرے تھی جس میں ایک گلاس جو اس نے ٹیبل پر پٹاخ سے رکھا اور اب رخ اپنے روم کی طرف تھا۔ نینا ہکا بکا جاتے دیکھتی رہی۔ یہ تو کھلم کھلا اسے جانے کا کہہ دیا گیا تھا۔ اب اس سے بڑھ کر وہ کیا عزت افزائی کر داتی اک جھٹکے سے اٹھی اور دروازہ پار کر گئی اور اندر وہ دروازے سے کمر نکائے رو رہی تھی۔ نہ یہ نینا کم بخت اس روز اتنی بکواس کرتی اور نہ اتنا کچھ ہوتا۔

”اف..... میٹم کہاں ہیں آپ۔ پلیز سوری!“

اس دن مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوئی..... واپس آ جائیں..... پلیز ز.....“ اب اس کا ہر دن یونہی اسے پکار پکار کر معافیاں مانگتے گزر رہا تھا۔

”بھئی واہ..... مزا آ گیا..... بہت مزے کا سوپ بنایا ہے میری بیٹی نے۔“ سہیل صاحب ہرچیز پر واہ واہ کر رہے تھے۔

”شکریہ بابا.....“ عزیزہ مسکرا دی۔ جب سے بابا واپس آئے تھے وہ پھر کبھی کبھار ہنس بول لیتی تھی نہیں تو لگتا تھا وہ سب بھول چکی ہے۔

”اور میں نے جو کباب کی فرمائش کی تھی وہ کہاں ہیں؟“

”بس کر دیں سہیل! جب سے آپ یہاں آئے ہیں اچھی خاصی بد پرہیزی کر چکے ہیں۔ بھول گئے ہیں ڈاکٹر نے کیا تاکید کی تھی؟ زینب نے انہیں یاد دلانا چاہا تھا۔“

”جھٹی۔ مجھے تو اندازہ ہی نہیں تھا۔ میری گڑیا اتنی سکھڑ ہو گئی ہے۔ ایسے مزے مزے کے کھانے بنانا سیکھ گئی ہے۔ اب اس کے ہاتھ کے بنے کھانوں سے تو میں دور نہیں رہ سکوں گا۔ تم تو خود دراصل اب ہو گئی ہو کامل۔ جب بھی کوئی فرمائش کی۔ تم نے ڈاکٹر کی تاکیدوں کی آڑ لے کر مجھے کئی کئی گھنٹے بھوکا رکھا۔ پتا ہے عزیزہ بیٹا یہ تمہاری ماں کیا کیا ظلم کرتی رہی ہے۔ میرے ساتھ.....“

وہ اب اسے اپنی مظلومیت کے کئی من گھڑت قصے سنار ہے تھے جو وہ ان کے آنے کے بعد سے کوئی پچاسیوں بار پہلے بھی سن چکی تھی۔ وہ ٹھوڑی تلے مٹھی لٹکائے پورے دھیان سے سن رہی تھی۔ زینب نے باپ بیٹی پر ایک کینہ تو ز نظر ڈالی اور اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”ارے! اب تم کہاں چلیں۔“ ان کے اٹھنے کا انہوں نے فوراً نوٹس لیا تھا۔

”آپ کو تو میرے گناہ جھاڑنے سے فرصت نہیں ہے۔ میں یا سمین بھابھی کی پاس چلی جانی ہوں۔ سویرا آئی تھی تو بتا رہی تھی۔ سر میں درد ہے ان کے۔ ایک تو ان کی طبیعت پوچھ لوں گی۔ دوسرے میٹم کا بھی پتا کروں، ایک ہفتہ ہونے کو آیا ہمیں آئے ہوئے اور اب تک وہ ملا ہی نہیں ہم سے۔ آخر ایسی بھی کیا پڑھائی۔ کہ وہ ہم سے ملنے تک نہیں آسکا۔ فون بھی بند کر رکھا ہے اس نے اپنا۔“

”بھئی بتا تو رہی تھیں بھابھی، فائنل ایگزیم ہیں اس کے آج کل میں ہی میں آجائے گا بچہ۔ نسلی سے دے لے امتحان۔“ وہ بے فکر تھے۔

”یہ تو پہلی بار ہی سن رہی ہوں میں۔ میٹم نے اس سے پہلے تو بھی یوں دوستوں کے ساتھ کیمائیں اسٹڈی نہیں کی۔ وہ تو ہمیشہ سے خود محنت کر کے نوٹس بنانے کا عادی ہے۔ اور ایسا لا پرواہ تو وہ بھی نہیں رہا۔ اس کا فون تو کبھی اس روز بند نہیں ہوا کہ جس روز اس کا پیپر ہو۔ اور اب کتنے دن ہو گئے اس کا سیل یا اور آف پر ہی مل رہا ہے۔ اس نے کچھ چیزیں کہی تھیں مجھ سے۔ وہ لے کر آئی ہوں اور وہ خود ہے کہ غائب، عجیب ہے یہ لڑکا بھی۔“ وہ جھنجھلائی سی کہتے ہوئے چلی گئیں۔ عزیزہ نے بلا ضرورت گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے جوڑ لیا۔

”ویسے کہہ تو ٹھیک ہی رہی تمہاری ماں۔ میٹم کو تو میں بھی مس کر رہا ہوں۔ میں وہاں تھا تو روز پلان بناتا تھا کہ چاچو جب آپ آئیں گے تو ہم یہ کریں گے۔ وہ کریں گے۔ اور اب مجھے آئے بھی اتنے دن

صوفی سوپ

QUALITY
SUF
GUARANTEED

ہاتھوں کی
حفاظت

صوفی سوپ کی کوالٹی کا مقابلہ، کوئی بھی ڈٹرجنٹ پاؤڈر نہ کر پائے۔

کیونکہ اس میں ہیں کپڑوں کے رنگوں کی حفاظت

100 فیصد قدرتی اجزاء

صوفی سوپ تمام پاؤڈروں اور صابنوں سے بہتر



کوئی دن پلٹ آیا تھا۔ ان کے سینے پر یاد کا تازیانہ لگا۔ ان کے چہرے پر اک اور چہرہ ابھر آیا تھا۔ وہ پتھر ہوئے کئی ٹاپے دیکھتے چلے گئے۔ جس پر سہیل صاحب نے گھبرا کر ان کا شانہ ہلایا۔

”اباجی..... کیا بات ہے۔ ایسے کیا دیکھ رہے ہیں؟ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟ آپ نے دوا لی؟ اور وہ جیسے ہوش میں آئے تھے۔

”ہاں..... ہاں طبیعت ٹھیک ہے میری۔ دوا ابھی لے لوں گا۔ تم بتاؤ کیا کہہ رہے تھے۔“ انہوں نے پیرسمیٹ کر ان کے بیٹھنے کے لیے جگہ بنائی۔ ”وہ کون سی دوا ہے جو آپ کھانے سے پہلے لیتے ہیں۔“ ٹرے بیڈ پر رکھ کر انہوں نے سائیڈ ٹیبل کی دراز کھول لی تھی۔ جس پر ان کا بگڑا موڈ اور بگڑ گیا۔

”یہ تم سب کو میری دوا کی فکر کیوں پڑی رہتی ہے۔ جو بھی آتا ہے۔ دوا ہی کیوں کھلانا چاہتا ہے۔ تم لوگوں کو اور کوئی کام نہیں ہے دنیا میں۔ کچھ نہیں ہونے لگا مجھے۔ اچھا بھلا ہٹا کٹا ہوں۔ مرنا ہوتا تو اس دن ہی مر جاتا۔ لیکن زندہ بچ گیا ہوں تو سمجھ لو کہ ابھی کچھ دن اور سر پر ہوں تم سب کے۔“ اور سہیل صاحب ششدر۔ ٹرپ کر انہیں دیکھا۔

”اللہ نہ کرے اباجی..... کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ اللہ آپ کا سایہ ہمارے سروں پر بنا قیامت قائم رکھے۔ اچھا چلیں۔ آپ دوا نہیں کھانا چاہ رہے تو مت کھائیں۔ لیکن فارگاڈ سبک غصہ تو مت کھائیں نا۔ مجھے بتائیں کیا ہوا ہے۔ کس بات پر موڈ آف ہے آپ کا؟“

وہ ان کے پاس بیٹھ گئے۔ ایک بازوان کے شانے پر پھیلا یا اور دوسرے ہاتھ سے ان کے سرخ پڑتے گال سہلائے اور انہوں نے بڑی مشکل سے سینے سے ابلتے سمندر کو قابو کیا۔ ورنہ توجی چاہ رہا تھا۔ پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔ دل پر ایسا کاری زخم لگا تھا کہ بل بل اٹھتی ٹیسیں بے حال گردیتیں۔

”اچھا..... اچھا میں سمجھ گیا۔ آپ کس بات سے پریشان ہیں۔“ سہیل صاحب کو یک لخت جیسے

ہو گئے اس نے ملنا تو دور ایک کال تک نہیں کی مجھے۔“

سہیل صاحب کا دھیان پیالے کی طرف تھا۔ وہ بے دھیانی میں خالی گلاس کو پکڑ بیٹھی تھی۔ بوکھلا کر جلدی سے ٹیبل پر رکھنا چاہا تو ہاتھ سے سرک گیا۔ لپک کر پکڑا۔

”اوہو..... بیٹا دھیان سے اور اب چلو جلدی سے جاؤ۔ میرے لیے کباب گرم کر لاؤ۔ اس سے پہلے کہ وہ ہٹلر کی رشتے دار واپس آ جائے۔“

وہ محتاط سے اس جانب دیکھتے کہہ رہے تھے۔ جدھر زیب گئی تھیں۔ شکر ہے انہوں نے اسے نہیں دیکھا تھا۔ ورنہ یک دم سفید پڑتے رنگ کا وہ کیا سبب بتاتی۔ اسے تو اٹھنے کا بہانہ مل گیا تھا۔ واپسی پر اس کے پلو میں کتنے موتی چھپ گئے تھے۔ یہ وہ خود بھی نہیں جانتی تھی۔

☆☆☆

کمرے میں نا کافی روشنی نے سارے ماحول کو پراسرار سا بنا رکھا تھا۔ اس پر دبیز چپ کی تہہ پر دروازے پر ہونی دستک نے سلوٹ ڈالی تو وہ چونک سے گئے۔ سوچوں کے الجھے ریشم سے خود کو چھڑاتے ہوئے۔

”کون ہے بھی۔ آ جاؤ“ اور دروازہ کھلتے ہی ملگجی سی روشنی آنے والی سے پہلے کمرے میں کسی شرارتی بچے کی طرح گھس آئی تھی۔ انہوں نے بے اختیار آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا۔ سہیل صاحب نے لائٹ آن کر دی۔

”خیریت اباجی! کمرے میں اندھیرا کیوں کر رکھا ہے۔ میں تو آپ کے لیے بہت مزے کی چیز لے کر آیا تھا۔ عزیزہ نے قیمہ میکرونی بنایا تھا میری فرمائش پر، اکیلے کھانے کو دل نہیں کیا۔ سوچا باپ بیٹا مل کر کھاتے ہیں۔ لیکن لگتا ہے آپ تو سونے کی تیاری میں ہیں۔“

وہ ان کے قریب ہی بیڈ پر آ بیٹھے۔ اباجی نے چونک کر انہیں دیکھا۔ یہی انداز، یہی ادا، یوں جیسے

کچھ یاد آیا تھا۔ اور انہوں نے بے اختیار گھبرا کر ان کی صورت دیکھی۔

”کس..... کس بات پر.....“

”میں آپ کا بیٹا ہوں اباجی..... آپ کیا سمجھتے ہیں۔ آپ بتائیں گے نہیں تو کیا میں جان نہیں پاؤں گا۔ میں آپ کی پریشانی کی وجہ خوب اچھی طرح سے سمجھ گیا ہوں۔“ اور ان کا دم لبوں پر آٹکا۔ جبکہ وہ اپنی دھن میں کہے جا رہے تھے۔

”ہمارے بچے اب خیر سے بڑے ہو چکے ہیں۔ اپنی اپنی تعلیم مکمل کرنے کو ہیں۔ اب یہی وقت ہے کہ ہم ان کے مستقبل کے فیصلے کریں اور میرا اللہ سب بہتر کرنے والا ہے۔ ان کے لیے ضرور بہترین ہوگا۔ آپ ٹینشن کیوں لے رہے ہیں؟ میں آپ کے جذبات سمجھ رہا ہوں۔ میں خود حیران ہوں۔ چھوٹی چھوٹی سی عینیں سویرا اور عزیزہ جب یہ گڑبڑوں سے کھیلا کرتی تھیں اور دیکھتے ہی دیکھتے کیسے بڑی ہو گئیں۔ وقت دبے پاؤں گزر گیا ہے کہ آج ہماری پیاری بیٹی سویرا کے لیے خان صاحب کے پوتے کا رشتہ آیا ہے اور یہ وقت یقیناً ہر ماں باپ کے لیے بڑا ٹھکانہ ہوتا ہے۔ بیٹی کا مقدر کیا ہے، یہ تو وہ نہیں جانتے لیکن انہیں اس کے لیے فیصلہ کرنا ہوتا ہے۔ اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق۔ آپ تو خان صاحب کو اک عرصے سے جانتے ہیں۔ اچھے سلجھے ہوئے لوگ ہیں۔ منصب بھی بے حد اچھا لڑکا ہے۔ جب سے میں آیا ہوں کئی بار آچکا ہے میری خیریت پوچھنے۔ باہر بھی ایک بار ملا ہے بہت اچھے طریقے سے ملتا ہے۔ میرا تو خیال ہے کچھ ایسی سوچ بچار کی ضرورت نہیں ہے۔“

اباجی نے آنکھیں موند کر اک گہری سانس لی۔ ان کا رک سانس بچال ہوا تھا۔ سوچ بچار کی تو واقعی ضرورت نہیں رہی تھی کیونکہ وہ تو فیصلہ کیے بیٹھے تھے۔ بس اب سب کو آگاہ کرنا ہی باقی تھا۔ انہوں نے بیٹے کی طرف دیکھا۔

”بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔ خان صاحب بہت

اچھے آدمی ہیں۔ اعلا حسب نسب ہے۔ منصب بھی بے حد نیک اطوار لڑکا ہے۔ ہماری خوش نصیبی ہے کہ وہ ہماری بچی کے لیے پیغام لے کر آئے۔ لیکن میرا ارادہ کچھ اور ہے۔ سویرا بیٹی کی مجھے اتنی فکر نہیں ہے کیونکہ بہو کے اٹلی والے بھائی نے بھی اپنے بیٹے کے لیے پیام دیا تھا۔ ہم انہیں ہاں کہلوادیتے ہیں اور میں خان صاحب سے بات کرتا ہوں۔ عزیزہ بیٹی کا رشتہ ہم منصب سے طے کر دیتے ہیں۔ یوں ہم ایک ساتھ دونوں بچیوں کے فرض سے سبک دوش ہو جائیں گے۔“

وہ نہایت اطمینان سے کہہ رہے تھے۔ جبکہ سہیل صاحب نے حد درجے حیران ہو کر انہیں دیکھا۔

”یہ..... یہ..... کیا کہہ رہے ہیں اباجی۔ ہم ایسا کیوں کریں گے۔ بھابھی نے تو بتایا تھا کہ انہیں انکار کر دیا گیا ہے یہ کہہ کر ہم سویرا کو اتنی دور نہیں بھیج سکتے۔ اور اب جبکہ اللہ کی کرم نوازی سے اس کے لیے ایک بہتر رشتہ آیا ہے تو آپ..... نہیں..... نہیں اباجی! میں ایسا ہرگز نہیں کروں گا۔ پھر وہ لوگ ہماری سویرا کے لیے سوالی بن کر آئے ہیں۔ ہم کیسے اپنے منہ سے عزیزہ کا نام لے دیں اور پھر مجھے اور زینب کو اس کی فکر ہے ہی نہیں۔ میٹم جو ہے ہمارے گھر کا بچہ۔ اس کے ہوتے میں بیٹی کو گھر سے باہر کیوں بھیجوں۔ ساری زندگی اس سے دور رہ کر گزاری ہے۔ اب یہی خواہش ہے کہ وہ میرے پاس رہے اور اس کے لیے اس سے بہتر کیا ہوگا کہ.....“

”چپ کر جاؤ۔ تمہاری کیا خواہش ہے مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں۔ ضروری نہیں ہے کہ ہم جو چاہیں وہ پورا بھی ہو۔ اس خواہش کو ہمیں دفن کر دو تو اچھا ہے۔ وہ کسی بھی طرح ہماری بیٹی کے لائق نہیں ہے اور کیوں؟ یہ مت پوچھنا اب مجھ سے۔ میں تمہارا باپ ہوں سہیل اور میں بہتر جانتا ہوں کہ مجھے کیا کرنا ہے اور بد قسمتی سے جب تک زندہ ہوں۔ تم لوگوں کی بھلائی سوچتا رہوں گا۔ ہاں جب مر مرا جاؤں گا تو پھر کرتے رہنا من مانیاں۔ وہ ترخ کر بولے تھے۔“

”اللہ نہ کرے اباجی! کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ اللہ آپ کو۔“

”بس کرو دو سہیل..... مت دو مجھے زندگی کی دعائیں۔ بہت جی لیا میں نے۔ اب مزید جینے کی تمنا نہیں ہے۔ اب تو بس یہ فکر ہے کہ میری معصوم بچی عزیزہ اپنے گھر کی ہو جائے، پھر شاید میں بھی سکون کی نیند سو سکوں گا۔ اور تمہیں کوئی بھی ٹینشن لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ہوں نا۔ میں خود بات کروں گا خان صاحب سے اور مجھے یقین ہے کہ وہ میری بات سمجھ جائیں گے، اب جاؤ۔ آرام کرنے دو مجھے اور ہاں جاتے ہوئے عتی بچھا دینا۔ روشنی سے وحشت ہوئی ہے مجھے۔“

وہ منہ پھیرے چادر درست کرنے لگے۔ سہیل صاحب آتے وقت تو بہت مطمئن تھے اور اب واپسی کے لیے قدم موڑے تو آج پتا چلا کہ پاؤں من من بھر کے کیسے ہو جاتے ہیں۔ دروازہ بند ہونے کی آواز پر انہوں نے چادر پرے سر کاٹی۔ بہت دیر کے رُکے ہوئے آنسو بہہ نکلے تھے۔

☆☆☆

کھلے گیٹ سے اندر آتی گاڑی کو دیکھتے ہی اس نے جھٹ پلو سے گال رگڑ ڈالے۔ ساتھ والی چیئر پر بیٹھی گل مینا سیدھی ہوئی۔

”اوئے..... یہ تو لالہ کی کار ہے۔ وہ ضرور ادھر ہی آئیں گے۔ اب تم خود کو سنبھالو۔ ایک دم سے پریشان نہیں کرنا ہے انہیں۔“

اس نے ہدایت نامہ جاری کیا اور اس نے تابع داری سے سر بھی ہلایا۔ لیکن جب تک وہ اس طرف آتا کچھ اور آنسو بھی پلکوں کی باڑھ سے پھسل آئے۔ جنہیں رخ پھیرے بے دردی سے جھٹک ڈالا اور گل مینا کا اندازہ بالکل ٹھیک تھا وہ انہیں دیکھ کر ادھر ہی آیا تھا۔ اس نے چہرے پر خیر مقدمی مسکان سجائی۔ لہجے میں زبردستی کی خوش گواری بھرے اس سے حال احوال لینے لگی اور وہ اس سے بات تو کر رہا تھا لیکن سارا دھیان اس رخ پھیرے بیٹھی دشمن

جاں کی طرف تھا۔ جسے آج کتنے دن بعد ادھر دیکھ رہا تھا۔ اس کی تو ساری تھکن اتر گئی تھی۔ جانتا تھا اس کے مزاج کو وہ اس سے بے تکلف تو کبھی بھی نہیں ہوئی تھی۔ پھر ان دنوں۔ جو سلسلہ چل رہا تھا اگر وہ شرما کر رخ پھیر گئی تھی۔ تو اسے اچھا لگا تھا۔ لیکن سبز آنکھوں میں چلتی شوخی و شرارت بھلا ہونٹوں پر کیسے نقل لگاتی۔ وہ بے اختیار اسے چھیڑنے کے لیے کہہ گیا۔

”اور یہ کچھ لوگوں کو کیا ہوا ہے۔ دیکھتے ہی منہ پھیر لیا۔ نہ سلام نہ دعا۔ کیا ساری میز بھلا دی ہے۔“ مینا نے اسے گھورا، وہ اطمینان سے کرسی کھینچتا بیٹھ گیا۔ ان دونوں کے سامنے رکھی ٹیبل پر چائے اور دیگر لوازمات بھی تھے۔ لیکن صاف دکھ رہا تھا کہ کسی بھی چیز کو ابھی تک چھوا نہیں گیا۔ چائے کی اوپری سطح بتا رہی تھی کہ وہ اس ناقدری پر ٹھنڈی پڑ چکی ہے۔

”اوہو..... لگتا ہے کوئی بہت ضروری ٹاپک چل رہا تھا تم لوگوں کے درمیان۔ کھانے پینے کا ہی ہوش نہیں۔“ اس نے ایک بسکٹ اٹھا کر منہ میں ڈالا۔ اور مینا اسے ٹالنے کو بول اٹھی۔

”وہ..... لالہ مورے یاد کر رہی تھیں آپ کو۔ ابھی پوچھ رہی تھیں آپ کا۔ آپ جا کر ان کی بات سن لیں.....“

”اچھا..... اچھا سن لیتا ہوں ان کی بات۔ نہیں کھانا تمہارے یہ بسکٹ۔ چلا جاتا ہوں یہاں سے، لیکن مہربانی ہوگی ایک گلاس پانی لے آؤ میرے لیے۔ بہت پیاس لگی ہے۔ حلق میں کانٹے پڑ رہے ہیں۔“ اب وہ کیا کہتی، چارٹنا چارٹھنا پڑا۔ اس کے جاتے ہی وہ سخت چڑے ہوئے انداز میں بولا۔

”میری شکل وہی ہے پہلے والی۔ جسے تم چوری چوری دیکھا کرتی تھیں۔ اور مجھتی تھیں کہ مجھے پتا نہیں چلتا۔ جبکہ میں بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ یہ تو میں بہت نرم دل ہوں جو تمہاری مشکل آسان کرنے کا خیال آ گیا۔ بھئی اب تو تم پورے اعتماد سے دیکھ سکتی ہو مجھے۔ اب کسی بات کا ڈر نہیں ہے۔ میں اب بھی ویسا خوب صورت ہوں۔“

اور ہونا تو یہ چاہیے تھا اس شوخی پر وہ ہنس دیتی۔ لیکن وہ تو سسکیاں بھر رہی تھی۔ بہت دیر سے خود پر باندھا ہوا بند اک دم ہی ٹوٹا تھا۔ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپائے وہ بری طرح روتی ہوئی اس کے بھی ہاتھ پاؤں پھلا گئی۔

”سوریا..... سوریا..... کیوں رو رہی ہو۔ کیا ہوا ہے..... خدا کے لیے مت روؤ..... اوئے کچھ تو بتاؤ مجھے۔ سوریا میرا دل بند ہو جائے گا۔ پلیز..... آنٹی کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا..... سب خیریت ہے نا۔“

”سب ٹھیک ہے لالہ بس ایک گڑبڑ ہو گئی ہے اور یہ کیا بتائے گی۔ یہ تو جب سے آئی ہے اسے رونے سے فرصت نہیں۔ میں آپ کو بتاتی ہوں۔“

اب یہ بات چھپنے والی تو بھی نہیں اب یا تب اسے علم ہو ہی ہی جانا تھا اور جو پریشانی آگئی تھی اس سے نبٹنے کا کوئی حل بھی نکالنا تھا۔ سو گل مینا نے مناسب الفاظ کا چناؤ کرتے اسے سب بتا دیا۔ سن کر وہ بھی یونہی سیناٹے میں آگیا تھا جیسے کچھ دیر قبل وہ خود گم سم ہوئی تھی۔ لیکن اس نے جلد ہی خود کو سنبھالا۔

”وہاٹ ربش..... ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ ایسا سوچ بھی کیسے سکتے ہیں۔ اگر انہیں عنبرہ کی اتنی فکر ہے تو اس کے لیے کوئی اور رشتہ ڈھونڈ لیں۔ میں نے ان سے سوریا کا ہاتھ مانگا ہے اور.....“

”لیکن لالہ! سوریا کا رشتہ تو وہ اس کے ماموں کے.....“ گل مینا کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی اس نے ہاتھ اٹھا کر اسے چپ کر دیا۔ چہرہ مارے ضبط کے اک دم ہی لالہ ہوا تھا۔ سوریا کی پچکی بندھی ہوئی تھی۔ اک بے بس سی نظر اس پر ڈالی۔

”تم اسے پانی پلاؤ، اور سمجھاؤ۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ رونے سے مسئلہ حل نہیں ہوتے۔ میں بات کرتا ہوں داجی سے۔“ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا واپس کار کی جانب گیا۔ کچھ ہی لمحوں میں ٹائر چٹکھاڑتے ہوئے پیچھے کو پھسلے تھے۔

”یا الہی خیر.....“ گل مینا نے بے اختیار سینے پر ہاتھ رکھا پھر اسے گھورا۔

”تم سے کہا بھی تھا سنبھالو خود کو۔ کر دیا نا لالہ کو آتے ہی پریشان۔ اب اتنے غصے میں نکلا ہے۔ یا اللہ اسے تیری ہی امان میں دیا۔“ وہ سر پر پلو ڈالے خیر مانگ رہی تھی۔ اسے بھی رونادھونا بھول کر اک نئی فکر لگ گئی۔

☆☆☆

”اوئے خوچہ اگر آج تم نے چالاکی دکھایا تو ام تمہارا سر توڑ دے گا۔ پورا دل سے کام کرو۔“ دلبر نے تمللا کر کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ دور سے کسی کو تیز تیز اس طرف آتے دیکھ کر رک گیا۔ ہاتھ کا چھبنا کر بغور دیکھا اور اک نعرہ مستانہ بلند کیا۔

”اے..... یہ تو اپنا منصب زمان صاحب ہے۔“ پتھر راغلے.....“ اس سے پھر کسی وقت نبٹنے کا سوچتا وہ دوڑ کر اس جانب بڑھا۔

”کہاں ہے وہ تمہارا کھڑوس صاحب.....؟“ منصب نے گویا لفظ چبائے تھے۔ دلبر نے الجھ کر دیکھا۔

”اس نام کا تو کوئی صاحب نہیں امارا.....“ منصب نے اسے ایک ہاتھ سے پیچھے کیا اور اسی رفتار سے آگے بڑھ گیا۔ دور اک درخت کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑے میثم کو اس نے دیکھ لیا تھا اور وہاں اس طرف جاتے وہ کئی لکڑیوں کے ڈھیر سے اک موٹے ڈنڈے کو اٹھانا نہیں بھولا تھا۔ اس کے پیچھے آتے دلبر نے اس کی حرکت دیکھی تھی۔ لیکن وہ قطعاً اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ اس کا ارادہ کیا ہے۔ وہ تو جب چند قدموں کے بعد اس نے نشانہ باندھ کر میثم کی طرف لکڑی اچھالی تب خبر ہوئی۔ وہ تو اس ڈنڈے کا بھلا ہو جو اپنے وزن کے باعث آدھے راستے میں ہی دھپ سے پتھروں پر جا گرا۔ اس نے رک کر ایک اور ہتھیار چننا۔ اب کی دلبر سے رہا نہ گیا۔

”یہ..... یہ کیا کرتا ہے صاحب.....“

”اوئے خانہ خراب دیکھتی کیا اے پکڑو.....“

دلبر پاس سے چیتا ہوا گزرا وہ بھی دوڑ پڑا۔

دونوں نے اس کے بازو جاد بوچے۔

”اوئے اوئے..... پیچھے ہٹ جاؤ۔ چھوڑ دو۔“ میثم اوٹ سے نکل کر بھاگتا آیا۔ دونوں کے پیچھے ہٹتے ہی منصب نے جھپٹ کر میثم کا گریبان پکڑا اور دو چار زور دار جھٹکے دے ڈالے۔ ساتھ ساتھ وہ پشتوں میں کچھ بول بھی رہا تھا۔ جسے سن کر دلبر اور گلغام نے پھٹی آنکھوں سے اک دوجے کو دیکھا۔ میثم نے اتنے ہی اطمینان سے اس کے ہاتھ پکڑے۔ اب یہ اور بات کہ اسے اتنے مہینے ہو گئے تھے اس پہاڑی علاقے میں رہتے، ابھی اس کی جو توضیح ہوئی تھی وہ خوب سمجھ گیا تھا۔ لیکن جو کر رہا تھا اگر وہ اس سے زیادہ بھی کر دیتا تو وہ برانہ مانتا۔ کیونکہ اتنی دور تک آنے والا ضرور کسی خاص وجہ سے یہاں تک آیا تھا۔ اس نے گلے سے لٹکی پانی کی بوتل اتار کر اس کی طرف بڑھائی۔ اور بازو سے پکڑے ایک طرف لے گیا۔ منصب اب بھی بولے جا رہا تھا۔

”دلبر، گلغام..... جلدی سے جاؤ، صاحب کے لیے کھانے کا بندوبست کرو،“ اس نے دور سے ہی آواز لگا کر ان دونوں کو وہاں سے دوڑایا تھا۔

”تم کھاؤ کھانا۔ میں تو تمہاری بوٹیاں کھانے آیا ہوں یہاں۔“ منصب کا بس نہ چلتا تھا اسے کچا چبا جائے۔

”اوخر.....“ (کھاؤ میثم نے بلا تامل اپنا ہاتھ اس کے منہ کے آگے کر دیا۔ اور اس کا منہ کھلا..... اس کا ہاتھ کھانے کے لیے نہیں بلکہ اسے پشتو کا لفظ بولتے سن کر۔ اور اگلے ہی لمحوں وہ منہ پھیر گیا۔ میثم کو اس کی کھسیا ہٹ مزادے گئی۔

”اور سناؤ کیسا رہا سفر؟ سب کیسے ہیں.....“ داجی، نیا جان!“ اس سے آگے کسی کا حال پوچھنے کی زبان میں سکت ہی نہیں تھی۔ وہ تمللاتا مڑا۔

”تمہیں کسی سے کیا۔ کوئی جیے یا مرے۔ تم تو خود کو ان پہاڑیوں میں گم کر چکے ہو۔ بس اتنا ہی کافی ہے۔ کتنی کالز کیں میں نے۔ مگر تمہارا فون ہی نہیں ملتا۔ اتنے بڑی تو پرائم منسٹر بھی نہیں رہتے ہوں گے

جس قدر مصروف تم ہو گئے ہو یہاں آ کر۔“ وہ بے طرح سلگا تھا۔ اس کا رخ ہنوز ادھر ہی تھا۔ فوری وضاحت پیش کی۔

”سوری..... فون ٹوٹ گیا تھا۔“

”اور میں نے کتنے میسجز کیے۔ کیا وہ بھی تم تک نہیں پہنچے۔“ وہ چیخ پڑا۔

”مے ہیں۔ سب پیغام ملے ہیں۔ لیکن کس لیے کرتا تمہیں کال۔ نہیں دل چاہا میرا تم پھر مجھے ایک وہی کہانی سناتے۔ امی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ابو شکل سے بیمار لگنے لگے ہیں۔ ابا جی کے کندھے اور جھک گئے ہیں۔ سوریا رو کر پاگل ہو گئی ہے..... اس انف..... تنگ آگیا ہوں میں یہ سب سن سن کر۔ اچھا تھا تم مجھے اس دن ہی مرنے دیتے۔ ان سب نے بے اعتباری کی آگ میں جھلسا کر مارا ہی تھا مجھے۔ تم بھی مرجانے دیتے۔ کیوں راہ میں آئے تھے میری۔ کیوں بچایا تھا مجھے۔ اب میں روز ایک نئی موت مرتا ہوں۔ جتنا میں ان بے حس لوگوں کو بھلانا چاہتا ہوں۔ تم اتنا ہی مجھے ان کی یاد دلاتے ہو۔ اسی لیے توڑ دیا تھا اس مصیبت کو جس کے ذریعے صور پھونکتے تھے تم۔ اب بھی تمہاری اپنی کوئی بات ہے تو کر سکتے ہو۔ باقی کوئی فالٹو کا قصہ سنانے کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ قطعیت سے کہتا چند قدم دور چلا گیا۔ منصب نے ہونٹ بھیج کر اسے دیکھا اور ایک پتھر اٹھا کر پوری قوت سے کئی گز پرے اچھال دیا۔

”یقیناً تم نے مجھے مارنے کی نیت سے اٹھایا ہوگا۔ پھر ارادہ کیوں بدل دیا۔ مار دیتے۔ تمہاری مہربانی سے دنیا سے ایک بدنما کہانی ختم ہو جاتی۔“ میثم پلٹا تو چہرے پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔

”ماردوں گا، ضرور ماردوں گا۔ اگر تم نے اپنا دماغ ٹھیک نہ کیا تو۔ خود تو یہاں چھپ کر سکون سے بیٹھے ہو۔ اور وہاں تمہاری بلا میرے گلے ڈالی جا رہی ہے۔ اور میں اسے بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ قصہ پاک کردوں گا اس کا بھی۔ سمجھتے کیا ہو تم۔ میرے ساتھ تو وہ ہوا ہے کہ نیکی برباد گناہ لازم۔ میری طرف

سے جاتے بھاڑ میں۔ مرجاتے چاہے۔ اب میں تو نہ مر رہا ہوتا۔ حد ہوگئی ہے۔“ اس نے مارے طیش کے اک اور پتھر اٹھایا۔ اور وہی عمل کیا۔ میٹم نے پانی کی بوتل کا ڈھکن کھول کر اس کے آگے کر دیا۔

”لو پانی پیو۔“ اور منصب نے کینہ تو ز نظروں سے گھورتے بوتل پکڑ لی۔ اور اگلے بل اس نے بوتل ہونٹوں سے لگانے کے بجائے سارا پانی اس کے سر پر اندیل دیا۔ بخ بستہ ہوا میں اور سرد پانی۔ میٹم بے چارہ سی بھی نہ کر سکا۔

”اب یقیناً تمہارا دماغ ٹھنڈا ہو گیا ہوگا۔ اور بے فکر رہو، کوئی فالتو کا قصہ نہیں ہے میرے پاس۔ میں بھی کوئی زمانے بھر کا فارغ آدمی نہیں ہوں جو تمہاری فکر میں گھلتا پھروں۔ سو بکھیرے ہیں میرے بھی۔ بات اگر میری اپنی ذات کی نہ ہوتی تو میں بھی سفر نہ کرتا یہاں تک۔ اور خبردار جو تم نے کوئی بکواس کی۔ چپ چاپ سنتے چلے جاؤ۔“

منصب شروع ہو گیا۔ نہ کوما، نہ فل اسٹاپ۔ الف سے بے تک تمام ماجرا کہہ سنایا۔ وہ پہلے ہی تاکید نہ کرتا تو بھی وہ کچھ بولنے جو گا بچا کہاں تھا۔ لبوں پر تو قفل پڑ گئے تھے۔ نظر پر اسرار سرمئی پہاڑیوں پر لگی تھی۔ وہ بھی جیسے ان ہی کی طرح ہو گیا تھا۔ ساکت۔ جامد۔ بے حس۔ وہ جتنا بھی بھاگ لیتا۔ چھپ جاتا مگر وہ لمحے اس کا دامن چھوڑتے ہی نہ تھے۔ کسی زہریلے ناگ کی طرح لپٹے تھے۔ بل بل ڈستے۔ رگوں سے لہو نچوڑ لیتے۔

وہ سب اس کے اپنے تھے۔ اور افسوس کیسے اپنے تھے جنہوں نے اسے توڑتے ایک بل نہیں لگایا تھا۔ ہاں ٹھیک ہے اس سے غلطی ہوئی اسے بھی غصہ اتارنے کے لیے رات کا وہ پہر نہیں چننا چاہیے تھا۔ جہاں کئی گھنٹے جل سگ کر گزارے تھے، وہاں کچھ اور وقت نہیں گزار سکتا تھا۔ باز پرس دن کے اجالے میں بھی کی جاسکتی تھی۔ اور اس نے کیا ہی کیا تھا۔ باز وہی تو پکڑا تھا اس کا۔ اف۔

”نہیں۔۔۔۔۔ کبھی نہیں۔۔۔۔۔ تمام عمر نہیں۔۔۔۔۔ نہیں

معاف کروں گا اسے۔ کیا اسے اعتبار نہیں تھا مجھ پر۔۔۔۔۔؟ وہ ایسا سمجھتی ہے مجھے۔ کیا وہ مجھے جانتی نہیں تھی۔ بچپن سے ساتھ تھے ہم۔ اور اس نے بے اعتبار کرتے اک لمحہ نہ لگایا۔ کیا وہ ذرا نہ جانتی تھی مجھے۔ میرے احساسات کو۔ میں تو اسے گرم ہواؤں سے بھی بچاتا آیا تھا اور۔۔۔۔۔ اور اس نے کیا کیا میرے ساتھ۔۔۔۔۔ اس نے کیوں کیا ایسا۔۔۔۔۔ کیوں۔۔۔۔۔ اندر سے کرچی کرچی کر دیا مجھے۔ ختم کر ڈالا میرا وجود۔ اب تو بھر بھری مٹی کے سوا اور کچھ نہیں۔ سب کی نظروں سے گرا دیا مجھے۔ مار دیا مجھے۔۔۔۔۔“

اس کی آنکھیں لہو رنگ ہو رہی تھیں۔ سینے کے اندر ایسی آگ جل رہی تھی جیسے کوئی الاؤ بھڑک اٹھا ہو۔ کچھ دیر پہلے منصب پتھر اچھال رہا تھا اب اس کے ہاتھ ان پتھروں کے پیچھے پڑ گئے تھے۔ وہ اٹھ کر اک طرف ہو گیا اچھا تھا۔ وہ اندر بھر اغبار اک بار خوب اچھی طرح نکال ہی لے۔

☆☆☆

کتنا وقت بیتا اس نے تو خود کو کمرے تک ہی محدود کر لیا تھا۔ کتنے ہی دن یونی نہ گئی۔ ہر چیز سے بے زار وہ اپنی ہی ذات کے قلعے میں محصور ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ تو سہیل اور نہنہب کے آنے سے اتنا ہوا کہ وہ اپنے کمرے سے نکل کر گھر میں چلتی پھرتی نظر آنے لگی۔ کبھی کبھار بات بھی کر لیتی۔ پھینکی سی مسکان بھی کسی بل چہرے پر چھب دکھلا جاتی۔ یہی شکر تھا کہ اس نے خود کو سنبھال لیا تھا۔ ورنہ وہ تو بہو اور بیٹے کے سامنے نظر نہ اٹھاتے وہ تو انہیں ہی اس کا خیال رکھنے کو کہہ گئے تھے اور کیسی ستم ظریفی تھی کہ وہ اپنے ہی گھر میں غیر محفوظ ٹھہری تھی۔ اف۔۔۔۔۔ جب جب بھی وہ گزری رات دھیان کے پردے پر لہرائی ان کا خون کھولتا پانی بن جاتا۔

کاش کوئی ایسی ترکیب ہوتی کہ وہ اس بدنما لمحے کو زندگی کے ورق سے کھرچ سکتے۔ اپنے ذہن دل پر آسیب بن کر چٹ جانے والے اس درد کو کسی جھاڑ پھونک سے دور کر سکتے۔ ایسا کیا کرتے کہ

روح اس بھیاںک بل کے شکنجے سے آزاد ہو جاتی۔ بس ایک ہی دعا تھی وہ آنکھیں بند ہونے سے پہلے اپنی لاڈلی عزیزہ کو دل کی پوری آمادگی کے ساتھ کھل کر ہنستے دیکھ لیں۔ اس کی آنکھ میں ٹھہرے گونگے آنسو ان کے زخموں پر ممکن قطروں کی طرح گرتے تھے۔

آج کتنے دن بعد انہوں نے اسے اپنے کمرے میں دیکھا تھا۔ وہ نماز عشاء ادا کر کے مسجد سے لوٹے تو وہ صوفے پر دونوں پاؤں اوپر رکھے گھٹنوں پر سیرنگائے بیٹھی تھی۔ آہٹ پر چہرہ اٹھایا اور انہیں دیکھ کر جھٹ پاؤں نیچے اتارے۔

”ارے۔۔۔۔۔ ارے بیٹی رہو۔ کیوں اٹھ کھڑی ہوئیں۔“

”وہ۔۔۔۔۔ وہ میں پوچھنے آئی تھی کہ آپ کو کسی کی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے اباجی؟“ وہ یوں بولی گویا بھول گئی ہو کیا کہنا تھا۔

”نہیں میرے بچے! مجھے کسی چیز کی طلب نہیں ہے۔ شام میں خان صاحب کی طرف چائے کے ساتھ کافی کچھ کھالیا تھا۔ اب بس دو کھاؤں گا۔ اور کھڑی کیوں ہو۔ بیٹھ جاؤ۔ یونی تو جارہی ہونا۔ پڑھائی کیسی چل رہی ہے تمہاری۔“

اس نے جواب میں فقط سر ہلادیا۔ انہوں نے ٹوپی اور سیج سائڈ ٹیبل ٹیبل پر رکھی۔ جیب سے چیزیں نکال کر دراز میں ڈالیں۔ نگلیہ جھاڑ کر سیدھا کیا اور بیڈ پر بیٹھتے اسے دیکھا وہ جوں کی تو کھڑی تھی۔

”ادھر آؤ میرے پاس۔ کیا بات ہے کچھ کہنا چاہتی ہو؟“ اور یہ ان کے لہجے کا اثر تھا یا وہ اتنی زود رنج ہو رہی تھی کہ جانے کب کے سنبھالے آنسو ان کے صرف اتنا پوچھنے پر ہی رخساروں پر قطار در قطار لڑھکتے چلے آئے۔ وہ کانپتے قدموں سے ان کے قریب آ بیٹھی تھی۔ انہوں نے سخت بے چین ہو کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

”میں پہلے ہی بڑی اذیت میں ہوں۔ مجھے اور مت الجھاؤ بیٹا۔ کیا ہوا۔ کیوں پریشان ہو۔ کیوں رورہی ہو میری جان!“

”اباجی۔۔۔۔۔ اباجی۔۔۔۔۔ ایسا نہ کریں پلیز۔ میں اپنی بے وقوفی کی پہلے ہی بڑی سزا بھگت رہی ہوں اور سزا نہ تجویز کریں میرے لیے۔ منصب بھائی کا رشتہ سویرا کے لیے آیا ہے۔ آپ داجی کو اس کے لیے ہاں کر دیں۔ میں مگر کبھی منصب بھائی سے شادی نہیں کر سکتی۔ مجھے بس ایک بار معافی دیو ادیں۔ مجھے معاف کر دیں اباجی! میں بہت ڈر گئی تھی۔ وہ اتنے غصے میں تھے کہ مجھے لگا وہ ابھی میری گردن دبوچ لیں گے۔ مجھے ان کے غصے سے بہت ڈر لگتا ہے۔

اباجی! وہ ایسے نہیں ہیں۔ میں جانتی ہوں ان کا ارادہ غلط نہیں تھا۔ لیکن بہت کچھ غلط ہو گیا۔ وہ تو انہوں نے نینا کی ساری بکواس سن لی تھی۔ اس لیے اتنے شدید غصے میں تھے۔ وہ باتیں ہی ایسی کر رہی تھی۔ بیٹا بھائی کا کوئی قصور نہیں ہے۔ ان کی کوئی غلطی نہیں ہے سب میری غلطی ہے۔ سارا میرا قصور ہے۔۔۔۔۔ مجھے ایسے نہیں ڈرنا چاہیے تھا لیکن میں کیا کرتی۔۔۔۔۔ بیٹا بھائی ایسے بالکل نہیں ہیں۔ آپ تو جانتے ہیں انہیں اباجی۔۔۔۔۔ پھر آپ نے کیوں سمجھا ایسا۔۔۔۔۔ کیوں مارا انہیں۔ پتا نہیں کہاں چلے گئے ہیں وہ اب تک واپس کیوں نہیں آئے۔ میں مرجاؤں گی۔ میں اس گلٹ سے مرجاؤں گی۔ وہ گھر آ جاتے، مجھے مار لیتے، اپنا غصہ نکال لیتے۔ لیکن یوں سب کو چھوڑ کر کیوں چلے گئے۔ مجھ سے کیوں ہوئی ایسی بھول۔ پلیز اباجی انہیں ڈھونڈیں نا۔ آپ کو اللہ کا واسطہ۔۔۔۔۔“

وہ زار و زار روئی بے ربط بولتی دونوں ہاتھ ان کے سامنے جوڑے ہوئی تھی اور وہ پتھر ہو گئے۔ وہ اسے یوں دیکھ رہے تھے جیسے پہلی بار دیکھ رہے ہوں۔ یا پہچان بھول گئے ہوں۔ وہ کہہ رہی ہے کہ اس سے بھول ہوئی۔ لیکن نہیں شاید بھول تو ان سے ہوئی تھی۔ وہ تو اتنی عمر گزار چکے تھے۔ تو کیا ساری عمر رائیگاں گئی تھی۔ وہ بوڑھے ہوئے تھے تو کیا سٹھیا بھی گئے تھے۔ وہ اپنے ہی ہاتھوں کے پالے کو بنا جرم کے سزا دیے بیٹھے تھے اور ایسے مطمئن جیسے بہت بڑا کمال کر دیا ہو۔ ان کے۔ چار اطراف شائیں شائیں

ہو رہی تھی۔ تیز جھکڑ چل رہے تھے۔ سب کچھ گڈمڈ ہونے لگا۔ انہیں کچھ بھول رہا تھا کچھ یاد آ رہا تھا۔

”ہاں..... ہاں میں ہی کوتاہ بین ہو گیا تھا.....“

یا اللہ..... یہ کیسا جرم سرزد ہو گیا۔ اف..... میرے خدا..... وہ کیسا چپ ہو گیا تھا۔ کوئی وضاحت، کوئی صفائی تک نہ دی تھی اور..... اور میں نے اسے کچھ بولنے کا موقع ہی کب دیا۔ پوچھا تو ہوتا اس سے کچھ تو بولنے دیا ہوتا۔ عدالت ملزم کو ایک موقع تو دیتی ہے۔ میں ایسا بدحواس ہوا کہ بس فیصلہ ہی سنا دیا۔ ہائے میرا بچہ پتا نہیں کہاں کہاں کی ٹھوکریں کھا رہا ہو گا۔ یا اللہ کہاں ہو گا وہ.....“ ان کے پاس روتی بلکتی پوتی کی تسلی کے لیے ایک حرف نہیں تھا۔ وہ تو صرف ڈر گئی تھی اور اب وہ پورے اندر سے مر گئے تھے۔ کیا اتنا ہی جانتے تھے وہ اسے۔ اتنا ہی اعتبار تھا اس پر۔ وہ اذیت کی کھائی میں اوندھے منہ جا پڑے تھے تو اس پر کیا ہوتی ہوگی جس نے ملزم ہو کر ایسی سخت سزا جھیلی۔ کیا وہ اک پیشی کا حق دار بھی نہ تھا۔

”اوہ..... میرے بچے..... معاف کر دینا مجھے۔ وہ دونوں ہاتھوں میں سر تھامے بیٹھے تھے اور ان کا سفید دامن بھیگتا جا رہا تھا۔

☆☆☆

”صبح پیاری ایک کام آپڑا ہے تم سے.....“ روشن لفظ اسکرین پر جگمگا رہے تھے۔ سویرا کے لبوں پر اک چمکیلی سی مسکان آٹھری۔ چاہتوں کا مان بھر رنگ اس کی آنکھوں سے چھلک رہا تھا۔ محبت حسن نکھارنے میں ہر نسخے ہر ٹونے کو پیچھے چھوڑ دیتی ہے۔ آج کل اس کی سہیلیاں بھی بے اختیار پوچھ لے لیں۔

”کون سی پروڈکٹ یوز کرنے لگی ہو۔ سچ میں تمہارا تو رنگ روپ اور سنور گیا ہے۔“ اور وہ کھلکھلا کر ہنس دیتی۔ اب ہر کسی کو راز کی باتیں تو نہیں بتاتے ہیں۔ وہ بھی کیوں بتاتی کہ اس کے لیے دنیا کی بہترین پروڈکٹ منصب زمان مروت ہے۔ جس کے اپنا ہونے کے احساس نے ہی اسے سرتا پابدل کر رکھ دیا ہے۔ زندگی ضرور اس پر مہربان بھی جو

ایسا دلربا اور دلکش ہمد ملتا تھا۔

”سویرا! تم سب کے لیے رہو گی۔ میری تو تم صبح ہو۔ صبح زندگی..... صبح آرزو..... صبح جادواں..... صبح بہاراں..... صبح تمنا..... صبح.....“ وہ اور بھی جانے کیا کیا بولتا اس کی سماعتوں میں رس گھول رہا تھا۔ وہ قل قل کرتی ہنسنے لگی۔

”اللہ..... اللہ..... کون کہہ سکتا ہے منصب زمان خشک پھلوں کا کاروبار کرتے ہیں۔ آپ کالب دلچہ تو آپ کو تازہ پھولوں کا بیوپاری بتا رہا ہے۔ آپ کے انداز تو کسی شاعر کے سے ہیں۔ ایسا کلام..... ایسا ردیف و قافیہ۔“

”یہ کلام کی سمجھ تو آگئی۔ لیکن یہ ردیف اور قافیہ کیا تمہاری سہیلیاں ہیں۔“ ادھر معصومیت کی انتہا تھی۔ وہ ہنس ہنس کے دوہری ہو گئی۔ وہ ایسی ہی شگفتہ باتیں کرتا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر کلیاں چلی رہتیں۔ اب جو کام آپڑا تھا۔ ضرور وہ بھی کچھ انوکھا ہی ہوگا۔ اور اس کے جوابی ٹیکسٹ ”جی فرمائیں“ کے بعد عقدہ کھلا۔

”نیا خان کل گلگت جا رہی ہیں۔ ان کے لاڈلے پوتے کی منگنی ہوئی ہے نا۔ تو سب خاندان والوں کا منہ میٹھا کرنا چاہتی ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ وہ اس خوشی کی مٹھائی اپنے ہاتھوں سے بانٹیں۔ لیکن ایک مسئلہ ہے۔ وہ چلی جائیں گی تو ان کے پرندوں کا خیال کون رکھے گا۔ کیا تم سنبھالو گی؟“

”لیس، بھلا یہ بھی کوئی مسئلہ ہے۔ پہلے بھی تو سنبھالے تھے میں نے۔ اب بھی پورا خیال رکھوں گی ان سے کہیں، بے فکر ہو کر جائیں۔“ اس نے مکمل اعتماد سے ٹائپ کیا۔

”اوہ۔ ٹھیک یو۔ تم کتنی اچھی ہون۔ لیکن ایک اور بھی مسئلہ ہے۔ اس بار ان کا پوتا ان کے ساتھ نہیں جا رہا۔ کیا تم اس کا بھی اتنا ہی خیال رکھو گی؟“

”بالکل..... یہ بھی کوئی مسئلہ نہیں۔ بشرطیکہ پوتے صاحب بھی ان پرندوں کے ساتھ ان کے پتھرے میں ہوں تو.....“ اور اس بار کسی حرف کے

جائے کھلی آنکھوں والی ایک شکل آئی تھی۔

”اب دیکھیں نا۔ میں تو یونی جانی ہوں۔ میں پھیلی بار بھی ان کی کیئر ٹھیک سے نہ کر سکی تھی۔ نیا جان کو وہاں کسی دشمن جاں نے فکر میں ہی ڈالے رکھا تھا کہ کہیں ان کے لولی برڈز بھوکے پیاسے نہ بلکتے ہوں۔ تو اس بار وہ ڈبل ذمہ داری میرے ناتواں شانوں پر ڈال کر جانا چاہ رہی ہیں تو بہتر حل یہی ہوگا کہ وہ اپنے پوتے کو بھی ان کے ساتھ ہی بند کر جائیں تاکہ ایک تو ان کا بھی آسانی سے خیال رکھا جاسکے اور دوسرا یہ کہ وہ خود اپنی آنکھوں سے میری کارکردگی بھی ملاحظہ کر سکیں۔“ اور اس کے ایسے مفصل جواب نے منصب کو خوب ہی ہنسایا تھا۔ یعنی وہ ایسی بھی بے خبر نہیں تھی۔ اس کا جوابی ٹیکسٹ آیا۔

”نیا جان کے پوتے کو اپنی محبت کے جال میں تو پھانس لیا ہے محترمہ آپ نے، اب اس معصوم کو پرندوں کے پتھرے میں بھی ڈالنا چاہتی ہیں تو وہ آپ کی خوشی کے لیے اس پر بھی تیار ہے۔“ اور اب وہ کیا کہتی اس ”معصوم“ نے تو بولتی ہی بند کر دی تھی۔ گال گلال ہو گئے۔ یوں ہی مسکراتے ہوئے نگاہ اٹھائی۔ سامنے ہی عنبرہ کھڑی تھی۔ جو اسے عجب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ کیا تھا اس کے انداز میں اور اس کے چہرے پر اب بھی وہی تاثرات کیوں تھے جو گزشتہ دنوں میں جیسے اس کے نقوش کا حصہ بن گئے تھے۔ ارے اب تو کوئی پریشانی نہ رہی تھی سب مسئلے حل ہو گئے تھے۔ اب تو اسے بھی ہنستا مسکراتا نظر آنا چاہیے۔ آخر کو اس کی بھی تو منگنی ہوئی تھی۔

ہاں..... ہاں آپ سب بالکل ٹھیک سمجھتے.....

☆☆☆

منصب نے تو اس کا پیچھا لے لیا تھا کہ وہ اب سارا غصہ بھول بھال واپس چلے۔ لیکن اس نے کورا جواب دے دیا۔

”یہ کوئی ایشو نہیں ہے جو تم یہاں تک سفر کر کے آئے ہو۔ تم عنبرہ کے لیے صاف انکار کھلو۔ بس معاملہ ختم۔“

”اچھا..... اوہ کتنا آسان حل بتایا آپ نے، میرا کندہ دماغ تو اس طرف گیا ہی نہیں تھا۔ میں بد عقل خواہ مخواہ اتنا سفر کر کے یہاں تک آ گیا۔ مجھے اتنے پیغام دینے کے بجائے بس ایک مشورہ مانگ لینا چاہیے تھا تم سے۔ اوہ..... کتنا بے وقوف ہوں نا میں بھی سچ میں۔ چلو ٹھیک ہے، میں انہیں انکار کر دیتا ہوں۔ میری طرف سے تو بات ختم ہو جائے گی۔ لیکن اگر انہوں نے آنا فانا اس کا رشتہ اٹھا کر کسی اور سے طے کر دیا تو.....“

”ہاں تو کر دیں..... وہ ان کی پوتی ہے اور پورا حق رکھتے ہیں وہ۔“ وہ کھڑکی سے باہر دیکھتا کہہ رہا تھا۔ منصب نے اک جھٹکے سے اس کا رخ اپنی طرف کیا۔

”اب یہی جملہ ذرا اک بار میری آنکھوں میں دیکھ کر کہو۔“ اور وہ اس سے کہیں بڑے جھٹکے سے شانہ چھڑاتا منہ موڑ گیا۔

منصب ہنس ہنس کے بے حال ہونے لگا۔ وہ تلملتا اس پر ہاتھ میں آئی ہر چیز اچھا ل رہا تھا۔ اور اسی رات جب منصب مایوس ہو کر اکیلے ہی واپسی کی تیاری کر رہا تھا کہ اس کے سیل پر کال آئی تھی۔ منصب کچھ نہیں بول رہا تھا بلکہ اس نے سیل کان سے ہٹا کر اس کا اسپیکر آن کر دیا۔

”منصب میرے بچے دیکھو مجھ سے جھوٹ نہ بولنا۔ مجھے سویرا نے بتا دیا ہے کہ تم جانتے ہو میٹم کہاں ہے۔ دیکھو..... دیکھو مجھے بس ایک بار اس کے پاس لے چلو۔ مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوئی۔ بوڑھا ہوں نا..... باگل ہو گیا تھا۔ میرا میٹم تو میرا بیٹا ہے نا وہ کوئی خطا نہیں کر سکتا۔ میں اس سے معافی مانگ لوں گا۔ میں اس کے سامنے ہاتھ جوڑ لوں گا۔ بس ایک بار..... مجھے اس کے پاس لے چلو۔ بس ایک بار..... منصب.....“ ابا جی زار و قطار روتے اس کی منت کر رہے تھے۔ میٹم اس سے زیادہ نہیں سن سکتا تھا۔ اس کے ہاتھ سے فون جھپٹ کر پرے پھینک دیا اور بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ آخر کار پچانہ صبر چھلک ہی گیا تھا۔ منصب نے بھی تسلی نہ دی۔ کھل کر رونے دیا۔

”چچ..... چچ میرا اتنا مہنگا آئی فون.....
خبیث..... اسکرچ ڈال دیے اس پر۔“ منصب فون
کا جائزہ لیتا دانت کچکا رہا تھا۔
”مرد نہیں..... نیا لے دوں گا۔“ وہ آستین
سے آنسو پونچھتا اٹھا۔ اب وہ الماری سے بیک نکال
رہا تھا۔

”اور وہ جو پہلے تو نے توڑا؟“
”وہ بھی لے دوں گا۔“

”اور وہ جو میں نے اتنا خرچ کیا تھا پر۔“ تجھے
یہاں لایا۔ پھر چار بار تیرے پیچھے تیری خبر لینے آیا
اور وہ.....“

”بے فکر رہ، سارے ہر جانے بھر دوں گا۔“ وہ
بیک بند کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ منصب مطمئن
ہو گیا پھر وہ کچھ دیر بعد بولا تھا۔

”خان! تیری بے وقوفی کے قصے تو بہت سن
رکھے تھے میں نے۔ لیکن تیری کمینگی سے پہلی بار
واقف ہوا ہوں۔ سچ بتا، تو پہلے سے ہی اتنا کمینہ تھا یا
اب ہو گیا ہے۔ چل خیر، پہلے سے ہے یا اب ہو گیا ہے
مجھے اس سے کیا لینا دینا۔ مجھے تو یہ خیال آ رہا ہے۔ اچھا
ہوا تیری اصلیت مجھ پر وقت پر ہی ظاہر ہو گئی۔ اب تم
از کم اباجی کو سمجھانا آسان ہو جائے گا۔ یوں بھی بہت
پیار کرتے ہیں وہ اپنی پوتیوں سے۔“

اور اس کی بات کا مطلب کیا ہے جب سمجھا تھا
تو کمرے کی ہر چیز اب میٹم کے سر کا نشانہ لے رہی
تھی۔ اور ان کے لیے چائے لے کر آنے والا دلبر
خان خود سے کہہ رہا تھا۔

”دواڑ و پوشونت لو انے دی۔“

(دونوں ہی ایک جیسے پاگل ہیں)

☆☆☆

”ارے عزیزہ! کھڑی کیوں ہو آؤ بیٹھو۔“ سویرا
نے خوش دلی سے خیر مقدم کیا۔ وہ ٹھس سے انداز
سے چلتی پاس آ بیٹھی۔

”کیا بات ہے، طبیعت ٹھیک ہے تمہاری۔“
سویرا کو اس کے چہرے کی بے رنجی نے پریشان کیا۔

اس نے اثبات میں گردن ہلاتے یونہی بالوں پر ہاتھ
پھیرا تو نظر اس کی خالی انگلی پر جا پڑی۔ یاسمین نے
اپنی سب سے مہنگی اور دلکش ڈیزائن والی انگلی بھوکو
پہنائی تھی۔ جو سویرا کو بے حد پسند تھی اور ماں سے
لینے کا ارادہ بھی تھا۔ لیکن اس کے کچھ کہنے سے پہلے
ہی انہوں نے وہ اپنی انگلی بھوکو پہنا دی تھی۔ جو
اب اس کے ہاتھ میں نہیں تھی۔ اس کا تشویش زدہ
ہونا فطری تھا۔ بے اختیار پوچھا۔

”تمہاری رنگ کہاں ہے، کیوں اتار رکھی ہے تم
نے۔ چلو جلدی سے لے کر آؤ۔ ابھی امی کی نظر
تمہارے ہاتھ پر پڑی تو خفا ہوں گی۔ پتا ہے نا ان اولڈ
خواتین کی تو ہم پرستیوں کا۔ مجھے تو نیا جان نے اس دن
اچھا خاصا لیکچر پلایا تھا اس بابت۔ اگر رنگ ڈھیلی بھی
ہے تو اس کا بھی حل ہے میرے پاس۔ وہ رنگ ایک دو
بار امی سے لے کر میں نے بھی پہنی تھی۔ تب انہوں
نے ہی بتایا تھا کہ اس کو دھاگہ باندھ لو تو سائز فٹ
ہو جائے گا۔ تم لے کر آؤ۔ میں سمجھاتی ہوں۔“

اور اس کی اتنی طویل بات کا کوئی بھی جواب
دینے کے بجائے جس تیزی سے اس کے منہ
کٹورے بھرے تھے۔ انہوں نے سویرا کی تشویش
میں کئی گنا اضافہ کر دیا۔

”عزیزہ! کیا ہوا ہے۔ تم مجھے کچھ پریشان لگ
رہی ہو۔ بات کیا ہے بتاؤ مجھے۔ ارے کہیں وہ رنگ
ادھر ادھر تو نہیں کر بیٹھی ہو۔“ اور اس کے ہاتھوں تو نہ
جانے کیا کیا ادھر ادھر ہو گیا تھا۔ وہ اکیلے بوجھ
اٹھاتے اٹھاتے تھک گئی تھی، اس لیے تو ایک ہمدرد
ملنے ہی جھرنے کی مانند بہنے لگی۔ اور جو انکشاف
کیا۔ اس نے سویرا کا دماغ سننا ڈالا۔

”مگر کیوں..... ایسا کیوں کیا بھائی
نے۔ یعنی انہوں نے ممکنہ کے وقت جب تمہیں
انگلی پہنائی گئی۔ اسی پل کسی کی نظر میں آئے بتا
تمہاری انگلی سے رنگ واپس نکال لی..... مگر
کیوں..... انہوں نے تو اباجی سے کہا تھا کہ وہ ہر
بات بھلا کر تمہیں اپنائیں گے۔ پھر..... ایسا کیسے

کر سکتے ہیں وہ..... اوہ مائے گاڈ.....“ وہ سر پکڑ کر رہ
گئی تھی اور اس کے آنسو روکے نہ رکتے تھے۔

وہ تو سمجھتی تھی اس کا یوں چپ چاپ بڑوں کے
فیصلے پر سر جھکا دینا ہر خطا کی عام معافی ہے۔ اس کا تو
روم روم اس کی محبتوں سے مہک رہا تھا۔ سرتاپا سرشاری
کی ٹھنڈی پھوار میں تھی۔ کہ میٹم نے عین اس پل جب
یاسمین بڑے چاؤ سے اسے انگلی پہنا کر سب سے
مبارک باد وصول کر رہی تھیں اور وہ چپکے چپکے رخساروں
تک کھینچے گئے دوپٹے کے اندر مسکرائے جا رہی تھی۔ کہ
ساتھ مگر فاصلہ رکھے بیٹھے میٹم کا ہاتھ اس کی گود میں
رکھے ہاتھوں پر آیا تھا۔ اس کا دل اچھل کر حلق میں آن
پھنسا اور قبل اس کے کہ وہ اس کے ہاتھوں کے نرمی
بھرے لمس کو محسوس کرتی کہ اس نے ڈھیلی سی انگلی
اک ساعت میں کھینچ کر اس کا دم بھی ساتھ ہی کھینچ لیا۔
وہ بیٹھے بیٹھے پتھر کی ہو گئی تھی۔ کیوں اس کے ساتھ ہی
کیوں سویرا کو ہر وقت چپکے چپکے مسکاتے دیکھ کر اسے
اپنے خسارے زیادہ ستانے لگے تھے۔ یہی وجہ تھی آج
خود پر اختیار نہ رہا۔ سویرا ملال میں گھری اسے روتے
دیکھتی رہی۔ بھائی پر تو خوب ہی غصہ آیا تھا اسے اور
فوری نکالنے کو اسے کال ملائی تھی۔ وہ ادھر مزے سے
پاؤں جھلاتا سننے گیا۔

”بڑوں نے اپنی خواہش پوری کی۔ اسے
سب نے میرے سر منڈھ دیا۔ میں نے کوئی
اعتراض کیا؟ نہیں نا؟ تو جب میں نے کسی دکھ کا رولا
نہیں ڈالا نہ پہلے نہ اب۔ تو اسے بھی چاہیے حوصلہ
رکھے۔ بجائے اس کے کہ اس کے ساتھ مل کر رونے
لگو۔ سمجھاؤ اسے۔ جو بویا جاتا ہے۔ وہی کاٹنا بھی
پڑتا ہے۔ اس کی خطاؤں کی لسٹ پہلے ہی بہت
طویل تھی کہ اب اس نے چارج شیٹ میں اپنی بے
دقوفی کی وجہ سے اور اضافہ کر لیا ہے۔ آج تو تم نے
اس کی حمایت کرنے کی غلطی کر دی ہے۔ آئندہ
میرے معاملات میں بولنے کی کوشش نہ کرنا۔ بس
اپنے معاملات تک محدود رہو۔ انڈراستینڈ.....“
وہ نہایت کھر درے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ سویرا کی

سٹی گم ہوئی۔ وہ بے چاری تو گونگی ہی ہو گئی تھی۔ دوسری
طرف اس کی گنگنا نہیں تیز سے تیز تر ہوئی گئیں۔

☆☆☆

ابھی پو پوری طرح نہیں بھٹی تھی۔ صبح نو کا
جامنی سا اجالا ہر طرف پھیل رہا تھا۔ خلی بھری مخصوص
ہوا اٹھلائی پھر رہی تھی۔ اک سکوت سا فضا میں سایا
ہوا تھا۔ ہمیشہ جاتے وقت کو پکڑنے والی عزیزہ کچھ
عرصے سے منہ اندھیرے ہی نماز فجر ادا کرنے لگی
تھی۔ اس کے بعد دعا اور اذکار کے لیے لان میں
لگے جھولے پر آ بیٹھتی۔ اک نئے امیدوں بھرے
دن کا ابتدائیہ اس کی اداسیوں میں گھری روح کو بھی
ایک آس کی دوڑ پکڑا جاتا۔ جب پہلے سب بگڑ گیا تھا
تو تب بھی صرف وہی تھا سننے والا۔ اسی نے بچ بھنور
سے نکالا تھا۔ وہ آنکھیں موندے اپنے دھیان میں
تھی۔ کہ کوئی چپکے سے پاس آ بیٹھا۔ جھولے کی خفیف
سی چرخ چوں پر اس نے پلکیں اٹھائیں۔ اور اپنے
قریب تر چہرے کو دیکھ کر ابھی جنبش بھی نہ کر سکی تھی کہ
اس نے احتیاطاً ایک ہاتھ یوں پر جھادیا۔

”آج اگر تم نے چیخنے کی غلطی کی نا تو یہیں
گردن دبا دوں گا.....“ اگر وہ گردن دبائے کی دھمکی
نہ بھی دیتا تب بھی وہ کچھ کہنے کے قابل ہی کہاں رہی
تھی۔ اسے یوں اچانک سامنے دیکھ کر اس کے
حواس تو ویسے ہی مختل ہو چلے تھے۔ اس پر اس کا
جارحانہ انداز دم نکالنے کو کافی تھا۔ وہ یوں گھور رہا تھا۔
جیسے برسوں پر اپنے جانی دشمن کو دیکھ رہا ہو۔ اس کی
زبان کنگ ہوئی تھی۔ دل کی رفتار مدھم۔ بس اک
آنسو تھے جو ہوش قائم رکھے ہوئے تھے۔ لمحوں میں
رخسار تر بتر ہوئے تھے۔ وہ بڑبڑاتا نظر پھیر گیا۔

”اسٹوپڈ..... نان سینس.....“ اس عزت
افزائی پر کچھ اور موتی لڑھکتے چلے آئے۔ وہ جانے
کچھ اور بھی کہہ رہا تھا۔ اب کے ساعت بند اور
بصارت دھندلا گئی تھی۔

”س..... سوری..... بہت دیر بعد گلے میں
اگلے نمکین گولے کو بصد مشکل نگلتے کہنا چاہا..... وہ

بھڑکتا پلٹا۔

”شٹ اپ..... اگلے کو جیتے جی جہنم میں اتار کے ہلکے سے منہ سے کہہ دو سوری۔ واہ..... کتنا بے ہودہ مذاق ہے نا..... یعنی حد ہوگئی۔ کوئی اپنی جان سے جائے اور تم جیسے لوگ سوری کہہ کر سمجھ لیں کہ ہر جرم سے بری الذمہ ہو گئے۔ بس پھر کہانی ختم نہیں عزیزہ سہیل صاحبہ کہانیاں بھی اس طرح سے ختم نہیں ہوتیں۔ تمہارے نام کا پہلا حرف عین اگر ہٹا دیا جائے تو پیچھے بچتا ہے۔ نیزہ اور خدا جانتا ہے کہ اب تمہارا نام میرے دل پر ایک نیزے کی طرح ہی گڑا ہے۔ سخت بے چین کرتا۔ اذیت دیتا۔ اک مستقل درد، جسے میں نے جان بوجھ کر مول لیا ہے۔“ وہ سانس لینے کو رکا اور اس نے موقع غنیمت جانتے جلدی سے اپنی صفائی دینا چاہی۔

”آپ..... آپ بہت غصے میں تھے۔ م..... میں ڈر گئی تھی۔“

”واہ..... واہ کیا خوب بہانا تراشا ہے عزیزہ سہیل نے۔ تم ڈر گئیں..... اور میں مر گیا۔ بے موت۔ کیا تمہیں اتنا ہی اعتبار تھا مجھ پر؟ بس اتنا ہی جانتی تھیں مجھے۔ جو بچپن سے لے کر اس وقت تک تمہارا سایہ بنا رہا ہوا اس سے تم ڈر گئیں۔ اور ایسا کہ اسے مارنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ جبکہ تم یہ اچھی طرح جانتی تھیں کہ مجھے کس بات پر غصہ تھا۔ اس روز جو بکواس وہ لڑکی کر رہی تھی اور اس پر جو خاموشی تمہارے لبوں پر تھی۔ کیا اس پر غصہ کرنے کا بھی حق نہیں تھا میرا۔ یعنی اس سے تو یہی ظاہر ہونا کہ تم اس کی باتوں سے متفق تھیں۔ میں کہتا رہا تھا اباجی سے کہ اس کا آپ کی پوتی کے ساتھ رہنا ٹھیک نہیں۔ یہ ضرور بگاڑے گی اسے۔ مگر انہوں نے بھی میری بات کو ذرا بھرا ہمت نہ دی۔ مجھے کبھی اچھی نہیں لگی تھی وہ تمہاری پیاری سہیلی۔ جس کے چھپوڑے روپے زہر لگتے تھے۔ جس نے یہاں آتے ہی مجھے اپنی اداؤں کے جال میں پھانسا جا ہا جب میں کسی طور قابو نہ آیا تو اس نے نئی چال چلی اور تمہیں ہم سے

متفرک کرنا شروع کر دیا۔“

(یہ ایک بالکل نئی اطلاع تھی اس کے لیے نینا اس حد تک دشمنی کر رہی ہے۔ یہ تو اس کے وہم و گمان میں بھی نا تھا..... انف..... ہمدردی کی آڑ میں ایسا کڑا وار۔ وہ پوری آنکھیں کھولے اسے دیکھ رہی تھی وہ سامنے دیکھتا بول رہا تھا

”اور مجھے اس پر تو جو غصہ تھا سو تھا لیکن اس کی ہر بری بھلی پر تمہاری چپ۔ نہیں برداشت ہوئی تھی۔ میں کیا تم سے کوئی سوال بھی نہ کرتا۔ لیکن مجھے کیا پتا تھا میری ایک جسارت کا تم ایسا جواب دوگی۔ وہ وقت..... اباجی کی مار سے زیادہ ان کے وہ لفظ۔ اف..... نہیں..... نہیں بھولے گی مجھے وہ تکلیف۔ اس رات جب میں گھر سے نکلا تو رنج اور غصہ میں پاگل ہو رہا تھا۔ کچھ شک نہیں کہ جس طرح اندھا دھند سڑک پر بھاگ رہا تھا کسی گاڑی کے نیچے پکلا جاتا۔ وہ تو منصب نے مجھ دیکھ لیا۔ زندگی باقی تھی جو معمولی سا زخمی ہو کر بیچ گیا۔ میں اتنا بدحواس ہو رہا تھا کہ اس کا احسان ماننے کے بجائے الٹا اس سے خوب لڑا۔ حتیٰ کہ اسے مارا۔ یا شاید میرے کانوں میں تمہاری اس فضول سہیلی کی بکواس بھری تھی۔ جو مجھے منصب سے بھی بدگمان کر رہی تھی۔ لیکن جس طرح اس نے مجھے ٹریٹ کیا۔ سنبھالا اور سمجھایا۔ پھر اس پر ہی بس نہیں بلکہ میری حالت دیکھتے ہوئے وہ مجھے یہاں سے دور لے گیا اور تب تک سائے کی طرح میرے ساتھ رہا جب تک میں نے خود کو سنبھال نہیں لیا۔ پھر آہستہ آہستہ میرا جسم تو ٹھیک ہو ہی گیا لیکن وہ روح کیسے زندہ ہوئی جسے فقط تمہاری چیخوں نے مار دیا تھا۔ تم رونی ہوگی۔ پریشان بھی ہوئی ہوگی۔ لیکن مجھ پر بیٹے اس عذاب کی ایک ٹیس بھی نہیں سہہ سکتیں۔ جس سے میں گزر کر آیا ہوں۔ کتنا نقصان ہوا میرا۔ میں تخمینہ لگانے بیٹھوں تو صدیاں گزر جائیں۔ اور حساب پورا نہ ہو۔ مجھے سب اپنوں سے اتنا عرصہ دور رہنا پڑا۔ امی، ابو، سویرا، اباجی اور..... (وہ تم..... کہتے کہتے رکاک نظر

نیر بہاتی لڑکی کو دیکھا اور پھر سے نگاہ پھیر لی) کتنی اچھی تیاری تھی میری۔ چند دن میں ہی تو ایکزام تھے۔ کہ پھر..... اب کیا میں بالکل ویسے ہی بڑھ سکوں گا۔ ویسی تیاری ہو سکے گی میری۔ نہیں ہرگز نہیں۔ خالی ہو گیا ہے میرا دماغ۔ اب کیسے سمیٹوں گا میں خود کو۔ تم نے میرا سب اعتماد چھین لیا۔ بے کار کر دیا مجھے۔ نا کارہ کر دیا۔ نیزہ بی بی۔“ اس کے لہجے سے ہی نہیں آنکھوں سے بھی گرم لپٹیں نکل رہی تھیں جو عزیزہ کے وجود کو موم کے جیسے پکھلا رہی تھیں۔ وہ اپنی جگہ یہ بالکل سچا تھا۔ وہ اس کی جلی کٹی چپ چاپ سن رہی تھیں۔

”اباجی کی تو بہت دیرینہ خواہش تھی اپنی کم عقل پوتی کو میرے لیے باندھنے کی۔ یہ اپنے بچپن سے جانتا ہوں میں اور ایک بار ان ہی سے سن کر بس یونہی میرا دل بھی ان کا ہم نوا ہو گیا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے نا۔ ان کی بے وقوف سی لاڈلی کو ان کے سمجھ دار اور حوصلہ مند پوتے کے علاوہ اور کوئی برداشت نہیں کر سکے گا۔ لیکن میں تمہاری بدتمیزی کبھی نہیں بھول سکتا۔ نہ ہی مجھے تم سے اب کوئی انسیت ہے۔ اب یہ انگوٹھی میرے ہاتھ میں ہے اور اسے پہننے یا نہ پہننے کا فیصلہ تمہارے ہاتھ میں۔ چاہو تو اٹھا لو اور اگر نہیں چاہتی ہو تو خود اٹھ کر چلی جاؤ۔ میری طرف سے تم پر کوئی زبردستی نہیں۔“

میٹم نے گیند اس کے کورٹ میں ڈال دی تھی۔ اس کے چہرے کے عین سامنے ہاتھ کیا۔ ہتھیلی پر انگوٹھی دھری تھی۔ اسے اختیار دے کر وہ خود منہ پھیرے بیٹھا تھا۔ عزیزہ کو کسی طور پر یقین نہیں آیا ہاتھ یہ وہی میٹم ہے۔ وہی میٹم جسے وہ بچپن سے جانتی تھی۔ وہ تو ایسا کٹھور اور سنگدل نہ تھا۔ وہ تو ہمیشہ اس کے لیے آسانیاں تلاش کرتا آیا تھا۔ کم سنی سے اس کی انگلی پکڑے اپنا ایسا عادی بنا لیا تھا کہ پھر وہ ہر معاملے میں اسی کی طرف دیکھتی۔ اور وہ بنا کہے ہی سب سمجھ بھی لیتا اور سلجھا بھی دیتا۔ یوں تو وہ اس سے نہایت سخت گیر استاد سا رویہ اپنائے رکھتا تھا۔ لیکن وہ یہ بھی

خوب جانتی تھی۔ اس کے اندر کی تمام نرمیاں بھی اسی کے لیے ہیں۔ کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جو لفظوں کی محتاج نہیں ہوتیں۔ وہ زبان پر نہ بھی آئیں۔ لیکن آنکھوں اور لہجوں سے عیاں ہوتی اپنا آپ بتا جاتی ہیں۔ میٹم نے بھی اس سے نہیں کہا تھا۔ ”تم مجھے اچھی لگتی ہو“ وہ تو ہمیشہ اسے اس کی ذات کی خامیاں ہی جتانے آیا تھا۔ لیکن اتنا وہ بہت اچھی طرح سمجھتی تھی کہ جو لوگ بُرے لگتے ہوں۔ پھر دن رات ان کی فکر میں ہلکان نہیں ہوا کرتے۔ نہ ہی رک رک کر انہیں دیکھتے ہیں اور نہ ہی ذرا ذرا سی بات پر حق جتانے کو خفکیاں دکھاتے ہیں۔ اگر وہ اذیت جھیل کر آیا تھا تو سکون سے وہ بھی کب رہی تھی۔ ہاں مانا کہ اس سے غلطی ہوئی اور وہ بھی بہت بڑی۔ مگر وہ پورے دل سے معافی مانگ تو رہی تھی اب کیا وہ جان لے گا اس کی۔ اتنی سزا دے کر بھی جفا جو کا دل نہیں بھرا تو چلو اور سہی۔“ بے دردی سے گال رگڑ کر اس نے خود کو مضبوط ظاہر کرتے گردن اٹھائی۔ فیصلے کبھی بھی جھکی گردن کے ساتھ نہیں ہوتے۔ جھکے شانوں سے صرف بوجھ اٹھائے جاتے ہیں۔

وہ اسے کتنا ہی بدھو سمجھتا یا کہتا ہو۔ مگر اتنا علم تھا اسے۔ اک بھگی نظر اس اکڑ پر ڈالی۔ جو ہتھیلی کھولے رخ موڑے بیٹھا تھا۔ جی کڑا کر کے ہاتھ بڑھایا۔ مگر یہ کیا اس کے انگوٹھی اٹھانے سے پہلے ہی وہ بھی بند کر گیا۔ ساتھ ہی عزیزہ کا دل بھی۔ ناچھی سے اسے دیکھا۔ وہ تنکے چتون لیے اسی کی جانب متوجہ تھا۔

”یہ بڑوں کی خواہش تھی۔ جس پر مجھے سر جھکانا پڑا۔ لیکن اپنی زندگی کے لیے کچھ میرے بھی تو ارمان تھے نا۔ اس روز حسرت ہی رہ گئی۔ خیال تھا اباجی کہیں گے۔ چلو بچو پہناؤ اک دو بے کے ہاتھ میں رنگ۔ مگر اچھی ہوئی میرے ساتھ۔ انہوں نے میرے ہاتھ میں پہنادی اور امی نے تمہارے۔ میں تو دیکھتا کا دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس بے تنکے پن پر اس قدر غصہ آیا کہ حد نہیں۔ اسی غصے میں تمہارے ہاتھ سے رنگ اتار لی۔ سوچا تھا جب سب ادھر ادھر

ہو جائیں گے تو اپنا شوق پورا کر لوں گا۔ مگر اس کی بھی نوبت نہیں آئی۔ دلبر کے داجی بیمار تھے۔ اس کی کال آئی تو لپک جھپک جانا پڑا۔ وہاں جا کر خیال آیا کہ جانے میری اس حرکت کا تم نے کیا مطلب لیا ہوگا۔ پھر خود کو تسلی دی کہ کوئی بات نہیں۔ اس کی وجہ سے میں نے اتنے عرصے کی بیگار کائی ہے۔ اگر چار دن وہ فکر کر لے گی تو کوئی مضائقہ نہیں۔ ان مہینوں میں اتنے کھڑکی کے شیشے اور چائے، کافی کے مگ توڑے ہیں۔ اور ہر جانے تنخواہ میں سے بھرے ہیں چلو کچھ وہ بھی توڑ کے دیکھے اور ہائے ری حسرت تم نے کیا توڑنا ہے سوائے میری تمناؤں کی کمر کے۔ اس نالائق لڑکی کے ساتھ بیٹھ کے ڈرائے تو بڑے دیکھے جاتے تھے۔ ان ڈراموں سے اتنا بھی نہ سیکھا کہ جب ہیرو رنگ پیش کرتا ہے تو ہیروئن کیا کرتی ہے؟“

وہ سخت برے تیوروں سے پوچھ رہا تھا۔ اور ہیروئن بے چاری ہوتی..... ہمیشہ کی طرح جس پر اسے مزید تاؤ آیا۔

”نہیں ٹھیک ہو سکتیں تم..... واللہ..... کوئی علاج نہیں ہو سکتا تمہارا۔ تم خالی دماغ ہو اور رہو گی۔ بلکہ کوئی شک نہیں کہ اپنے ساتھ ساتھ مجھے بھی پاگل کر ڈالو اف..... میرے اللہ کب سدھرے گی یہ احمق لڑکی.....“ وہ جھنجھلایا سا سر اٹھائے دہائی دے رہا تھا۔ (اور احمق کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب بھلا کیا خطا سرزد ہو گئی تھی اس سے)

”اف..... اب کیسے سمجھاؤں میں تمہیں۔ ایسے لمحوں میں لڑکی کئی وقت کے بھوکوں کی طرح اگٹھی اٹھانے کو نہیں لپکتی۔ بلکہ اک ادا سے اپنا ہاتھ ہیرو کے آگے کر دیتی ہے۔ بالکل ایسے (عملی مظاہرہ کر کے دکھایا گیا اور ہیروئن ہک دک.....) تاکہ وہ خود اسے رنگ پہنائے۔ اب آیا کچھ عقل شریف میں۔ چلو ہاتھ ادھر لاؤ۔“ اور اس کے پتھر بنے بت نے کیا ہاتھ بڑھانا تھا وہی پکڑنے لگا کہ.....

”کٹ..... کٹ..... کٹ“ سویرا دھڑ دھڑ سیڑھیاں اترتی نیچے آ رہی تھی۔

”اتنے اہم موقعے پر ایک کلک نہ ہو تو مزا نہیں آئے گا اور یہ ذرا ٹھیک سے بیٹھیں۔ یوں ہاتھ پکڑیں۔ پرفیکٹ۔..... بس اب ڈالیں رنگ..... اور یہ کیس جی..... کلک..... کلک.....“ سویرا کے اندر اس پل کوئی ماہر کیمرو دو مین گھس آئی تھی۔ وہ ہدایات دیتی گئی اور عمل کرتا گیا اور وہ..... اس کی پلکوں سے پانی کی چادر ہتی تو دیکھتی تاکہ اپنا ارمان پورا کرتے پل کیسی جگہ گاہٹ بھی موصوف کے چہرے پر جواگی ہی ساعت میں پھر موڈ بدلے اسے یاد دہانی کروا رہا تھا۔

”زندگی صرف ایک بار ملتی ہے اور ایسے لمحے بھی۔ میں نے تو جسٹ اپنا شوق پورا کیا ہے۔ اس سے تم ہرگز یہ مت سمجھ لینا کہ میں تمہاری کوئی خطا بھول گیا ہوں۔ عنقریب گن گن کر بدلے لوں گا تم سے۔“

”افوہ..... عزیزہ اب تو بس کر دو..... بلیوی۔ تمہاری ایک بھی پک ٹھیک نہیں ہے۔ تھوڑا سا تو مسکرا دو یا! اور بھائی پلیز یہ ڈائلاگز پھر کبھی پراٹھا رکھیں۔ ابھی اس کے آنسو ہی پونچھ دیں۔“

اور جس کے ہاتھ میں کیمرو ہوتا ہے۔ سب اس کے تابع ہوجاتے ہیں۔ یہ گڑکی بات آج ہی عزیزہ کو پتا چلی تھی۔ قبل اس کے کہ ٹیم کی انگلیاں اس کے رخساروں سے موتی چھتیں، وہ قدرے دور ہو گئی۔ (جب وہ کوئی خطا نہیں بھولا تھا۔ تو اسے بھی ضرورت نہیں تھی نام نہاد ہمدردیوں کی) وہ اب ان ہی انگلیوں پر کچھ کن رہا تھا۔

”اب یہ کیا سٹیج کر رہے ہیں۔“ سویرا پوچھ رہی تھی۔

”خطا نمبروں میں ایک اور خطا کا اضافہ۔ میرے پاس پورا ریکارڈ ہے ان محترمہ کی خطاؤں کا۔ جو انہوں نے میرے حضور کی ہیں۔ ابھی بھی تم نے دیکھا نا کیسے ہاتھ جھٹکا اس نے میرا۔“ تیغ صفت نظریں اس پر گڑی تھیں۔

”ہاتھ کب جھٹکا اس نے۔ وہ تو تھوڑا پیچھے ہوئی ہے۔ اب ایسی بھی گپ نہ ماریں بھائی۔ آپ بھی نا..... اینڈ پلیز بس کر دیں اب۔ وہ تو پہلے ہی رورو کے

ہلکان ہوئی پڑی ہے۔ اب اور تنگ نہ کریں۔“ سویرا کو اس کے ہچکیاں لیتے وجود پر ترس آیا تھا۔

”تنگ..... تنگ..... بس تنگ..... میں اب بس تنگ نہیں کروں گا۔ میں تو اب جینا دو بھر کر دوں گا۔ اس نے سمجھا کیا ہے مجھے۔ اس نے پرے کیا میرا ہاتھ۔ اس کی جرأت کیسے ہوئی۔ اس بد تمیزی کا جلد ہی خمیازہ بھگتنا پڑے گا اسے“ وہ پھوپھیاں پھاں کرتا اٹھا اور سیڑھیاں پھلانگ گیا۔ سویرا سر جھٹکتی اس کے پاس آ بیٹھی۔

”افوہ..... انف بار..... بس بھی کر دو اب۔ کیا تمہیں پتا نہیں ہے بھائی کے مزاج کا۔ وہ صرف ستار ہے ہیں تمہیں۔ جس دن تم بہادر ہو کر ان کے سامنے ڈٹ گئیں نا۔ اسی دن ان کی تمام نوٹسکی ٹھس ہو جائے گی اور یہ دیکھو جسٹ اپنا شوق پورا کرنے والوں کی آنکھیں کیسے چمک رہی ہیں اور چہرے کے ایکسپریشنز۔ اف..... لگتا ہے دنیا کیسے بیٹھے ہیں۔ بدلہ لینے والوں کی شکلیں ایسی ہوتی ہیں بھلا۔ تم خود بتاؤ۔“

اور اس کے انداز جان نکال رہے تھے تو یہ سب کیا تھا۔ پھر۔ مجال ہے جو لبوں سے مسکراہٹ جدا ہوئی ہو۔ اور آنکھیں تو پورے سوداٹ کا بلب ہوں گویا..... عزیزہ نے اسے دیکھا۔ اس نے مسکراتے شانہ تھپتھپایا۔

”یہ رونے دھونے والے سین اب پرانے ہو چکے۔ اگر وہ سیر ہیں تو تم سوا سیر ہو جاؤ۔ پھر دیکھنا کیسے مزے سے گزرتی ہے زندگی۔“ ایک مخلصانہ مشورے سے نواز کر وہ آگے بڑھ گئی۔ اس نے بھی ہتھیلیوں سے گال صاف کیے۔ اب اس کے سامنے ہرگز نہیں رونا۔ ساتھ ہی یہ عزم صمیم بھی کر ڈالا۔ اک گہرا سانس بھرتی اٹھی تو نظر سامنے ٹیرس پر جا پڑی۔ وہ سینے پر ہاتھ باندھے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ بظاہر تو کڑے تیور۔ ماتھا بلوں والے پراٹھے جیسا۔ اسے جانے کا سوچھی آنکھوں میں آنکھیں

ڈالے دیکھتی رہی اور پھر..... پھر شرارت سے منہ چڑا کر اندر کو بھاگ لی۔ میٹم کو ایک جھٹکا تو ضرور لگا۔ لیکن صرف اک ساعت کو۔ اگلے پل وہ بے اختیار مسکرا اٹھا۔

اپنے کمرے میں جا کر دم لیتے اس کی شکل کا تصور کرتے۔ بھی بے تحاشا ہنسے جا رہی تھی اور سویرا نے ان کی پک منصب کو فاورڈ کی تھی، نیچے لکھا تھا۔

”کتنے اچھے لگ رہے ہیں نا دونوں پتا ہے کیا میری بھی بڑی خواہش تھی۔ انگلی جمنٹ رنگ آپ میری انگلی میں ڈالتے۔ مگر ہک ہا۔ حسرت ہی رہ گئی میری تو۔“

”افوہ..... اللہ نہ کرے کیوں کوئی حسرت رہے تمہاری۔ تمہارے سارے شوق پورے کرنے کو یہ خادم ہے نا..... بس کچھ دن ٹھہر جاؤ۔ تمہارے سب سنگھار اپنے ہاتھ سے کیا کروں گا۔ انگوٹھی، چوڑی، بندے، پائل، کاجل، لالی، لپ اسٹک، مسکارا اور..... کیا ہوتا ہے یار..... چلو بانی تم بتاتی جانا۔ کافی چیزوں کے نام ابھی مجھے نہیں آتے۔ بٹ ڈونٹ وری۔ ڈرائنگ اور کلرنگ میں کلاس میں ہمیشہ سو فیصد مارکس لیتا تھا میں۔ سو کوئی کمی نہیں رہنے دیا کروں گا۔ اس طرف سے تو بالکل بے فکر ہو جاؤ تم۔“

وہاں سے محبت بھرا جواب آیا تھا۔ اور بجائے خوش ہونے کے وہ شاکڈ ہو گئی تھی۔

ڈرائنگ اور کلرنگ میں سو فیصد مارکس لینے والا جب اس کا سنگھار کرے گا تو کیا صورت ہو سکتی ہے؟ اپنی متوقع شامت کا تصور کوئی اتنا بھی دلکش نہ تھا۔ مگر کیا کرتی کہ وہ آنے والا نظارا ابھی سے آنکھوں کے سامنے لہرانے لگا تھا اور پھر وہ خیال علاوہ ہنسی کے اور کیا تھا دیتا۔ سو وہ بھی ہنسنے لگی اور ہنستی ہی چلی گئی۔



مت اس خواب کے پیچھے بھاگو،

بھولی لڑکی!

مت اس خواب کے پیچھے بھاگو

پتھر بن کر رہ جاؤ گی

تیر بہت ہے وقت کا دریا

تم بھی اس میں بہہ جاؤ گی

یہ نشتر جیسی رسوائی

بولو کیسے سہہ پاؤ گی

کیا بچوں جیسی باتوں سے

تم سب کو بہلا سکتی ہو!

کیا تم اپنے من کی منطق

دنیا کو سمجھا سکتی ہو؟

خوابوں جیسی باتیں کر کے

کیا تعبیریں پاسکتی ہو؟

باپ کی شفقت، ماں کی ممتا

کیا سچ بچ ٹھکرا سکتی ہو؟

جس گھر میں پروان چڑھیں تم

اس کو چھوڑ کے آسکتی ہو؟

ایسی باتیں ناممکن ہیں

بس تم اپنی تنہائی میں

ہجر کے گیت ہی گاسکتی ہو!

اعتبار ساجد

خیر سے رات اپنے گھر لوٹی

بھر رہی تھی وہ در بدر لوٹی

دستیں آسمان کی چھو آئی

زندگی ہو کے معتبر لوٹی

تھک گئی ہوا مسافت سے

ختم کر کے بڑا سفر لوٹی

ہاں ضروری تھا گھر سے جانا بھی

اپنی چادر سنبھال کر لوٹی

کچھ ادھوے سوال باقی ہیں

آنکھ اب بھی ہے منتظر لوٹی

خوف تھا کھڑکیوں میں بیٹھا ہوا

بند کر کے وہ سارے در لوٹی

نہ ہو شیطان میری جنت میں

یہ دعا بھی وہ مانگ کر لوٹی

ڈاکٹر عزیزہ انجم

نہیں کہ سایہ دیوار دیکھتا ہوں میں

ہر ایک قید کے اس پار دیکھتا ہوں میں

کسی کے مرتبہ و جاہ سے نہیں مطلب

عمل میں عظمت کر دار دیکھتا ہوں میں

ہنرنے آئینہ سازوں کے جس کو چھین لیا

وہ عکس بھی سر بازار دیکھتا ہوں میں

ہے تیرے ذہن پر چھائی ہوئی عجیب بہار

نمو کو صورت اشعار دیکھتا ہوں میں

کوئی نمود و نمائش مجھے نہیں درکار

خود اپنے فن کو ہی شہکار دیکھتا ہوں میں

سبھی خموش ہیں اس بزم میں مگر فغان

تنبہ میں جرأت اظہار دیکھتا ہوں میں

فیضان سروری



رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت ابوقتادہؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا۔ ”جس کو یہ بات پسند ہو کہ اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کی بے چینیوں سے نجات دے تو اسے چاہیے کہ وہ تنگ دست کو ہمت دے یا اس سے (قرض) معاف ہی کر دے۔“

فائدہ:- اس کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ قرض کی ادائیگی میں مزید مہلت دے دے، یعنی مطالبے کو مؤخر کر دے دوسرے معنی ہیں اس کی تکلیف کو دور کر دے یا یہ کہ اپنے پاس سے اسے اتنی رقم دے دے کہ جس سے وہ اپنا قرض ادا کر دے۔ بہر حال یہ ہمدردانہ رویہ قیامت کے روز انسان کو قیامت کی بے چینیوں سے بچائے گا جہاں ہر شخص بے چین اور مضطرب ہوگا۔

شہادت کی فضیلت،

تاریخ اسلامی کا عظیم سرمایہ قربت کے رشتوں میں ریشم کی طرح نرم تھا۔ اپنے بھائی زید بن خطاب کی شہادت کے بعد کہا کرتے تھے۔

”باد صبا بولی ہے تو زید کی خوشبو لیے آتی ہے۔ دل کے زخم تازہ ہو جاتے ہیں اور قرار و سکون لگ جاتا ہے۔“ قسم بن زبیر نے اپنے بھائی کا دردناک مرثیہ لکھا۔ جب اس کی مدینہ آمد پر عمر فاروقؓ سے ملاقات ہوئی تو آپؓ نے کہا۔

”اگر میں تیری طرح شاعر ہوتا تو تیری طرح اپنے بھائی کا دردناک مرثیہ لکھتا۔“

نورہ نے کہا۔ ”امیر المومنین! اگر میرا بھائی اللہ کی راہ میں اس طرح مارا جاتا جیسے آپ کا بھائی شہید ہوا تو مجھے کوئی غم نہ ہوتا اور میں اس کے لیے مرثیہ نہ کہتا۔“

یہ سن کر حضرت عمر فاروقؓ نے کہا۔ ”مجھ سے بہت سے لوگوں نے میرے بھائی کی تعزیت کی مگر مجھ سے بہتر تعزیت کرنے والا کوئی میرے پاس نہ آیا۔“

تنہائی،

تم تنہا ہو اور وقت کے دل شکن لمحات تمہارے سینے کے محسوسات کو پامال کر رہے ہیں تو کیا ہوا، تم اس دنیا میں تنہا ہی آئے، تنہا ہی جاؤ گے تو پھر تنہائی سے کیوں گھبراتے ہو۔ (خلیل جبران)

اقوال دانش،

① میں بھول چکا ہوں کہ میں آخری بار کب رویا تھا۔ اس لیے نہیں کہ میری زندگی میں دُکھ، تکالیف اور مصائب نہیں رہے، بلکہ اس لیے کہ میں نے جان لیا ہے کہ جنگیں مسلسل جدوجہد سے جیتی جاتی ہیں، آسودگی سے نہیں۔ اور ہمارے عہد کی ہر زندگی کسی طور بھی ایک جنگ سے کم نہیں۔ (لیون ٹالسکی)

② اگر تم کسی قوم کو جنگ کے بغیر فتح کرنا چاہتے ہو تو اسے احساس کسری کا شکار بنا دو۔ وہ ہمیشہ تمہاری غلام رہے گی۔

③ جس شخص نے کبھی کوئی غلطی نہیں کی، اس نے کبھی کچھ نیا کرنے کی کوشش بھی نہیں کی ہوگی۔ (البرٹ آئن اسٹائن)

صدف شند - شاہ پور

نقص،

انگلش کے لیکچرار نے طالب علموں کو بتایا۔ ”انگریزی کا نہایت ممتاز اور مشہور شاعر ملٹن ٹاچنا تھا۔“

دوسرے روز لیکچرار صاحب نے جاننا چاہا کہ ان کے اسٹوڈنٹس نے یہ بات یاد رکھی ہے یا نہیں۔

چنانچہ انہوں نے پوچھا۔ ”کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ ملٹن کی شخصیت میں کیا خرابی تھی؟“

۔ یہی کہ وہ شاعر تھا۔“

انتظامات،

ایک خاتون اپنے شوہر کو قصور ٹانگنے کی ہدایت کرتے ہوئے بولیں۔ ”بھئی! ہتھوڑی الماری میں رکھی ہے۔ کیلیں میز کی دراز میں ہیں اور مرہم پی کا سامان ساتھ والی الماری میں رکھا ہوا ہے۔“

اقطی ناصر - کراچی

ہم بھی یہاں کے تھے،

جون ایلیا جب ہندوستان گئے تو وہاں کے لوگوں کے لیے یہ شعر پڑھا۔ ہم آندھیوں کے بن میں کسی کا دواں کے تھے جانے کہاں سے آئے ہیں جانے کہاں کے تھے مل کر تپا کس سے، نہ سمجھے ہمیں ادا اس خاطر نہ کیجیے، کبھی ہم بھی یہاں کے تھے

عذابِ نجات کس کو ملے گی،

بعض مرتبہ اللہ کسی قوم کو آفات میں مبتلا کر کے بھی عذاب کا مزہ چکھاتا ہے اور اس عذاب سے بچنے کا واحد راستہ سورہ الاعراف کی ایک سو پینسٹھویں آیت میں واضح طور پر بتا دیا ہے۔

”اور جب ان میں سے ایک گروہ نے کہا ”تم ایسے لوگوں کو کیوں نصیحت کرتے ہو جنہیں اللہ ہلاک کرنے

والا ہے یا انہیں عذاب دینے والا ہے۔ بہت سخت عذاب۔“ انہوں نے جواب دیا۔ تمہارے رب کے سامنے عذر کرنے کے لیے کہ شاید وہ درجائیں۔ پھر وہ اس بات کو بھول گئے۔ جس کی انہیں نصیحت کی گئی تھی۔ تو ہم نے ان کو بھالیا جو بُرائی سے منع کرتے تھے۔ اور باقی سب لوگوں کو جو ظالم تھے ان کی نافرمانیوں پر سخت عذاب پر پکڑ لیا۔“

یعنی اس یعنی میں میں قسم کے لوگ تھے۔ ایک وہ جو دیدہ دلیری سے اللہ کے احکام کی خلاف ورزی کرتے تھے۔ دوسرے وہ جو خود تو خلاف ورزی نہیں کرتے تھے۔ مگر اس خلاف ورزی کو خاموشی سے بیٹھ کر دیکھتے تھے۔ اور منع کرنے والوں سے کہتے تھے۔ ”ان کم بخونوں کو نصیحت کرنے سے کیا حاصل۔“

تیسرا گروہ وہ تھا جو غیرت ایمانی سے معمور تھا اور انہیں بُرائی سے روکتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے دونوں گروہوں کو عرق کر دیا۔ ان کو بھی جو گناہ پر خاموش تھے کہ اللہ کے نزدیک ایسی خاموشی بھی گناہ ہے اور ان کو بچالیا جو بُرائی سے روکتے تھے۔

سید الانبیا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کلیہ عذاب کو اپنی ایک حدیث میں واضح کیا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جبرائیل علیہ السلام کو چند بیتوں پر عذاب نازل کرنے کو کہا۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے کہا۔

”ان میں سے ایک بیتی میں ایک شخص ایسا بھی ہے جس نے بیک چھکے جتنا عرصہ بھی گناہ میں صرف نہیں کیا۔“

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ ”وہ خود تو زاہد اور پرہیزگار تھا لیکن میرے احکام کی کھلم کھلا خلاف ورزی، بوسہی تھی۔ لیکن اس کے چہرے کا رنگ کبھی میری غیرت کی وجہ سے متغیر نہیں ہوا۔ سب سے پہلے اسے زمین پر پٹخا اور پھر پوری بیتی کو اس پر الٹا دو۔“

اللہ تعالیٰ کے حکم کی کھلم کھلا بغاوت اور نافرمانی پر خاموش رہنے پر اللہ کی ناراضی کا یہ عالم ہے اور عذاب کی سختی کی یہ کیفیت ہے۔ (از حرف ناز)

الکھنگری،

سیانے کہتے ہیں اتنے اچلے نہ ہونکہ دوسرے
میلے نظر آئیں۔
(ممتاز مفتی)

حقیقت،

کسی کو ہلنے کے لیے ہماری ساری جویاں بھی کم پڑ
جاتی ہیں...! مگر کھونے کے لیے ایک خامی ہی کافی ہوتی ہے۔

نابیندیدہ،

فیکٹری میں ایک سپروائزر نے کچھ عرصہ کام کرنے
کے بعد محسوس کیا کہ وہ کراسے پسند نہیں کرتے۔ ایک
روز اس نے ایک دکر کو علیحدگی میں بلایا اور اس
سلسلے میں اسے کریدنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔
"کیا بات ہے لوگ مجھے پسند نہیں کرتے؟"
اس سے پہلے میں جس کا رخنہ میں کام کرتا تھا، وہاں
وہ دکر مجھے اتنا پسند کرتے تھے کہ جب میں نے وہاں سے
نو کری چھوڑی تو انہوں نے مجھے بہت شاندار فیڈویل
پارٹی دی اور تحفے کے طرز پر ایک فی سیٹ پیش کیا۔
"صرف فی سیٹ؟" قدر کرتے حیرانی سے کہا۔
"سر! جس دن آپ یہاں سے نو کری چھوڑ کر جائیں
گے، آپ کو اس سے بڑی فیڈویل پارٹی دیں گے
اور تحفے میں ڈریسٹ دیں گے۔"
غزہ، اقرا، کراچی

کرکٹ،

جاہلوں کا ذکر نہیں، بڑے بڑوں کو ہم نے اس فیلڈ میں
میں مبتلا دیکھا کہ زیادہ نہ کم، بوسے بائیس کھلاڑی کرکٹ
کھیلنے ہیں۔ ہم قواعد و ضوابط سے واقف نہیں لیکن جو
کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا، اسی کی قسم کھا کر عرض کرتے
ہیں کہ کرکٹ درحقیقت صرف ایک ایسی شخص کھیلنا
ہے، مگر اس کھیل میں یہ وصف ہے کہ بقیہ اکیس حضرات
سارا سارا دن اسی مغالطے میں مگن رہتے ہیں کہ وہ بھی کھیل
رہے ہیں۔ جالانکہ ہوتا یہ ہے کہ یہ حضرات شام تک

سایس کی طرح کھڑے کھڑے تنک جاتے ہیں اور گھر
پہنچ کر اس تنک کو تندرستی سمجھ کر بڑے رہتے ہیں۔
(مشتاق احمد یوسفی)
عائشہ، تحویم، گوجرہ

انارٹی باؤلر،

مشتاق باؤلر سے کوئی غائف نہیں ہوتا۔ وہ زیادہ
سے زیادہ وکٹ ہی تو لیتا ہے۔ جان تو انارٹی سے
ٹکتی ہے۔
(مشتاق احمد یوسفی)

نشانہ،

ایک کرکٹر اپنی ساس کو مرعوب کرنے کے لیے بیچ
دکھانے لگا۔ جب اس کی باری آئی تو اس نے
اپنے ساتھی بلے باز سے کہا۔
"میری ساس بھی تماشائیوں میں موجود ہیں اور میں
زبردست شائس لگانے کی کوشش کروں گا۔"
اس پر ساتھی بلے باز نے بے تکلفانہ انداز میں
کہا۔
"تم احمق ہو، بھلا تم اپنی ساس کو اتنے تماشائیوں
میں کیسے نشانہ بناؤ گے؟"
آسیہ جاوید، علی پور چٹہ

ستم،

دہلی میں جب نادر شاہ کے سپاہی ہزاروں
شہری قتل کر چکے اور شہر کو لوٹ چکے تب محمد شاہ
رنگیلانے اپنا وزیر اعظم نادر شاہ کے حضور بھیجا۔
نظام الملک تنگے باؤں اور تنگے سرودبار میں
ماضر ہوا اور امیر خسرو کا یہ شعر پڑھا۔
ترجمہ :- اور کوئی نہیں بچا جسے تو اپنی تیغ ناز سے
قتل کرے سوائے اس کے کہ مردوں۔ کو زندہ کرے
اور دوبارہ قتل کرے۔"



خالد بیچا لائی



اقرا عزیز، گاؤں دریاخان جلبانی

رات گہری تھی ڈر بھی سکتے تھے
ہم جو کہتے تھے کر بھی سکتے تھے
تم جو بچھڑے ہم سے یہ بھی نہ سوچا
ہم تو پاگل تھے مر بھی سکتے تھے
مدد بخورین مہک، بکرات
وہ کب کا بھول چکا ہو گا دوستی کا قصہ
پھڑک کر کسی سے کسی کو کسی کا خیال کہاں رہتا؟
راٹے عذرا سرفراز، فیصل آباد
ان الٹی سیدھی دیکھاؤں کو پہروں چوہا کرتے تھے
میں اپنی اہلی دیوہوں تو کچھ لوگ بہت یاد آتے ہیں
دوہیل بھر کی ناراضیاں اور دمان بھی جانا پل بھر میں
اب ارشد خود سے دوٹھوں تو کچھ لوگ بہت یاد آتے ہیں
رمناز شکیل راؤ، لودھراں
جس طرف دیکھا مقام ہو نظر آیا
کچھ نظر آیا نہیں جب تو نظر آیا
یاسمین کنول، پسرورد
کیسے لمحے ہیں بھولتے ہی نہیں
وہ جو گزرے ہیں کامیابی سے
جب تم بھی سوچ میں انہیں لاؤں
رنگ بکھرتے ہیں کچھ گلابی سے
عائشہ فاطمہ، کراچی
نبوت ہے یہ محبت کی سادہ لوحی کا
جب اس نے وعدہ کیا، ہم نے اعتبار کیا
ملائکہ کوثر، بسم اللہ پور
ہول میں روز بجاتی ہیں خواہشوں کے دیے
یہ زندگی بھی اندھیرے مکان جیسی ہے
میں اپنے ساتھ ہوں یا کوئی دوسرا ہے منیاد
یقین کنی یہ گھڑی بھی گمان جیسی ہے

نخبہ اکرم، گاؤں گونیکی

حکایت غم دینا طویل تھی، کہہ دی
حکایت غم دل مختصر ہے کیا کہیے
جدا نیاں تو یہ مانا بڑی قیامت ہیں
رفاقوں میں بھی دکھ کس قدر ہے کیا کہیے
فضہ یوسف، بہاول پور
ہم اپنے قرب کے کم زور دھاکے
جھٹک کے توڑ دیں ہمت نہیں ہے
یہ زہر اب پی ہی تیں جرأت نہیں ہے
کبھی سچ بول دیں عادت نہیں ہے
غزیزہ شریٹ، بکرات
یہی مت سمجھنا تم ہی زندگی ہو
بہت دن اکیلے بھی ہم نے گزارے
غزہ، اقرا، کراچی
محبت کا تعلق ٹوٹنے میں دیر لگی ہے
ہماری امدان کی دوستی برسوں چلی اچھی
مرجین تاج، کراچی
وقت کی اپنی عدالت بھی ہوا کرتی ہے
آج اس شہر میں قانون تمہارا ہی ہے
ثوبہ قطب، کراچی
ہم ہی نہیں تھے ہماری طرح کے اور بھی لوگ
غدا میں تھے جو دنیا سے سوچتے تھے الگ۔
اقصی طیب الرحمن، گاؤں موئن ہری پور
کچھ وقت کی روانی نے ہمیں یوں بدل دیا
وفا پر اب بھی قائم ہیں مگر محبت چھوڑ دی ہم نے
تینم کوثر، کراچی
ایک مدت سے نہ قاصد ہے نہ وفانہ پیام
اپنے وعدے کو تو کر یاد، مجھے یاد نہ کر

عائشہ فاطمہ

کسی ڈائری سے

موجودہ صورت حال اور درپیش معاملات کے تناظر میں احمد فراز کی یہ غزل قارئین کی نظر لب کشا ہیں لوگ، سرکار کو کیا بولنا ہے اب لہو بولے گا، تلوار کو کیا بولنا ہے

خلقت شہر ہے چپ، شام کے فرمان کے بعد اب کسی واقف اسرار کو کیا بولنا ہے

وہی جانے ہیں پردہ جو تماشا گر ہے کب، کہاں، کون سے کردار کو کیا بولنا ہے

بکنے والوں میں جہاں ایک سے ایک آگے ہو ایسے میلے میں خریدار کو کیا بولنا ہے

لو چلے آئے عدالت میں گواہی دینے عجب کو معلوم ہے کس یار کو کیا بولنا ہے

جہاں دوبار ہوں، شاہوں کے مصائب ہوں وہاں غالب کے طرف دار کو کیا بولنا ہے

افسی، غم، افراتفری

کسی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر رشید کامل کی غزل قارئین کی نذر۔

کسے ہے لوحِ وقت پر دوام سوچتے رہے لکھے ہوئے تھے کیسے کیسے نام، سوچتے رہے

رو حیات میں دکا ہے کون کتنی دیر کو مسافروں کا وقفہ قیام سوچتے رہے

اُجڑے دل بسا نہیں، پھڑکے وہ ملا نہیں عذاب ہے کہ بھر صبح و شام سوچتے رہے جو ملا تھا راستے میں، کیا تباہی کون تھا وہ یاد آگیا تو اس کا نام سوچتے رہے

کچھ ایسے بے خبر تھے شکاریوں کی جال سے جب آگے ٹیلور زیر دام سوچتے رہے

رشتہ ساری عمر اسی خیال میں گزر گئی کہ ظالموں سے لیں گے انتقام، سوچتے رہے

حمیدہ خان

کسی ڈائری سے

انسانی فطرت میں جو بے پنی بے مبری قدرت نے رکھی ہے، وہ اسے کبھی خوش نہیں رہنے دیتی۔ لاماصل کی خواہش اسے ہمیشہ ایک تشنگی کی کیفیت میں مبتلا رکھتی ہے۔ احمد ندیم قاسمی نے انسانی فطرت کے اسی رخ کو بیان کیا ہے۔

آدی بھی عجیب چیز ہے جو نہیں ہے اسے ڈھونڈنا ہے مگر جس کو پاتا ہے

اس کو جب تک کھونڈ دے کتنا بے چین رہتا ہے

حاضر کو غائب میں غائب کو حاضر میں

یوں کھو جاتا ہے کہ جیسے وہ خود کہیں کھو گیا ہے

سحر ہیل

کسی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر جاوید اختر کی یہ غزل زندگی کی تلخ حقیقتوں کی ترجمان ہے۔ وہ حقیقتیں جن سے راہِ زیست میں رہنا ہوتا ہے بھی گزرتے ہیں۔ درد کے پھول بھی کھلتے ہیں، بکھر جاتے ہیں زخم کیسے بھی ہوں، کچھ روز میں بکھر جاتے ہیں

راستہ روکے کھڑی ہے ہسی اُلمجن کب سے کوئی پوچھے تو کہیں کیا کہ کدھر جاتے ہیں

چھت کی کردیوں سے اترتے ہیں مگر میری دیواروں سے ٹکرا کے بکھر جاتے ہیں

نرم الفاظ، بھلی باتیں، مہذب لہجے پہلی بارش میں ہی میں یہ رنگ اتر جاتے ہیں

اس درختے میں اب کوئی نہیں ادم بھی سر جھکاٹے ہوئے چپ چاپ گزر جاتے ہیں

عزیز دلی

کسی ڈائری سے

لیانیت علی حاصم کی شاعری سادگی اور پُر کاری کا بہترین نمونہ ہے۔ ان کی شاعری میں بے ساختگی اور برجستگی کے ساتھ ساتھ ایک خاص رنگ و آہنگ اور لب و لہجہ ہے جو انہیں دوسروں سے منفرد کرتا ہے۔ ان کی ایک غزل قارئین کے لیے۔

عشق بارِ دگر ہوا، ہی نہیں دل لگایا تھا دل لگا ہی نہیں

ایک سے لوگ، ایک سی باتیں گھر بدلنے کا فائدہ ہی نہیں

ماہنامہ کرن

جولائی 2018ء کا شمارہ شائع ہو گیا

کرن کا دسترخوان

اب ہر ماہ کرن کے ساتھ مفت موصول کریں

• فنکار ”رمشا خان“ سے شاہین رشید کی ملاقات،

• فنکار ”وہاج علی“ کہتے ہیں ”میری بھی سنی“،

• اس ماہ ”سعدیہ وحید سعدی“ کے ”مقابل ہے آئینہ“،

• آواز کی دنیا سے ”آرے سہیل خان“ اس ماہ مہمان ہیں،

• ”حبِ نم کی سحر“ رخ چوہدری کا نیا سلسلہ وار ناول،

• ”ہوائیں رخ بدل گئیں“ نگہت عبداللہ کا سلسلہ

وار ناول،

• ”لذتِ غم عشق“ صائمہ قریشی کا ناول،

• ”اباجی میں اور تم“ اُم ایمان قاضی کا ناول،

• ”غم ہے یا خوشی ہے تو“ تنزیلہ ریاض کا ناول،

• ”سورما“ نظیر فاطمہ کا ناول،

• فرح بھٹو، عمارہ خان، کشف بلوچ، عمارہ امداد

اور رضوانہ اسحاق کے افسانے اور مستقل سلسلے،

جولائی 2018

کے شمارے کی ایک جھلک



شعاع

جولائی 2018
کا شمارہ شائع ہو گیا

”شہر زاد“ صائمہ اکرم کا ناول،

”خواب شیشے کا“ عفت سحر طاہر کا ناول،

”بن پاکی“ فرح بخاری کا مکمل ناول،

”تیری ایک نگاہ کے اسیر ہیں“ نادیہ احمد کا مکمل ناول،

”خواہشوں کے دیار میں“ حمیرا نوشین کا مکمل ناول،

”نہ جائے ماندن“ ام طیفور کا ناول،

اف شین نعیم، نیر فہیم خان، انیلا طالب، حمیرا عروش اور ناطمہ زیدی کے افسانے،

معروف فنکارہ ”زارا نور عباس“ کا ”بندھن“،

”دستک“ معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ،

”جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے“،

”پیارے نبی ﷺ کی پیاری باتیں“ اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں،

شعاع ہر ماہ پوری محنت سے ترتیب دیتے ہیں، لیکن آپ کے خط ہمیں بتاتے ہیں کہ ہم اپنی محنت میں کتنے کامیاب ٹھہرے، ہمیں خط لکھنا نہ بھولیے گا۔

شعاع جولائی 2018 کا شمارہ آج ہی خرید لیں

بہنوں کے لیے۔
ہم نے کھٹکنے نہ دیا بے سرو سامانی کو
کہاں لے جائیں مگر شہر کی ویرانی کو
صرف گفتار سے زخموں کا در فوجا ہتے ہیں
یہ سیاست ہے تو پھر کیا کہیں نادانی کو
کوئی تقسیم نئی کر کے چلا جاتا ہے
جو بھی آتا ہے گھر کی نگہبانی کو
اب کہاں جاؤں کہ گھر میں بھی دشمن اپنا
اور باہر مرا دشمن ہے نگہبانی کو

سارے پوہدی
کے ڈاڑھی سے

حسن نقوی میرے پسندیدہ شاعر ہیں، اللہ پاک ان کے درجات بلند فرمائے۔ ان کی اس غزل کے باعث ہمارا ان سے تعارف ہوا جو مجھے بہت پسند ہے۔
ہم یوسف زمان تھے ابھی کل کی بات ہے
ہم تم پہ مہرباں تھے، ابھی کل کی بات ہے

ہم ہی تیری زبان پہ تھے اے دوست
مومنو ج داستان تھے، ابھی کل کی بات ہے

اے کاوان انقلاب و گل تم کو یاد ہو
ہم میر کا رواں تھے ابھی کل کی بات ہے

جن دوستوں کی کمی ہے آج حیات میں
وہ اپنے درمیان تھے، ابھی کل کی بات ہے

کچھ حادثوں سے گر گئے حسن زمین پہ ورنہ
ہم رشکِ آسمان تھے ابھی کل کی بات ہے

ہم جہاں بھی گئے پلٹ آئے
کوئی تیری طرح ملا ہی نہیں
دھونڈ لاتے دیں سے دل لیکن
پھر وہ میلہ لگا ہی نہیں
اس طرح ٹوکتا ہوں امداد کو
میسے میں جھوٹ بولتا ہی نہیں
ورنہ سقراط مر گیا ہوتا
اس پیالے میں نہ ہر تھا ہی نہیں

نوال افضل گھمن
کے ڈاڑھی سے

میری ڈاڑھی میں تحریر یہ چند لائیں عزیزان
ماریہ اعجاز گھمن کے نام۔

ہوائیں سرد ہو جائیں
یہ لہجے برف ہو جائیں
ہم اس کی یاد کی چادر کو
خود پہ تان لیتے ہیں
ستو...!

درویش لوگوں کی
کوئی دنیا نہیں ہوتی
ملے جو خاک رستے میں
اُسی کو چھان لیتے ہیں
اگر وہ روٹھ جاتا ہے
ہماری جان نکلتی ہے
یہ سانس جاری رکھنے کو
ہم اس کی مان لیتے ہیں

حمیدہ واجد
کے ڈاڑھی سے

میری ڈاڑھی میں تحریر یہ غزل آپ سب



نانک خالقون



خط بھجوانے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com

شعوانہ عائد..... مردان

اس بار شمارہ بے حد انتظار کے بعد ہاتھ آیا۔ ہمارے دھیان کے سارے دھاگے تو اسی سے جڑے رہتے ہیں۔ روز پتا کرواتے مگر بے سود۔ آخر کراچی سے مردان، فاصلہ بھی تو زیادہ ہے اوپر سے روزے اور گرمی۔ اللہ اللہ کر کے رسالہ ملا تو ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالا۔ ہر بار خیالوں میں ایک خط آپ کو لکھتے ہیں اور آپ کی طرف سے خود کو خود ہی جواب دے ڈالتے ہیں۔ اور مزے کی بات تو یہ ہے کہ آنے والے شمارے میں قارئین کے خطوط میں کہیں نہ کہیں ہمارے دل کی وہ باتیں موجود ہوتی ہیں اور آپ کے جوابات حسب توقع۔ آپ کے ادارے سے دلی وابستگی کا اتنا طویل عرصہ گزرا کہ ہماری ذہنی ہم آہنگی کمال کی ہو چکی ہے لیکن اس بار شبانہ طارق کے سوال

پر خود کو روک نہیں پائے۔ ان سے عرض ہے کہ سرسوں کے پھول فردری 2012ء کے شعاع میں چھپی تھی اور میری پسندیدہ کہانیوں میں سے ایک ہے۔

اس بار شمارہ سرورق سے آخر تک لا جواب تھا۔ عید کا سروے پڑھ کر معلوم ہوا کہ سب کی عیدیں ایک ہی طرز پر گزرتی ہیں۔ زینب احمد کی باتیں بس ٹھیک تھیں۔ دشت جنوں شکر ہے تھوڑا سا بدلاؤ آیا۔ حالم بہت غیر متوقع صورت حال سے دوچار ہے۔ نمرہ احمد بھی کچھ بھی کر سکتی ہیں۔ سوچ سے ماورا۔ مکمل ناول میں سمیرا حمید ایک بار پھر ایک اچھوتی تحریر کے ساتھ رونق افروز ہیں۔ افسانے بس ٹھیک تھے۔ سمیرا لپٹک تو سمیرا حمید کی کہانیوں کی ہیروئن کی طرح جھنجھکی، پر عزم اور کچھ کر کے دکھانے والی۔ بہت متاثر کیا۔ نفسیاتی الجھنیں پڑھ کر ان بہنوں سے ہمدردی محسوس ہوتی ہے "بیوی بس" کے مشورے آزمودہ اور قابل عمل۔ یہ تو تھا اس بار کا شمارہ۔ اب آپ سے ایک بات پوچھتی ہے کہ کیا عزیز سید اور رفعت ناہید سجاد کی تحاریر کتابی شکل میں آچکی ہیں؟ وقت کے ساتھ تبدیلی ناگزیر ہے۔ نئے لکھنے والے بھی اچھے ہیں

لیکن ہم پرانی مصنفین کو بہت یاد کرتے ہیں ان کی بات ہی کچھ اور ہے۔

ایک بات اور۔ ہم جانتے ہیں کہ عموماً پٹھان کا نام لیتے ہی پہاڑ، گھیردار لباس اور نسوار ہی ذہن میں آتے ہیں لیکن آپ کو بتاتے چلیں کہ صوبہ خیبر میں میدانی علاقے بھی بہت ہیں اور عام طور پر لوگ قومی لباس پہنتے ہیں اور سبھی پٹھان نسوار کا استعمال نہیں کرتے۔ دل چاہتا ہے کہ اپنے ملک کا یہ رنگ ساری دنیا سے متعارف کرنے کے لیے قلم اٹھائیں اور کہانیاں لکھ ڈالیں جو ہمارے ذہن میں پکتی رہتی ہیں تاہم ہمت نہیں کی۔

ج: پیاری شعوانہ! مردان کا کراچی سے فاصلہ کتنا ہی ہو، دلوں میں فاصلہ نہیں آنا چاہیے اور بھی پٹھان کا نام لیتے ہی ہمارے ذہن میں تو کھڑے نقشے

کے حسین چہرے گھوم جاتے ہیں جن کے دل ان کے چہروں کی طرح اچلے اور معصوم ہیں اب بھلا عجیب گل اور شاہد آفریدی کو دیکھ کر کس نالائق کے ذہن میں نسوار کا خیال آئے گا؟ اور ٹیلی پتھی تو ہمیں آتی نہیں اس لیے براہ راست آپ ہی سے پوچھ رہے ہیں، یہ شعوانہ عائد کا کیا مطلب ہے؟

عزیزہ سید اور رفعت ناہید سجاد کے ناول کتابی شکل میں آچکے ہیں۔ آپ 021-32735021 پر فون کر کے ان کے بارے میں دریافت کر سکتی ہیں۔

شاز یہ ستار..... ڈی جی خان

بابی! عید سروے میں میرے جوابات کیا اتنا برے تھے کہ آپ کو ذرا بھی پسند نہیں آئے؟ میں نے تو سب سے ہٹ کر اپنے دل سے جوابات دیے تھے کیا آپ کو میری کسی بات میں اٹرکشن محسوس نہیں ہوئی؟ اب آپ ہمارے افسانے کو جگہ دیں گی تو میں دوسرا افسانہ شروع کروں گی۔

عید نمبر اس دفعہ مزہ دے گیا۔ احادیث نبوی سے آنکھوں و دل کو منور کیا۔ (الحمد للہ)

"رنگ عید اور آپ" جوابات اچھے تھے سب کے، زینب احمد سے ملاقات اچھی تھی "دشت جنوں" میں یقین کریں مجھے پہلے سے پچھلی قسط سے ہی شک ہو گیا کہ بدروح "میڈم آئے کت" ہے داد تو دیں ہمیں بھی ہمارے انداز پر؟ (ہی ہی ہی) جیا بخاری کا افسانہ "تم آؤ میری عید ہو" میں زبردست قسم کا سبق دیا گیا، چھوٹے سے افسانے میں بڑا سبق پنہاں تھا ان لڑکیوں اور خواتین کے لیے جن کے ہاں فیس بک ٹویٹرز انٹرنیٹ کا بڑا ہی رواج آچکا ہے۔ عندلیب زہرا کا افسانہ اچھا تھا۔ انشیں نعیم "اب کے برس کی عید" میں بچوں نے اپنے امی ابو کو جس طریقے سے منوایا۔ دل کو گداز کر گیا۔ پیار آ گیا بچوں پر، قانتہ رابعہ "دن زیست کے" میں بہت ہی پیارا پیغام دے گئیں۔ قانتہ رابعہ کے افسانے سبق آموز ہوتے

ہیں۔ امت العزیز شہزادی "یہ شادی نہیں ہو سکتی" نے خوب خوب ہنسایا سیاست دانوں پر تاک تاک کے وار کیے۔ اس دفعہ اس ماہ کا بیسٹ ناول، ٹاپ پر سمیرا حمید کا "مہر میراں" رہا۔ آپ لوگوں نے بے چاری کو کیوں زہر پلا دیا بھی سمیرا حمید نے کیوں زہر پلویا؟ اور ایک بات آپ لوگوں نے واضح نہیں کی مہر کا پورا واضح سین آپ لوگوں نے نہیں دکھایا کہ کب اور کہاں زہر دیا گیا نہ ہی ان رشتہ داروں کا دکھ درد دکھایا گیا کہ ان پر کیا گزری جو اس کو ہر وقت گانے اور راگ پر اکتاتی رہتی تھیں؟؟؟ بہر حال میراں نے زبردست اینڈ کیا بہت اچھے طریقے سے بہرام خود غرض کو سزا دی۔ "حالم" کے۔ تو کیا کہنے زبردست ترین موڑ پر آچکی ہے۔ نمرہ ویل ڈن جی! شاز یہ جمال کی "باحیا" میں کمال کا سبق تھا بعض دفعہ ظالم لوگ۔ مظلوم بن جاتے ہیں اور مظلوم کو ظالم بنا دیا جاتا ہے۔ زبردست اور آپ نے "فریدہ گوہر" کو مشورہ دیا ہے سمیرا حمید بن کر نہ لکھیں فریدہ بن کر لکھیں۔ جی میں تو "شاز یہ ستار" بن کر لکھتی ہوں۔ بابی مجھے کراچی آنے کا بہت شوق ہے۔ مجھے بہت محبت ہے کراچی سے، شروع سے ہی ایک عجیب سی اٹرکشن محسوس ہوتی ہے مجھے۔ کراچی کے حالات اب ٹھیک ہو چکے ہیں ناں؟؟؟

ج: پیاری شاز یہ! ہمیں اپنی تمام قارئین کا خط لکھنا، تبصرہ کرنا بہت اچھا لگتا ہے آپ دل برداشتہ نہ ہوں۔ آپ کے سروے کے جواب بہت اچھے تھے۔ پسند کیوں نہ آتے۔ سروے کی بہت بڑی تعداد ابھی ہمارے پاس محفوظ ہے زہر نہ سمیرا نے پلایا نہ ہم نے پلایا، زہر تو زیا م منصور نے پلایا تھا زیا م منصور ہر دور میں کسی نہ کسی نام سے موجود رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ نواز شریف حکومت میں جو اقدامات کیے گئے۔ اس کے بعد کراچی کے حالات بالکل ٹھیک ہیں۔ آپ شوق سے کراچی آئیں۔ کراچی کا سمندر دیکھ کر آپ ایک ناقابل بیان سی کیفیت محسوس کریں

گی۔

سارہ محمود، آمنہ اکرام، مہک ندیم..... ظفر وال
مئی کا شمار ہاتھ میں آتے ہی سرورق پر ماڈل کو
دیکھا تو دل خوش ہو گیا۔ سب سے پہلے کرن کرن
روشنی پڑھا۔ پھر آمنہ ریاض کے ”دشت جنوں“ پہ
چھلانگ لگائی۔ نمرہ احمد مائی دی موسٹ فیورٹ
رائٹر حالم تو چھا گیا۔ یہ ہمیں ملا کہ میں ہی پہنچا دیتا
ہے۔ سمیرا حمید کا ناول بہت اچھا تھا۔ باقی شمارہ سارا
ہی اچھا تھا۔

ج: پیاری سارہ! خواتین کی پسندیدگی کے
لیے تہہ دل سے شکریہ۔ ہمیں افسوس ہے کہ آپ کی
کہانیاں شائع نہیں ہو سکتیں۔ آپ میں صلاحیت ہے
آپ باقاعدہ کہانی بنا کر لکھیں۔ آپ نے جو لکھا ہے
وہ محبت کے موضوع پر محض فلسفیانہ ہے۔

ناہید اسماعیل..... کراچی

آپ سب کو عید کی ڈھیروں مبارکباد۔ آپ
نے جن الفاظ میں ہمارے تبصرے کا جواب دیا
اس سے آپ پر ہمارا مان اور بھی کئی گنا بڑھ گیا
حقیقت تو یہ ہے کہ یہ جو ہم چند لفظوں کو جوڑ کے کچھ
جملے لکھ پاتے ہیں، اس کا سہرا بھی آپ اور آپ کے
ان رسالوں کے سر ہی ہے ورنہ ہم کہاں اتنے قابل۔
اس بار ڈائجسٹ کھولتے ہی پہلا صفحہ کھلا ”ایک
سوال نامہ کا جواب نامہ“ پڑھنا شروع کیا مسکراہٹ
سے اور ختم ہوا کھلکھلاہٹ پر۔ پھر ”حالم“ کی طرف
بڑھے اکثر کہانیاں ایسی ہوتی ہیں جنہیں پڑھتے
ہوئے قاری آگے کے واقعات کا اندازہ لگانے میں
کامیاب رہتے ہیں لیکن ”حالم“ وہ منفرد کہانی ہے
جس میں آگے کا کچھ بتا نہیں چل رہا اور تجسس ہے کہ
بڑھتا ہی جاتا ہے، کیا خوب لکھا نمرہ نے کہ ”تخت و
تاج کے لیے جنگیں لڑنے والے..... مخلوق میں رہنے
والے..... آخر میں کس مقام پہ آ کے روتے تھے؟
ایک دل تھا جو امیر غریب سب کا ایک ہی طرف
دھڑکتا تھا.....“

یعنی اس بار ”تالیہ“ میں حالم کے ساتھ ساتھ
ایک ایسی لڑکی کی جھلک بھی نظر آئی جس کے کچھ
خواب و خواہشات تو ضرور ہیں لیکن جو خودداری اور
عزت نفس کی دولت سے مالا مال بھی ہے، بلاشبہ نمرہ
احمد نے شاہکار تخلیق کیا ہے۔ ”دشت جنوں“ بھی
فیصلہ کن موڑ پر ہے یہ قسط بھی بھر پور رہی، سو معاویہ
نے آئے کت کو سزا دے ہی ڈالی تھی۔ افسانوں میں
حیا بخاری کی تحریر اچھی رہی۔ ذرا عندلیب زہرا کو تو
دیکھیں ننھی مئی کی تحریر میں عورت کی پوری زندگی کو تین
ادوار میں بیان کر کے جیسے دریا کو کوزے میں بند کر
دیا۔ ”اب کے برس“ میں کوئی نئی بات نہیں لگی یوں لگا
جیسے بچوں نے پرانی مودیز بہت دیکھ رکھی تھیں۔

شازیہ جمال کا افسانہ بھی پسند آیا لیکن اختتام
تھوڑا بڑھا کر لکھ دیتیں تو تشنگی نہ محسوس ہوتی۔ دلچسپ
عنوان سے مزین امت العزیز کی تحریر ”یہ شادی نہیں
ہو سکتی“ سیاسی پارٹیوں پر جملے بازی نے ماحول کو گل و
گلزار بنا دیا، طنز و مزاح اور ہنستے مسکراتے رنگوں سے
سجی تحریر بہت اچھی لگی۔ نگہت عبداللہ کی تحریر بھی اچھی
رہی، ویسے ہماری بہن پوچھ رہی ہیں ”بائے داوے
ایسے باس ملتے کہاں ہیں؟“ نسخہ ہائے وفا“ کی پہلی
قسط تو بہت اچھی لگی اب یہ جاننے کا تجسس ہے کہ آخر
عظمتی پھپھو نے ایسا کیا کیا جو عرش سے فرش پر آ
گئیں۔ پلیز زیادہ لمبا مت چلائیے گا۔ اب بات
کریں گے اس ماہ کی بہترین تحریر ”مہر میراں“ کی،
جس نے ہمیں ارد گرد سے بالکل غافل کیا، کیا منفرد
موضوع ہے اور کیا غضب لکھا سمیرا آپ نے کہ.....

”دل کا کرب آنسوؤں سے دھل جائے تو یہ
بھی بڑی نعمت ہے۔ زخموں کو دوا مل جاتی ہے، زخموں
کو دعا لگ جاتی ہے..... ناسور کو دوا ملے نہ دعا
لگے.....“ بہرام اور زیام جیسے ایک ہی سکے کے دو رخ
فیلڈ میں جو بھی ہو سیاست اور سازشیں ڈیڑھ صدی
پہلے اور بعد بھی وہی ہیں، لیکن جیتنے والے جیت ہی
جاتے ہیں، جیسے مہر اور میراں، ایک ”مر“ کے جیتی تو

دوسری ”جی“ کے۔

سمیرا ایملک کا انٹرویو اچھا لگا۔ سروے پسند
آیا۔ نفسیاتی انجمنیں میں تینوں بہنوں کی زندگیوں
میں آسانی کی دعا کی۔ ہماری بہن کی ایک فرمائش
ہے کہ پلیز نسیم آمنہ شاہ اور ہما کوکب بخاری کی پرانی
تحریریں شائع کیجیے۔

ج: پیاری ناہید! اچھی چیز کی تعریف نہ کرنا
بھی ہمارے نزدیک نا انصافی ہے۔ آپ کا تبصرہ
ہمیشہ کی طرح جامع اور مکمل ہے۔

ایسے باس ہم نے بھی نہیں دیکھے۔ نگہت عبداللہ
سے پوچھ کر بتائیں گے کہ کہاں ملتے ہیں۔ ویسے ہمارا
خیال تو یہ ہے کہ ایسے باس صرف اور صرف کہانیوں
میں ہی ملتے ہیں۔ آپ کی بہن کی فرمائش ضرور پوری
کریں گے، کچھ کہانیاں واقعی اتنی اچھی ہوتی ہیں کہ
”قدر مکرز“ کا لطف آتا ہے۔

سحر تبسم سحری..... مغل پورہ

عید نمبر کے حوالے سے ٹائٹل اے ون تھا
”کہنی سنی“ عید کا مفہوم زبردست اگر لوگ سمجھیں تو
”کرن کرن روشنی“ سبحان اللہ، ”ایک سوال نامہ“
انشائی کا لکھا ہمیشہ عمدہ رہا لیکن آپ پہلے ان کی
شاعری دیا کرتے تھے وہ زیادہ لا جواب ہوتی تھی۔

”میری ڈائری سے“ نمرہ اقرا اور رضوانہ کی شاعری
میرے دل کے حال جیسی تھی..... زینب احمد کا انٹرویو
خوب رہا پلیز شاہین رشید باجی انٹرویو دے دیں۔
پلیز پلیز۔ انٹرویو ”رنگ عید اور آپ“ اقرا جٹ اور

فریدہ رحیم لے جوابات اٹھائے۔ ”حالم“ نمرہ کی
کیا تعریف کریں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ سمیرا حمید کی
میں نے تعریف نہیں کرنی ہے۔ وہ بہت بہت آگے
ہیں آپ سمجھ جاؤ۔ نعیمہ ناز کیا واقعی آپ قسط وار لکھ
رہی ہیں؟ شکر ہے آپ ہر ماہ پڑھنے کو ملے گا۔ نگہت
عبداللہ کا ناولٹ اچھا تھا۔ امت العزیز کی تحریر میں
نے اپنی چھوٹی بہن کو پڑھنے کو کہا۔ اسے پسند آئی
اسے مطالعہ کا شوق نہیں ہے۔ افسانے میں حیا بخاری
ہمیشہ افسانے پہ ٹر خادیتی ہیں ناول کیوں نہیں لکھتیں
ہیں؟ عندلیب اور قانتہ، شازیہ کی تحلیریں بھی اچھی
تھیں افسانے! تم افسانے بہت اچھے لکھتے ہو افسانے
ہی لکھا کرو (آہم) رنگارنگ سلسلہ میں کینر، نمرہ،
نوال، عذرا، نادیہ اور آسیہ ونڈرفل، عید کے پکوان
لا جواب ”انجمنیں“ پیاری حجاب تم بالکل اپنی محبت
سے شادی کرو کیونکہ آج کل کے زمانے میں تو نیکی
کوئی یاد نہیں رکھتا اور نفیسہ تم اپنے ابو کا خیال کرو وہ بیمار
ہیں انہیں تمہاری ضرورت ہے، باپ کی کمی کوئی مجھ
سے پوچھے میں چار سال کی تھی جب بابا چلے گئے!
”آپ کی بیاض سے“ میں ہما فاروق، شبانہ، میمونہ،
سدرہ، نجمہ اکرم لا جواب، اس دفعہ فوزیہ ثمر اور کوثر
خالد کی کمی رہی۔

ج: پیاری تبسم! باب سائبان ہوتا ہے اس کا
وجود تحفظ اور عافیت ہوتا ہے لیکن باپ اپنے فرائض کو
نہ سمجھے تو اسے کیا کہا جائے۔ نفیسہ صدیقی کا معاملہ
مختلف ہے ان کی سوتیلی ماں انہیں گھر میں رکھنے پر
تیار نہیں تو پھر وہ باب کا خیال کیسے رکھیں۔

اعتذار

اس ماہ آمنہ ریاض کے ناول ”دشت جنوں“ کی آخری قسط آنا تھی۔ آخری قسط میں ناول کے تمام
کرداروں کو انجام تک پہنچانا اور واقعات کو سمیٹنا ہوتا ہے تاکہ کوئی پہلو تشنہ نہ رہ جائے۔ اس لیے آمنہ
ریاض اس ماہ قسط نہ لکھ سکیں۔

ان شاء اللہ آئندہ ماہ ”دشت جنوں“ کی آخری قسط شامل ہوگی۔

شاہین رشید کسی صورت انٹرویو دینے پر آمادہ نہیں ہم ان تک آپ کی فرمائش پہنچا رہے ہیں۔
خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

ارم ربانی..... سوہدرہ تحصیل وزیر آباد
کتنے خوش قسمت ہوتے ہیں وہ لوگ جو ہاتھ بڑھاتے ہیں اور ان کا ہاتھ تھام لیا جاتا ہے۔ پہلی دفعہ آپ کی محفل میں شرکت کی اور آپ نے میرا ہاتھ تھام کر جو حوصلہ افزائی فرمائی ہے۔ وہ میری خوش قسمتی ہے۔ خواتین میرا بچپن کا ساتھی ہے، بڑھاپے میں بھی ساتھ ہے، لیکن ابھی اس میں شرکت اس نظریہ پر نہیں کی کہ میں کسی کہانی پر تبصرہ کروں یا ڈائجسٹ کی تعریف و تنقید کروں کیونکہ تخلیق جیسی بھی ہو کسی کی امید ہوتی ہے۔ اس لیے میرے نزدیک ہر رائٹر بہتر سے بہتر کوشش کر رہی ہے۔

ج: ارم بہن! خواتین آپ کے بچپن کا ساتھی ہے تو یقیناً آپ کی عمر ایسی نہیں کہ آپ کو بوڑھا کہا جاسکے۔ ویسے بھی دل جوان ہونا چاہیے۔ یوں تو خواتین کے ساتھ آپ کا اتنا طویل تعلق ہی اپنی جگہ ایک جامع تبصرہ ہے لیکن کیا ہی اچھا ہوتا کہ آپ کہانیوں کے بارے میں بھی اظہار خیال کرتیں۔ تنقید کا مطلب حوصلہ شکنی نہیں اصلاح بھی مقصود ہو سکتی ہے۔ لکھنے والے کو پتا ہونا چاہیے کہ اس کی تحریر میں کیا کمی یا خامی ہے تاکہ وہ اپنی اصلاح کر سکے۔

اقرا عزیز جلبانی..... دریا خان جلبانی
خواتین وقت پر نہیں ملتا۔ روٹھے ہوئے محبوب کی طرح اس کا انتظار کرنا پڑتا ہے اس دفعہ بھی تبصرے سے پہلے میں سائرہ رضا کو مبارکباد پیش کرتی ہوں حسن المآب سے بہت کچھ سیکھا۔ حلیمہ جیسے لوگ میرے آس پاس رہتے ہیں، پر افسوس ہم ان کو کچھ کہہ نہیں سکتے کیونکہ ان کے پاس ہر دلیل ہوتی ہے اپنے لیے گنجائش نکال لیتے ہیں۔ دوسری وجہ یہ کہ ہر پرچار ہمارا ہے ہم سب قاری دوست کی طرح ہیں سو

ایک بات میں آپ سے شیر کرنا چاہتی ہوں وہ یہ کہ میں نے مسلسل دو راتیں اقراجٹ، انیلا طالب اور مہوش طالب کے نام سے جیسے کوئی بار بار ان کے نام

کی گردان کر رہا ہو۔ اب اقرار اور انیلا کو تو بحیثیت قاری کے میں جانتی ہوں یہ مہوش طالب پتا نہیں کون ہیں خیر میں نے ان کے لیے دل سے خیر و سلامتی کی دعائیں مانگی تھی اب پلیز کوئی بھی بہن یہ نہ سمجھے کہ میں تالیف بننے کی کوشش کر رہی ہوں یا کچھ اور بس جو بات بھی شیر کی۔ ماڈل بہت ہی پیاری تھی سب سے پہلے ”حالم“ پڑھا۔ اس ناول کا نام حال کے بجائے وقت کے قیدی ہونا چاہیے تھا۔ نمرہ کے ہر ناول سے ہم بہت کچھ سیکھتے ہیں ”حکم اذن“ وہی پرانا گھسا پٹا موضوع خاص متاثر نہیں کیا۔ نعیمہ ناز میں کیا کہوں کاوش بے سود کے بارے میں؟ عثمان کے کردار نے تو مانور لایا ہی دیا۔ بہت ہی پیارا ناول تھا یہ جالب اپنے حبیب جالب ہی تھے نا؟ افسانوں میں سمیرا حمید آئیں اور چھانگیں ہمیشہ نئے انداز نئے موضوع کے ساتھ قیافہ شناس تو پڑھا تھا یہ ردا تو سوچ شناس نکلی خیر دنیا عجائب گھر ہے یہاں سب ممکن ہے۔ قدرت کے شاہکار ہر جگہ موجود ہیں۔ قرۃ العین خرم ایک ”تھی چھوٹی“ اچھا لگا اب کچھ نئے انداز نئے ٹاپک یہ لکھیں ”دشت جنوں“ آئیوتمتی آخر ظاہر ہو ہی گئی (ابھی اینڈ رہتا ہے) یہ سلیپ پیرالیس کا کوئی حل ہے؟ کیونکہ یہ میرے ساتھ بھی دو تین دفعہ ہوا ہے اور یہ کیوں ہوتا ہے؟

آخر میں ایک سوال ہے آپ سے یہ نمرہ اقراء خط کیوں نہیں لکھتیں باقی تو ہر سلسلے میں شرکت کرتی ہیں بخت سحر، کنیر نبوی میں ہر ماہ آپ کی تحاریر کا انتظار کرتی ہوں۔ بیقہ انا نسبت زہرہ کہاں گم ہو۔
ج: پیاری اقرار! پلیز کیک کی ترکیب اس ماہ شعاع میں شامل ہے۔ آپ نے ان ناموں کی گردان بار بار سنی تو اس سے پریشان نہ ہوں، خواتین ڈائجسٹ میں یہ نام اکثر و بیشتر آپ کی نظر سے

گزرتے ہیں۔ تو آپ کے لاشعور کا حصہ بن جاتے ہیں۔

خواتین ڈائجسٹ لیٹ ملتا ہے یہ شکایت ہماری دیگر قارئین کو بھی ہے۔ انتظار تو ہمیشہ ہی مشکل ہوتا ہے لیکن محبوب کا انتظار تو کچھ زیادہ ہی جان گسل ہوتا ہے۔ خیر کوشش کر رہے ہیں کہ آپ کو خواتین انتظار کی کوفت سے گزرے بغیر وقت پر مل جایا کرے۔

سیسی خان..... بنوں
میں نہیں جانتی کہ خط وہ بھی اتنے بڑے ادارے کو کیسے لکھتے ہیں۔ مجھے تو بس جو اپنائیت اور محبت و تربیت ملی ہے اس ادارے سے اس کی بنا پر اپنے دل کی آواز پر آپ کو یہ لیٹر لکھ رہی ہوں۔

میں نے ڈائجسٹ کی وجہ سے بہت مارا اور بے عزتی کھائی ہے کیونکہ ابا..... پہلے نہیں پڑھنے دیتے تھے۔ اب وہ کچھ نہیں کہتے تو مزہ ہی نہیں آتا ڈائجسٹ کے سب سلسلے بہت پسند ہیں شاہین رشید سے ایک گزارش ہے کہ مغرور اور تک چڑھے لوگوں کا انٹرویو کرنے کے بجائے ہم جیسی سیدھی اور معصوم بچیوں کا کر لیا کریں انٹرویو۔

کوثر خالد، شمینہ اکرام، گریا شاہ اور وہ جو آپ کو خط لکھتی تھی۔ پہلے مجھے اس کا نام یاد نہیں آ رہا اب وہ خط کیوں نہیں لکھتی ”بنوسی“ ہے وہ ”بنوسیوں“ جاگ جاؤ پلیز خط لکھا کرو میں آپ کو بنوں کے ایک بہت ہی پیارے اور سرسبز گاؤں سے خط لکھ رہی ہوں۔

ج: پیاری سیسی! سادہ الفاظ اور خلوص دل سے لکھی ہوئی تحریر میں جو لطف ہے وہ بھاری بھر کم مشکل الفاظ میں کہاں۔ آپ نے بنوں کے ایک گاؤں سے خط لکھا۔ ہمارے لیے یہ ہی بڑی بات ہے۔ آئندہ بھی لکھتی رہیں۔ ہمیں خوشی ہوگی۔ کہانیوں کے لیے، ابھی مزید آپ کو محنت کی ضرورت ہے۔

ابا کچھ نہیں کہتے تو پڑھنے میں مزا ہی نہیں آتا پڑھ کر اس محاورے پر یقین آ گیا کہ چوری کے پیر زیادہ میٹھے ہوتے ہیں۔

ایمان کنول..... چکوال

خواتین اور شعاع سب سے معیاری پرچے ہیں۔ مجھے کتابیں پڑھنے کا بہت شوق ہے۔ گھر میں ڈائجسٹ پڑھنے کی اجازت نہیں ملتی۔ پچھلی دفعہ میں نے بہت ضد کر کے اپریل اور مئی 2017ء میں خواتین پڑھے۔ اس میں حسن المآب مجھے بہت پسند آئی مگر بعد میں یہ سلسلہ پڑھائی کی وجہ سے رک گیا۔ پلیز اس کی آخری قسط کا شمارے کا مہینہ اور سال بتا دیں۔ اس دفعہ شمارہ بہت اچھا تھا اور اس کی ساری کہانیاں ابھی بہت اچھی تھیں۔ تمام افسانے، ناولٹ اور ناول اچھے تھے۔ مجھے سب سے زیادہ سمیرا حمید کا ناول ٹیولپ پسند آیا۔ ابوبکر کی بے بسی نے آنکھیں نم

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوب صورت ناولز

ملال زیست	آمنہ ریاض	300/-
بڑا آدمی	نسیم سحر قریشی	400/-
فصل غم کا گوشوارہ	رضیہ جمیل	300/-
دل اک گلشن	رضیہ جمیل	300/-
سوچ گھر کی رانی	رضیہ جمیل	350/-
حتا	نادرہ خاتون	550/-
چلمن	نادرہ خاتون	300/-

بذریعہ پاک سٹور کے لیے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار گرجی، فون: 32216361



بادشاہ
ان دنوں ہر طرف آم کی بہار ہے۔ مختلف قسم کے آم مختلف ناموں سے بازار میں نظر آ رہے ہیں۔ اس پھل میں مزے کے ساتھ ساتھ بہت سے طبی فوائد بھی ہیں۔ مثلاً آم میں موجود اینٹی آکسڈنٹ مرکبات ہمیں بریسٹ کینسر، پروسٹیٹ اور بلڈ کینسر سے محفوظ رکھتے ہیں۔ اس کے تے ابال کر پینے سے ذیابیطس کے مریضوں میں انسولین کی سطح مناسب رہتی ہے۔ حال ہی میں کی گئی تحقیق کے مطابق نظام ہضم کی خرابیوں کو دور کرنے میں جتنا فائدہ آم کھانے سے ہو سکتا ہے اتنا کسی اور پھل سے نہیں ہوتا (جب ہی تو اسے پھلوں کا بادشاہ کہا جاتا ہے) اس میں ریشے یا فائبر کے ساتھ ایسے غذائیت بخش اجزاء ہوتے ہیں جو قبض کو دور کرنے میں اور آنتوں کی سوزش ختم کرنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ یہ فوائد اسپنول اور دیگر ریشے والی دواؤں سے بھی حاصل نہیں ہوتے۔

شکر

پاکستان میں بہوویں اس بات پر شاکی رہتی ہیں کہ انہیں سسرالی ماحول اور روایات کو اپنانا پڑتا ہے۔ لیکن یہ صرف مشرق میں ہی نہیں ہوتا بلکہ برطانیہ میں بھی بہو کو سسرال کے طور طریقے اپنانے پڑتے ہیں۔ اب یہی دیکھ لیں کہ سابق امریکی اداکارہ میگن مرکل جو برطانوی شہزادے ہیری سے شادی کے بعد اب شاہی خاندان کی بہو ہے۔ اسے اب شاہی خاندان کا ہر حکم ماننا لازمی ہے۔ شاہی روایات کے مطابق میگن کو اس بات کا پابند کیا گیا ہے کہ وہ گھر سے باہر جاتے ہوئے یا کسی بھی تقریب میں شرکت کے وقت شاہی خاندان کا لباس اپنانا گئی۔ میگن کو شاہی خاندان کی دیگر خواتین کی طرح سر

میری۔ میری ایک ریکویسٹ ہے اگر آپ مان لیں تو۔ پلیز میں بہت مان سے کہہ رہی ہوں۔ F.M 107 کے آر جے ساحر لودھی کا انٹرویو شائع کر دیں پوری تفصیل سے۔

میرے گھر ٹی وی نہیں سو میں ٹی وی پہ شو بھی نہیں دیکھ سکتی۔ جو تھوڑی سی عقل میں نے سیکھی ہے وہ اس رسالے سے سیکھی ہے۔ میری ماما، خالہ، میری کزنز اور گاؤں کی (جہاں سے چھٹیاں گزار کر واپس آئی ہوں) ساری لڑکیاں خواتین اور شعاع بڑھتی ہیں۔ ج: پیاری فضا! تھوڑی تو نہیں اچھی خاصی عقل سیکھ لی ہے تب ہی تو شاعری نہیں بھیجی شاباش۔ پہلے دل لگا کر تعلیم حاصل کرو ان جھیلوں میں بعد میں پڑنا۔ ٹائٹل گرل اتنی محنت سے تیار ہوئی تھی آپ نے شاعروں کی طرح صرف آنکھوں کی تعریف کر دی۔ یہ تو زیادتی ہے۔ آئے کت چودھویں کے چاند کو کہتے ہیں اتنی دفعہ تو بتایا ہے اس کا مطلب، اب تو یاد ہو جانا چاہیے تھا۔

خواتین ڈائجسٹ

کی طرف سے
بہنوں کیلئے خوبصورت ناول

یہ لگیاں یہ چھوہارے

فائبرہ انٹار

قیمت - 400 روپے

منجانبہ کا پتہ:
مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37، اردو بازار، کراچی
فون نمبر:
32735021

ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے رچوں ماہنامہ شعاع اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرویا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ٹی وی چینل پہ ڈراما ڈرامائی تفصیل اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشرس تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

کر دیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ میں بھی معذور ہوں۔ اور اس لفظ سے مجھے سخت چڑ ہے۔ مگر بعد میں یہ سوچا اور اللہ کا شکر ادا کیا کہ میں تو بہت بہتر ہوں۔ اگرچہ مجھے محتاجی کا سامنا کرنا پڑتا ہے مگر پھر بھی کسی کو میرے منہ میں نوالہ نہیں ڈالنا پڑتا ہے۔ قارئین سے التماس ہے کہ میری صحت کے لیے دعا کریں۔
ج: پیاری ایمان! اللہ تعالیٰ آپ کو صحت دے۔ ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ آپ کی ہمت اور جذبہ قابل تحسین ہے کہ آپ نے معذوری کو مجبوری نہیں بنایا۔ حسن الہام کی آخری قسط جنوری 2018ء میں شائع ہوئی تھی۔

فضہ یوسف..... بھاول پور

میری عمر 15 سال ہے۔ میٹرک کے پیپرز دیے ہیں۔ سرورق پہ ماڈل کی آنکھیں بہت اچھی لگیں۔ نمرہ احمد، سمیرا حمید اور نایاب جیلانی مجھے بہت پسند ہیں۔ سمیرا آپ کی کاٹرز تحریر اور جملوں کی چٹنگی کی میں داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ نمرہ آپ کا عالم زبردست ہے۔ مجھے وان فاح اور ان کی بیٹی کا کردار پسند ہے۔ نایاب آپ! آپ کے ناول وہ اک لمحہ، چاند رات اور سرخ گلابوں پہ شبنم پڑھ کر تو میں پکی آپ کی فین ہو گئی۔

دشت جنوں میں آمنہ آپ کی کمال کا لکھ رہی ہیں مگر آمنہ آپ! آئے کت کا مطلب کیا ہے۔ یہ مسلمانوں والا نام نہیں لگتا نہ ہی پہلے بھی سنا ہے۔ خبریں و بریں میں واصفہ آپ ہاتھ ہولا رکھا کریں پلیز۔

اپنا! مجھے رسالے کی صحیح تاریخ کا نہیں پتا۔ مجھے بتائیے یہ کب آتا ہے پلیز۔ میں شاعری بھی کر لیتی ہوں اور دو ناول بھی لکھ کر رکھے ہیں۔ بھیجتی اس لیے نہیں کہ اگر شائع نہ ہوئے تو بے عزتی ہو جائے گی

اعتراف

صحیفہ جبار (تیری میری کہانی کی ہیروئن) کا کہنا ہے کہ ”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں ان ماؤں، بیٹیوں یا بیویوں کو کیا مشورہ دوں جو مجھے بتاتی ہیں کہ انہیں خودکشی کرنے کے خیالات آتے ہیں یا وہ اندر سے خوشی محسوس نہیں کرتیں۔ ان کے گھر والے انہیں نہیں سمجھتے اور وہ خود کو نقصان پہنچانا چاہتی ہیں یا کہیں



گے، اس الم کو صرف وہی جان سکتے ہیں۔ ہماری مذہبی قومی اور اخلاقی روایات یہ سکھاتی ہیں کہ اس لمحے کا احترام لازم ہے۔ اس مرحلے پر دل جوئی فرض ہے۔ (عمار مسعود..... آپ)

☆☆☆

☆2013ء کے انتخابات کے نتیجے میں جو حکومت سامنے آئی اس نے توقعات کے برعکس سابق فوجی آمر پرویز مشرف پر آئین کے آرٹیکل 47 کے تحت مقدمہ چلانے کا اعلان کر دیا۔ 2013ء کے موسم خزاں میں سامنے آنے والے اس قضیے کے بعد مسلم لیگ (ن) کی حکومت زمین پر پاؤں نہیں جما سکی۔

(وجاہت مسعود..... تیشہ نظر)

سروں کی شخصیت

ماڈل اریج خان
میک اپ روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافی موسیٰ رضا

ہے کہ نہیں“ (یعنی آپ اپنے کام سے مطمئن نہیں ہیں.....؟)

تبدیلی

سونیا حسن معاشرے میں خواتین کے ساتھ ہونے والے ناروا سلوک کے بارے میں کہتی ہیں کہ مائیں، بہنیں، بیٹیاں اور بیویاں ہمارے معاشرے کا اہم حصہ ہیں۔ ان کا احترام کرنا سب سے زیادہ ضروری ہے۔ میں چاہتی ہوں ہمارے ملک میں ایسا قانون بنے جہاں مجرم اس قسم کے جرائم کرنے سے قبل ان کی خطرناک سزاؤں سے ڈریں۔ میں نے بہت سی خواتین کو مردوں کے ہاتھوں ہراساں ہوتے دیکھا ہے۔ (سب ہی دیکھتے ہیں سونیا! پر عمل.....؟) میں چاہتی ہوں کہ تبدیلی آئے (تبدیلی صرف کہنے سے نہیں آتی سونیا! سوچ کو بدلنا ہوگا) تبدیلی آئے گی تو خواتین آزادی سے گھوم سکیں گی جب انہیں کسی قسم کا ڈرنہ ہوگا نہ کوئی ان پر الزام لگایا جائے گا۔ (سونیا! اس تبدیلی کے لیے خواتین کو اپنے طرز عمل میں تبدیلی لانا پڑے گی۔ اپنے بیٹوں، بھائیوں کی سوچ کو بدل کر انہیں ماں بہن بیٹی کے بجائے عورت کی عزت کرنا سکھانا ہوگا۔ تب ہی تبدیلی آئے گی ورنہ.....؟)

☆☆☆

کچھ ادھر ادھر سے

☆2013ء میں تمام سیاسی ہنگاموں کے باوجود آئندہ حکومت میں سیاسی استحکام کی امید موجود تھی۔ بد قسمتی سے 2018ء کے انتخابات کی طرف بڑھتے ہوئے یہ خوش فہمی دور ہو چکی ہے۔

(وجاہت مسعود..... تیشہ نظر)

☆ جب ڈاکٹر کہتا ہے کہ اچھی خبر یہی ہے کہ کوئی بری خبر نہیں تو اس کا کیا مطلب ہوتا ہے جب اس جاں کنی کے عالم میں انٹیشن ہونے کی اطلاع ملتی ہے تو اہل خانہ پر کیا گزرتی ہے۔ نواز شریف اور ان کے بچے اس وقت جس کیفیت سے گزر رہے ہوں

ادھر بے نظیر بھٹو کی بیٹی بختاور زرداری نے کہا ہے کہ اگر ایسی کسی فلم پر کام ہو رہا ہے تو اس کی اجازت ان کے وارثوں یا بچوں سے نہیں لی گئی ہے۔ اور یہ بات ان کے لیے مکمل طور پر ناقابل برداشت ہے۔ ہم اس کے خلاف قانونی ایکشن لیں گے۔

صدمہ

ڈراما سیریل ”سایہ“ کے ہیرو اداکار سہیل سمیر کا کہنا ہے کہ ”ہمارے یہاں سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ آپ کس چینل کے اداکار ہیں۔ اس سے بڑی ہماری تو ہین کیا ہوگی۔ ایکٹر ایکٹر ہوتا ہے، یہ نہیں کہ آپ فلاں فلاں چینل کے ایکٹر ہیں (اچھی اداکاری اپنا آپ منوا ہی لیتی ہے جناب) یہ تو ایکٹر کی موت ہے۔ (ہاں جی بات تو ٹھیک ہے) میں صرف کام کرنا چاہتا ہوں۔ اچھا کام کرنا چاہتا ہوں (تو آپ کام کر تو رہے ہیں۔) کام کی کمی نہیں ہے (تو پھر.....؟) اچھے کام کی کمی ہے (یہ اچھا اور برا کام کیا ہوتا ہے جی.....!) ٹیلنٹ کی کمی بھی نہیں ہے۔ سب اچھا کام کر رہے ہیں (کون سب.....؟) کاسٹنگ کے وقت یہ دیکھ لیا جائے کہ اداکار اس کردار کے لیے موزوں



بھاگ جانا چاہتی ہیں۔“

آج پہلی بار میں ان کے سامنے یہ اعتراف کرنا چاہتی ہوں کہ مجھے اینگرائی کی بیماری ہے۔ مجھے بھی خود کشی کے خیالات آتے ہیں جب کہ میں انتہائی خوش نصیب ہوں کہ مجھے بہترین شوہر، والدین اور سسرال ملا۔ میں اپنی پروفیشنل اور نجی زندگی میں کامیاب ہوں پھر بھی مجھے کبھی لگتا ہے کہ میں اندر سے ادھوری ہوں۔ جن لوگوں کو ایسے خیالات آتے ہیں میں ان سے کہنا چاہتی ہوں کہ گھبرا میں نہیں۔ ایک دن سب ٹھیک ہو جائے گا پھر ہم راتوں کو نہیں جاگیں گے۔

اجازت

مہوش حیات بہت جلد بے نظیر بھٹو کا کردار ادا کرتی نظر آئیں گی۔ بے نظیر بھٹو کی زندگی پر بنائی جانے والی فلم کے بارے میں مہوش حیات کا کہنا ہے کہ انہوں نے کبھی سیاست میں دلچسپی نہیں لی۔ البتہ وہ اس بات کو نظر انداز نہیں کر سکتیں کہ بے نظیر نے مردوں کے معاشرے میں خواتین کے لیے جدوجہد کی۔ مہوش حیات نے بتایا کہ بہت جلد اس فلم پر کام شروع ہوگا (کون کرے گا..... بھی کام شروع؟)

اپ کا باورچی خانہ

قرآنہ انصاری

تھیں اور گرمی سے ان کی حالت خراب ہو جاتی تھی) تو جب سے میں نے بنانا شروع کیا۔ امی بتاتی رہتی تھیں میں پکاتی تھی اور الحمد للہ ایک سال میں ہی میرے پکائے ہوئے کھانوں کی ہر جگہ تعریف ہونے لگی۔ دعوتوں تک کا کھانا بنانے لگی تھی۔ سوائے بریانی کے، بریانی آج تک مجھے ڈھنگ کی بنانی نہیں آئی۔ سالن بنوالیں جو دل چاہے۔ بریانی اور کھیر میری بڑی بہن ہی بناتی تھیں۔ میں کہتی مجھے کھیر تو بنانا سکھا دیں۔ شادی کے بعد سب سے پہلے کھیر میں ہاتھ ہی لگتا ہے اور اس چیز سے میں بہت ڈرتی تھی۔

پہلی مرتبہ میں نے کھیر شادی کے بعد ربیع الاول میں بنائی (میری شادی عید کے بعد ہوئی تھی) میری بہن فون پر گائیڈ کر رہی تھیں (وہ حیدرآباد میں رہتی ہیں) آپ یقین کریں جب سب کو بھجوائی تو کوئی یقین نہیں کر رہا تھا کہ میں نے پہلی مرتبہ بنائی ہے۔ سب کہہ رہے تھے ضرورت میں نہ کھویا وغیرہ ڈالا ہے جبکہ میں نے صرف اور صرف خالص دودھ کی بنائی تھی بنانی ڈالے۔

س: کھانا پکاتے ہوئے آپ کن باتوں کا خیال رکھتی ہیں؟

ج: شادی سے پہلے تو امی کا حکم اور میرے بھتیجے کی فرمائش چلتی تھی۔ تو جوان دونوں کی پسند ہوئی، وہی پکاتا تھا۔ یہ محاورہ تو مشہور ہے ہی کہ ”مرد کے دل کا راستہ معدے سے ہو کر گزرتا ہے“ اور اس میں کوئی شک بھی نہیں ہے۔ تو کھانا پکاتے وقت ان کی پسندنا پسند کا بھرپور دھیان رکھتی ہوں۔ جو انہیں پسند ہو وہی پکاتی ہوں۔

غذائیت ان کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ یہ

میں ایک ہاؤس وانف ہوں۔ میری شادی کو چھ سال ہو چکے ہیں اور الحمد للہ پانچ سال کا میرا بیٹا ہے۔ شادی سے پہلے بھی چکن کی ذمہ داری مجھ پر تھی اور شادی کے بعد تو ہر لڑکی پر چکن کی ذمہ داری آ جاتی ہے۔ میرا چکن میں جانا بھی ایک عجیب واقعے سے ہوا۔ ہمارے ہاں عام طور پر پانچویں جماعت کے بعد سے ہی تھوڑا بہت کام کروانا شروع کر دیتے ہیں تو چھٹی کلاس سے شام کو پورے گھر کی صفائی، دوپہر کے ڈھیروں کھانے کے برتن اور شام کی چائے کی ذمہ داری مجھ پر تھی۔ حالانکہ اس وقت ہمارے گھر میں چار بھابھیاں اور تین بہنیں غیر شادی شدہ تھیں اس کے باوجود امی نے بچپن سے ہی کام کرنے کی عادت ڈالی۔ جب میں میٹرک کے پیپر دے کر فارغ ہوئی تو مجھے میری بڑی بہن بھانجی اپنے دادا کے چہلم میں شرکت کے لیے نواب شاہ لے گئیں۔ اب میری بھانجی ناہید (جو مجھ سے دو سال بڑی ہے) روٹیاں پکانے بیٹھی تو مجھے بھی ساتھ بٹھا لیا۔ ”چلو دونوں روٹیاں پکاتے ہیں۔“

مجھے تو آٹا بھی گوندھنا نہیں آتا تھا۔ اب گھر مہمانوں سے بھرا ہوا میں پیڑہ بنانے کی کوشش کرنے لگی تو مجھ سے بن ہی نہیں رہا۔ (اس سے پہلے بھی کچھ پکایا نہیں تھا سوائے چائے کے) یقین جانیں اس قدر شرمندگی ہوئی کہ میں بتا نہیں سکتی۔ بس پھر تو میں نے عہد کر لیا اب بس کھانا بنانا سیکھنا ہے۔

اتفاق کی بات بھابھا علیحدہ ہو گئیں میری دو بہنوں کی شادیاں ہو گئیں۔ ایک بہن کوٹا سیفائیڈ ہو گیا۔ بڑی بھابی جو کہ ہمارے ساتھ تھیں ان سے امی کھانا نہیں پکواتی تھیں (وہ ہائی بلڈ پریشر کی مریضہ

شکر ہے، گلی سے نکلتے ہی کھانے پینے کا بازار ہے تو فوراً ان سے گوشت وغیرہ منگوا لیتی ہوں۔ باقی سامان تو گھر میں ہوتا ہی ہے۔ میری چکن کڑا ہی میں میری دو چیزیں اپنی شامل کردہ ہیں۔ ایک تو چھوٹی ہری مرچ اور دوسرا لیموں کا رس ترکیب حاضر ہے۔

مرغی کا گوشت آدھا کلو (دھو کر رکھ لیں)

ٹماٹر (چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں کاٹ لیں)

چھوٹی ہری مرچ چار سے چھ عدد (لمبائی میں دو ٹکڑے کاٹ لیں ٹماٹر کے ساتھ)

پسپا ہوا درک لہسن دو بڑے کھانے کے چمچے تیل آدھا پاؤ سے تھوڑا زیادہ

زیرہ ایک چھوٹا چائے کا چمچ چکن کڑا ہی مسالا دو کھانے کے بڑے چمچے

کٹی ہوئی لال مرچ ایک چھوٹا چائے کا چمچ نمک حسب ضرورت

(میں ایک بڑا چمچ استعمال کرتی ہوں)

بڑی ہری مرچ تین سے چار عدد (سجاوٹ کے لیے)

ادرک تھوڑی سی باریک کٹی ہوئی (سجاوٹ کے لیے)

لیموں ایک بڑے سائز کا سب سے پہلے پتلی میں تیل گرم کر کے زیرہ، لہسن ادرک پیسٹ، مرغی کا گوشت (ایک کے بعد ایک چیز) ڈال کر فرائی کر لیں۔ اب اسی میں کٹے ہوئے ٹماٹر، چھوٹی ہری مرچ، کڑا ہی مسالا، کٹی ہوئی مرچ، نمک ڈال کر ڈھکن ڈھک کر دس منٹ تیز آگ پر پکائیں۔ پانی بالکل نہ ڈالیں۔ دس منٹ بعد جب ٹماٹر نرم پڑ جائیں تو انہیں چمچ سے مسل لیں۔ اب آگ دھبی کر کے ٹماٹروں کا پانی خشک ہونے تک گوشت بھونیں۔ (چکن ٹماٹر کے پانی میں ہی گل جاتی ہے۔) اب ثابت ہری مرچ ڈال کر

گوشت خور ہیں، ان کا بس چلے تو روز گوشت پکوائیں۔ (مگر آج کے دور میں روز گوشت پکانا مڈل کلاس کے لیے ناممکن سا ہے) تو پھر ہفتہ وار مینیو میں ایک دن گوشت کی کوئی بھی ڈش، دوسرے دن دال یا سبزی تیسرے دن پھر گوشت اور اس سے اگلے دن دال سبزی تو اسی طرح روٹین چل رہی ہے۔

بھی نہیں بھی موڈ ہوتا تو نہیں پکاتی (یہ اور بات ہے کہ بعد میں پچھتاتی ہوں، باہر کا کھانا بہت مہنگا پڑتا ہے۔) میرے شوہر ماشاء اللہ اچھا کھانا کھانے کے بے حد شوقین ہیں۔ تو اس وجہ سے بجٹ بھی اپ سیٹ ہوتا رہتا ہے۔

س: کھانے کا وقت ہے، اچانک مہمان آجائیں، کسی ایسی ڈش کی ترکیب جو فوری طور پر تیار ہو سکے؟

ج: شادی سے پہلے تو ہمارا گھر ہر وقت کے مہمانوں سے بھرا رہتا تھا۔ مسلسل دوسرے شہروں سے آنے والے مہمان بھی ٹھہرے ہوتے تھے۔ ہماری امی ابو کے رشتہ دار حیدرآباد، نواب شاہ، سکھر، ملتان، شجاع آباد، لاہور، اسلام آباد (یہاں تک تو ہم گئے ہیں شادی سے پہلے) اور نجانبے کہاں کہاں سے آ کر رہتے تھے۔ آج سے بیس سال پہلے جب بھی کوئی رشتہ دار آتا ہمارے ہاں ہی ٹھہرتا تھا (یہ اس وقت کی بات ہے جب والد صاحب حیات تھے اور کام کرتے تھے) ہمارے گھر سے کوئی بناء کھائے ہے نہیں جاسکتا تھا۔ (چاہے اگلے کو بھوک ہی نہ ہو) امی ابو کی مہمان نوازی بے مثل تھی۔

اس وقت سادگی بھی بہت تھی۔ دکھاوا نہیں تھا۔ گھر میں جو کچھ بھی تازہ بنا ہوا ہوتا وہی مہمان کے آگے پیش کر دیا جاتا تھا۔ زیادہ ہوا تو سویوں کا زردہ بنا لیا (جو جلدی سے بن جاتا تھا) امی نے ہمیں بھی یہی سکھایا۔ کسی مہمان کو سوکھے منہ نہیں ٹرخانا، گھر میں جو کچھ بھی پکا ہوا ہے وہی پیش کر دو۔ (تازہ تازہ) اور اگر کچھ نہیں پکا ہوا ہوتا (بھی موڈ نہیں ہوتا) تو سب کی طرح میں بھی چکن کڑا ہی ہی بناتی ہوں۔

میں بھی گوشت فریز کر کے نہیں رکھتی۔ اللہ کا

(تیل اور آنے کے بعد) پانچ منٹ دم پر رکھ دیں۔ ڈش میں نکالنے سے پہلے لیموں کا رس شامل کر کے مکس کر لیں۔ ساتھ میں نمک بھی چکھ لیں۔ ڈش میں نکال کر کٹی ہوئی ادرک سے گارنش کر کے گرم گرم تندور کی روٹی یا گھر کی روٹی کے ساتھ پیش کریں۔

میرا دعوا ہے مہمان انگلیاں چاٹتے رہ جائیں گے۔ آپ گھر میں آزما کر دیکھ لیں۔

س: کچن عورت کے سلیقے کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ آپ کچن کی صفائی کے لیے کیا خصوصی اہتمام کرتی ہیں؟
ج: یہ بالکل سچ ہے۔ ہم نے آپ کے ڈائجسٹ سے ہی سیکھا ہے۔ گھر کے ساتھ کچن واش

روم کو بھی صاف رکھنا۔ گھر تو ہر کوئی سجا کر رکھتا ہے۔ میں کچن کی صفائی پر بھی خصوصی توجہ دیتی ہوں۔ (زیادہ ٹائم تو وہیں گزرتا ہے نہ)

میری عادت ہے میں بھی کھانا پکاتے وقت برتن جمع نہیں کرتی، ہاتھ کے ہاتھ دھوتی رہتی ہوں۔ کچر پاسکٹ میں ڈالتی رہتی ہوں چاہے مجھے دس مرتبہ کچن سے باہر آنا پڑے۔ میں کچن میں ڈسٹ بن نہیں رہتی۔ بو ہوتی ہے۔ چاہے کچھ بھی پکاؤں سوائے چولہے پر چڑھی ہانڈی اور ساتھ رکھے کچے کچے علاوہ کوئی برتن گندا نہیں ملے گا۔ (اس بات پر گھر والے بھی اور یہ بھی مجھے نفسیاتی کہتے ہیں تو کیا واقعی صفائی رکھنا نفسیاتی بن ہے؟)

کچن کی صفائی پندرہ دن بعد ضرور کرتی ہوں۔ پورا کچن خالی کر کے اچھی طرح جھاڑ کر کونے کونے میں کیڑے مار پاؤڈر ضرور ڈالتی ہوں۔ (اس کی وجہ سے کاروچ وغیرہ بالکل نہیں ہوتے) چولہے وغیرہ روز کے روز صاف کرتی ہوں۔ ہر چیز اچھی طرح دھو خشک کر کے رکھتی ہوں۔ جب کچن بالکل صاف ہو جاتا ہے تو تھکن کے ساتھ بے پناہ خوشی کا بھی احساس ہوتا ہے۔ (اس دن کھانا پکانے کی چھٹی ہا، ہا، ہا)
س: صبح ناشتے میں آپ کیا بناتی ہیں، کوئی خصوصی ڈش؟

ج: شادی سے پہلے تو کبھی صبح کی چائے بھی نہیں بناتی تھی (چاہے بعد میں سارا دن گدھے گھوڑوں کی طرح کام کرتے) مگر ناشتہ کے ٹائم ہم بادشاہ ہوتے تھے۔ جب تک میری بڑی بہن روٹی کی شادی نہیں ہوئی تھی ناشتہ وہی بناتی تھی۔

میں اور میری بیٹی ”کرن“ اپنی بہن کو بہت ستاتے تھے۔ ہمارا آرڈر تھا کہ جب ہم منہ دھو کر آئیں تو ہمارا من پسند ناشتہ تیار ہونا چاہیے۔ نہ چائے پہلے سے بنا کر رکھیں اور نہ ایک منٹ لیٹ ہو۔ (جو ذرا سی دیر ہو جاتی تو منہ پھول جاتا) ہمارا بس چلتا تو چائے کے بغیر ہم سانس بھی نہ لیں (نعوذ باللہ) بہن یا امی اپنی مرضی سے کچھ بناتیں یا منگواتیں تو ہمارے خڑے آف توبہ۔

”ہمارا تو آج یہ دل چاہ رہا تھا، آج تو یہ کھانا تھا۔“ تو اس معاملے میں اپنی بڑی بہن اور امی کو بہت ستایا (اب احساس ہوتا ہے) جب کرن اور میں منہ دھو رہے ہوتے تب امی پوچھتیں۔

”مہارانیوں بتادو۔ کیا کھانا ہے (طنز پر)۔“ ہمارے ہاں پیکری قریب تھی اور حلوہ پوری بھی آسانی سے مل جاتی تھی۔ تو کبھی بھی ناشتہ میں کھانا ہوتا امی ہی لا کر دیتی تھیں۔ (باقی سب سو رہے ہوتے تھے) اور ہم دونوں کے سوا سب ہی چائے پراٹھا کھاتے تھے۔ تو ہم بھی حلوہ پوری، بھی پاپے، پیکری کے سارے ہی آٹم، ایک ایک کر کے منگواتے تھے۔ (بس کسی طرح امی کے پیسے خرچ کروانے ہوتے تھے) امی بعد میں ہم سے سارا دن کام کرواتی تھیں۔

بہر حال شادی کے بعد تو سارے خڑے رکھے رہ جاتے ہیں۔ میں شروع سے ہی چائے کے ساتھ کچھ بھی لیتی ہوں۔ (صبح میں پراٹھا سالن نہیں کھایا جاتا) یہ تو دو بجے کے بعد ہی اٹھتے تھے تو سردیوں میں چائے کے ساتھ کبھی پراٹھا کبھی بن وغیرہ کھاتے تھے اور گرمیوں میں لسی اور ملک شیک بنواتے ہیں۔ کبھی رات میں رگین سویاں بنوا کر رکھ لیتے ہیں۔
صبح ناشتے میں ٹھنڈی میٹھی سویاں بہت مزیدار

لگتی ہیں۔ اب جب سے حسن اسکول جانے لگا ہے تو اس کے کچ بکس کے لیے بہت اہتمام کرنا پڑتا ہے۔ کبھی انڈا پراٹھا، کبھی کباب پراٹھا، کبھی بوٹی پراٹھا تو کبھی آلو کا پراٹھا، ججہ کو ہاف ڈے ہوتا ہے تو سینڈویچ بنادیتی ہوں۔ (سچ ہے ماں بننا آسان نہیں)۔

س: مہینے میں کتنی بار کھانا کھانے باہر جاتی ہیں؟
ج: مہینے میں..... یوں پوچھیں سال میں؟ حسن کی پیدائش سے پہلے تو اکثر یہ کھانا کھلانے لے جاتے تھے۔ اب تو سال میں دو یا تین مرتبہ ہی جا پاتے ہیں۔ اول تو ان کو چھٹی نہیں ملتی۔ چھٹی ملتی ہے تو پیسے نہیں ہوتے۔ پھر بھی حسن کی سالگرہ یا عید، بقرعید پر ضرور جاتے ہیں۔ ہاں بازار وغیرہ جائیں تو وہی بڑے ضرور کھاتے ہیں۔ اگر تکہ وغیرہ کھانا ہو تو یہ رات کو گھر پر

ہی لے آتے ہیں اور کچھ نہیں منگواتی۔ حسن کو چکن بریانی بہت پسند ہے وہ بھی باہر کی تو وہ بہت لاتے ہیں۔ س: کھانے کے انتخاب میں موسم کا خیال رکھتی ہیں؟
ج: جی بالکل! گرمیوں میں مونگ، مسور کی دال کے ساتھ تلی ہوئی مسالہ بھری ہری مرچیں، بیسن کی روٹی اچار اور چٹنی کے ساتھ، کھجڑی یا سادے چاول دہی کے رائتے کے ساتھ جو مزہ دیتے ہیں تو سردیوں میں پائے، شام گوشت، بھنی بھنی کٹیجی اور کچھ فرانی سردیوں کا مزہ دو بالا کر دیتا ہے۔ اسی طرح برسات میں سمو سے پکڑے نہ بنائیں تو برسات کا مزہ نہیں آتا۔ بارش میں آلو کے پراٹھے بھی ضرور بنتے ہیں اور گڑ کی میٹھی روٹیاں بھی۔ میں موسم کی مناسبت سے ہی پکاتی ہوں۔ خود بھی کھاتے ہیں اور اوروں کو بھی کھلاتے ہیں۔

س: کھانے میں محنت کی کتنی قائل ہیں؟
ج: شادی سے پہلے تو امی کے حکم سے پکاتی تھی۔ مگر شادی کے بعد اپنے موڈ کی قائل ہوں۔ اگر آپ کا موڈ اچھا ہو گا تو کھانا اچھا بنے گا۔ اگر آپ کا موڈ خراب ہے تو یہ فرمائش کر دیتے ہیں۔ جب بھی موڈ بنتا ہے۔ بنادیتی ہوں ورنہ اپنی مرضی سے ہی پکاتی ہوں۔ (جوان کو پسند ہوتا ہے) حسن بھی فرمائش کرتا

رہتا ہے۔ اسے چکن کڑاہی اور شامی کباب بہت پسند ہیں۔ تو اتوار کے دن زیادہ تر یہی بناتی ہوں۔

بہت سے گھروں میں تو شامی کباب مہمانوں کے لیے فریز کر لیے جاتے ہیں۔ میں نے بھی بہت مرتبہ کوشش کی، اتنا سارا سارا قیمہ سل پر پیس کر مہمانوں کے لیے رکھا مگر نہ جی ہمارے شوہر اور بیٹے بھی چھوڑیں تب نا، جب تک وہ ختم نہ ہو جائیں، دوسری چیز نہیں پک سکتی۔ میں جو سر، بلینڈر کے بجائے سل بٹ زیادہ استعمال کرتی ہوں۔ جو مزہ سل پر پیسی چٹنی کا ہوتا ہے وہ بلینڈر میں نہیں آتا۔

اسی طرح اگر دال کے بڑے (منگو چیاں) بنانی ہوں یا کوفتے، کباب سب کچھ سل پر ہی پختی ہوں۔ ایسے ہی جو مزہ کسی کا بنانے میں ہے وہ جو سر میں نہیں آتا۔ رکی سے بنی کی گاڑھی گاڑھی مزے دار لگتی ہے۔ جو سر میں تو بالکل پتلی ہو جاتی ہے۔

س: اگر آپ کوئی ٹپ دینا چاہیں؟
ج: کھانا پکاتے ہوئے سب سے پہلے بسم اللہ شریف پڑھیں۔ اس کی برکت سے کھانا بھی کم نہیں پڑے گا..... اور اسے کھانے میں سے ضرور ایک آدنی کا کھانا کسی نہ کسی کو بھجوائیں، چاہے متحد ہو یا مدرسہ، اپنے کسی رشتہ دار کے، پڑوسی کے یا مانگنے والوں کے، کسی کو بھی ضرور دیں۔ چاہے سالن ہی کیوں نہ دیں یا ایک روٹی ہی دے دیں۔ اللہ آپ کے رزق میں بے تحاشا برکت دے گا۔ آپ کو ایک بات اور بتائی چلوں، گردے میں تکلیف کی وجہ سے مجھ سے زیادہ دیر بیٹھا نہیں جاتا، اس کے باوجود میں آپ سب کی محبت میں ایک ہی نشست میں بیٹھ کر خط مکمل کرتی ہوں۔ پتا نہیں کیوں مگر ایسا لگنے لگا ہے میرے پاس اب بہت مختصر وقت رہ گیا ہے۔ اب تو سفر آخرت کی تیاری ہے۔ اللہ مجھے اتنی زندگی دے میں جو کرنا چاہتی ہوں وہ کر پاؤں۔ جب اس دنیا سے جاؤں تو لوگ اچھے الفاظ میں یاد کریں پیاری فرزانہ! اللہ تعالیٰ آپ کو صحت مند لمبی زندگی دے اور آپ اپنے پوتوں کی خوشیاں دیکھیں۔ آمین۔

موسم کے پکوان

خگد جیلانی

چکن کھڑا مسالہ

اجزاء:	
چکن (بڑی بوٹیاں)	ایک کلو
لہسن اور مک (پسا ہوا)	دو کھانے کے چمچے
ٹماٹر	دو سے تین عدد
پیاز	دو عدد
نمک	حسب ذائقہ
ہلدی پاؤڈر	ایک چوتھائی چائے کا چمچ
دھنیا پاؤڈر	ایک چائے کا چمچ
لال مرچ پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچ
ثابت دھنیا	آدھا چائے کا چمچ
زیرہ	آدھا چائے کا چمچ
گرم مسالا پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچ
ثابت لال مرچیں	دو عدد
ہری مرچیں	چار عدد
ہر ادھنیا	ایک گٹھی
گھی	آدھا کپ

ترکیب: پتیلی میں گھی گرم کر کے اس میں ثابت دھنیا، زیرہ اور ثابت لال مرچ ڈال کر چند سیکنڈز تک پکائیں۔ اس کے بعد اس میں پیاز ڈال کر گلابی ہونے تک فرائی کریں۔

چکن، نمک اور پسا ہوا اور مک لہسن ڈال کر چھ سے آٹھ منٹ تک فرائی کریں۔ اس کے بعد اس میں ٹماٹر، ہلدی پاؤڈر، دھنیا پاؤڈر، لال مرچ پاؤڈر، گرم مسالا پاؤڈر اور ہری مرچیں ڈال کر دو سے تین منٹ

تک فرائی کریں اور ایک کپ پانی ڈال کر ڈھکن ڈھک کر پکائیں۔ گوشت گل جائے اور پانی خشک ہو جائے تو اس میں ہر ادھنیا چوپ کر کے ڈالیں۔

اسپائسی فرائیڈ بیف رائس

اجزاء:	
گوشت	ایک کلو
نمک	حسب ذائقہ
لال مرچ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچ
پیاز	ایک عدد
ٹماٹر	چار عدد
ادرک لہسن	ایک کھانے کا چمچ
ہلدی پاؤڈر	ایک چوتھائی چائے کا چمچ
دھنیا پاؤڈر	ایک چوتھائی چائے کا چمچ
گرم مسالا پاؤڈر	ایک چوتھائی چائے کا چمچ
تیل	حسب ضرورت
چاول	دو کپ (ابلے ہوئے)

ترکیب: کسی برتن میں تیل گرم کر کے اس میں پیاز ڈال کر سنہری کریں۔ اس کے بعد اس میں گوشت، نمک اور پسا ہوا لہسن اور مک ڈال کر پانچ سے آٹھ منٹ تک بھونیں۔ لال مرچ پاؤڈر، ٹماٹر، ہلدی پاؤڈر، دھنیا پاؤڈر، گرم مسالا پاؤڈر ڈال کر مزید پانچ سے چھ منٹ تک بھونیں۔

گوشت گلنے کے حساب سے پانی ڈال کر ڈھکن ڈھک کر ہلکی آنچ پر پکائیں۔ گوشت گل جائے اور پانی خشک ہو جائے تو ڈش میں پہلے ابلے ہوئے چاول ڈالیں۔ اس کے اوپر بھنا ہوا گوشت رکھیں اور

سرو کریں۔

فرائیڈ چکن بائیت

اجزاء:	
بون لیس چکن	آدھا کلو
پسا ہوا اور مک لہسن	ایک چائے کا چمچ
چاٹ مسالا پاؤڈر	ایک چائے کا چمچ
ہلدی پاؤڈر	ایک چمچ
نمک	حسب ذائقہ
لال مرچیں (کٹی ہوئی)	ایک چوتھائی چائے کا چمچ
دہی	ایک کھانے کا چمچ
سویا ساس	دو کھانے کے چمچے
کارن فلور	چار کھانے کے چمچے
نخنی	آدھا کپ
کیچپ	دو کھانے کے چمچے
سرکہ	دو کھانے کے چمچے

ترکیب: چلی گارلک ساس لہسن کے جوے ہری مرچیں (چوپ کر لیں) دو عدد تیل حسب ضرورت

چکن میں نمک، پسا ہوا لہسن، چاٹ مسالا، دہی، ہلدی پاؤڈر، کٹی لال مرچیں، ایک چمچ، سویا ساس اور کارن فلور ملا کر ایک گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ اس کے بعد گرم تیل میں فرائی کر کے نکال کر ایک طرف رکھ دیں۔ ساس پین میں تیل گرم کر کے اس میں چوپ کیا ہوا لہسن اور ہری مرچیں اور بقیہ سویا ساس ڈال کر پکائیں۔ آمیزہ گاڑھا ہونے لگے تو اس میں فرائی کی ہوئی چکن ڈالیں۔

مزے دار فرائیڈ چکن بائیت تیار ہے۔ ابلے چاولوں کے ساتھ سرو کریں۔

بہاری کباب

اجزاء:

پسندے کا گوشت	آدھا کلو
پیاز (کچی پس ہوئی)	ایک عدد
نمک	حسب ذائقہ
لال مرچ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچ
گرم مسالا پاؤڈر	ڈیڑھ کھانے کا چمچ
سرسوں کا تیل	ایک کپ
دہی	آدھا کپ
ادرک پیسٹ	آدھا چائے کا چمچ
پیتا	ایک چائے کا چمچ

ترکیب: پسندوں کو دھو کر اچھی طرح خشک کر لیں۔ سب سے پہلے اس پر نمک، ادرک، پیتا اور دہی لگا کر برتن کو ڈھک کر رکھ دیں۔ اس کے بعد پیاز، گرم مسالا پاؤڈر لگا کر رکھیں۔ اس میں سرسوں کا تیل، لال مرچ پاؤڈر لگا کر رکھ دیں۔ سینوں پر پسندے لگائیں۔ اور کوئلے پر سینک لیں یا گرل کر لیں۔ پیاز اور سلاد کے ساتھ گرم گرم سرو کریں۔

رنگ برنگی قلفی

دودھ	ایک کلو
چینی	آدھا کپ
قلاقند	ایک کپ
کارن فلور	ایک کھانے کا چمچ
بادام (چوپ کر لیں)	آدھا کپ
پستہ ایسنس	دو قطرے
دودھ کو پکا کر گاڑھا کر لیں۔ اس میں چینی، کارن فلور، علیحدہ دودھ میں ملا کر ڈالیں۔ اس کے بعد قلاقند شامل کر کے اچھی طرح ہلائیں اور چولہا بند کر دیں۔	
ٹھنڈا ہونے پر بادام اور ایسنس ڈال کر قلفی کے مولڈ میں جمادیں۔ قلفی تیار ہے۔	

نادیہ..... لاہور

س: میرے شوہر کے انتقال کو ایک سال ہو گیا ہے۔ انہیں کسی نے ٹارگٹ کر کے گولی ماری۔ وہ موقع پر ہی شہید ہو گئے۔ شادی کے بعد صرف ڈھائی سال کا مختصر عرصہ میں نے ان کے ساتھ گزارا۔ جب ان کی شہادت ہوئی تو میری بچی صرف چھ ماہ کی تھی۔ اب وہ ڈیڑھ سال کی ہے۔

میرے شوہر میری محبت تھے۔ وہ میرے چچا زاد تھے۔ بچپن میں ہی دادا نے رشتہ طے کر دیا تھا۔ ان کی محبت کی جڑیں میرے دل میں بہت گہری تھیں۔ کچھ انہوں نے مزاج اور طبیعت بھی ایسی پائی تھی کہ سب ہی ان سے محبت کرتے تھے۔ انتہائی نرم خو اور نیک دل تھے۔ شاید ہی دنیا میں کوئی ایسا ہوگا جس کو انہوں نے کوئی تکلف پہنچائی ہو، پتا نہیں قاتلوں کو ان سے کیا دشمنی تھی۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ دہشت گرد لاشوں کی کنتی میں اضافہ کرنا چاہتے تھے۔ یہ سامنے آئے تو ان کو گولی ماری۔

اتنی اچانک موت کہ وہ کوئی وصیت بھی نہ کر سکے۔ جس گھر میں، میں رہتی ہوں۔ اس میں میرے جیٹھ جٹھانی اور دونوں بچے بھی رہتے ہیں۔ میں جانتی ہوں کہ یہ گھر دونوں بھائیوں نے مل کر تعمیر کیا تھا۔ اوپر کے پورشن میں میں رہتی ہوں جبکہ نیچے منزل میں جیٹھ، جٹھانی اور ان کے بچے رہتے ہیں۔

اب جیٹھ اور جیٹھانی کہتے ہیں کہ تم یہ گھر چھوڑ دو۔ یہ ہمارا ہے۔ تجھے یہ بھی علم نہیں کہ گھر کس کے نام ہے۔ میرے والدین کا انتقال ہو چکا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہاں جاؤں، کیا کروں؟ بھائی ہیں لیکن ان کا رویہ بہت سرد ہے۔ میرے پاس کوئی بڑی ڈگری نہیں ہے۔ بی اے کا امتحان دیا تھا کہ شادی ہو گئی۔

ج: نادیہ بہن! انسان ظالم بھی ہے اور جاہل بھی۔ اسے اپنے آنے والے بل کا علم نہیں لیکن وہ سامان سو برس کے کرتا ہے۔ آپ کے جیٹھ یہ بھول رہے ہیں کہ اس گولی کا نشانہ وہ بھی بن سکتے تھے۔ تب ان کی بیوی، بچے کہاں جاتے۔ اللہ تعالیٰ ان کو ہدایت دے۔

آپ کی بچی ابھی بہت چھوٹی ہے..... آپ کے لیے فی الحال کوئی کام کرنا بھی مشکل ہوگا۔ آپ اپنے جیٹھ اور جٹھانی سے بات کریں۔ ان سے کہیں کہ جب آپ اپنا کوئی بندوبست کر لیں گی تب یہ گھر چھوڑ دیں گی۔ فی الحال وہ آپ کو ڈسٹرب نہ کریں۔ اس دوران آپ کوئی ہنر سیکھیں یا پرائیویٹ پڑھائی مکمل کرنے کی کوشش کریں۔

یہ اچھی بات ہے کہ جیٹھ تایا زاد ہیں۔ آپ اپنے خاندان کے بزرگوں، رشتہ داروں سے مدد لیں۔ انہیں درمیان میں ڈالیں۔ ان سے کہیں کہ وہ جیٹھ سے بات کریں۔ مقدمہ بازی کا مشورہ اس لیے نہیں دیا جاسکتا کہ یہاں عدالتوں کا حال سب کو معلوم ہے۔ اول تو مقدمہ کے اخراجات ہی بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ پھر جج بھی رشوت لے کر فیصلہ کرتے ہیں۔ مقدمہ بازی میں آپ جیت نہیں پائیں گی۔

س: ک..... کراچی

س: چھوٹی سی عمر میں، والدین نے میرا رشتہ تایا زاد سے کر دیا تھا۔ ہمارے گھر میں غربت بہت ہے۔ اس لیے والدین کا ہاتھ بٹانے کے لیے لوگوں کے کپڑے سیتی ہوں۔ میری ایک بہن پولیو زدہ ہے۔ اس کی دیکھ بھال کے علاوہ چھوٹے پانچ بہن بھائیوں کو سنبھالنا بھی میری ذمہ داری ہے۔ نکاح کو پانچ سال ہو گئے ہیں۔ تایا جی دفعہ رخصتی کی

بات کر چکے ہیں مگر میرے والدین کا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔ ان کا خیال ہے میری شادی ہو جائے گی تو آمدنی کا ذریعہ ختم ہو جائے گا۔ ماں کو گھر سنبھالنا پڑے گا۔ والدین کی ان باتوں نے مجھے ذہنی مریض بنا دیا ہے۔ میں خود بھی اس غربت اور مشقت سے تنگ آ گئی ہوں۔ مگر والدین کو احساس نہیں۔ وہ ہر صورت اس رشتے کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔

ج: آپ کا خط پڑھ کر دلی دکھ ہوا ہے۔ یہ آپ کا ہی نہیں ان بہت سارے گھروں کا مسئلہ ہے جہاں لڑکیاں نوکری یا محنت کر کے کمائی ہیں اور ان کی کمائی سے گھر چلتا ہے۔ آپ نے اپنی پولیو زدہ بہن کے بارے میں نہیں لکھا کہ وہ کس حد تک معذور ہیں۔ اگر وہ صرف ٹانگوں سے معذور ہیں تو بیٹھ کر کپڑے با آسانی سی سکتی ہیں۔ آپ انہیں کپڑے سینا سکھادیں۔ چھوٹے بہن بھائی بھی یقیناً آپ سے بہت زیادہ چھوٹے نہیں ہوں گے۔ دو چار سالوں میں آپ کی کوئی بہن آپ کی جگہ لے سکتی ہے۔ آپ اپنی والدہ سے کھل کر بات کریں۔ ان سے کہیں کہ وہ تایا کے ساتھ بدسلوکی کر کے اس رشتہ کو ختم کرنے کی کوشش نہ کریں بلکہ ان سے کچھ عرصہ کی مہلت لے لیں۔ آپ کے تایا آپ کے والد کے بھائی ہیں، وہ اپنے بھائی کی مجبوریاں سمجھتے ہوں گے۔ یقیناً مان جائیں گے۔ آپ کا نکاح ہو چکا ہے۔ آپ اپنے شوہر سے بھی اس سلسلے میں بات کر سکتی ہیں۔ انہیں اپنے گھر والوں کی مجبوریاں بتائیں۔

اپنی امی کو بھی سمجھائیں کہ یہ ممکن نہیں نکاح ہے۔ اگر یہ سلسلہ ختم ہوا تو آپ کی پیشانی پر طلاق کا داغ لگ جائے گا۔ اپنے حق کے لیے زبان کھولنا بے حیائی نہیں۔ آپ کو اپنے حق کے لیے آواز اٹھانا ہوگی۔

آسینہ خان..... جام پور

س: میں ایک ایسے گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں جہاں مذہبی اقدار و روایات کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ میری منگنی بچپن سے پھوپھی زاد سے طے تھی۔ مگر پھوپھا کے انتقال کے بعد ان کا سارا کاروبار چوٹ ہو گیا۔ میری انتہائی امیر پھوپھی ملازموں کی بدعنوانی کے باعث کوڑی کوڑی کی محتاج ہو گئی ہیں۔

مسئلہ یہ ہے کہ اب میری والدہ اپنی غریب نند کے گھر میرا رشتہ نہیں کرنا چاہتیں۔ میں نے بچپن سے پھوپھی زاد کا نام ہی اپنے نام کے ساتھ سنا ہے۔ مگر والدہ کی خواہش ہے کہ میری کسی فارن رشتہ منشی کے حامل شخص سے شادی ہو جائے تاکہ میرے چھوٹے بھائیوں کا باہر جانے کا راستہ کھلے۔

میں تین بھائیوں کی اکلوتی بہن ہوں۔ والد، والدہ کی ضدی طبیعت سے واقف ہیں اور کچھ بھی کرنے سے قاصر ہیں۔ میں والدہ کی نافرمان نہیں ہوں مگر پھوپھی زاد کے علاوہ کسی اور کا تصور بھی میرے لیے سوہان رویہ ہے۔

ج: آپ نے لکھا ہے کہ آپ کے گھرانے میں مذہبی اقدار و روایات کو اہمیت دی جاتی ہے۔ تو ایسے گھرانے میں تو زبان اور رشتوں کی پاس داری کرنا چاہیے۔

آپ پہلے اپنے ذہن کو یکسو کریں۔ اگر آپ میں اتنی اہمیت اور حوصلہ ہے کہ اپنے غریب شوہر کا ساتھ دے سکیں۔ اس کے ساتھ زندگی کی مشکلات کا سامنا کر سکیں تو یہ رشتہ قائم رکھیں ورنہ اس رشتہ کا ختم ہو جانا ہی بہتر ہے۔ آپ کو بتادوں کہ جو لوگ غربت کے ماحول کے عادی نہیں ہوتے ان کے لیے غربت میں زندگی گزارنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ آپ مسائل اور مصائب کا مقابلہ نہ کر سکیں۔ ایسی صورت میں آپ اپنے لیے ہی نہیں اس لڑکے کے لیے بھی پریشانی کا باعث بن جائیں گی۔ صرف محبت ہی کافی نہیں، مشکل حالات میں ساتھ دینے کے لیے حوصلہ اور ہمت کی بھی ضرورت ہوتی ہے، اگر آپ خود میں واقعی یہ ہمت پاتی ہیں تو اپنے والدین سے بات کریں۔ انہیں بتادیں کہ آپ اپنا رشتہ قائم رکھنا چاہتی ہیں۔ اب حالات کافی حد تک بدل گئے ہیں۔ ممکن ہے کہ آپ کی والدہ آپ کی مرضی جان کر اس رشتہ کو ختم نہ کریں۔ ایسی صورت میں یہ اور بھی ممکن ہے کہ آپ کے والد اس رشتہ کو قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن آپ کو ثابت قدم رہنا ہوگا۔

FACE FRESH BEAUTY PRODUCTS

جوفیس فریش
وہی بیوٹی فیل

BEAUTY TREATMENT



سے صاف کر لیں۔

6- اب فاؤنڈیشن لگائیں۔ اسے نقطوں کی شکل میں لگائیں پھر ہلکے سے نم اسفنج کی مدد سے پورے چہرے پر پھیلائیں اور اچھی طرح ہموار کر لیں۔ فاؤنڈیشن اپنی جلد کی رنگت کے مطابق لیں بہت زیادہ سفیدی مائل ہونے کی صورت میں وہ آپ کی جلد سے مطابقت نہیں رکھ سکے گا۔

7- اب چہرے پر فیس پاؤڈر لگائیں۔ فیس پاؤڈر کا رنگ بھی فاؤنڈیشن سے میچ کرتا ہوا لیں۔ اور بہت ہلکا لگائیں۔

8- اب چہرے کی ہڈیوں کے ابھار سے کپٹی کی طرف بلش آن لگائیں۔ اس سے آپ کے چہرے پر چمک پیدا ہوگی۔

9- آئی شیڈو..... شادی والے دن آپ لباس کی مطابقت سے آئی شیڈو لگائیں۔ ہلکا سنہری یا میرون رنگ کا آئی شیڈو استعمال کر سکتی ہیں۔

10- آنکھوں پر آئی لائنر بھی لگا سکتی ہیں لیکن بہتر یہی ہے کہ کاجل لگائیں۔

11- اب آخر میں لپ اسٹک لگائیں۔ عروسی جوڑا عموماً سرخ رنگ کا ہوتا ہے اس لیے سرخ لپ اسٹک لگائیں پہلے میرون رنگ سے آؤٹ لائن لگائیں پھر برش کی مدد سے سرخ رنگ کی لپ اسٹک لگائیں۔

ایک بات ذہن میں رکھیں۔ دہن کو میک اپ سے زیادہ جو چیز دلکش بناتی ہے، وہ اس کے چہرے پر ہلکی سی شرمیلی مسکان ہے۔ اس سے چہرہ پر چمک آتی ہے اور چہرہ تروتازہ نظر آتا ہے۔

شاز یہ عمران..... چٹوکی

س: میں بہت چھوٹے سے گاؤں میں رہتی ہوں۔ بھائی شہر میں نوکری کرتے ہیں۔ میری شادی ہونے والی ہے۔ گاؤں میں بیوٹی پارلر کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ میں چاہتی ہوں کہ میں شہر سے میک اپ کی کچھ چیزیں منگوا لوں تاکہ شادی والے دن تیار ہو کر اچھی لگ سکوں۔ میرا رنگ گندمی مائل سانولا ہے۔ یہ بھی بتائیں مجھ پر کس رنگ کی لپ اسٹک اچھی لگے گی؟

ج: شاز یہ! آپ اپنے بھائی سے درج ذیل اشیاء منگوائیں۔
کلینزنگ ملک، موچر انر، اسٹرنجٹ، فاؤنڈیشن (لیکونڈ) فیس پاؤڈر، بلش آن، آئی شیڈو، کاجل اور لپ اسٹک کے ریڈ کلر میں تین مختلف شیڈ۔

1- شادی سے ایک دن پہلے آپ چہرے پر کلینزنگ ملک لگائیں پھر روئی سے چہرے کو صاف کر لیں۔

2- اب چہرے کو بھاپ دیں۔ دس منٹ بعد چہرہ اچھی طرح صاف کر لیں۔ اگر چہرے پر کیل ہیں تو وہ بھاپ سے نرم ہو جائیں گی۔ انہیں دبا کر نکال دیں۔

3- اب اسٹرنجٹ لگائیں۔ اس سے جلد کے کھلے مسام بند ہو جائیں گے اگر جلد پر داغ یا دھبے ہیں تو ختم ہو جائیں گے۔ اسے روئی کی مدد سے لگائیں۔

4- شادی والے دن آپ کسی اچھے صابن سے منہ دھونے کے بعد چہرے پر کلینزنگ ملک لگائیں۔ پھر ٹشو سے چہرہ صاف کر لیں۔

5- چہرے پر موچر انر لگائیں۔ اسے بھی ٹشو